آگرہ

اکبر اور اُس کا دربار

سیّد محمّد لطیف



آگرہ

اکبر اور اُس کا دربار

سید محمد لطیف



اکرم آرکیڈ، ۲۹۔ ٹیمپل روڈ (اسقاں والا چوک) لاہور۔ پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۳

سید محمد لطیف کی معرکہ آراء تصنیف

AGRA

HISTORICAL & DESCRIPTIVE WITH AN ACCOUNT OF AKBAR AND HIS COURT

کا اردو ترجمہ

— مصنف —

خان بہادر شمس العلماء جج سید محمد لطیف

- ★ فیلو رائل اسٹرونومیکل سوسائٹی
- ★ فیلو رائل جیوگرافیکل سوسائٹی
- ★ فیلو پنجاب یونیورسٹی
- ★ ممبر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
- ★ ممبر ڈی لا سوسائٹی ایشیاٹک پیرس (فرانس)

تحقیق و ترتیب : سید منہاج الدین

مترجم : افکار محبوب

ناشر : تخلیقات' لاہور

اہتمام : لیاقت علی

پرنٹرز : یاسر ظہیر پرنٹرز ۔ لاہور فون ۶۳۲۰۹۶۲

سن اشاعت : اکتوبر 1995

ٹائٹل ڈیزائن : ریاظ

قیمت : 230 روپے

فہرست مضامین

صفحہ

باب اول

آگرہ: تاریخی

باب دوئم

آگرہ: بیانی

باب سوئم

اکبر اور اس کا دربار

باب چہارم

تصاویر کی فہرست



مصنف :- سید محمد لطیف

1845 - 1902ء

سید محمد لطیف

میرے دادا سید محمد لطیف صاحب المعروف جج محمد لطیف ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ منشی سید محمد عظیم صاحب کے گھر پیدا ہوئے، جن کا تعلق دہلی کے ایک معروف علمی و مذہبی خاندان سے تھا۔ سید محمد لطیف صاحب کے آباؤ اجداد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اپنی دینی خدمات اور علم پروری کے باعث ممتاز و اعلیٰ حیثیت کے حامل تھے۔ اس گھرانے کے ایک جید عالم و بزرگ مولانا حاجی محمد عرب صاحب کی شہرت سن کر مغل شہنشاہ شاہجہان نے انھیں ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ مولانا حاجی محمد عرب صاحب دہلی آکر آباد ہو گئے اور اس شہر کے دینی و علمی حلقوں کو رونق بخشی۔ آپ کی بے حد عزت و توقیر کی گئی اور آپ کو شاہی خاندان کا معلم مقرر کیا گیا۔ آپ کی خدمات اور احترام کے پیش نظر مغل بادشاہ آپ کی اور آپ کے جانشینوں کی قدر و خبر گیری کرتے رہے۔

ایک قدیم خاندانی دستاویز کے مطابق سید محمد لطیف صاحب کا سلسلہ نسب ۲۷ ویں پشت میں امام دہم حضرت امام الہادی التقی علی ابن محمد التقی صدق اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ امام دہم کی چھ اولادیں تھیں، جن میں سے تین بیٹے لاولد تھے۔ ایک بیٹے امام یازدہم حضرت امام حسن عسکری اور دوسرے حضرت سید جعفر جلیل اللہ تھے۔ حضرت سید جعفرؒ، جو زہد و تقویٰ میں یکتا تھے، کے بیٹے حضرت سید علی جمیل اللہ تھے، جنھوں نے اپنے والد بزرگوار کے ہدایت الی الحق کے مشن کو جاری رکھا۔ ان کے بیٹے حضرت سید عبداللہ تھے، جو بڑے زاہد اور اطاعت خداوندی میں نہایت برگزیدہ تھے۔ حضرت سید عبداللہ کے بیٹے حضرت سید احمد مقبول اللہ تھے، ان کے دو بیٹے حضرت سید علی اور حضرت سید محمود مختار اللہ تھے۔

سادات بخاری، حضرت سید محمود مختار اللہ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت سید محمود کے بیٹے حضرت سید محمد صفی الدین بخاری مسند نشین ہوئے۔ ان کے فرزند شیخ المشائخ قطب الاقطاب حضرت سید محمد علی ثانی ہمدانی تھے، جنھوں نے اپنے زمانے میں کفر و ضلالت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور حق پرستوں نے ان کی حمایت و سرپرستی میں حق کا بول بالا کیا۔ ان کے

فرزند شیخ المشائخ قطب الاقطاب حضرت سید محمد اسحاق ختلانی تھے۔ ان کے فرزند شیخ المشائخ سید السادات جامع السادات حضرت سید محمد نور بخش تھے جن کے فرزند نور بخش حضرت سید محمد علی تھے۔ ان کے فرزند حضرت سید محمد غیاث نور بخش اعلیٰ اللہ درجاتہ ہوئے۔ ان کے فرزند حضرت سید حسن محمد تھے' جن کے فرزند حضرت سید محمد' ان کے فرزند حضرت سید محمد مکرم' ان کے صاحبزادے حضرت سید پیر محمد اور ان کے فرزند حضرت سید محمد عبدالرشید قادری تھے۔ ان کے جانشین فرزند شیخ المشائخ قطب الاقطاب حضرت سید محمد قاسم تھے۔ ان کے فرزند حضرت سید پیر محمد مکرم ثانی تھے' جن کے فرزند شیخ المشائخ حاجی الحرمین حضرت مولانا سید محمد عرب (وفات ۱۰۵۸ھ) تھے' جو علم اور زہد و تقویٰ میں بہت اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کے رشد و ہدایت کی شہرت اس قدر ہوئی کہ اس زمانے کے بادشاہ بھی ان کے علم و فضل سے نہایت متاثر ہوئے' چنانچہ مغل شہنشاہ شاہجہان نے آپ کو مدینہ طیبہ سے ہندوستان بلایا اور ان کے فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوا۔ حضرت سید محمد عرب' کے فرزند حضرت حاجی محمد عبدالرحیم (وفات ۱۱۱۸ھ) شیخ المشائخ تھے' جو اپنے والد کی مسند ارشاد پر فائز ہوئے۔ ان کے فرزند شیخ المشائخ حضرت حاجی محمد اکرم (وفات ۱۱۳۱ھ) تھے' جن کے صاحبزادے حضرت سید حاجی محمد ماہ (وفات ۱۱۷۹ھ) تھے۔ ان کے فرزند حضرت حاجی محمد اعظم (وفات ۱۲۵۰ھ) تھے' جن کے فرزند ارجمند حضرت حافظ محمد صالح (وفات ۱۸۵۶ء) تھے۔ ان کے خلف الرشید منشی حاجی سید محمد عظیم صاحب (وفات ۱۸۸۵ء) غفراللہ ذنوبہ تھے۔ ان کے تین صاحبزادے سید محمد لطیف صاحب (وفات ۱۹۰۲ء)' سید محمد شمس الدین صاحب (جج) (وفات ۱۹۲۹ء)' سید محمد سراج الدین صاحب (چیف جسٹس ریاست بہاولپور) (وفات ۱۹۳۹ء) تھے۔ سید محمد لطیف صاحب کے دو فرزند سید محمد غیاث الدین صاحب (وفات ۶ ستمبر ۱۹۰۶ء) اور میرے والد محترم خان صاحب سید محمد عزیز الدین (وفات یکم مئی ۱۹۵۳ء) تھے۔

دہلی میں آپ کے خاندان کے مشہور و معروف بزرگوں میں حاجی محمد عبدالرحیم صاحب' حاجی محمد اکرم صاحب' حاجی محمد ماہ صاحب' حاجی محمد اعظم صاحب اور حافظ محمد صالح صاحب کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ یہ سب حضرات اپنے اپنے دور میں دہلی کی بزرگ اور معتبر ہستیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ سید محمد لطیف صاحب کے برادر صغیر سید محمد شمس الدین صاحب کے مطابق "نو لکھا میں حضرت والد صاحب (سید محمد عظیم صاحب) کے پاس دہلی سے ہمارے دادا صاحب حضرت حافظ محمد صالح صاحب" کی سناونی آئی' چنانچہ ان کا چہلم وہیں نہایت احترام سے کیا گیا۔ حضرت دادا صاحب کا مزار دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مزار

پر انوار کی پائنتی سے پانچ سات گز کے فاصلہ پر جانب غرب ایک چبوترہ پر واقع ہے۔ لحد کے سرہانے الفاظ "حافظ محمد صالح" درج ہیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ" کا اصلی نام سید رضی الدین احمد تھا۔ وہ کابل سے تشریف لائے تھے۔ ہندوستان میں انہی کی ذات فیض آیات سے طریقہ نقشبندیہ کو رواج حاصل ہوا۔ دو مزارات ہمارے بزرگوں کے اس چبوترے پر واقع ہیں' جو جامع مسجد دہلی کی غلام گردش میں مسجد کے شمال کی طرف ہے۔ اس چبوترہ کے غربی حصہ میں یہ مزارات ہیں۔ تاریخ وفات حضرت دادا حافظ محمد صالح صاحب بمطابق "پنجابی اخبار" مورخہ ۸ مئی ۱۸۵۶ء ہے"۔

حضرت حافظ محمد صالح صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں ہزاروں افراد تھے اور کئی شعرا نے اس موقع پر قطعات کہے۔ فقط ایک قطعہ تاریخ وفات مل سکا جو کہ جناب حضرت انور حسین رسول شاہی ہما کا ہے۔

چوں محمد صالح نیکو سیر بود ممتاز و حلیم و ہم فہیم
کرد رحلت زیں جہاں بے ثبات شد رواں سوئے مکان مستقیم
در سر تاریخ فوتش انچناں بودہ ام سرگرم کر لطف عمیم
ای ہما ہا کف ز روئے التفات گفت صالح یافت جنات النعیم

"جناب حافظ محمد صالح صاحب اور ان کے برادر اکبر حضرت حافظ عبدالعزیز صاحب ایسے اصحاب تھے کہ ان کی زبان میں برکت تھی۔ وہ پیران طریقت اور مجیب الدعوات کہلائے۔ عقیدت مند ان کا طواف کیا کرتے تھے اور اسے فلاح اخروی سمجھتے تھے۔ حضرت حافظ محمد صالح صاحب بڑے خوش پوشاک اور نفاست پسند تھے۔ ان کی خیر و خیرات کا یہ عالم تھا کہ راستہ چلتے اگر کوئی سائل مل گیا اور اس نے سوال کیا تو بسا اوقات اسے تن کے کپڑے بھی اتار کر دے دیتے۔ سادگی اور فروتنی کا یہ حال تھا کہ ایک وقت قیمتی دوشالہ زیب تن ہوتا تو دوسرے وقت پھٹا پرانا کمبل اوڑھ کر بازار میں نکلتے"۔

سید محمد شمس الدین صاحب کے مطابق "جامعہ مسجد دہلی کا ایک حصہ آثار شریف کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے تبرکات ہیں۔ ان تبرکات کے محافظ ہمارے خاندان کے افراد ہیں۔ درگاہ آثار شریف پر حافظ محمد صالح صاحب اور ان کے بڑے بھائی حافظ عبدالعزیز صاحب بطور سجادہ نشین متمکن تھے۔ ان دونوں حضرات کی وفات کے بعد یہ منصب حافظ عبدالعزیز صاحب کی اولاد کو منتقل ہوا اور ان کے خلف اکبر حافظ محمد داؤد صاحب اور خلف اصغر پیر جی عبدالرشید صاحب سجادہ نشین مقرر ہوئے اور آثار شریف

والے کہلائے اور یہ منصب انہی اصحاب کی اولاد کو منتقل ہوتا رہا"۔

"درگاہ آثار شریف میں ہر شب کثرت سے چراغاں ہوتا ہے۔ حکومت کی طرف سے پانچ سو روپیہ نذرانہ یہاں خاص مواقع کے لیے مقرر تھا۔ ریاست رام پور سے بھی آثار شریف کے اخراجات کے لیے کچھ نہ کچھ سالانہ مقرر تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر یہاں لوگ سلام کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے اور اب تک یہ رسم جاری ہے۔ حضرت والد صاحب کے بقول ہمارے خاندان کی یہ خصوصیت چلی آ رہی ہے کہ ہر ایک پشت میں ایک نہ ایک حافظ قرآن ضرور ہوتا ہے"۔

سید محمد لطیف صاحب نے ایک علمی' ادبی اور مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ یوں تو آپ کے خاندان میں انگریزی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا' مگر اس روایت کو آپ کے والد محترم سید محمد عظیم صاحب نے توڑ ڈالا' لہٰذا آپ کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فارسی' عربی اور دیگر مروجہ علوم کی ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے ہندوستان کی اعلیٰ درسگاہوں سے علم حاصل کیا۔ کٹڑہ تارکشاں (لاہور) میں قیام کے دوران آپ نے فارسی اور عربی منشی اسد اللہ صاحب سے پڑھی۔

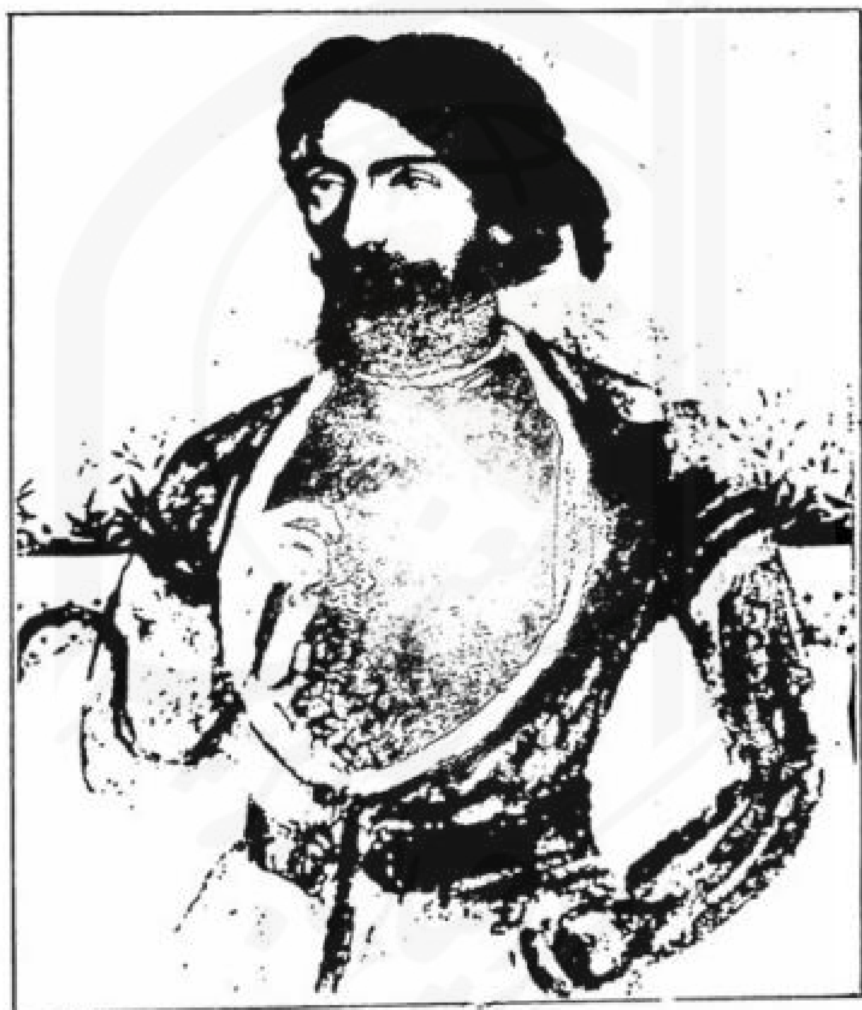
نوجوانی کے ایام میں ہی سید محمد لطیف صاحب کا تعلق دہلی کے ایک اور علمی و ادبی خاندان سے ہو گیا' جب ان کی شادی قاضی ولی جان صاحب کی دختر سے قرار پائی۔ قاضی ولی جان صاحب' سرسید احمد خاں صاحب اور خان بہادر مولوی سمیع اللہ جج صاحب کے قریبی عزیز تھے۔ اس نسبت سے سید محمد لطیف صاحب اور سرسید احمد خاں ایک دوسرے کے خاصے قریب ہو گئے اور مختلف ملکی و مذہبی مسائل کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ دونوں کے درمیان سلسلہ خط و کتابت کافی عرصے تک قائم رہا۔ سرسید احمد خاں کے دورۂ پنجاب (۱۸۸۴ء) کے دوران مراد آباد کے اخبار "نیر اعظم" نے ان کے خیالات پر نکتہ چینی کی تو سید محمد لطیف صاحب نے "پنجابی" اخبار میں اس کا مدلل جواب دیا۔

گھریلو علمی و ادبی ماحول کے باعث شعرگوئی اور تصنیف و تالیف کا شوق سید لطیف صاحب کی طبیعت میں بہت پہلے سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ان کی پہلی تصنیف ایک شعری مجموعہ "دیوان لطیف" تھی' جو ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی۔ جب ۱۸۶۵ء میں اخبار "پنجابی" دوبارہ جاری کیا گیا تو اس کے مترجم اور ایڈیٹر محمد لطیف صاحب ہی تھے۔ سید محمد لطیف صاحب ۱۸۶۸ء میں پنجاب چیف کورٹ میں بعہدہ مترجم بہ مشاہرہ یک صد روپیہ ماہوار متعین کیے گئے۔ جلد ہی وہ چیف کورٹ کے ریڈر مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ

جوڈیشل کمشنر کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔ بعد ازاں انہوں نے کئی اضلاع میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے فرائض منصبی سرانجام دیے۔ حکومت برطانیہ کے ریذیڈنٹ مسٹر پلوڈن نے آپ کو بطور چیف جسٹس ریاست حیدر آباد دکن کی پیشکش کی اور آپ کا باقاعدہ تقرر بھی کر دیا گیا لیکن ان کی طبیعت پنجاب چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی اور انکار کر دیا۔ ۱۹۰۲ء میں ان کا نام پنجاب چیف کورٹ کے جج کے لیے تجویز کیا گیا لیکن تقرری سے پیشتر ۹ فروری ۱۹۰۲ء کو وفات پا گئے۔

سید محمد لطیف صاحب کے گھر کا ماحول چونکہ شروع ہی سے علمی و ادبی تھا' چنانچہ بچپن ہی سے آپ کو علماء' مصنفین اور شعراء کرام کی صحبت حاصل رہی۔ ایسے ماحول میں ان کا تصنیف و تالیف میں دلچسپی لینا ایک فطری امر تھا۔ آپ کے والد سید محمد عظیم صاحب ہر ماہ ایک مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کی رنگینی نے سید محمد لطیف صاحب کو شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ وہ عربی' فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں ہی دیوان کی اشاعت کے بعد' ان پر نثر نویسی کا شوق غالب آ گیا۔ وہ اخبار "پنجابی" کے عملہ ادارت میں شامل تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اور وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے جاری کردہ اخبار "رسالہ انجمن پنجاب" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں اسی رسالہ کے لیے مولانا محمد حسین آزاد بھی بطور ایڈیٹر کام کرتے رہے۔ "شروع جوانی ہی سے وہ اردو انگریزی اخبارات میں مضامین لکھتے تھے جس سے ان کی استعداد اور شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ وہ انگریزی اور اردو' دونوں زبانوں کے انشاء پرداز تھے۔ ان کی زبان میں سادگی اور ندرت تھی۔ ملک بھر میں ان کی تحریروں کی دھوم تھی اور خاص و عام میں ان کو زبردست شہرت و مقبولیت تھی"۔ ("نقوش" لاہور نمبر' ۱۹۶۱ء) لیکن جلد ہی ان کی ساری توجہ تاریخ نویسی پر مرکوز ہو گئی۔

۱۸۸۸ء میں انہوں نے "تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور" کے عنوان سے ایک کتاب بزبان اردو تصنیف کی۔ اس کتاب میں سید محمد لطیف صاحب نے پنجاب میں سکھوں کے عروج و زوال کی مستند اور جامع اور مفصل تاریخ تحریر کر دی ہے۔ آج کل کے حالات میں بالخصوص اس کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کتاب کو بھی طرز جدید میں جلد ہی آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ان کا ایک کتابچہ "ملتان کی قدیم تاریخ" (بزبان انگریزی) شائع ہوا۔ اسی سال ان کی کتاب "تاریخ پنجاب" (بزبان انگریزی) شائع ہوئی۔ ایک ہی سال بعد ان کی معرکہ الاراء کتاب "تاریخ لاہور" (انگریزی) منظر عام پر آئی۔



سید محمد لطیف کے والد منشی سید محمد عظیم

1815ء __ 1885ء

۱۸۹۶ء میں ان کی انتہائی دلچسپ شاندار تصنیف "تاریخ آگرہ" (انگریزی) شائع ہوئی۔ یہ کتابیں علم تاریخ میں مستند و معتبر قرار پائیں اور ان کے حوالہ جات دیگر علمی تحقیق کے علاوہ عدالتوں میں بھی دیئے جانے لگے۔ اس کے علاوہ سید محمد لطیف صاحب کلکتہ سے شائع ہونے والے "جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" و "کلکتہ ریویو" کے مستقل قلمی معاون تھے۔ ان رسائل میں سید محمد لطیف صاحب کے تاریخی تحقیقی مضامین باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ بالخصوص قدیم سکوں پر تحقیقی مقالے تمام دنیا میں تاریخ کے طالب علموں اور اساتذہ کے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ وہ رائل اسٹرونومیکل سوسائٹی اور رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے بھی فیلو تھے' نیز ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور سوسائٹی ڈی لاء ایشیاٹک پیرس (فرانس) کے رکن بھی تھے۔ سرکاری عہدوں کی بھاری ذمہ داریوں اور مصروفیت کے باوجود' چند سال کی قلیل مدت میں کئی کتابوں اور تحقیقی مقالہ جات کی اشاعت' سید محمد لطیف صاحب کی غیر معمولی ذہنی استعداد کا بین اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انہیں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطابات سے نوازا۔

سید محمد لطیف صاحب بڑی ہمہ گیر اور گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں اردو' عربی' فارسی کے علاوہ ہندی' سنسکرت' فرانسیسی اور انگریزی زبان پر بھی زبردست قدرت حاصل تھی۔ انگریزی زبان میں متعدد تصانیف کے علاوہ وہ انگلستان سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات و رسائل کے ہندوستان میں ریذیڈنٹ کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) بھی تھے اور مختلف جرائد و رسائل میں باقاعدگی سے لکھتے تھے۔

سید محمد لطیف صاحب کے والد محترم منشی سید محمد عظیم صاحب ۱۸۱۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے زمانہ میں انگریزی تعلیم کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے گھریلو تعلیم کے بعد انگریزی پڑھنا شروع کی اور اپنے والدین سے خفیہ' قدیم دہلی کالج میں داخل ہوگئے۔ کالج کے پرنسپل مشہور عالم مسٹر جے۔ ایچ ٹیلر تھے' جن کے کئی شاگرد ہندوستان میں اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔ ۱۸۳۰ء میں سید محمد عظیم صاحب کو انگریزی زبان پر دسترس کی بنیاد پر وظیفے کی سند ملی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سید محمد عظیم صاحب نے دہلی گزٹ پریس میں بطور کمپوزیٹر ملازمت حاصل کرلی۔ ان کے پرانے کاغذات میں سے بزبان انگریزی ایک چٹھی بھی دستیاب ہوئی' جو انہوں نے پنجاب کے چیف کمشنر کو لکھی تھی۔ اس میں لکھتے ہیں:
"میں نے اپنی تعلیم اپنے استاد مسٹر جے۔ ایچ ٹیلر سے پائی اور مسٹر رابرٹ نیو بھی مجھے گھر میں

تعلیم دیا کرتے تھے اور میرے بڑے مہربان تھے۔ سات برس کی تعلیم کے بعد میں مطبع دہلی گزٹ میں ڈاکٹر رینگر صاحب' سول سرجن دہلی کی سفارش پر ملازم ہو گیا اور تب سے میں مطبع کا کام بطور پرنٹر کرتا ہوں"۔

اس زمانہ میں یونیورسٹی کوئی نہ تھی۔ اگر تھی بھی تو دہلی کالج کے طالب علموں سے یونیورسٹی کا کوئی امتحان نہیں لیا جاتا تھا۔ سید محمد عظیم صاحب' سید حادی حسین خان صاحب بہادر سابق ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور پنڈت جوالا ناتھ صاحب کا زمانہ تعلیم ایک ہی تھا اور ان کے ساتھ بھائیوں جیسی محبت کیا کرتے تھے۔

کالج چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد سید محمد عظیم صاحب نے مسٹر پلیس (جو ایک بہت بڑے سوداگر تھے) کے چھاپہ خانہ میں ملازمت کر لی۔ یہاں ان کا وظیفہ پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔ عظیم صاحب چونکہ بہت محنتی اور نہایت تعلیم یافتہ تھے' اس لیے چند ہی برس میں انہوں نے فن طباعت میں کمال حاصل کر لیا اور کل مطبع کے فورمین ہو گئے۔ نیز انہیں مطبع کی سیاہی اور دیگر ساز و سامان وغیرہ کا ٹھیکہ بھی دے دیا گیا' جس سے آپ نے خاصا روپیہ کمایا۔ اس چھاپہ خانہ کا نام دہلی گزٹ پریس تھا۔ یہاں سے دہلی گزٹ اخبار بھی نکلتا تھا۔ لاکھوں روپیہ کا کارخانہ تھا۔ سید محمد عظیم صاحب کی رائے کی قدر کی جاتی تھی۔ قدر و منزلت ان کی عروج پر پہنچ گئی۔ رؤساء و دیگر شرفائے شہر کے ساتھ خاندانی لحاظ سے تو تعارف تھا ہی' مطبع کے اعلیٰ کارکن ہونے کی وجہ سے حلقہ احباب میں مزید وسعت ہو گئی۔ خاندان میں جب کوئی روزگار کی خواہش کرتا تو عظیم صاحب کے والد بزرگوار اسے سید عظیم صاحب کے پاس بھیج دیتے۔ ان کے چچازاد بھائی عبدالحکیم صاحب آگرہ والے (جو جناب خان بہادر پروفیسر مولوی ذکاء اللہ صاحب کی ہمشیرہ سے بیاہے ہوئے تھے)' ان کے برادر نسبتی میر عنایت علی صاحب اور ہم زلف مرزا محمد بیگ صاحب اور حقیقی بھائی محمد حفیظ اور دیگر بے شمار لوگ ان کے شاگرد اور زیربار احسان تھے۔

سید محمد عظیم صاحب جس وقت دہلی گزٹ پریس میں تھے' تو انہیں پتہ چلا کہ آگرہ کے نزدیک سکندرہ آرفن پریس فروخت ہونے لگا ہے۔ پنجاب پر سرکار برطانیہ کا قبضہ ہوا تو انہوں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا کہ سکندرہ آرفن پریس خرید کر لاہور میں مطبع جاری کریں گے' چنانچہ حکام سے۔ ...وہ طے کر کے لاہور تشریف لائے اور مطبع کے لیے جگہ کا انتخاب کیا۔ یہ ایک شاہی محل تھا جو نولکھا کے نام سے مشہور تھا اور شہر سے باہر واقع تھا۔ اس میں محل کے علاوہ کئی ایک حویلیاں اور متعدد اندرونی صحن تھے۔ ان سب کے باہر جنوب کی

طرف کھنڈر تھے۔ مشرق کی جانب بہت سی سفید زمین تھی اور تین اطراف میں لوگوں کے کھیت تھے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں اب لاہور ریلوے اسٹیشن واقع ہے۔ یہ جائیداد آپ نے خرید لی۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد آپ دہلی سے ہوتے ہوئے آگرہ تشریف لے گئے اور سکندرہ آرفن کا تمام ساز و سامان اور مطبع کے لیے حسب ضرورت ملازمین ساتھ لے کر واپس لاہور تشریف لائے۔ سامان باربرداری اس قدر تھا اور اتنے لوگ ہمراہ تھے کہ جس گاؤں سے گزر ہوتا' لوگ یہی سمجھتے کہ کوئی غنیم آگیا ہے۔ اسی محل میں مطبع جاری کیا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں جاری ہونے والے اس مطبع کو پنجاب کا اولین مطبع قرار دیا گیا ہے۔ اس کا نام "لاہور کرانیکل" رکھا گیا۔ اس میں فارسی اور انگریزی کے الگ الگ شعبہ جات تھے' جن کے مہتمم اور کارکن بہت قابل افراد تھے۔ ان میں سے اکثر وہ یورپین' بنگالی اور ہندوستانی شرفاء تھے' جو سکندرہ آرفن پریس میں ملازم تھے یا جنہیں دہلی سے بلایا گیا تھا۔ ان کی تنخواہیں خاطر خواہ تھیں۔ مطبع کا ایک وسیع گودام تھا۔ اسی طرح دفتری خانہ' مستری خانہ اور لوہار خانہ میں چیدہ چیدہ اشخاص متعین تھے۔

اس مطبع سے ایک انگریزی روزنامہ اخبار "دی لاہور کرانیکل" کے نام سے جاری کیا گیا جو بعد ازاں سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے نام سے ۱۹۶۳ء تک شائع ہوتا رہا۔ یہ نہایت اعلیٰ درجے کا اخبار تھا۔ مسٹر ولبی مینجر اور مسٹر کوپ اس کے ایڈیٹر تھے۔ کوئی دفتر یا سرکاری محکمہ ایسا نہ تھا جس کا مطبع سے واسطہ نہ پڑتا ہو۔ معمولی سے اعلیٰ طباعت کا کام اس مطبع میں ہوتا تھا۔ بڑی بڑی سرکاری رپورٹیں نہایت صحت کے ساتھ چھاپی جاتی تھیں۔ عظیم صاحب خود تمام کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ یہ انہی کی قابلیت اور مہارت تھی کہ انگریزی اخبار کے علاوہ مطبع کے اہم کام کو برسوں بخوبی نبھایا۔ عظیم صاحب کے بیٹے سید شمس الدین صاحب لکھتے ہیں "ہائی کورٹ لاہور کی لائبریری میں' میں نے کرانیکل پریس کی شائع شدہ ایک سرکاری رپورٹ دیکھی' جو بلحاظ طباعت و اشاعت ولایت کی طبع شدہ کتابوں سے کم نہ تھی"۔

سید شمس الدین صاحب ایک خاندانی دستاویز میں تحریر فرماتے ہیں "دہلی میں حضرت والد صاحب (منشی سید محمد عظیم صاحب) نے مطبع لاہور کرانیکل کے اجراء کے لیے ایک کمپنی قائم کی تھی۔ اس میں بائیس حصے والد صاحب کے تھے اور چند حصے بعض رؤسائے دہلی کے تھے۔ ایک حصہ اڑھائی سو روپیہ کا تھا۔ ان شراکت داروں سے مسٹر ولبی مینجر مطبع نے تنازعہ کرا دیا' جس کی بنا پر والد صاحب نے مطبع کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے حامی و مربی سر رابرٹ

منٹگمری صاحب بہادر سابق چیف کمشنر پنجاب و بعدہ' نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی زیر حمایت ایک جدید ذاتی مطبع جاری کرنے کا ارادہ کیا"۔

اس تفرقہ کی وجہ سے والد صاحب نے نولکھا والا مکان بھی چھوڑ دیا اور اہل خانہ کو لے کر چوک وزیر خاں کے متصل ایک حویلی میں رہائش اختیار کر لی' جسے سلطانہ والی حویلی کہا جاتا تھا۔ سلطانہ والی حویلی میں آتے ہی انہوں نے انگریزی پریس اور ٹائپ کے لیے ایڈنٹ کیا اور اس کے آنے پر دیوان شنکرناتھ کے طویلہ' متصل مسجد وزیر خاں میں ۱۸۵۶ء میں مطبع جاری کیا۔ اس مطبع کا نام سر رابرٹ منٹگمری کے مشورہ سے "پنجابی پریس" رکھا گیا۔ تاریخ اجرائے مطبع پنجابی اخبار مورخہ ۲۴ جولائی ۱۸۵۶ء سے ذیل میں درج کی جاتی ہے:

قطعہ تاریخ مطبع پنجابی لاہور

از فقیر انور حسین رسول شاہی ہما

چوں بنا ایں مطبع پنجابی لاہور شد — از کمال اہتمام منشی عالی ہمم

وہ کہ اشہر مطبع پنجابی لاہور شد — سال تاریخ بنائش با ہما گفتہ سروش

(۱۲۷۳ھ)

یہاں سے ایک اردو اخبار "پنجابی" بھی جاری کیا گیا جو ہفتہ میں دو بار اور پھر ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ منشی محمد عظیم صاحب اس کے ایڈیٹر تھے' جبکہ مرزا محمد اکبر سیستانی خاور کو معاون ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ منشی محمد عظیم صاحب نے ایک عربی اخبار "نفع عظیم" جاری کیا' جو ہفتہ میں تین بار شائع ہوتا تھا۔ حضرت والد صاحب کے شاگردوں اور ملازموں میں سے گرگیری صاحب نے اپنا الگ مطبع جاری کیا جس کا نام انہوں نے "دامن گیر" رکھا۔ منشی عزیز الدین صاحب مطبع وکٹوریہ پریس کے مالک ہو گئے مگر والد صاحب کی اسی طرح عزت کرتے تھے اور خود کو ان کا نمک خوار سمجھتے تھے۔ اسی طرح مسٹر کینیڈی' جو پرنٹر تھے' انہوں نے ایک عرصہ کی ملازمت میں اس قدر ثروت پیدا کی کہ اپنا الگ انگریزی مطبع جاری کیا لیکن بہت زیادہ شراب پینے لگے اور اسی وجہ سے انتقال کر گئے۔ ان کے علاوہ بھی کئی افراد نے خاصا نام کمایا۔

۱۸۶۱ء میں قانون تعزیرات ہند جاری ہوا۔ اسی سنہ میں سید محمد عظیم صاحب کو سید محمد لطیف صاحب کی شادی کے سلسلے میں دہلی جانا پڑا' جن کی شادی قاضی ولی جان صاحب کی دختر

سے قرار پائی تھی۔ اس دوران منشی محمد عظیم صاحب نے پنجابی اخبار' جو طویلہ دیوان شنکرناتھ میں جاری کیا گیا تھا' اس خیال سے بند کر دیا کہ ان کی عدم موجودگی میں کہیں کوئی غلط بات نہ چھپ جائے۔

کاروبار میں وسعت ہوئی تو سید محمد عظیم صاحب نے چھاپہ خانہ کٹڑہ تار کشاں والا میں ایک وسیع مکان میں منتقل کر دیا۔ پریس میں انگریزی اور ہندی کے ٹائپ تھے۔ اردو اور فارسی کے لیے کاتب اور محرر تھے' نیز مستری خانہ' دفتری خانہ اور جلد سازی کا بھی انتظام تھا۔ فارسی اور انگریزی میں طباعت کے لیے مشینیں الگ الگ نصب تھیں۔ یوں تو ہر قسم کی چھپائی کا کام اس مطبع واقعہ کٹڑہ تار کشاں والا میں ہوتا تھا۔ انگریزی اور فارسی قوانین' اہل ہنود و اسلام کی مذہبی کتابیں' سرکاری محکمہ جات کے مختلف فارم اور رپورٹیں بزبان انگریزی' سررشتہ تعلیم کی کتابیں وغیرہ سب کچھ چھپتا تھا' لیکن سب سے عجیب اور منفرد ایک کتاب "نغمہ صنم" چھاپی گئی' جو علم موسیقی کی اولین کتاب تھی۔ اس کتاب کے مصنف دیوان محمد مردان علی خاں رعنا تھے۔ دیوان صاحب علم موسیقی کے استاد تھے اور "نغمہ صنم" میں انہوں نے تمام راگ' راگنیوں اور گیتوں کو مفصل بیان کیا تھا اور نقشہ جات و تصاویر کے ذریعے ان کو عام فہم کر کے دکھایا تھا۔

اس وقت فقیر نورالدین صاحب مرحوم وزیر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ذہانت اور حاضر جوابی کا ایک واقعہ سید عظیم صاحب کے فرزند سید شمس الدین صاحب بیان کرتے ہیں: "ایک موقع پر لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل نے ازراہ تضحیک فقیر نورالدین صاحب سے پوچھا کہ مہاراجہ کی کون سی آنکھ کانی (کانڑی) ہے۔ تو فقیر نورالدین صاحب نے جواب دیا کہ مہاراجہ صاحب کی ہیبت اور شوکت کی وجہ سے آج تک فقیر کو اس امر کی تمیز نہیں ہوئی۔ قصہ پنجاب سنگھ' مصنفہ مولوی کریم الدین صاحب مرحوم ان دنوں سرکاری مدارس میں مروج تھا۔ اس میں یہ قصہ درج ہے۔ قصہ پنجاب سنگھ میں نے مدرسہ واقع حویلی راجہ دھیان سنگھ میں پڑھا تھا"۔

منشی عظیم صاحب نے پنجابی پریس سے اردو کے ساتھ ایک انگریزی اخبار "دی پنجابی" کے نام سے شروع کیا جو ہفتہ میں تین بار شائع ہوا کرتا تھا۔ اعلیٰ یورپین اس کے مضمون نگار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اس کا ہفتے میں تین بار شائع ہونا بھی ناکافی ثابت ہوا تو حسب ضرورت روزانہ صبح اور شام بلکہ شب کے وقت موقع جنگ سے خبریں بذریعہ تار آتیں اور فوراً طبع ہو کر بذریعہ سانڈنی سوار تقسیم کی جاتیں اور بذریعہ ڈاک

بیرون جات میں روانہ کی جاتیں۔ ان اضافی پرچوں کی اشاعت بلکہ خود اخبار کی اشاعت پر بے اندازہ روپیہ خرچ ہوتا لٰہذا کچھ عرصے کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ اخبار پنجابی (اردو) سنجیدہ مذاق کی ترجمانی کرتا تھا۔ مذہبی اور ذاتی بحث سے گریز کیا جاتا تھا۔ اس میں زیادہ جگہ خبروں کو دی جاتی تھی۔ نیم سیاسی مضامین' موسم کا حال اور بیرونی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ سادگی اور عمدگی میں یہ اخبار اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھا۔ بعد میں محمد عظیم صاحب نے انگریزی طباعت کا کام ترک کر دیا اور فارسی و اردو چھاپہ خانہ اور رہائش اس کوچے میں منتقل کر دی جو بازار حکیماں کے ساتھ ٹبی کے سامنے واقع ہے اور ان کے صاحبزادے کے نام پر "بازار جج محمد لطیف" کے نام سے مشہور ہے۔ جس حویلی میں آپ منتقل ہوئے' وہ "حویلی جج صاحب" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۶۱ء میں اخبار "پنجابی" کی اشاعت معطل کر دی گئی لیکن ۱۸۶۵ء میں اس کا دوبارہ اجراء کیا گیا' جس کے بعد یہ اخبار ۱۸۹۰ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا"۔

جب مسٹر پرنسپ' صاحب بہادر کمشنر بندوبست نے ضلع امرتسر کے کل دیہات کے شجرہ ہائے کشوار کی چھپائی کا ٹھیکہ منشی محمد عظیم صاحب کو دیا تو اس کے لیے سید محمد عظیم صاحب خود ایک شاخ مطبع کی لے کر امرتسر تشریف لے گئے اور کرموں کی ڈیوڑھی میں مطبع جاری کیا اور وہیں سب کام مکمل کیا۔ ان دنوں میں سید عظیم صاحب کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ ماہوار سے بھی زائد تھی۔ علم و فضل کی بنیاد پر اور اخبارات کے ناشر ہونے کے باعث سید عظیم صاحب کا شمار شہر کے ممتاز ترین افراد میں ہوتا تھا۔ پنجاب میں صحافت کے بانی کے طور پر ان کا مقام مسلم ہے۔

ایک خاندانی دستاویز کے مطابق "سید محمد عظیم صاحب بہت زیادہ عبادت گزار تھے اور ہر دم اللہ سے رجوع رکھتے تھے۔ دہلی میں سکونت کے ایام میں ان کے رفیقان طریقت میں سے دو صاحبان حافظ محمد بخش صاحب اور حافظ محمد حسین صاحب ان کے ہمراہ دہلی شہر کے باہر بیابانوں میں نکل جاتے اور وہاں عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ اس زمانہ میں انہیں کئی مرتبہ ایسی جماعتوں کی زیارت بھی نصیب ہوئی' جو نماز پڑھتی نظر آئیں مگر پھر اچانک نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ اسی دوران انہیں آقائے دو جہاں سرور کائنات حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیارت باسعادت نصیب ہوئی"۔ انہوں نے ۱۸۴۹ء میں فریضہ حج ادا کیا۔

منشی عظیم صاحب چھریرے بدن کے مالک تھے۔ غذا بہت کم تھی۔ انہیں کیمیاگری اور ملمع سازی پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ چند ادویہ مجرب بھی بناتے اور غرباء میں تقسیم کر دیتے

تھے۔ بندوق کا نشانہ لگانا اور تیراکی بھی جانتے تھے۔ مہمان و دوست نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ضرورت مندوں کے لیے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد 'اکثر روسائے دہلی کو لاہور آنے کی ضرورت پڑتی تو ان میں سے اکثر سید عظیم صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ کنبہ پروری سید محمد عظیم صاحب پر ختم تھی۔ ان کے فرزند سید شمس الدین صاحب کے بیان کے مطابق "جناب والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ دوستوں اور احباب کی مدارات میں پانچ سو روپیہ خرچ کر دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ ملنسار ایسے تھے کہ غریب سے غریب کے ہاں بھی شادی وغیرہ پر جانا عین باعث راحت سمجھتے تھے۔ بڑی شادیوں پر ان کا خزانچی پانچ سو روپیہ کی تھیلی ہمراہ لے جاتا تھا۔ کوئی دریافت کرتا کہ یہ بوجھ کیوں اٹھا رکھا ہے تو جواب ملتا کہ ابھی خرچ کثیر آن پڑے تو حضرت کو کیا جواب دوں گا۔ ملازمین سے کسی بھی قسم کا نقصان ہو جاتا تو سخت گیری نہ فرماتے تھے۔ ان کے استعمال میں اکثر اشیائے نقرئی مثلاً پان دان' خاصدان' حقہ' پیچوان' تھالیاں وغیرہ رہا کرتی تھیں"۔

سید شمس الدین صاحب ہی کے بیان کے مطابق "سید محمد لطیف صاحب پنجابی اخبار مورخہ ۳۱ جنوری ۱۸۸۵ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ثناء اللہ صاحب مرحوم رئیس دہلی کی زبانی ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہمارے خاندان کے وظائف بند کر دیے گئے تھے مگر بادشاہ کو رات 'حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ ﷺ نے بادشاہ کو سرزنش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے فوراً وظائف بحال کر دیے"۔

یہ اسی عبادت و ریاضت کا اثر تھا کہ عظیم صاحب نے تمام عمر چارپائی پلنگ پر استراحت نہ فرمائی۔ سردیوں میں زمین پر اور گرمیوں میں تخت پر بستر کر کے سوتے تھے۔ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ دلائل الخیرات اور قصیدہ بردا شریف آپ کا ورد تھا۔ قرآن پاک سے آپ کو دلی محبت تھی۔ میاں قادر بخش صاحب نابینا امام مسجد کا بیان ہے کہ کسی شخص کو تلاوت قرآن مجید کرتے دیکھتے اور اس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو فوراً اس کی اصلاح فرما دیتے تھے۔ طبیعت اس قدر گداز تھی کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ذکر مبارک آتا تو فوراً آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ کوئی رات ایسی نہ گزرتی ہوگی جب ذکر الٰہی نہ فرماتے ہوں۔ ان کی اہلیہ بھی نہایت عبادت گزار تھیں۔

سید محمد عظیم صاحب بادشاہ دہلی کے پیر و مرشد حضرت میاں غلام نصیرالدین عرف کالے میاں" کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ کٹڑہ تارکشاں کی سکونت کے زمانے میں نیاز سولویں کا

مختصر سلسلہ جاری رہا۔ سید شمس الدین صاحب کے مطابق "باوجود انحصار سینکڑوں آدمی خمیری روٹی اور دال نخود تناول کرتے۔ تعلیم نسواں کی طرف بھی عظیم صاحب کی خاص توجہ تھی' جس کے صلے میں حکومت نے انہیں خلعت عطا کی۔ حضرت والد صاحب کا معمول تھا کہ ہر سال اپنے مطبع کی چھپی ہوئی کئی سو روپے کی درسی کتب وغیرہ طلبہ کے انعام کے لیے جناب آرنولڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم کے حوالے کیا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب وائسریگل درباری تھے۔ گورنر جنرل بہادر اور پرنس آف ویلز وغیرہ کے درباروں میں آپ کو فخر کرسی نشینی حاصل تھا۔

سکونت کٹڑہ تارکشاں میں منشی سید محمد عظیم صاحب ماہوار مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے' جس میں تمام شاعران وقت کے علاوہ اہل شہر کثرت سے شامل ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں اعزا کو شوق شعرگوئی تھا۔ نواب شیخ غلام محبوب سبحانی خلف نواب امام الدین خان صاحب رئیس اعظم لاہور اور اسی درجہ کے اور روٴساء اور شعراء شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ ان کی خاطر مدارات دل کھول کر کی جاتی تھی جو حضرت والد صاحب کا خاصہ تھا۔ سید محمد لطیف صاحب کو بھی شوق شعرگوئی اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ ایک ماہوار رسالہ عنوان عالی قدر کے کلام کا شائع کیا جاتا تھا۔

اسی مشاعرہ میں دیوان امرناتھ صاحب رئیس لاہور خلف دیوان دینا ناتھ صاحب درباری مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔ ایک کتاب مثنوی بہار عشق مصنفہ دیوان صاحب موصوف ہے' جس میں اول تو صفت خدا تعالیٰ اور بعد ازاں نعت سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پنج تن پاک درج ہے۔ فرماتے ہیں:

کیا نعت لکھوں میں مصطفیٰؐ کی   نور حق و جلوہ خدا کی
جو بات کہ فہم میں نہ آئے   کیا اس کا پتہ کوئی بتائے
کیا نعت کرے یہ ذرهٔ خاک   حق میں جو ہو تیرے ما عرفناک
اب غنچہ دل چمن چمن ہے   خاک رہ پاک پنجتن ہے

بقول سید شمس الدین صاحب "اسی زمانہ کٹڑہ تارکشاں میں حضرت والد صاحب علم برداری کیا کرتے تھے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں دہلی لٹ گئی تو وہاں کی لوٹ میں کسی امام باڑہ کے علم وشدے بھی لاہور پہنچے۔ حضرت والد صاحب نے انہیں خرید لیا۔ چند علم ان میں سے پیتل کے تھے' جو سالم ایک پرزہ کے بنے ہوئے تھے۔ باقی علم تانبہ کے تھے' ان پر والد صاحب نے سنہری روغن کرایا اور اپنے کاتب مولوی اسد اللہ

صاحب سے ان پر کلمات مناسب بہ خط نسخ و خط نستعلیق تحریر کرائے۔ یہ علم چھڑیوں پر آویزاں کیے گئے اور چھڑیاں ایک قطار میں ایک مصفی فرش چوبی پر' جو چوکیوں کا تھا' رکھے گئے' جن پر کلمات متبرکہ بحروف نقرئی تحریر شدہ تھے۔ مکان کو شیشہ و آلات سے خوب آراستہ اور لوبان وغیرہ سے معطر کیا گیا تھا۔ لاہور میں یہ علم عجوبہ روزگار تھے۔ مجھے یاد ہے کہ نواب نوازش علی خاں صاحب قزلباش ان کی زیارت کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ ایک درگاہ تھی جو زنانہ مکان میں تھی۔ مجالس ہائے عزاداری میدان مطبع میں منعقد ہوتی تھیں' جن میں کئی سو آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ تمام مشہور سوز خوان اور تحت اللفظ پڑھنے والے اپنی خوش الحانی سے دلوں کو مسخر کرتے تھے۔ ہمارے ہاں عشرہ کی ساتویں تاریخ کو مہندی بھی اٹھائی جاتی تھی۔ سبیل ایام عشرہ میں جاری کی جاتی تھی۔ یہ سب نتیجہ آسودگی کا تھا۔ ماتم ہمارے ہاں کبھی نہیں ہوا۔ حضرت والد صاحب اہل سنت والجماعت تھے۔ ان کی بیعت بھی خاندان چشتیہ میں تھی"۔

"سلطنت مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خاتمہ کے بعد جب گورنمنٹ (حکومت برطانیہ) کا تسلط ہوا اور حضرت والد صاحب لاہور تشریف لائے تو رانی جنداں' مہاراجہ کی بڑی رانی زندہ تھیں اور مہاراجہ کے امراء مثل تیجا سنگھ وغیرہ سب زندہ تھے۔ یہ سب اصحاب حضرت والد صاحب کی خدمت میں تشریف لایا کرتے اور ان کی خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ ان دنوں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ شہر کا کوئی حصہ نہ تھا کہ وہاں کے رہنے والے والد صاحب کے پاس ملازم نہ ہوں۔ اس لیے شرفائے شہر والد صاحب کی توقیر و منزلت حد سے زیادہ کرتے تھے۔ امراء تو تعظیم و تکریم سے پیش آتے ہی تھے' حکام والا مقام بھی عزت افزائی میں کمی نہ فرماتے تھے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اس امر کے خواستگار رہتے تھے کہ ان کے انتظام کی بابت کوئی غلط بات اخبار "دی لاہور کرانیکل" میں شائع نہ ہو"۔

"سردار علی رضا خاں کابلی' جنہیں بعد میں گورنمنٹ نے نواب کا خطاب دیا' کے فرزند نواب نوازش علی خاں' اس زمانے میں چنداں آسودہ نہ تھے۔ حضرت والد صاحب کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ یہ صاحب ہر سال عشرۂ محرم کے موقع پر والد صاحب سے خرچ مجالس عزاداری کے لیے پانچ سو روپے قرض لیا کرتے تھے اور سال بھر میں بتدریج ادا کرتے"۔

"تذکرہ میں ہر چاند کی سولہ تاریخ کو والد صاحب نیاز بزرگان کی تقریب سے فیاضانہ دعوت غرباء و مساکین کرتے تھے۔ متوسط طبقہ کے اصحاب کی بھی دعوت کی جاتی تھی۔ کثرت

اغذیہ لذیذہ اور مردمان کی مثل ایک شادی کے ہوا کرتی تھی"۔

"اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ بعد نواب حاجی محمد خان صاحب، نواب صادق محمد خاں صاحب والی ریاست بہاولپور کسی خانہ جنگی کی وجہ سے ثمن برج قلعہ لاہور میں نظربند تھے۔ والد صاحب سے ان کا اس قدر دوستانہ ہو گیا کہ وہ والد صاحب کے پگڑی بدل بھائی بن گئے۔ نواب صاحب کی کئی بیگمات تھیں مگر وہ بے اولاد تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ثمن برج میں جاتا تو نواب صاحب میدان پریڈ کی طرف کے جھروکوں میں مجھے گود میں لے کر بیٹھے رہتے اور بیگمات، جو پانچ سے کم نہ تھیں، مجھے یکے بعد دیگرے اپنی گود میں رکھنے سے نہ تھکتی تھیں۔ نواب صاحب نے مجھے اپنا بیٹا بنانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر والدہ صاحبہ نے انکار کر دیا کہ میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دیتی"۔

"نواب صاحب کو سولہ سو روپیہ ماہوار خرچ ملتا تھا۔ انہوں نے والد صاحب سے استدعا کی کہ ہمارا خرچ آٹھ سو روپے ماہوار ہے، باقی آٹھ سو روپیہ ہمارا آپ جمع کر لیا کریں مگر والد صاحب نے امانت رکھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ شیخ رحیم بخش کلاں سوداگر انارکلی ایک دیانت دار شخص ہے، آپ آٹھ سو روپیہ اس کے پاس جمع کروا دیا کریں۔ چنانچہ نواب صاحب ایسا ہی کرتے رہے۔ عرصہ کے بعد نواب صاحب ثمن برج میں ہی ہیضہ سے فوت ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، نواب صاحب بعلت خانہ جنگی لاہور لائے گئے تھے۔ حضرت والد صاحب اخبار "لاہور کرانیکل" کے ذریعے ان کی بریت ثابت کیا کرتے تھے اور عنقریب یہ معاملہ نمٹ جاتا مگر عمر نے وفا نہ کی۔ نواب صاحب کا وعدہ تھا کہ اگر خدا نے ریاست میں واپس جانے کا موقع دیا تو والد صاحب کو اپنا مدارالمہام کر کے ریاست کے جزوی و کلی معاملات ان کے سپرد کر دیں گے۔ نواب صاحب کی بیگمات کا انتظام محمد برکت علی خاں صاحب تحصیلدار لاہور کے سپرد ہوا۔ انہوں نے منشی شجاعت خاں صاحب کو بیگمات کا داروغہ مقرر کرایا۔ یہ منشی صاحب اس وقت عرضی نویس تھے مگر بعد میں لاہور میونسپل کے کمشنر ہو گئے"۔

دسمبر ۱۸۸۴ء میں سید محمد عظیم صاحب کی طبیعت بگڑ گئی۔ سید محمد لطیف صاحب گورداسپور سے عیادت کے لیے تشریف لائے اور انہیں اپنے ساتھ ہی گورداسپور لے گئے۔ وہاں علاج معالجہ سب کچھ ہوا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بالآخر ۲۷ جنوری ۱۸۸۵ء کو اپنی جملہ اولاد کی موجودگی میں واصل بحق ہوئے۔ جسد خاکی لاہور لایا گیا اور رشید الدین مرحوم (جو آپ کے تیسرے صاحبزادے تھے اور صغیر سنی میں ہی انتقال کر گئے تھے) کے پہلو

میں قبرستان میانی صاحب میں دفن کردیا گیا۔ سید محمد لطیف صاحب اور دیگر اقرباء بھی انہی کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔

قطعہ تاریخ وفات

از حضرت مرحوم مصنفہ حافظ عمردراز فائق

مندرجہ پنجابی اخبار مورخہ ۳۱ جنوری ۱۸۸۵ء

صد افسوس منشی محمد عظیم — کہ باحق ہمی داشت راز و نیاز
ہمیں داشت بر آستین وجود — ہمہ عمر دولت و دین طراز
غنی خاطرش بود از جاہ و مال — دلش پاک بودست از حرص و آز
دل از خلق بروے بخلق عظیم — بد ارچہ ز قرآن خود سرفراز
چناں منشی عالی افتادہ بود — کہ بود اوج گیرای چوں شاہباز
چو من بندگان دارشتہ بسیار بود — بر صادق اطلاق بندہ نواز
پے بیکساں و یتیماں شہر — در دوتس بود پیوستہ باز
بہ توحید و صوم الفتی بیش داشت — ادا کرد حج و زکوٰۃ و نماز
برفت از جہاں در دہر کے — اگرچہ زید عمر ہائے دراز
از اخلاف وا قران او ہر کہ ہست — دلش ہست زیں سانحہ در گداز
نجواں سال فوتش از روی عالم — برفت سوئے جنت آں پاکباز

(۱۳۰۲ ہجری)

قطعہ تاریخ

از مفتی امام بخش صاحب رئیس وٹالہ

شریف الزماں چوں محمد عظیم — ز دنیا رواں شد بہ جنت نعیم
ز ترحیل سالش ز ہاتف ندا ست — مکان ابد بین محمد عظیم

(۱۳۰۲ ہجری)

قطعہ

از مفتی امام بخش صاحب رئیس وٹالہ

چوں محمد عظیم کرد سفر سوئے عقبیٰ خیال غیر بہشت
سال ترحیل او از ہاتف غیب شد محمد عظیم دین بہشت
(۱۸۸۵ عیسوی)

قطعہ

از جناب مولوی گل محمد عالی گورداسپور

ز تاریخ حاجی محمد عظیم چہ خوش گفت عالی با زرنگار
سوئے خلد شد عزیز نامدار دریغا کزیں دار ناپائیدار
(۱۳۰۲ ہجری)

قطعہ

از جناب منشی محمد غیاث الدین نبیرہ حضرت موصوف

چوں جناب حاجی شوکت عظیم ایں جہان پر دغا پدر و دکرو
اشک جاری شد در چشم ناتواں از دل محزوں بر آمد آہ سرد
الغیاث از مرگ عظیم الغیاث از ریاضت بد ہمہ تن حرف درد
بد فنا قبل از فنا اندر جہاں زاتش اندر اتقا بودست فرد
رحم خلقش بر مساکین و غریب حق چنیں ست اندریں آواں کہ کرد
ہاتم گفت کشیدہ روی آہ جان بحق تسلیم کرد آن نیک مرد
(۱۳۰۲ ہجری)

قطعہ

از جناب مولوی محمد انور شاہ انور

مقیم امرتسر، ملازم سرکار رامپور

چوں منشی محمد عظیم معظم نمود انتقال اندریں سال پر غم

ز ہر سمت برخاست شور قیامت — بصد غم جہانے نشستہ بماتم
ز ہر دیدہ بینم رواں اشک حسرت — ز ہر دل عیاں آہ پرسوز ہر دم
ز رنج و قلق شق گردید دلہا — شد از بار مجبوریش پشت جان خم
مناسب شمر کانچہ خوانم بمدحش — کہ بودہ نجیب و خردمند اعظم
بہ تحریر و تقریر و فہم و فراست — نبودہ بہ پنجاب مثلش یکے ہم
رشید و وحید و فرید زمانہ — حلیم و علیم و کریم و مکرم
غرض کان خدا بندہ زین بند فانی — رہا گشتہ و شد بجائش مسلم
بہ انور علی گفت سال وفاتش — بود عدن جائے محمد عظیم

(۱۳۰۳ ہجری)

قطعہ تاریخ

از حافظ عمر دراز فائض

کرد جہان را وداع منشی محمد عظیم
گشت دل عالمی از غم ہجرش دونیم
بسکہ بدل داشتی عشق رسول کریم
رخت چو زین دار بست گشت بہ جنت مقیم
سال وصالش نوشت فائض غمگیں چنیں
سید آل نبی حاجی محمد عظیم

منشی محمد عظیم صاحب کی زوجہ مبارک کی تاریخ وفات بمطابق "پنجابی اخبار" مورخہ ۲۶ فروری ۱۸۹۰ء سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

قطعہ

از حافظ عمر دراز فائض

جس سے غریب اور یتیم پائیں مراد دل مدام
موت سے اس عفیفہ کے سینہ و قلب چاک ہے
فائض غم رسیدہ شدت و رنج و درد میں
سال وفات لکھ دیا داخل خلد پاک ہے

سید محمد لطیف صاحب نے اپنی تصنیف "تاریخ لاہور" (انگریزی) میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچی سن کا وہ پیغام بھی نقل کیا ہے' جو انہوں نے منشی سید محمد عظیم صاحب کی وفات پر دیا تھا۔ "ان کا صحافتی کیریئر چالیس سال کی طویل مدت پر پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۸۴۹ء میں پرانا "کرانیکل" جاری کیا اور بعد ازاں "پنجابی" (اردو) کی اشاعت شروع کی جو مقامی زبان میں پہلا اخبار تھا۔ پنجاب میں صحافت کے بانی کی حیثیت سے ان کے کارناموں اور حکومت کے مقاصد و عزائم کے دانش مندانہ تجزیے کی صوبے سے متعلق ممتاز افراد قدر کرتے تھے"۔

سر لیپل گرفن (Sir Lepel Griffin) کے مطابق "منشی سید محمد عظیم زبردست قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی وفات ایک بڑا نقصان ہے"۔ سر رچرڈ ٹمپل' سر (لارڈ) لارنس اور اس دور کے دیگر زعماء ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ الغرض سید محمد عظیم صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے خطہ پنجاب میں صحافت کا جو بیج بویا' وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

تاریخی تحقیق کے شوق نے غالباً سید محمد لطیف صاحب میں آثار قدیمہ' مجسموں اور سکوں میں دلچسپی کو ابھارا۔ ملتان کی قدیم تاریخ پر ان کے کتابچے میں قدیم کھنڈرات کے ڈھیروں کی نشاندہی سے آثار قدیمہ میں دلچسپی رکھنے والے افراد آج بھی مستفیض ہو سکتے ہیں۔ "تاریخ لاہور" میں گندھارا فن کے نمونوں کے عکس بڑی تعداد میں شامل ہیں' جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم از کم ایک حد تک فن پاروں کو کسی قوم کے ارتقاء کا مظہر قرار دیتے تھے۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے رسائل میں انہوں نے سکوں کے بارے میں متعدد مقالے لکھے۔ اس کے علاوہ لاہور کے عجائب گھر میں موجود مختلف ادوار کے سکوں کے متعلق انہوں نے جس قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے' وہ شاید ہی کسی اور کتاب میں نظر آئے۔ ان کی اس تحقیق پر حیرت ہوتی ہے جو انہوں نے تاریخ کے اصل حقائق کو سامنے لانے کے لیے کی۔ لطیف صاحب نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر بیان کیا ہے کہ انہوں نے روایتی طریقہ کار سے ہٹ کر تاریخ کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود بھی کئی مقامات پر تشریف لے گئے۔ آثار قدیمہ کا بچشم خود مشاہدہ کیا' اردگرد کے ماحول کا بغور جائزہ لیا۔ مقامی لوگوں سے رابطہ کر کے عمارات اور آثار کے متعلق قیمتی معلومات جمع کیں۔ سرکاری ریکارڈ میں درج اصل حقائق کو عام قاری کے روبرو پیش کیا' حالانکہ اس سے پیشتر مورخ حضرات زیادہ تر اپنے ذاتی مشاہدہ سے کام لینے کے بجائے لکیر کے فقیر ہوتے ہوئے پہلے سے موجود تاریخی

کتب سے ہی استفادہ کو کافی سمجھتے تھے' کسی نئی بات یا تحقیق کے متعلق کوشش کو عبث اور لایعنی خیال کیا گیا...... مگر سید محمد لطیف صاحب کی متجسانہ طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا بلکہ سائنٹیفک طریقے سے تاریخ کے اصل اور مبنی بر حقیقت اور مبالغہ آرائی سے یکسر پاک حقائق اور حالات و واقعات کے متعلق نہایت باریک بینی اور احتیاط سے چھان بین کو اپنا نصب العین بنایا۔ اسی بنا پر انہوں نے کئی تاریخی کتب میں موجود متعدد غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح بھی کی۔ یقیناً یہ کام زبردست اور شبانہ روز تحقیق و جستجو کے بغیر ناممکن تھا۔

زیر نظر کتاب "تاریخ آگرہ" جس کا اردو ترجمہ (آگرہ' اکبر اور اس کا دربار" کے عنوان سے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے' مصنف سید محمد لطیف صاحب کے اپنے الفاظ میں:

"مورخین اور سیاحوں نے آگرہ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے مگر سوائے مسٹر کینے کی تصنیف "بیاض آگرہ" کوئی ایسی کتاب نہیں جو اس تاریخی شہر سے متعلق کوئی بیان پیش کر سکتی ہو۔ جس سے طالب علم' سیاح' ماہر آثار قدیمہ اور عام قاری یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہوں۔ مختلف کتابوں میں درج بیانات عموماً یادگاروں کے بیان تک محدود ہیں جو یکے بعد دیگرے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ان میں آثار قدیمہ کے ماہر اور عالم کی دلچسپی کے لیے خصوصی قدر و قیمت کا مواد بہت قلیل تھا۔ چنانچہ میں نے فارسی اور عربی کے اصل نسخہ جات سے بھی استفادہ کیا ہے"۔

"تاریخ آگرہ" کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ تاریخی' دوسرا بیانی' تیسرا شہنشاہ اکبر کے مکمل حالات زندگی اور اس کے دربار کے متعلق بیان پر مشتمل ہے' جبکہ چوتھا حصہ اس وقت کے جدید آگرہ کے بارے میں ہے۔

مصنف نے ابتداء میں آگرہ کی افسانوی اور روایتی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے زمانہ قبل از تاریخ کی انتہائی قدیم دیومالائی داستانوں مثلاً مہابھارت اور سنسکرت زبان میں تحریر کردہ ہندوؤں کی دیگر قدیم کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ آگرہ کی بنیاد ہندوؤں نے رکھی اور انہوں نے ہی اسے اپنے دیوتاؤں کی آماجگاہ ہونے کے باعث مقدس جانتے ہوئے سب سے پہلے آباد کیا۔ اس سلسلہ میں مصنف نے آثار قدیمہ کے نو دریافت شدہ شکستہ مندروں' مورتیوں اور کھنڈرات کا بنظر غائر عمیق مشاہدہ کے بعد ماہرین آثار قدیمہ کے تاثرات کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے اصل محل وقوع کی نشاندہی کی

ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ آگرہ قدیم ترین ادوار میں بھی بہت اہمیت کا حامل تھا۔

یوں تو سید محمد لطیف صاحب نے مسلمان فاتحین مثلاً سلطان محمود غزنوی' محمد غوری کے حملوں اور فتوحات اور غارت گری اور اس کے ساتھ ساتھ غوری' خلجی' تغلق اور سید خاندانوں کے تحت آگرہ کے عروج و زوال' سلطان سکندر لودھی کی طرف سے آگرہ کی از سرنو آبادکاری اور ترقی' خوفناک زلزلہ سے آگرہ کی مکمل تباہی کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے' لیکن مصنف کی سب سے زیادہ دلچسپی شہنشاہ اکبر کی ذات میں نظر آتی ہے' کیونکہ اکبر نے آگرہ پر خصوصی توجہ دی۔ اکبر ہی نے جدید آگرہ کی بنیاد رکھی اور اسے خوبصورت و عالیشان عمارات سے آراستہ کر کے ہندوستان کا ایک عظیم شہر بنا دیا۔

سید محمد لطیف صاحب نے آگرہ کے متعلق مورخین' مصنفین اور خود بادشاہوں کی آراء کو بھی اس دلچسپ تصنیف کا حصہ بنایا اور شہنشاہ بابر کی "تزک بابری" کے حوالہ سے تحریر کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حمام جس میں حوض ہے مکمل طور پر پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ پانی کا راستہ سفید پتھر سے بنایا گیا ہے۔ فرش اور چھت بیانہ سے منگوائے گئے سنگ سرخ سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ہوا کا درجہ حرارت حمام پر اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ جب گرم ہوا چلتی ہے تو حمام کو مصنوعی طور پر ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کوئی شخص مشکل ہی سے اس ٹھنڈک کو برداشت کر سکتا ہے"۔

ابوالفضل "اکبر نامہ" میں جدید آگرہ کی بنیاد رکھے جانے کے متعلق لکھتا ہے:

"بادشاہ سلامت نے آگرہ کو سلطنت کا دارالخلافہ بنا دیا اور دور حکومت کے تیسرے سال ۱۵۵۸ء میں اپنی رہائش قلعہ میں اختیار کر لی جو پہلے بادل گڑھ کے نام سے مشہور تھا۔ بادشاہ سلامت نے اپنی خصوصی توجہ اور مہربانی سے اس کو ایک مختصر عرصہ میں ہفت اقلیم کا زیور بنا دیا۔ اس کی آب و ہوا صحت افزا ہے۔ گرمی اور سردی اپنے اپنے موسموں میں معتدل ہوتی ہے"۔

شہنشاہ جہانگیر اپنی تزک میں قدیم آگرہ اور اپنے والد اکبر کے ہاتھوں جدید شہر کی بنیاد کے بارے میں رقمطراز ہے:

"آگرہ کا شمار ہندوستان کے انتہائی قدیم اور اہم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ دریائے جمنا کے کنارے پر اس کا پرانا قلعہ تھا۔ میرے والد نے میری پیدائش سے قبل اسے مسمار کر کے اس کی جگہ سنگ سرخ کا ایک اتنا شاندار قلعہ تعمیر کروایا کہ

اس کی مثال نہیں ملتی"۔

عہد جہانگیری میں انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور آگرہ کے بارے میں ان کی آراء کو بھی نقل کیا ہے۔ بقول سیاح تھامس ہربرٹ "آگرہ' لندن کی طرح طویل اور تنگ گلیوں کے ہمراہ نیم دائرہ شکل کا ایک گنجان آباد اور خوشحال شہر ہے"۔

شہنشاہ بابر کی عادات و خصائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان پر متعدد حملوں اور پے در پے ناکامیوں کے بعد' اس نے شراب نوشی سے مکمل توبہ کر لی۔ خدائے ذوالجلال کے سامنے سچی توبہ کر کے شراب نوشی کی محفلوں میں مستعمل' طلائی و نقرئی جام' پیالے اور دیگر برتن منگوا کر توڑ ڈالے اور ان کے ٹکڑے درویشوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیئے۔ وہاں موجود تمام شراب بہا دی' ڈاڑھی بڑھانے کی قسم کھائی اور اپنی افواج سے خطاب کر کے ان کے حوصلے بڑھائے۔ آخرکار زبردست لڑائی کے بعد اسے فتح و کامرانی نصیب ہو گئی۔

مصنف نے باغبانی اور گل بانی میں خصوصی طور پر مغل شہنشاہوں کی گہری دلچسپی کا ذکر بھی بڑے دلفریب انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آگرہ میں بابر نے متعدد باغات لگوائے اور انہیں مختلف اقسام کے پھول دار اشجار سے آراستہ کیا۔ شہنشاہ اکبر کو بھی پھولوں سے بہت رغبت تھی۔ جہانگیر نے آگرہ میں پیدا ہونے والے بدیسی اور دیسی پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے: "آگرہ اور اس کے مضافات میں بہترین قسم کے خربوزے' آم اور دیگر پھل بہ آسانی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دیسی پھلوں میں' میں آم کا مزہ بہت پسند کرتا ہوں"۔ اسی ضمن میں بادشاہ نے انگور' انناس وغیرہ کی مختلف اقسام اور پھولوں میں چمپا' کیوڑہ' رائی بیل اور مولسری وغیرہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

باب دوم چونکہ بیانی حصہ پر مشتمل ہے' اس لیے اس میں آگرہ میں اکبر اور اس کے جانشینوں کی تعمیر کردہ عالیشان اور دیدہ زیب عمارات' محلات اور کشادہ ایوانوں کا انتہائی مفصل اور مکمل بیان پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے قدیم قلعہ آگرہ کے علاوہ اکبر کے تعمیر کردہ موجودہ قلعہ' اس کے دروازوں' ان پہ درج مختلف طرز خطوط کی عبارات' میناروں' گنبدوں' راہداریوں' نقشین حاشیوں' برآمدوں' غلام گردشوں' دیوان عام' دیوان خاص' تخت شاہی' جہانگیری محل' حوض' مچھی بھون' خاص محل' شیش محل' انگوری باغ' حمام شاہی' پچیسی' ثمن برج' سیاہ سنگ مرمر کے تخت' موتی مسجد' نگینہ مسجد' محمود کے مقبرہ کے دروازوں' مینا بازار' آنکھ مچولی' تہ خانوں کے علاوہ دیگر لاتعداد عمارات اور ان کی تعمیر کے

بے شمار نمونہ جات' فواروں' جھرنوں' آبشاروں' درباری رسوم و رواج' ناچ گانوں' حرم شاہی کی بیگمات اور کنیزوں کے شب و روز' رنگ رلیوں' تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کا ذکر اس قدر تفصیل کے ساتھ کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ قاری ان تفصیلات میں کچھ اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اسے کتاب کے اوراق میں عمارات اور اس دور کے حالات و واقعات چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دینے لگتے ہیں اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بچشم خود ان عمارات کی دلکشی اور رعنائیوں کا بھرپور مشاہدہ کر رہا ہو۔

مذکورہ عمارات میں سب سے زیادہ مکمل اور جامع بیان تاج محل کا ہے' جو مشرق کا ایک عجوبہ' ہندوستانی فن تعمیر کا نادر نمونہ اور جوہر ہے۔ اس کی مدح سرائی میں نہ صرف مسلمان اور مشرقی مورخین اور مصنفین پیش پیش ہیں بلکہ مغربی اہل قلم بھی کسی سے پیچھے دکھائی نہیں دیتے۔

تاج محل کے بیان کے سلسلہ میں' اس عمارت کی کوئی ایسی چیز اور کوئی ایسا پہلو نہیں' جس کا ذکر مصنف نے نہ کیا ہو۔ انہوں نے اس کے محل وقوع' تاریخ بنیاد' وجہ تخلیق' ارجمند بانو بیگم المعروف ممتاز محل کی مکمل سرگزشت' شاہ جہاں کی اس سے شادی' بادشاہ کی اس سے زبردست وابستگی اور گہری الفت' اس کی اولاد' اس کے آخری لمحات' انتقال کے بعد اس کے سوگ' عارضی تدفین' بادشاہ کے شدید رنج و الم' تاج محل کی عمارت' دروازوں کی آرائش' محرابوں کی تراش خراش' گنبدوں کی جسامت' چبوتروں اور میناروں پہ کی گئی دلفریب کندہ کاری و منبت کاری کے دلکش اور بوقلموں نمونہ جات' مختلف طرزہائے تحریر کی عبارات' گنبد بازگشت' مسجد' جماعت خانہ' تاج محل کا نقشہ' چاندنی میں دریا کے پانی میں اس کا ناقابل فراموش عکس' اس کی لاگت' اس کی تعمیر میں حصہ لینے والے اہل حرفہ کے نام' ان کے آبائی شہروں' ان کے فنی اوصاف' ان کی اجرتوں' عمارت کے ساز و سامان' زیبائش و آرائش دیدہ زیب نمونہ جات' ان میں استعمال ہونے والے بیش قیمت پتھروں اور نگینوں کے مختلف رنگوں' اقسام' اشکال' ان کی فی کس لاگت' فن تعمیر' فواروں' درختوں اور ان چیزوں سے جدا ہونے کے منظر کا حال خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

عمارت کے متعلق مغربی مورخین اور مصنفین کی آراء اور خیالات کا حوالہ بھی انہوں نے اپنی اس تصنیف میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سر ولیم ہنٹر' تاج محل کے خوبصورت گنبدوں کو سنگ مرمر کا ایک خواب بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "تاج محل زیبائش کے اس انتہائی اعلیٰ ترین دقیق مرحلہ کو پیش کرتا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں تک پہنچا' یہ ایسا مرحلہ

ہے جس میں معمار کا کام ختم ہوتا ہے اور ایک جوہری کا شروع ہو جاتا ہے"۔ بیرڈ ٹیلر کے مطابق: "یہ مکمل خوبصورتی کی حامل اور انتہائی باکمال چیز ہے۔ ہر لحاظ سے ایک جناتی کام معلوم ہوتا ہے"۔ ایک روسی فنکار اس کے بارے میں کہتا ہے: "یہ ایک ایسی حسین و جمیل عورت کی مانند ہے' جسے آپ اپنی مرضی سے لاکھ برا بھلا کہیں' مگر جس وقت اس کے پاس جاتے ہیں تو اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں"۔

اس کے بعد مصنف نے فتح پور سیکری میں حضرت سلیم چشتیؒ کی سکونت' اکبر کی پسندیدہ رہائش گاہ' اس ولی کامل کی دعاؤں کے زیر اثر شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی پیدائش' فتح پور سیکری کے متعلق جہانگیر کے خیالات' پرتگیزی عیسائی پادریوں کی فتح پور سیکری کے دربار میں آمد' ملاؤں کے ساتھ مناظروں' عبادت خانہ میں منعقد ہونے والے اجتماعات' بحث مباحثہ کے موضوعات' آب رسانی کے ذرائع' پتھر کے کاروبار' دستکاریوں' خیر پورہ' دھرم پورہ' حضرت سلیم چشتیؒ کی زیر ہدایت دارالحکومت کی یہاں سے منتقلی اور بعد میں اس کی ویرانی' اور وہاں کی چیدہ چیدہ شخصیتوں کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ بیانی حصہ میں ہی سکندرا' اکبر کے مقبرہ' بلند دروازے' نقار خانہ اور بادشاہ کے نوادرات اور وہاں موجود دیگر عمارات کا بیان شامل ہے۔

تیسرا باب' شہنشاہ اکبر کے مکمل حالات زندگی اور اس کے درباری امراء' رسوم و رواج اور مکمل حالات و واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔ شہنشاہ اکبر کی ولادت' اس کی ابتدائی تربیت' دلیری و جوانمردی' ہندوؤں کے ساتھ حکمت عملی' ہندو شہزادی سے شادی' اس کی اختراعات و ایجادات' متجسسانہ ذہن' ہندو مذہب اور رسوم و رواج کی طرف رجحان' دین الٰہی کے قیام' جشن نوروز منانے' دعوتوں اور مینا بازاروں کے انعقاد' سماجی اجتماعات میں بحث مباحثہ' اس کے دور میں مذہبی آزادی و رواداری' باغبانی کے ذوق و شوق' رحمدلی' شادی بیاہ کے لیے اصول و ضوابط' عدل و انصاف' غذا میں سادگی' عیش و عشرت سے اجتناب' مصروفیات' لباس' کھیل تماشوں' خصوصاً ہاتھیوں کی لڑائی میں گہری دلچسپی' سیر و سیاحت اور شکار میں خصوصی رجحان' مشہور زمانہ محاصرہ چتوڑ' درندوں اور پرندوں کو پالنے اور سدھانے میں بھرپور دلچسپی' دشمنوں کے ساتھ سختی اور دوستوں سے مشفقانہ برتاؤ' بھیس بدل کر گشت کی عادت' زبردست حاضر جوابی' قیافہ شناسی' علم دوستی' امور سلطنت' نظام مالگزاری' حرم شاہی' بیوی بچوں کی تعداد' اس کی وضع قطع اور کردار' اپنے بیٹے شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے ساتھ اس کی گہری محبت' ابتداء میں اولیائے کرام اور بزرگان دین سے اس کی

گہری وابستگی و عقیدت' اس کی علالت اور انتقال کے بارے میں کوئی پہلو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ دربار اکبری کے زعماء' اکابرین' امراء اور اکبر کے انتہائی بااعتماد دوست احباب اور وفادار ساتھیوں کے مکمل حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سرفہرست شیخ ابوالفضل ہے جو اس کا انتہائی بااعتماد وزیر اور گہرا دوست تھا۔ ابوالفضل کی خصوصیات' کردار اور خصائل' اس کی مشہور و معروف تصانیف' نجی زندگی' غیر معمولی بسیار خوری' فیاضی' اکبر کی زندگی پر ابوالفضل اور فیضی' دونوں بھائیوں کے اثر و رسوخ' اس کے بھائی فیضی کے حالات زندگی' اس کی تصانیف اور انتقال کے مکمل حالات' راجہ بیربر کے حالات زندگی' اس کے اثر و رسوخ کے باعث ہندوستان سے اکبر کے دلی لگاؤ' یوسف زئیوں کے خلاف اس کی فوجی مہم' اس کی ہلاکت پر بادشاہ کا شدید رنج و الم' اس کی بذلہ سنجی اور چٹکلوں کی شہرت' بہرام خان کی پنجاب میں بغاوت' اس کی ہلاکت' راجہ ٹوڈرمل کی جائے پیدائش' میدان جنگ میں اس کے جوہر' اس کی مالی اصلاحات' راجہ بھگوان داس اور اس کے بیٹے راجہ مان سنگھ کے حالات' مرزا عبدالرحیم خان خاناں کی خدمات' واقعات بابری کے فارسی ترجمے اور اس کے کردار کے متعلق تفصیلات' مرزا عزیز کوکہ کے حالات زندگی' عظیم موسیقار میاں تان سین کی فن موسیقی میں زبردست مہارت' اس کے گیتوں اور تراکیب' شیریں دھنوں اور مسحور کن آواز کے متعلق بیان' علماء اور مصنفین میں خواجہ نظام الدین احمد کی ادبی مہمات' خصوصاً طبقات اکبری' اس کا کردار اور فنی مہارت' ملا عبدالقادر بدایونی کے علم و فضل میں زبردست کمالات' دین اسلام سے گہری وابستگی' اس کی عظیم تاریخی تصنیف منتخب التواریخ وغیرہ کے متعلق بتایا گیا ہے۔

درباری شعراء میں عرفی شیرازی کے مکمل حالات زندگی' اس کی شاعری اور زبردست ذہانت' اور امیر فتح اللہ شیرازی کی زبردست علمی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاہی اطباء میں حکیم علی جیلانی کے حالات زندگی' اس کے پراسرار حوض' طبی کمالات' حکیم ابوالفتح کے سرکاری امور اور بادشاہ پر زبردست اثر و رسوخ اور اس کے کردار کے متعلق بتایا گیا ہے۔

چوتھا باب جدید آگرہ شہر کے بیان پر مبنی ہے۔ اس میں آگرہ ڈویژن اور ضلع آگرہ کی تشکیل' اس کے طبیعیاتی پہلو' زراعت' غذائی اجناس' چیدہ چیدہ فصلوں' قدرتی آفات' تجارتی منڈیوں اور مراکز' میلہ جات مویشیاں' آگرہ شہر کی آبادی کی تقسیم' کارخانوں' اہم مصنوعات' دستکاریوں' کاروبار' ریلوے کے نظام' سڑکوں اور بڑی بڑی شاہراہوں کی تعمیر' آگرہ نہر کے ذریعے سامان کی باربرداری' درآمدات و برآمدات' مکانات کی طرز تعمیر' سالانہ

آمدنی و اخراجات' تعلیم و تربیت' خیراتی اداروں' شفاخانوں' محکمہ حفظان صحت' ذرائع نکاسی آب' آب و ہوا' شجرکاری' ذرائع آب رسانی' جدید عمارات' آگرہ میونسپل بورڈ اور لیفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈونل کی آگرہ جدید کے متعلق رائے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

سید محمد لطیف صاحب نے جس قدر محنت' زبردست کاوش' ذاتی مشاہدہ' بھرپور تحقیق اور عرق ریزی سے کام لے کر جس انداز میں تاریخ کے اصل حقائق کو ایک عام قاری کے سامنے پیش کیا ہے' فی زمانہ اس کی مثال ملنا انتہائی مشکل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کی یہ تصنیف کس قدر اہمیت کی حامل ہے اور یقیناً یہ عام قاری سے لے کر دانشور' علما اور مورخین تک' سب کے لیے یکساں طور پر معلومات اور درست حالات و واقعات کا ذخیرہ ثابت ہوگی۔

سید محمد لطیف صاحب کے انگریز حکمرانوں اور اعلیٰ سول و فوجی افسران و حکام بالا سے گہرے اور دوستانہ مراسم تھے۔ انگریز حکام نے ان کی خوب حوصلہ افزائی کی' لہٰذا اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے انگریزوں کو ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور یہاں کے قیمتی ورثوں اور نوادرات سے روشناس کرانے کے لیے تاریخی کتب (بزبان انگریزی) تصنیف کیں۔ اگرچہ سید محمد لطیف صاحب نے ایک مختصر زندگی پائی مگر اس قدر قلیل عرصہ میں تصنیف و تالیف کا یہ ریکارڈ ہر لحاظ سے شاندار اور لائق تحسین و آفرین ہے اور برصغیر کے مورخین کی صف میں سید محمد لطیف صاحب کا اعلیٰ مقام شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

سید محمد لطیف صاحب کی تحریروں سے ان کی عربی' فارسی' اردو اور انگریزی زبانوں پر قدرت اور استعداد کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کی مستقل مزاجی اور اظہار رائے میں دیانت داری بھی واضح ہے۔۔۔ سید محمد لطیف صاحب کے چھوٹے بھائی سید شمس الدین صاحب کے مطابق "جناب بھائی صاحب قبلہ کی طبع مبارک کبھی ظرافت کی طرف مائل ہو جاتی تو وہ چٹکلہ دار مضامین اخبار میں لکھتے کہ اگر انہیں سنیں یا پڑھیں تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں"۔

ان کے ذاتی خیالات' نظریات اور مشاہدات کا عکس ان کی ہر کتاب میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے' مسلمان حکومت کے زوال پر انہیں افسوس تھا لیکن وہ اس زوال کی وجہ مسلمانوں کی رجعت پسندی قرار دیتے تھے۔ نسلاً وہ پنجابی نہ تھے' لیکن تحریروں کے حوالے سے انہیں پنجابی قوم پرست کہنا غلط نہ ہوگا۔ وہ رنجیت سنگھ سے ازحد متاثر تھے۔ وہ مغل امراء اور سکھ حکام کے مظالم کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے ہر بات کو

نہایت دیانت داری اور ہر قسم کے مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر بیان کیا ہے۔

سید محمد لطیف صاحب نے "تاریخ لاہور" لکھی تو اپنی اس کتاب میں ایسی باتوں اور چیزوں کا بھی اضافہ کیا' جس پر مورخین یا تو دھیان نہیں دیتے رہے یا جان بوجھ کر اس سے پہلوتہی کرتے رہے۔ انہوں نے اس خطہ کی قدیم ترین تاریخ کا ذکر کیا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ جدید دور کے متعلق اور اس کی فلاح و بہبود' لوگوں کے رہن سہن اور نئی نئی ایجادات کے بارے میں بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک کہ دریاؤں' ندی نالوں' پلوں' تاریخی عمارات' سکولوں' کالجوں' سرکاری دفاتر کا تذکرہ کیا ہے تو ساتھ ساتھ اس کے دروازوں' گلی محلوں' بازاروں' چیدہ چیدہ خاندانوں' دستکاریوں' سبزیوں' پھلوں' پھولوں' موسموں' آب و ہوا' میلوں ٹھیلوں' تہواروں' ملبوسات' اہل حرفہ اور دیگر دلچسپیوں کا بڑے خوبصورت اور دلکش پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے صرف محاسن ہی بیان نہیں کیے' بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عیوب کو بھی واضح کیا ہے۔ انہوں نے جنگوں' قتل و غارت گری' ڈاکہ زنی' ظلم و جبر' محلاتی سازشوں وغیرہ کا حال لکھا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ بادشاہوں اور حکمرانوں کی فیاضیوں' دریا دلی' عوامی فلاح و بہبود' درباری جاہ و جلال' شان و شوکت' چمن آرائی اور عشق و محبت کی داستانوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے بادشاہوں کے عروج و زوال کی مکمل تصویر اپنی اصل حالت میں پیش کی ہے اور اس میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔ سید محمد لطیف صاحب کی خدمات کے پیش نظر ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حقائق کو چھپانے کی ضرورت نہ سید محمد عظیم صاحب نے محسوس کی' نہ سید محمد لطیف صاحب نے اور نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں' لہٰذا اپنے دادا سید محمد لطیف صاحب کی نادر کتب کا اردو زبان میں ترجمہ کروا کر دوبارہ اشاعت کا بیڑا اس مقصد کے تحت اٹھایا ہے کہ نہ صرف اس کتاب' بلکہ سید محمد لطیف صاحب کی دیگر تصانیف کو عام قاری تک پہنچایا جا سکے اور ان کتب سے صرف ایک مخصوص طبقہ' تاریخ کا طالب علم یا مورخ ہی مستفید نہ ہو بلکہ عام قاری بھی اس چشمہ فیض سے سیراب ہو سکے۔

اس کتاب کا اوریجنل انگریزی ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں ایک صدی قبل کے آگرہ شہر و چھاؤنی کا نقشہ اور ۴۷ تصاویر (Engravings) شامل تھیں' ان کو اسی حالت میں شامل کر دیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب کو ترتیب دیتے وقت کتابیات (Bibliography) کو احتیاط سے تیار

کر کے شامل کر دیا گیا ہے' تاکہ قارئین اس کتاب کے ماخذ سے بھی مستفید ہو سکیں۔

میری اس ادنیٰ سی کوشش سے نہ صرف میرے بزرگوں کی شبانہ روز محنت کا ثمر حاصل ہو گا بلکہ آنے والی نسلیں بھی اپنے اسلاف کے کارناموں' تاریخی حقائق اور ماضی کے سربستہ رازوں سے واقفیت حاصل کر سکیں گی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کاوش تاریخ نگاروں اور اصل تاریخی حقائق کے متلاشی افراد کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کرے گی اور تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ کتب مینارۂ نور کا کام دیں گی۔

اس مشن کی تکمیل میں نامور صحافی' مصنف' دانشور اور عالمی شہرت یافتہ ہیومن رائٹس ایکٹیوسٹ اور میرے انتہائی محترم بزرگ دوست جناب آئی۔ اے رحمٰن نے نہ صرف مجھے اپنے بزرگوں کے کام کو آگے بڑھانے کا دانشمندانہ مشورہ دیا بلکہ سید محمد لطیف صاحب اور ان کی تحریروں کے بارے میں اپنی آراء سے بھی مستفید کیا۔

میرے دیرینہ دوست' مشہور شاعر' ادیب' صحافی اور اردو ادب کے اہم جریدہ ماہنامہ "تخلیق" کے ایڈیٹر جناب اظہر جاوید نے اردو تراجم پر نظرثانی کی۔

جناب مرزا محمد شعیب نے کتب کی تیاری و تکمیل میں میرا ساتھ دیا۔ جناب افتخار محبوب نے انتہائی محنت و جانفشانی سے ان کتب کے تراجم کیے اور تکمیل کے تمام مراحل میں بالخصوص انڈکس اور کتابیات ترتیب دینے میں میری بہت مدد کی۔

جناب لیاقت علی صاحب مالک ادارہ "تخلیقات" نے تراجم کی اشاعت اور ان کو پاکستان بھر میں پہنچانے کا بہت خوبی سے اہتمام کیا۔ میرے محترم دوست' مفکر و دانشور جناب ڈاکٹر ظفر عمر اور مشہور صحافی' دانشور' محقق جناب شفقت تنویر مرزا نے بھی ازراہ عنایت قابل قدر مشورے دیے۔ میں ان تمام محبتوں کے لیے بے حد ممنون ہوں کیونکہ ان کے بغیر یہ اہم کام ممکن نہ تھا اور اسی کی بدولت یہ کتب آپ تک پہنچ سکی ہیں۔

سید منہاج الدین

۸-اے شمع روڈ' اچھرہ' لاہور

یکم ستمبر ۱۹۹۵ء



پیش لفظ

"بے شک یہ فرنگی ایک عظیم قوم ہیں' اور میری یہ خواہش ہے کہ میں اپنے فرزند شاہ ہسپانیہ کو اپنی دعا اور سلام بھیجوں"" یہ الفاظ عظیم تاتاری فاتح تیمور بیگ یا تیمور لنگ نے اس وقت کہے تھے' جب 1403ء میں کیسٹیلے (ہسپانیہ) کے بادشاہ کے مختار کل کی حیثیت سے عیسائی نائٹ' ڈان روئی گونزیلز ڈی کلیویجو نے اس وقت کے مشہور زمانہ دارالخلافہ ""عروس البلاد ایشیا" سمرقند کا دورہ کیا۔ اس نے اس شہر میں عظیم چغتائی بادشاہ کے دربار اور وہاں منعقد ہونے والی ضیافتوں اور مختلف مظاہروں کے متعلق تیمور کے ممتاز سوانح نگار شرف الدین کی رنگ آمیزی کے مقابلہ میں بہت زیادہ درخشاں بیان اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ 28 تاجوں کا حامل اور دنیائے مشرق کا مالک اس وقت اس بات سے قطعی طور پر ناآشنا تھا کہ اس کے اس عظیم الشان دیوان عام میں (جہاں اس کی وسیع و عریض سلطنت کے امراء اور منصب دار اور معلوم دنیا کے عظیم ترین بادشاہان کی طرف سے بھیجے گئے سفیر جمع ہوئے تھے) عظیم فرنگیوں کی تواضع کرنے کے پورے تین سو برس بعد اس عظیم قوم کا ایک سورما' مہا بھارت کے ملک ہندوستان کی دور دراز سرزمین پر اس کی نسل کے ایک وارث سے مصافحہ کرے گا اور وہ اسے اپنے اذیت رساؤں اور ظالموں سے چھٹکارہ دلانے والے کی حیثیت سے بلائے گا۔ یہ ہندوؤں کے اندر پرستھا' دہلی اور قدیم شہرت کے حامل آگرہ کا فاتح' برطانوی جرنیل لارڈ لیک تھا' جس نے 1803ء میں بے یارومددگار' شاہ عالم کو قید سے باہر نکال کر آزادی' وقار اور حکومت بخشی' جسے اس کے ایک ہم مذہب کے بے رحم خنجر نے اندھا کر دیا تھا اور مرہٹوں نے بے عزت کیا تھا۔ تاریخ مظفری کا مصنف کہتا ہے' "لوگوں کے دل تعریف سے لبریز خوشی سے پھولے نہ سمائے اور بادشاہ کا دل شکر گذار مسرت و شادمانی سے جھوم اٹھا' اس کو اس قدر خوشی حاصل ہوئی کہ مسرت کے آنسو بہانے کے باعث اس کی بصارت لوٹ آئی' جسے پندرہ سال پیشتر سخت گیر روہیلہ کے ظالمانہ خنجر نے ضائع کر دیا تھا!"

مگر یہ محض عظیم تیمور ہی نہیں تھا' جس نے من حیث القوم' فرنگیوں کی عظمت کے

بارے میں گرمجوشی کا اظہار کیا' بلکہ ہم ابوالفضل کے پرفصیح صفحات میں یہ دیکھتے ہیں کہ اس فاتح کی ساتویں پشت میں اور اڑھائی سو برس تک ہندوستان کے سیاہ و سفید پر حکمرانی کرنے والے اس نسل کے بادشاہوں سے کہیں زیادہ روشن خیال اکبر بادشاہ نے انہیں مستقل طور پر "دانایان فرنگ" کا نام دیا۔ ہندوستان نے اپنی حکمرانی کے انتہائی خوشحال دنوں میں اس سے زیادہ عظیم شہنشاہ' ایک عظیم صلح جو' ایک انتہائی مشفق حکمران یا ایک انتہائی فیاض اور ہمدرد دوست کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ سچ ہے کہ اگر ہندوستان بجا طور پر اکبر اور اس کی فیاضانہ حکمرانی پر فخر کرتا ہے' تو اکبر آباد یا آگرہ (جس کی بنیاد اس نے رکھی اور وہ اسی کے نام سے مشہور ہوا) کی سب سے زیادہ شان و شوکت کا تعلق بھی اسی بادشاہ سے وابستہ ہے۔ یہ تعلق اس قدر گہرا ہے کہ جب تک آفتاب کی چمکدار کرنیں وہاں پر اس کے تعمیر کردہ محل کی کنگورے دار فصیلوں کو روشن رکھیں گی اور چاند کی پرسکون اور حلیم چاندنی اس قدیم شہر کو آراستہ و پیراستہ کرنے والے درخشاں ترین تعمیراتی گوہر' تاج محل کی پاکیزہ شان و شوکت میں اضافہ کرتی رہے گی' اس کا عظیم نام اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ یہ اس شہر' اس کے عظیم بانی اور وہاں منعقد ہونے والے اس کے دربار کی تاریخ ہے' جسے میں نے اگلے صفحات میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اور اگر ان سطروں سے قطع نظر نقاد اس قوم (جسے صدیوں پہلے تیمور اور اکبر نے عظیم قرار دیا تھا) کے نام کے موجودہ دور میں اکبر کے شہر کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے تعارف کرائے تو میں اپنی بات کی وکالت میں پائیدار شہادت پیش کروں گا۔ ہو سکتا ہے جب آپ تاج محل کے سامنے کھڑے ہو کر حیرت میں ڈوبے ہوئے اس کی بے مثل خوبصورتی کی بہت زیادہ تعریف کریں اور جب آپ مشہور زمانہ قلعہ میں موتی مسجد کو دیکھیں' تو تہہ دل سے اس کی شان و شوکت کو محسوس کریں' جس کے بارے میں مسٹر ٹیلر نے پرجوش الفاظ میں بیان کیا ہے: "یہ اس قدر پاکیزہ اور بے داغ معبد ہے' جو عبادت کے بلند پایہ جذبہ کو اجاگر کرتا ہے۔" ہو سکتا ہے جب آپ اسکندرا میں خود اس عظیم شہنشاہ کا مقبرہ دیکھیں' تو آپ میں تعریف کا زبردست جذبہ پیدا ہو جائے ——— کون سا ایسا دل ہے' جو وہاں' عظمت ماضی کو دیکھ کر اور انسانی شان و شوکت کی ناپائیداری کے خیال سے نہ پگھلے اور یکساں طور پر اس طاقت کے لئے شکر گزاری اور تعریف کے گہرے جذبے سے متاثر نہ ہو' جس کی سب کے لئے فیاضی' رواداری اور خیر خواہی نے اس کو محفوظ کیا' جسے ہم دیکھتے اور تعریف کرتے ہیں؟ اگر فاتح آگرہ انتقام کی خاطر تلوار بے نیام کرتا (جس کا ہندوستان عادی تھا) اگر جنگ کے بعد آگ اور تباہی آتے (بے شمار ادوار تک ایسا ہوتا رہا) تو نہ کوئی شاعر اس کی عکاسی کرتے' نہ ہی کوئی مغنی گانا گاتے اور نہ ہی کوئی مصور' تاج محل

کی رعنائیوں کی تصویر کشی کرنے کے قابل رہتا اور نہ ہی اس کے موروثی محافظ اس کے انتظام و انصرام پر فخر محسوس کرتے۔ مگر برطانوی فاتحین ادب و فن کے دلدادہ تھے اور بااصول افراد ہونے کی حیثیت سے انسانی مہارت اور فضیلت کے معترف تھے' چنانچہ انہوں نے قدیم شہرت کی حامل ان تاریخی یادگاروں کو نہ صرف محفوظ کیا' بلکہ ایک بھاری لاگت سے ان کی دیکھ بھال کے لئے تدابیر بھی اختیار کیں۔ انہوں نے انہیں آراستہ و پیراستہ اور صاف ستھرا بنایا اور جہاں تک ممکن ہو سکا ان کو مرمت بھی کروایا ـــــ اگر بادشاہ شاہجہاں واپس زمین پر آ سکتا تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی محبوب شریک حیات کی عظیم یادگار کی بحالی و حفاظت اور اسے غارت گروں کی دسترس سے محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں محبت اور خلوص دل سے کی گئی محنت کے لئے برطانوی حکمرانوں کا شکریہ ادا کرتا۔ کیا یہ کہنا بجا نہیں کہ تین سو سال پیشتر چغتائی فاتح نے سمرقند کی عظیم الشان ضیافت میں فرنگیوں سے جو کردار منسوب کیا تھا' انگریزوں کی فتح پر اس کی مکمل تصدیق ہو گئی' جو آگرہ اور دہلی کے شہروں اور ہندوستان کے کروڑوں عوام کے لئے امن و آشتی' قانون اور بہترین نظم و ضبط کا حامل دور حکومت لائے؟ پس آگرہ کی تاریخ اگر ایمانداری سے بیان کی جائے تو انگریزوں کی عظمت تاریخ سے جدا نہیں ہے' جس طرح کہ اس کے بانی اور اس کے مورث اعلیٰ نے تسلیم کیا اور جیسا کہ ممتاز کمانڈر لارڈ لیک کی فتح سے ظاہر ہے۔

اس ملک کی حالت اس پر انگریزوں کی فتح سے لے کر اب تک تاریخ کے دلدادہ کی توجہ سے نہیں بچ سکتی۔ بھڑکتی ہوئی آگ' جو نواب کے محل کو خاکستر کرنے کے بعد اپنی باری پر کسان کی جھونپڑی کو جلا دیتی تھی' گرم ترین جھکڑ' جو امید کے درخت کو جھلسا دیتے تھے' تیز و تند خنجر' جو کسی جنس اور عمر کا لحاظ کئے بغیر معصوموں کا خون بہایا کرتا تھا۔ ملک کی خوش قسمتی ہے کہ سب کچھ غائب ہو چکا ہے۔ اب اس وطن کی پامالی یا امن عامہ کو مزید خراب نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تلوار قسمت کا فیصلہ کرنے والی اور تباہی کا خوفناک آلہ تھی' وہاں اب حفاظت کے لئے قانون کا مہربان اور نرم ہاتھ ہے۔ خوفناک جنگلات اور ویران صحراؤں میں جہاں گھاس کا ایک پتا بھی نہیں اگتا تھا یا کسی ہرن کی پیاس بجھانے کے لئے پانی کی ایک ندی تک نہیں تھی' وہاں اب لہلہاتے سرسبز و شاداب کھیت یا تھکے ہارے مسافر کو اپنے خنک سایہ کی پناہ میں لئے پھلوں کے بوجھ سے نیچے جھکے ہوئے درخت دیکھے جا سکتے ہیں۔ گاؤں اور قصبہ میں مسرت و انبساط روزمرہ کا معمول ہیں اور نوحہ و ماتم کی بجائے مسافر دور سے دیہاتی دوشیزاؤں کے گانے' باجوں گاجوں کی مترنم آواز اور موسیقی کے آلات کا شور سنتا ہے' جو کسی شادی کی آمد' کسی زیر غور تقریب یا کسی اور پر مسرت تقریب یا مذہبی رسم کا پتہ دیتے ہیں۔ شہر کے مضافات' جو کبھی ڈاکوؤں اور ٹھگوں کے

زیر تصرف تھے اور وہاں گیدڑوں اور بھیڑیوں کا بسیرا ہوا کرتا تھا' اب سرسبز و شاداب اور خوشحال مضافات میں تبدیل ہو گئے ہیں' جہاں دوست احباب کھانے پینے اور تفریح کے لئے سیر گاہوں میں ملاقات کرتے ہیں۔

اور اب آگرہ کی طرف آئیں' صدیوں تک یہ طوائف الملوکی اور افراتفری کا شکار رہا تھا۔ مسلمانوں نے نادر شاہ کے حملہ پر' جاٹوں نے سورج مل کے عروج کے دوران' مرہٹوں نے شاہ عالم کے دور میں —— ہر ایک نے اپنی باری پر تباہی اور لوٹ مار کا کام کیا اور جان و مال اور عزت کو غیر محفوظ بنا دیا۔ جو طاقتور تبدیلی رونما ہوئی ہے' وہ ایک توانا قوم کے وسیلہ سے دور اندیشی کا کام ہے۔ یہ وہ قوم ہے' جس نے اپنے داناؤں میں مکمل دانشمندی سمو کر ہم پر حکومت کرنے کے لئے بھیجا' جسے تیمور اور بعد میں اس کے ممتاز وارث نے عظیم کہا اور حقیقت میں بالکل صحیح طور پر یہ عظیم ہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مورخین اور سیاحوں نے آگرہ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے' مگر ماسوائے مسٹر کینے کی تصنیف' "بیاض آگرہ" (ایک چھوٹی سی قابل تعریف تصنیف' جسے زیادہ تر سیاحوں کے لئے ایک رہنما کتابچہ کے طور پر لکھا گیا) کوئی ایسی کتاب نہیں' جو اس تاریخی شہر سے متعلق کوئی بیان دے سکتی ہو۔ اس کی گزشتہ اور موجودہ تاریخ اور اس کے آثار قدیمہ اور نوادرات کے بارے میں کچھ یوں بیان کر سکتی ہو کہ طالب علم' سیاح' ماہر آثار قدیمہ اور عام قاری کی توجہ یکساں طور پر اپنی جانب مبذول کرا سکتی ہو۔ ان عبارات کو بھی مکمل طور پر حذف کر دیا گیا ہے' جو انتہائی اہم متعدد یادگاروں کا اہم سرمایہ ہیں اور بیانات کی بنیاد پر درست مواد پیش کرنے کے لئے مدد کرتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انتہائی اہم بات پر کافی توجہ نہیں دی گئی' یعنی نظر آنے والی دلچسپ عمارات کا ماضی کے واقعات سے تعلق۔

اگرچہ' سطحی مشاہد کے لئے آگرہ کی شان و شوکت مشہور زمانہ تاج محل اور اس کی چند دیگر متبرک یادگاروں پر مشتمل ہے مگر تاریخ سے محبت کرنے والوں کے لئے اس کا حقیقی فخر اس حالت میں مضمر ہے کہ یہ نصف صدی تک ایشیا کے ایک انتہائی روشن خیال اور نامور بادشاہ اکبر اعظم جلال الدین کا پایہ تخت رہا۔ موجودہ تواریخ دور دراز صوبہ جات میں اس کی جنگوں سے بھرپور ہیں' جو حالانکہ مفید ہیں مگر انتہائی اکتاہٹ پیدا کرنے والی ہیں۔ ایسی کوئی تصنیف نہیں تھی' جو بطور ایک مصلح' مخالف مذاہب میں مفاہمت کرانے اور اصلاح و ہم آہنگی کے ایسے اقدامات کرنے کے سلسلہ میں بادشاہ کی زندگی کے متعلق بحث کرتی ہو' جن کی مدد سے ہندو اور مسلمان' دونوں کو محبت کے ایک رشتہ میں پرو دیا گیا' یا جو اس کے کردار اور دارالخلافہ آگرہ میں

تعمیر کردہ شاندار سنگ مرمر کے دیوان خاص و دیوان عام یا فتح پور سیکری کے ایوانوں میں گذاری گئی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہو۔

مختلف کتابوں میں پھیلے ہوئے بیانات عام طور پر یادگاروں کے متعلق بیانات تک محدود ہیں' جو یکے بعد دیگرے زیادہ تر بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ کتابوں میں آثار قدیمہ کے ماہر اور عالم کی دلچسپی کے لئے خصوصی قدروقیمت کا مواد بہت ہی قلیل تھا۔چنانچہ' میں نے فارسی اور عربی کے اصل نسخہ جات سے استفادہ کیا ہے (ان میں سے چند نایاب ہیں) اور آگرہ سے متعلق ایسے موضوعات کی معلومات فراہم کی ہیں' جو ابھی تک انگریزی زبان میں شائع نہیں کی گئیں (i)

باوجود اس کے کہ موجودہ تصنیف پر وقت اور توجہ صرف کی گئی ہے' مگر اپنی تمہید میں یہ اپنے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ لیکن اس کے باوجود' اگر مہربان عوام اس کی غلطیوں سمیت اسے اسی نوعیت کی سابقہ کاوشوں کی طرح قبول کرلیں' تو میں یہ سمجھوں گا کہ اس ذمہ داری پر صرف کیا گیا وقت رائیگاں نہیں گیا۔ (ii)

اب میں اس امید پر کہ یہ ان کے لئے مفید ثابت ہوں گے' اپنے نوجوان ہم وطنوں سے چند الفاظ کہنے کے لئے قاری سے اجازت طلب کروں گا۔

میرے پیارے نوجوان ہم وطنو ـــــ میں بذریعہ ہذا تصنیف آپ کے سامنے اگر دنیا کے نہیں' تو ایشیا کے انتہائی خوبصورت اور شاندار شہر (جس کا شمار ہندوستان کے چند اہم شہروں میں ہوتا ہے) کی تاریخ پیش کرتا ہوں۔ مشرق و مغرب کے شعراء اس کی تعریف و توصیف میں گرمجوشی کا اظہار کرتے ہیں: نیز دنیا کے دور دراز علاقوں کے سیاح' اس کی رعنائیاں دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس کتاب کے صفحات کا مطالعہ کریں اور انہیں پڑھنے کے بعد ماضی کی عظمت کی یادگاروں اور ساسانی طرز تعمیر کی سچی کامیابیوں' سکندرہ کے ماہر تعمیرات' یا تاج محل کے بانی کی یاد تازہ کرنے کے لئے بجا طور پر ان کی تعریف کریں۔ لیکن یاد رکھئے کہ ایک بادشاہ کی حقیقی عظمت اس کے تعمیر کردہ محلات کی خوبصورتی' ان کی آرائشوں اور سنگ مرمر کی روشوں' یا کسی محبوب ہستی کی یاد میں تعمیر کردہ ایک فقید المثال اور دلفریب یادگار کی شان و شوکت یا نزاکت یا اس کے تخت کی آب و تاب یا اس کے تاج کی چکاچوند پر مشتمل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی بادشاہ ایک ہزار آئینوں کے ایوان میں سوتا ہے' جس پر سرکیسین' جارجین اور کالموک خاتون پہرہ داروں کا پہرہ ہو یا شاہی دروازوں پر بہادر راجپوتوں کی نگرانی ہو یا وہ کئی ماہ کی مدت میں تیار ہونے والے طلائی کشیدہ کاری سے مزین شامیانہ کے نیچے ایک لاکھ روپے کی لاگت کے ایک تکیہ سے ٹیک لگائے ایک شاندار مسند پر شان و شوکت کے ساتھ بیٹھا ہو اور

قسمت کے دھنی اور امیر ترین امراء اور غیر ملکی سلطنتوں کے سفیر اس کی نظروں کے سامنے سر جھکا کر ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں' تو دنیا کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ دنیا کو اس کے پرندوں' جانوروں' شکاری جانوروں یا پالتو انوکھے جانوروں کی بہت بڑی تعداد یا برما کے ہاتھیوں اور شاہی اصطبل میں عربی و ترکی نسل کے گھوڑوں کی تعداد سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایسی چیزیں نہیں' جو کسی بادشاہ کو عظیم بناتی ہوں۔ ایک بادشاہ کی اصل عظمت' اس کی توجہ میں دیئے گئے خدا کے بندوں کی حفاظت کے لئے کئے گئے اقدامات' اس ملک کے امن' جس پر وہ حکمرانی کرتا ہے اس کے زیر انتظام اقوام کی خوشحالی: اپنی تمام رعایا سے یکساں انصاف برتنے: انہیں خیال اور شعور کی آزادی دینے' قصہ مختصر' انصاف اور تحمل کے اصولوں پر کاربند رہنے اور اپنے عوام کو مطمئن اور خوشحال بنانے کے لئے تدابیر متعارف کرانے اور انہیں اقوام کے پیمانہ میں بلند کرانے کے سلسلہ میں مدد کرنے میں مضمر ہے۔ کسی بادشاہ کی عظمت' اس کی جیتی ہوئی لڑائیوں' جنگ میں بنائے گئے قیدیوں کی تعداد' یا کروڑوں روپے پر مشتمل خزانوں کے انبار جمع کرنے میں نہیں' بلکہ اس کی حکومت کے تحت علم و فضل کے میدان میں حاصل کی گئی کامیابیوں' تجارت و زراعت میں کی گئی ترقی' ریلوے کی آمد و رفت میں توسیع کے ذریعے ملکی وسائل میں ترقی کرنے' شاہراہوں کی تعمیر اور ان کی حفاظت کرنے' انسانی مہارت اور توانائی کے راستے میں حائل ناقابل عبور رکاوٹیں ختم کرنے' صنعتی فنون کی ترویج و ترقی کرنے' بڑے بڑے تندوتیز دریاؤں اور ندیوں کو پلوں کے ذریعے ملانے' ملک کو سرکاری عمارات سے آراستہ کرنے' انسانیت کے دکھ درد میں تخفیف کرنے کی خاطر خیراتی ادارے قائم کرنے اور عوام کی بھلائی میں ترقی کے لئے کام کرنے میں ہے۔ امن و آشتی کی یہ کامیابیاں' علم و فضل کی یہ فتوحات' جنگ کی فتوحات (اگرچہ عظیم ہی کیوں نہ ہوں) کے مقابلہ میں کہیں زیادہ درخشاں اور شاندار' کہیں زیادہ ٹھوس اور پائیدار ہیں۔ انہیں دیرپا فتوحات نے انگریزی قوم کو شاندار اور عظیم بنایا ہے اور ان کی اس عظمت پر اقوام عالم رشک کرتی ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک پرشکوہ اور عظیم قوم کی رعایا ہیں۔ میرے عزیز ہم وطنو' مجھے امید ہے کہ اگر درست انداز میں آگرہ کی تاریخ پڑھی جائے تو یہ آپ کو بتائے گی کہ ایک بادشاہ کی عظمت کا اصل مطلب کیا ہے۔ آیا یہ سرکاری خزانے کے کروڑوں روپے کی لاگت سے اپنی محبوب بیوی کی یاد میں ایک یادگار تعمیر کرنے میں ہے یا دوسری جانب عوامی افادیت اور بھلائی کے لئے اقدامات کا آغاز کرنے میں ہے (جس کا بین اور وافر ثبوت ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں) یہ تصنیف آپ کو بتائے گی کہ کسی قوم کی اصل عظمت کا مطلب کیا ہے۔

مجھے امید ہے' جب آپ اس تاریخ کو پڑھ لیں گے تو' ترقی اور روشن خیالی کے اس دور نے آپ کے سامنے جو عظیم الشان نظارہ کھول کر پیش کیا ہے' اس میں آپ کے سپرد جو ذمہ داری سونپی گئی ہے' اسے پورا کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ آپ کو میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ: عیش و عشرت کو چھوڑ دیں' فضول گفتگو ترک کر دیں' ان لوگوں کی صحبت سے پرہیز کریں' جو آپ کے دماغ میں ایسے خیالات بھر دیتے ہیں' جو لازماً زہر آلود ثابت ہوتے ہیں: خیال کیجئے کہ انگریزوں کی فیاضی کے ذریعے عظیم محل کا دروازہ' جو انسانی عظمت کی طرف جاتا ہے' آپ کے لئے کھول دیا گیا ہے' مگر چونکہ آپ ابھی تک ننھے بچے کی طرح ہیں اس لئے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تیزی سے نہ دوڑیں' کیونکہ ایسا کرنے کی تیز و تند کوشش میں اس بات کا امکان ہے کہ آپ سر کے بل گر کر اپنی گردن تڑوا لیں گے۔ اپنے ہم وطنوں کی توقیر حاصل کیجئے اور اپنے حکمرانوں کا احترام کیجئے۔ راست باز لوگوں کے نقش قدم پر چلئے' اپنے حکمرانوں کے حکم کی تعمیل کیجئے' جو آپ کے جان و مال کے محافظ ہیں اور جن سے آپ نے تعلیم' دولت اور عزت و مرتبہ' سب کچھ حاصل کیا ہے' ان سے وفاداری اور خدمت کا اظہار کر کے' حاصل کردہ تعلیم کے مفید تاثر اور اپنی نسل کی شرافت کا عملی ثبوت فراہم کریں: اپنے والدین اور بزرگوں کا احترام کریں اور اپنی زندگی عزت و وقار سے بسر کریں' ایسا صرف قابل تکریم کارناموں ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں' تو میں یہ محسوس کروں گا کہ آپ نے مذکورہ کتاب کا مطالعہ اسی انداز میں کیا ہے' جس کی میں نے آپ کو تلقین کی ہے اور اس نے آپ کو صحت مند سبق دیا ہے' تب میری خوشی و مسرت بہت زیادہ ہو گی۔

جہاں تک ممکن ہو سکا ہے' معلومات کے ذرائع' ذیلی حاشیوں اور متن میں تحریر کر دیئے گئے ہیں۔ اپنی کتاب کے تاریخی حصہ کے لئے میں' محمد قاسم فرشتہ کی مشہور و معروف تصنیف' عبدالرحیم خان خاناں کی تزک بابری (وقائع بابری)' معتمد خاں کی تزک جہانگیری' علامی ابوالفضل کی آئین اکبری اور اکبر نامہ' ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ' مرزا نظام الدین احمد کی طبقات اکبری' ملا عبدالحمید لاہوری کی شاہجہاں نامہ' محمد کاظم کی عالمگیر نامہ' محمد ساقی کی ماثر عالمگیری' مولوی غلام حسین خاں کی سیر المتاخرین' خفی خاں کی منتخب اللباب' انگریزی زبان میں تحریر کردہ' آنریبل مونسراٹ ا-یلفن سٹون' ویلر' کینے' سرولیم ہنٹر' مرے وغیرہ کی تواریخ ہند کے لئے بہت مشکور ہوں۔ بیانی حصہ کو زیادہ تر موقع پر لکھے گئے میرے اپنے مندرجات کی مدد سے تحریر کیا گیا ہے' مگر میں نے مسٹر کینے' سی۔ جے فریچ' مسٹر جیمز فرگوسن' مسٹر رلیارڈ ٹیلر اور دیگر مصنفین کی بہترین تصانیف سے بھی بہت زیادہ افادہ حاصل کیا ہے۔ تاج محل کا بیان زیادہ تر

مقبرہ کے متولین (موروثی محافظوں) کے پاس موجود تاج محل کی قدیم تاریخ پر مشتمل قلمی نسخہ کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ اکبر کی زندگی اور اس کے دربار سے متعلق باب کے لئے مواد ابو الفضل اور اکبر کے مورخین کی تصانیف سے حاصل کیا گیا ہے (جن کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے)۔ مگر میں نے اس باب کی تیاری کے وقت باصلاحیت مستشرق عالم' آنجہانی پروفیسر بلاچ مین کے آئین اکبری کے بہترین ترجمہ سے بھی مدد حاصل کی ہے۔ جدید آگرہ کے متعلق آخری باب لکھتے وقت' میں نے سر ولیم ہنٹر کی گز-ٹیئر آف انڈیا' کلکٹر آگرہ ایچ۔ ٹی ہورے بہادر کی فراہم کردہ سرکاری معلومات اور سیکرٹری آگرہ میونسپل کمیٹی' رائے بہادر منشی شیو نارائن کی براہ مہربانی مہیا کردہ میونسپل رپورٹوں سے استفادہ کیا ہے۔

محمد لطیف' جالندھر
27 ستمبر' 1896ء

(i) ہندوستانی ناموں کے رسم الخط کے سلسلہ میں بہترین نظام رسم الخط مندرجہ ذیل صفحات میں اپنایا گیا ہے' ماسوائے اشخاص اور مقامات کے مقبول عام ناموں کے' عام استعمال کے باعث' جن کے ہجے' غیر متبدل بن گئے ہیں۔

(ii) تاریخ پنجاب (1891ء) تاریخ لاہور (1892ء) اور ملتان کی ابتدائی تاریخ' (1891ء)

باب اول

آگرہ

تاریخی وبیانی

تاریخی

مسلمانوں میں آگرہ (2) کے نام سے مشہور' اکبر آباد کا شہر' (1) اسی نام کے ضلع کے تقریباً وسط میں' دریائے جمنا کے مغربی یا دائیں کنارے پر' اس دریا کے دریائے گنگا کے ساتھ سنگم سے 300 میل اوپر' دہلی سے 139 میل جنوب مشرق اور ریل کے ذریعے کلکتہ سے 841 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

افسانوی تاریخ: جمنا' (قدیم پرانوں کا یمنا) کے علاقے' ویدوں کے نامور جامع' اور مہابھارت' پرانوں' برہماسوترا اور دھرماسوترا کے مشہور زمانہ مصنف اور مشہور و معروف دانشور' پراسارا کے بیٹے' ویاسہ (سنسکرت کے لفظ وی آس سے ہے' جس کا مطلب تقسیم کرنا ہے) کی پیدائش کے قدیم مقام ہیں۔ لوگ اس وقت آگرہ سے ناآشنا تھے اور' اندراپرستھ اور ہستینہ پور کی بنیاد ابھی نہیں رکھی گئی تھی۔ ہندوؤں کی قدیم کتابوں کے مطابق' یہ علاقے ویاسہ کی پیدائش اور اس مشہور شخصیت کے ابتدائی سالوں سے تعلق کے باعث' دلچسپی کے حامل ہیں۔ وہ اپنی سابقہ زندگی میں برہمن تھا' لہٰذا اس نے موجودہ دنیا کے تیسرے اور چوتھے ادوار کے درمیانی عرصہ میں' دیوتا کے خصوصی حکم سے' جسمانی وضع قطع اور انسانی شکل و صورت اختیار کر کے' آخر کار آنند حاصل کیا۔ سنتانو کی شکاری مہمات' اس علاقے کے لئے تباہ کن اور ویران انگیز ثابت ہوئیں' جہاں مچھیروں کا ایک بہت بڑا اور طاقتور قبیلہ آباد تھا' ان کا ایک اپنا بادشاہ تھا اور وہ

لوگ شکار پر گذر بسر کرتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مقدس دریا کے کناروں کے ساتھ اس وقت آباد' ان لوگوں کی اولاد بھی پرہیز گار ہی ہو گی۔ پار سورلما کے نام کے تحت' وشنو کے ظہور کا مقام ہونے کے باعث' ہندو اس جگہ کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آگرہ کی بنیاد ہندوؤں نے رکھی تھی۔ اس کے نام کی اصل "اگر" سنسکرت کا لفظ ہے' جس کا مطلب' پہلا ہے' یہ اس خیال کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ یہ درختوں کے ان جھنڈوں میں سب سے پہلا تھا' جہاں' ہندوؤں کے چرواہے دیوتا کرشنا نے اپنی مشہور و معروف بانسری بجا کر برندر بن کی گوپیوں اور گنگا کے علاقوں کی شہزادیوں کو یکساں طور پر اسیر کر لیا تھا۔ اس کی نشاندہی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ یونانی مصنف کیوتس کرٹیس نے اگرامیس کا ذکر' گنگا کے علاقوں میں آباد پارسی آبادی کے شہزادہ کے طور پر بھی کیا ہے۔

آگرہ کی قدامت کی شہادت' ضلع میں موجود چند قدیم قصبات سے بھی ملتی ہے۔ ان سب میں نملیاں' عقاب سر' المعروف' سورج پور ہے' روایت کے مطابق' اس کی بنیاد' راجہ سوراسینہ نے رکھی' جنرل کنگھم نے اس کی شناخت' اجودھیا کے عظیم بادشاہ' رام کے بھتیجے کے طور پر کی ہے۔ اس کے شکستہ مندروں میں قدیم بت اور مجسمے ملے ہیں اور اعتماد پور اور ہتیل کے سرحدی خطوں میں' مہاتما بدھ کے دور کی عمارات کے کھنڈرات' مورتیاں' اور قدیم خانقاہوں کے باقیات دریافت کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ کسی دور میں ان جملہ قدیم شہروں کا انحصار' طاقتور ہندو بادشاہت پر تھا' جس کا دار السلطنت متھرا تھا۔

داستان سے تاریخ میں آنے پر' ہمیں سب سے پہلے آگرہ کا ذکر' تاریخ داؤدی کے نام سے مشہور' عبداللہ کی ایک فارسی تصنیف میں ملتا ہے۔ یہ تصنیف' افغان سلطنت کے پہلے بادشاہ بہلول لودھی کے دور حکومت سے محمد عادل سور اور اس نسل کے آخری حکمران' داؤد شاہ کے دور تک' افغان لودھی بادشاہوں کی تاریخ ہے۔ مصنف' آگرہ کی ابتداء کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"ہندو بیان کرتے ہیں کہ آگرہ' متھرا کے حکمران راجہ کانس کے دور میں ایک مضبوط مقام تھا' جو کوئی بھی اس کی ناراضگی مول لیتا' وہ اسے اس جگہ کے قلعہ میں قید کر دیتا تھا' چنانچہ' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ' یہ باقاعدہ سرکاری قید خانہ بن گیا۔"

اسی مصنف کے مطابق' جب فاتح' سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا' تو اس کی افواج نے آگرہ کو اس قدر تہ و بالا کر دیا کہ اس کا مرتبہ کم ہو کر ایک غیر اہم دیہات کا رہ گیا۔ یہ واقعہ تقریباً 1022ء میں رونما ہوا۔

معلوم ہوتا ہے' اس ملک سے محمود کی روانگی کے بعد' آگرہ نے اپنی اہمیت دوبارہ حاصل کر لی اور وہ ایک مرتبہ پھر ایک ہندو راجدھانی بن گیا' کیونکہ غزنی کے سلاطین' محمود' (3) ابراہیم اور بہرام شاہ کی تعریف میں لکھی گئی' سلمان کی نظموں میں ہمیں محمود کی قیادت میں مسلمانوں کی طرف سے اس شہر پر قبضے کا ذکر ملتا ہے۔

مصنف لکھتا ہے "آگرہ کا قلعہ ریت میں ایک پہاڑی کی طرح تعمیر کیا گیا ہے اور اس کی فصیلیں ٹیلوں کی مانند ہیں۔ اس کی چار دیواری پر کبھی کوئی آفت نازل نہیں ہوئی' نہ ہی پرفریب وقت نے دغا بازی کی ہے۔" شہر کا محاصرہ کر لیا گیا' رات کو راجہ جے پال کے سردار نے ایک خواب دیکھا۔ اگلی صبح' راجہ نے قلعہ سے باہر آ کر سیف الدولہ کو اطاعت پیش کر دی' اس نے اسے بادشاہ سے متعارف کرا دیا۔ لیکن بادشاہ نے قلعہ کو تباہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور وہ کافروں کے ساتھ صلح کے تصور سے نفرت کرتا تھا' اس نے کہا "میں اس ملک میں جہاد کرنے آیا ہوں' میں بے شمار قلعوں کو تسخیر کر چکا ہوں اور اس جیسے ایک بہت بڑے ان چھوٹے قلعہ کی تلاش میں تھا' لہٰذا میں اسے ضرور تسخیر کروں گا اور اسے اسلام کی حکومت کے تحت لاؤں گا۔" بادشاہ ایک ننگی تلوار لے کر لڑائی میں ایک شیر کی طرح کود پڑا۔ مجاہدین کی تلواروں نے آگرہ کی سرزمین پر دشمن کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ مصنف کے مطابق "اسلام کے سپاہیوں نے قلعہ کو گھیر لیا اور دن کو رات جیسا بنا دیا" "منجنیقوں سے داغے جانے والے پتھر درویشوں کی دعاؤں کی طرح عرش تک جاتے تھے۔" "آخر کار' قلعہ کے اندر' مجاہدین اسلام کے درمیان' نعرہ بلند ہوا "ہمارے بادشاہ محمود کی فتح" قلعہ تسخیر کر لیا گیا اور مضافات کے سرداروں نے فاتح کو اپنے تحائف میں' سونے کے انبار اور لدے ہوئے ہاتھی بھیجے۔

شہزادہ محمود' (قصیدے میں جس سے خطاب کیا گیا ہے) مالوہ اور اجین کو فتح کرنے کے بعد' دریائے سندھ کو اٹک کے مقام سے پار کرتے ہوئے غزنی کی طرف لوٹ گیا۔ سلمان اس کارروائی کو مبارک سمجھتا ہے اور اس کی مہمات کا موازنہ حضرت موسیٰؑ کی مہمات سے کرتا ہے' جنہوں نے مصر میں دریائے نیل کو پار کیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے' غوری' خلجی' تغلق اور سید خاندانوں کے تحت' آگرہ ایک غیر اہم مقام تھا اور بیانہ کی سرکار پر مشتمل تھا۔ محمد غوری' 1195ء میں ہندوستان کی طرف لوٹا' تو وہ بیانہ کی طرف روانہ ہوا' اس پر قبضہ کر کے اس نے اس کی حکومت' اپنے جرنیل' بہاؤالدین طغرل کو عنایت کر دی۔ (4) چند اور کے چوہان راجہ' (جس نے آگرہ تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا) کی طاقت کو موثر طور پر کچل دیا گیا: مگر ہندو راجگان' جنہیں' مسلمان بادشاہوں کو خراج ادا کرنے

پر مجبور کر دیا گیا تھا' جلد ہی نیم خود مختاری کی طرف پلٹ آئے۔ 1398 میں تیمور لنگ کے حملہ کے وقت' راجپوت سرداروں کو آزادی کا ایک مختصر سا وقفہ حاصل ہو گیا۔ سید خاندان کے دور حکومت میں' دہلی کے مسلمان بادشاہوں نے آگرہ کے ضلع میں از سرنو اپنی بالادستی قائم کی' مگر اس حکومت کے آخری دور میں ہندوؤں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

دہلی کے تخت پر سلطان سکندر لودھی کے براجمان ہونے پر' حاکم بیانہ' سلطان شرف نے بہلول لودھی کے پوتے عظیم ہمایوں کے توسط سے قلعہ بیانہ کے دروازوں کو بند کر دیا اور خود کو عمر خاں شیروانی کی فوج کے خلاف دفاع کرنے کے لئے تیار کر لیا' جسے نئے بادشاہ نے قلعہ کا انتظام سنبھالنے کا حکم دیا تھا۔ تاہم' بادشاہ موقع کی نزاکت کے پیش نظر' آگرہ کی طرف روانہ ہوا' جہاں' ہیبت خاں جرونی (جس نے سلطان شرف کی قیادت میں قلعہ پر قبضہ کیا ہوا تھا) نے بھی دروازے بند کر دیئے۔ اس بے عزتی نے سکندر لودھی کو آگ بگولا کر دیا' اس نے سلطان شرف پر جنگ مسلط کر دی' لہٰذا بیانہ اور آگرہ کے دونوں قلعے فتح ہو گئے: اس شکست کے بعد' سلطان شرف کو گوالیار کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔

آگرہ کی دوبارہ آبادکاری: اب سلطان سکندر نے اپنی توجہ' آگرہ شہر کو از سرنو آباد کرنے پر مرکوز کی۔ تاہم' لودھی بادشاہوں کا شہر' جمنا کے مشرقی کنارے پر آباد کیا گیا۔ "تاریخ خان جہاں لودھی" کا مصنف' فرشتہ کا ہمعصر' نیامت اللہ (جس نے اپنی تصنیف' 1612ء یا جہانگیر کی حکومت کے آٹھویں برس میں مکمل کی تھی) سلطان سکندر کی جانب سے مسلمانوں کے آگرہ کی بنیاد رکھے جانے کے بارے میں مندرجہ ذیل حال بیان کرتا ہے:-

"بیانہ سرکار کے سرکاری افسروں اور عام کسانوں نے سلطان سے سلطنت کے اس علاقہ کی سرکش آبادی کی زیادتیوں کی شکایت کی تو سلطان نے جمنا کے کنارے پر ایک شہر کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کر لیا' جسے اس کی فوج اور حکومت کے صدر مقام کے طور پر استعمال کیا جا سکے اور وہ ایسے مقام کے طور پر کام دے سکے' جہاں سے باغی قبائل کی موثر طور پر روک تھام کی جا سکے۔ اس مقصد کے تحت' سلطان نے 1505ء میں سلطنت کے چند مستحق اور ذہین افسران کو دریا کے کناروں کا جائزہ لینے اور اس مقصد کے لئے بہترین مقام کو استعمال کرنے کے لئے اطلاع دینے کی خاطر روانہ کیا۔ یہ جماعت کشتیوں کے ذریعے دہلی سے روانہ ہوئی' چنانچہ' جب یہ کناروں کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے تو انہوں نے انتہائی احتیاط سے ان کا جائزہ لیا' آخر کار وہ اس جگہ پہنچ گئے' جہاں اس وقت شہر موجود ہے۔ اس مقام کو منظور کرتے ہوئے انہوں نے بادشاہ کو اپنے انتخاب سے آگاہ کیا' وہ بذات خود اس کا معائنہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ جس وقت بادشاہ' مقررہ

جگہ پر پہنچا تو اس نے بلندی پر دو مقامات دیکھے جو عمارتی مقاصد کے لئے موزوں معلوم ہوتے تھے' لہٰذا اس نے مہتر ملاخاں الخاطب نائیک' (جس کے پاس شاہی بجرے کی کمان تھی) سے دریافت کیا' ان دونوں ٹیلوں میں سے کون سا مناسب رہے گا۔ اس نے جواب دیا "وہ جو آگے راہ ہے" بادشاہ مسکرایا اور کہا: "چنانچہ شہر کو بھی آگے راہ (یا آگرہ) کے نام سے پکارا جائے گا۔" ازاں بعد' سلطان نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے اور اس کے اردگرد کھڑے امراء نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایک مبارک گھڑی کو نئے شہر کی بنیاد رکھنے کے احکامات جاری کئے گئے' لہٰذا' اس مقصد کے لئے مواضع' پاشی اور پویا' پرگنہ ولی' بیانہ سرکار کے حصے شامل کئے گئے۔ آگرہ کی ایک علیحدہ پرگنہ میں تشکیل کی گئی اور اسے ان باون پرگنوں میں شامل کر دیا گیا جو بیانہ سرکار کو تشکیل دیتے ہیں۔"

شہر کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا' لہٰذا وہ حکومت کا پایہ تخت بن گیا۔ سلطان' قلعہ کی تعمیر کا حکم دے کر دھول پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی کے لودھی بادشاہ اپنی رہائش' جمنا کے مشرقی کنارے پر رکھتے تھے' جس پر سلطان بابر نے 1526ء میں' پانی پت کی فتح کے بعد قبضہ کر لیا۔ موجودہ آگرہ کے سامنے اس کی بنیادوں کا ابھی تک پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

تاریخ داؤدی کا مصنف آگرہ کی قدامت کو تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے' گرچہ' یہ سلطان سکندر لودھی کے دور میں ایک شہر بن گیا' مگر اس کے دور سے قبل یہ ایک قدیم جگہ تھی۔ خاں جہاں لودھی کی تاریخ میں' 1510ء کے واقعات کے حوالہ سے یہ درج کیا گیا ہے کہ ناگور کے حکمران' محمد خاں نے سلطان سکندر کو اپنی اطاعت پیش کرتے ہوئے' بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھنے اور اس کے نام کا سکہ جاری کرنے کا حکم دیا' جس نے اسے ایک گھوڑا اور خلعت روانہ کیا۔ اس کے بعد بادشاہ دھولپور سے روانہ ہوا اور آگرہ کا دورہ کیا' کچھ وقت' رنگ رلیوں' تفریح' باغات کی سیر اور شکار میں صرف کیا۔ مصنف لکھتا ہے' "تقریباً اسی دور میں' آگرہ' جو بیانہ کی ماتحت ریاست تھا' بادشاہوں کی رہائش گاہ مقرر ہوا۔"

سلطان کے دور میں' آگرہ' تمام اقوام کے لوگوں کی ایک عظیم آماجگاہ بن گیا' لہٰذا' عرب' فارس' بخارہ اور ایشیا کے دیگر ممالک کے عالم فاضل لوگ اس کے دربار میں جمع ہو گئے' چنانچہ' ان کی بڑے اعزاز کے ساتھ آؤ بھگت کی جاتی اور انہیں خوب نوازا جاتا۔ سلطان نے اس مقام سے متعدد فرمان جاری کئے' جن کا مقصد' عوام کی فلاح و بہبود' ملک کی خوشحالی اور اپنی سلطنت میں جرائم اور مکروہ استحصالات کی روک تھام تھا' اس کی وجہ سے اسے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ اس کے دیگر فرامین میں سالار مسعود (5) کے نیزے کی

نمائش کے لئے سالانہ جلوس کو ختم کرنے کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے' جو زبردست شور و غوغا کا باعث بنتا تھا' اس کے علاوہ مزارات پر خواتین کی حاضری کی ممانعت اور کارخانوں کے قیام کے لئے احکامات قابل ذکر ہیں' جہاں نوجوان امراء اور سپاہیوں کے بیٹوں کو مفید دستکاریوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بادشاہ نے انتہائی سادہ زندگی بسر کی' وہ شان و شوکت اور دکھاوے کے خلاف تھا۔

بادشاہ کے لئے احترام کا اظہار کرنے کے لئے' اس وقت ایک عجیب و غریب رسم موجود تھی۔ یہ ہر سردار کی عادت تھی' کہ جب وہ شاہی فرمان کی آمد کا سنتا تو اس فرمان کے حامل سے ملاقات کرنے کے لئے دو یا تین کوس تک سفر کرتا تھا۔ اس کے بعد' ایک بلند چبوترہ تعمیر کیا جاتا اور انتہائی قیمتی گاؤ تکیے اس پر بچھا دیئے جاتے۔ ایلچی خود اس چبوترے پر بیٹھ جاتا' جبکہ وہ امیر جس نے فرمان وصول کرنا ہوتا تھا' نیچے کھڑے ہو کر انتہائی عاجزی اور احترام سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیتا' چنانچہ' فوراً فرمان اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا جاتا اور وہ اسے بوسہ دے کر اپنے سر پر رکھتا اور اسے اپنی آنکھوں سے لگاتا تھا۔ اگر یہ کوئی نجی پیغام ہوتا تو وہ اسے خاموشی سے پڑھتا۔ اگر یہ عوامی نوعیت کا ہوتا تو اسے مسجد کے منبر پر سے باآواز بلند پڑھا جاتا۔ یہ تاتاریوں کی رسم کی نقل تھی' جو چین میں ابھی تک موجود ہے' مگر سکندر نے اسے ختم کر دیا۔

زلزلہ سے آگرہ کی تباہی: 3 صفر' 911 (5 جولائی 1505ء) کو آگرہ میں زبردست زلزلہ آیا۔ یہ اس قدر شدید تھا کہ "بلند و بالا عمارات' زمین بوس ہو گئیں اور کئی ہزار افراد کھنڈرات تلے دفن ہو گئے۔ (6) ہندوستان میں اس سے پیشتر اس قدر شدید زلزلہ کبھی نہیں آیا تھا۔

923 (1517ء) میں بادشاہ سکندر لودھی نے گوالیار کو تسخیر کرنے کے لئے' دور دراز کے تمام امراء کو آگرہ بلوا لیا' لہٰذا وہ جنگ کے لئے ابھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھا کہ خناق کے باعث بیمار پڑ گیا اور بروز اتوار 14 دسمبر' 1517ء کو آگرہ میں اپنے محل کے اندر انتقال کر گیا۔ اس نے سکندرا کی بنیاد رکھی (جو ہندوستان کے انتہائی ممتاز بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کی مشہور زمانہ جائے مدفون ہے) اور سنگ سرخ کی ایک نفیس بارہ دری تعمیر کرائی جو بعد میں' اکبر کی پرتگیزی بیوی' مریم زمانی کی آخری آرام گاہ بن گئی۔

اس روز' جب پانی پت کی مشہور زمانہ لڑائی لڑی گئی (29 اپریل' 1526ء) اور سلطان سکندر کا بیٹا اور جانشین' بادشاہ ابراہیم لودھی' میدان جنگ میں قتل ہوا' تو بابر نے دہلی اور آگرہ میں سرکاری خزانہ حاصل کرنے کے لئے اپنے دو فوجی دستے روانہ کئے' وہ بذات خود' جنگ کے تیسرے روز دہلی پہنچا اور اگلے جمعہ کو جامع مسجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا تو وہاں مختلف خزانوں کو سر بمہر کرنے کے بعد آگرہ کی طرف روانہ ہوا' جہاں اس نے شہزادہ ہمایوں کو

پہلے ہی سے روانہ کر دیا تھا۔ 10 مئی' 1526ء کو آگرہ' لودھی گھرانے سے چھین لیا گیا۔

شہزادہ ہمایوں نے بغیر کسی سخت مزاحمت کے' آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت' آگرہ میں گوالیار کے راجہ' بکماجیت کا خاندان رہائش پذیر تھا' جس کا ملک' بادشاہ ابراہیم کے ایک جرنیل عظیم ہمایوں شیروانی نے فتح کر لیا تھا۔ بکماجیت کو پانی پت کی جنگ میں خدمات سرانجام دینے کے لئے بلوایا گیا اور وہ میدان جنگ میں مارا گیا۔ اس کی بیویوں' بچوں اور اس کے قبیلے کے سرداروں (جو قلعہ میں تھے) نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر انہیں گرفتار کر کے وہاں قید کر دیا گیا۔

کوہ نور ہیرے کی تاریخ: ہمایوں نے اس قدیم ہندو خاندان کی بدحالی میں' اس کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا اور انہیں لوٹ مار سے محفوظ رکھا۔ اس فیاضانہ سلوک کے بدلے میں' انہوں نے اپنی مرضی سے ہمایوں کو جواہرات کا تحفہ پیش کیا' جن میں ایک مشہور و معروف ہیرا بھی شامل تھا' بابر کے مطابق' اسے مالوہ کے سلطان علاؤالدین نے حاصل کیا تھا' بادشاہ اپنی تزک میں لکھتا ہے' "یہ اس قدر قیمتی ہے کہ ہیروں کے ایک جوہری نے اس کی مالیت کا اندازہ پوری دنیا کے روزمرہ اخراجات کے نصف کے برابر لگایا ہے۔ یہ تقریباً آٹھ مثقال (یا 320 رتی) کا ہے۔"

بابر نے آگرہ پہنچنے پر' سلطان ابراہیم کے پرانے محل میں رہائش اختیار کر لی۔ ہمایوں نے اپنے والد کی آمد پر سب سے پہلے' اسے راجہ بکماجیت کے خاندان سے حاصل کردہ ہیرا پیش کیا۔ بابر نے یہ ہمایوں کو بطور تحفہ واپس کر دیا۔ یہ وہی قیمتی ہیرا تھا' جو اورنگ زیب نے' جوہری اور سوداگر' ٹیورنیئر کو دکھایا' لہٰذا' ٹیورنیئر نے اس کی مالیت کا اندازہ' تقریباً 880,000 سٹرلنگ پونڈ لگایا' خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ مشہور ہیرا' کوہ نور تھا۔ (7)

بادشاہ نے' قلعہ میں' ابراہیم کے افسر اعلیٰ' ملک داؤد قرنی کو معافی دے دی' اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا اور اس کے ساتھیوں کو جائداد رکھنے کی اجازت دے دی۔ ابراہیم کی والدہ کو اس نے سات لاکھ روپے مالیت کا ایک پرگنہ عنایت کیا اور اسے اس کے تمام اثاثوں کے ساتھ' آگرہ سے ایک کوس کے فاصلے پر ایک محل میں لایا گیا جو اس کی رہائش گاہ کے طور پر مقرر کیا گیا۔

بابر اکثر اپنی رہائش' آگرہ میں رکھتا تھا' لہٰذا' آگرہ کے قریب فتح پور سیکری کے مقام پر' راجپوتوں کے ساتھ اس کی عظیم اور فیصلہ کن جنگ' 1527ء میں لڑی گئی۔ بادشاہ نے اپنی تزک بابری میں اس جنگ کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ بھمیر' جس نے علاؤالدین خلجی (1316ء) کے دور میں چتوڑ کو بازیاب کرایا اور میوات' مشرقی مالوہ اور اجمیر پر راجپوت سلطنت قائم کی' اس کی چھٹی پشت سے راجہ سانگا کو تمام راجپوت راجاؤں نے اس وقت اپنا سردار تسلیم کر لیا۔ جس وقت بابر' سلطان ابراہیم کے خلاف پیش قدمی کر رہا تھا تو اس نے اس کے ساتھ دوستانہ خط و کتابت شروع



شہنشاہ بابر

کر دی مگر اب جب کہ مغل بادشاہ کی حکومت دہلی اور آگرہ میں قائم ہو چکی تھی' تو اس نے اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور اس موقع پر لودھی گھرانے کے ایک شہزادے محمود کے ساتھ شامل ہو گیا' جس کے جلو میں' 10,000 جوانوں کی ایک فوج تھی۔ اس نے میوات کے سردار حسن خاں کی صورت میں بھی ایک قیمتی مددگار تلاش کر لیا تھا' راجہ اپنے حلیفوں کی مشترکہ افواج اور راجپوت قبائل کے منتخب جنگجوؤں کے ساتھ' آگرہ کی ماتحت ریاست بیانہ کی طرف بڑھا اور اس مقام کی حفاظتی فوج کو شکست دے کر دارالسلطنت اور ان کے درمیان ہر قسم کے رابطے کو کاٹ دیا۔ اس پر' بابر' سیکری پہنچا' مگر اس کے ہراول دستے کو شکست ہوئی اور زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ ان پے در پے شکستوں سے بابر کے آزمودہ کار سپاہیوں کو بہت زیادہ مایوسی ہوئی' لہٰذا انہوں نے اس لڑائی کو انتہائی سنجیدگی سے دیکھنا اور بہت زیادہ خطرناک سمجھنا شروع کر دیا۔ جس دوران مغلیہ فوج میں ابتری اور خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا' اس وقت' کابل سے آنے والے ایک نجومی محمد شریف نے اس کی شکست کی پیش گوئی کر دی' اس نے یہ توجیہہ بیان کی کہ اس وقت مریخ مغرب میں ہے اور یہ کہ جو کوئی بھی مخالف سمت کے علاقہ سے آکر جنگ میں شریک ہو گا اسے شکست ہو گی۔ بادشاہ اپنی تزک میں لکھتا ہے' "اس کی احمقانہ پیش گوئیوں کو سنے بغیر' میں ایسے اقدامات کرنے کے لئے روانہ ہوا' وقت جن کا تقاضہ کرتا تھا' لہٰذا میں نے اپنے سپاہیوں کو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنے کی خاطر ہر طریقہ استعمال کیا۔"

اس نے اپنی حالت کی دشواری کو پہچان لیا تھا' لہٰذا' اس نے خدا کے سامنے توبہ و استغفار کی اور شراب نوشی سے توبہ کر لی' جس کا وہ بہت زیادہ عادی تھا' چنانچہ' اس نے شراب نوشی کی محفلوں میں استعمال ہونے والے اپنے سونے چاندی کے جام' پیالے اور دیگر برتن منگوا کر توڑ ڈالے اور ان کے ٹکڑے درویشوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیئے۔ اس کے امراء نے بھی اس کی تقلید کی۔ غزنی کی بہترین شراب' جسے چند روز پیشتر' بابا دوست' باورچی' تین اونٹوں پر رکھ کے کابل سے لایا تھا' اس میں نمک شامل کر کے سرکہ میں تبدیل کر دی گئی۔ اس وقت بادشاہ کے پاس موجود دوسری شراب بھی زمین پر بہا دی گئی۔ اس نے اپنی داڑھی بڑھانے کی قسم کھائی اور تمام مسلمانوں پر سے تمغہ محصول معاف کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے اپنی فوج کی صفوں میں خوف و ہراس اور دہشت پھیلی ہوئی دیکھی تو تمام امراء اور افسروں کو جمع کر کے ان سے خطاب کیا؟"

امیرو اور سپاہیو! ہر وہ شخص جو اس دنیا میں آتا ہے اسے آخر کار ختم ہونا ہوتا ہے۔ جب ہم یہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں' تو صرف خدائے پاک ہی باقی رہتا ہے' جو غیر تغیر پذیر ہے۔ جو کوئی بھی زندگی کی دعوت پر آتا ہے' اس کے ختم ہونے سے پہلے اسے لازماً موت کا جام پینا پڑتا ہے'

جو کوئی بھی اس فانی جہاں میں آتا ہے' ایک روز اسے ہر صورت میں اس جہاں کے دکھ بھرے گھر سے رخصت ہونا ہوتا ہے۔ یہ کس قدر بہتر ہے کہ ذلت کی زندگی سے وقار کی موت مرا جائے!

شہرت کی موت مرنا میری شان ہے'
بجائے اس کے کہ میں ذلت اور شرمندگی کی زندگی بسر کروں

خدائے برتر و اعلیٰ' ہم پر مہربان ہو گیا ہے اور اس نے ہمیں ایسے بحران میں ڈال دیا ہے کہ اگر ہم میدان میں مارے جائیں' تو شہید کی موت مرتے ہیں: اگر ہم بچ جاتے ہیں تو فتح یاب ہو کر خدا کے حق میں انتقام لینے والے بن جاتے ہیں۔ چنانچہ' ہم متفقہ طور پر خدائے پاک کے نام کی قسم کھائیں کہ ہم میں سے کوئی کسی وقت بھی جنگ سے منہ موڑنے کا تصور تک نہیں کرے گا اور نہ ہی میدان جنگ کو چھوڑے گا اور دشمن کو اس وقت تک قتل کرتا رہے گا جب تک اس کی روح جسم سے جدا نہیں ہو جاتی۔ (8)

جواب میں پرجوش نعرہائے تحسین لگائے گئے۔ سب نے قرآن پاک پر فتح یا موت کی قسم کھائی۔ فوج کا حوصلہ' بحال ہو گیا تو بابر نے اپنی خندقوں کے سامنے سپاہیوں کی صف بندی کی۔ اس کے بعد وہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا صفوں کے آگے سے گزرا' سپاہیوں کے حوصلے بڑھائے اور انہیں ہدایات دیں کہ انہوں نے کس طرح کارروائی کرنی ہے۔ راجپوت انتہائی بے جگری اور بہادری سے لڑے۔ بابر نے اپنے معتمد کے ایک مراسلہ میں اس عظیم لڑائی کا حال بیان کیا ہے وہ گھمبیر لڑائی میں مغلیہ فوج کی کارروائی کے بارے میں بیان کرتا ہے:۔ "مجاہدین اسلام' جو جانثاری کے جذبہ سے سرشار تھے اور شہادت پیش کرنے کے لئے تیار تھے' انہوں نے ایک غیبی آواز سے یہ خوشخبری سنی' اور نہ تو افسردہ اور نہ ہی پشیمان ہو' تمہیں سرفراز کر دیا گیا ہے' لہٰذا' غیر مرئی قاصد سے یہ خوش کن الفاظ سنے گئے' اللہ کی طرف سے مدد و نصرت حاصل ہے اور فتح قریب ہے' اس خوشخبری کو مومنوں میں پھیلا دو۔' وہ اس قدر جوش و خروش سے لڑے کہ آسمان سے ان پر تعریف و توصیف کی بارش برسنے لگی اور فرشتے' جو خدا کے نزدیک رہتے ہیں' ان کے سروں کے گرد تتلیوں کی مانند گھومنے لگے۔"

ظہر اور عصر کی نماز کے درمیان جنگ کی آگ اس قدر بھڑک اٹھی کہ اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے' آخر کار بابر کو فتح و نصرت حاصل ہو گئی۔ حسن خاں اور بہت سے دوسرے سردار لڑائی میں مارے گئے اور راجہ سانگا انتہائی مشکل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ اس فتح کے بعد بابر نے "غازی" کا قابل فخر لقب اختیار کیا۔ یہ جنگ سیکری کے قریب ایک چھوٹی سی

پہاڑی کے سامنے لڑی گئی۔ اس نے میدان جنگ میں قتل ہونے والے دشمنوں کی کھوپڑیوں کا ایک مینار تعمیر کرایا۔ کابل کا نجومی' بادشاہ کو اس کی فتح پر مبارک باد دینے کے لئے آیا۔ بادشاہ کہتا ہے: "میں نے فوراً اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور اس طرح اپنی روح کو ہلکا کر لیا' اگرچہ وہ بے دین' گمراہ' بہت زیادہ متکبر اور نہایت دروغ گو تھا' لیکن چونکہ وہ میرا ایک پرانا ملازم تھا' اس لئے میں نے تحفہ کے طور پر اسے ایک لاکھ روپے دیئے اور اسے یہ حکم دے کر باہر نکال دیا کہ وہ میری سلطنت میں موجود نہیں رہے گا۔"

آگرہ میں حمام: خوبصورت مناظر' سرسبز و شاداب وادیوں' پر تکلف جھیلوں اور جھرنوں سے بھرپور ملک سے آنے اور قدرت کی طرف سے روشن خیالی اور شاعرانہ ذہانت سے مزین ہونے کے باعث' مسلمان بادشاہوں میں' بابر وہ پہلا شخص ہے' جس نے ہندوستان میں خوبصورت باغات اور تفریح گاہیں بنانے' مصنوعی نہریں تعمیر کرنے اور عوامی تفریح گاہوں کا انتظام کرنے کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ بادشاہ بیان کرتا ہے' "ہمیں ہندوستان میں تین چیزوں سے نفرت ہے' پہلی اس کی گرمی ہے' جو ناقابل برداشت ہے۔ دوسری اس کی آندھیاں اور طوفان ہیں' جو اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو اڑا کر لے جاتی ہیں' اور تیسری اس کی گرد ہے' جو گھر کے ہر کونے کھدرے میں اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔" ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے بابر نے آگرہ میں حمام تعمیر کروائے۔ ہم اس باصلاحیت بادشاہ کا اپنی مشہور زمانہ تزک میں اپنے حمام کے بارے میں پیش کردہ بیان سے بہتر حال نہیں بتا سکتے:-

"حمام جس میں حوض ہے' مکمل طور پر پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے: پانی کے راستے کو سفید پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ باقی ماندہ فرش اور چھت کو بیانہ سے منگوائے گئے سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے۔ ہوا کا درجہ حرارت' حمام پر اثر انداز نہیں ہو سکتا' کیونکہ جب گرم ہوا چلتی ہے' تو حمام کو مصنوعی طور پر ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے' چنانچہ کوئی شخص مشکل سے ہی اس سردی کو برداشت کر سکتا ہے۔"

گلفشاں یا چار باغ: بابر نے جمنا کے پار ایک باغ لگایا اور ایک محل کی بنیاد رکھی۔ وہ باغ جسے اس نے گلفشاں کا نام دیا فارسی زبان میں اسے چار باغ کہا جاتا تھا۔ ذیل میں ان مقامات پر باغات لگانے اور اس جیسے طریقہ کار کو اختیار کرنے کے بارے میں وجوہات کے متعلق اس کا بیان ہے: "میں نے محسوس کیا ہندوستان کے نقائص میں سے ایک مصنوعی آب رواں کی کمی بھی ہے' جو اس کے زرعی وسائل کی ترقی کے لئے ایک رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔ اس نقص کو دور

کرنے کے لئے میں نے ارادہ کر لیا کہ میں جس جگہ بھی رہائش اختیار کروں گا' وہاں مصنوعی نہریں اور آب رواں کھدواؤں گا' رہٹ تعمیر کروانے اور شاندار و منظم تفریح گاہیں بنوانے کا حکم دوں گا۔ آگرہ میں اپنی آمد کے تھوڑی دیر بعد میں نے اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور ایک باغ کے لئے کوئی مناسب مقام منتخب کرنے کے لئے' جمنا کے کناروں کا گہرا اور بغور معائنہ کیا۔ پورا علاقہ اس قدر بدوضع اور ویران دکھائی دیا کہ میں نے دریا پر انتہائی نفرت سے سفر کیا اور وقتی طور پر اس علاقہ میں باغ بنوانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ تاہم' چونکہ آگرہ کے گردونواح میں کوئی بہتر صورت حال سامنے نہیں آئی تھی' اس لئے میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ میں اپنے اختیار میں اسی قسم کے مقام کا اس سے بہتر استعمال نہیں کر سکتا۔ میں نے ایک بہت بڑا کنواں کھدوا کر اس عمل کا آغاز کر دیا' جو حماموں کو پانی فراہم کرتا تھا' اس کے بعد میں نے زمین کا وہ ٹکڑا ہموار کرایا' جہاں املی کے درخت اور مثمن تالاب ہے: ازاں بعد' میں بہت بڑا تالاب بمعہ اس کی چار دیواری بنوانے کے لئے آگے بڑھا۔ یہ کرنے کے بعد میں نے سنگین محل کے سامنے ایک دیوان عام تعمیر کروایا۔ یہ ایوان سامنے سے کھلا ہے اور ستونوں نے اسے سہارا دے رکھا ہے۔ اس کے بعد میں نے کمروں اور حماموں کو مکمل کروایا اور ان کے ساتھ ملحقہ ایک نفیس اور عمدہ باغ بنوایا۔ اسی طرح' میں نے ہندوؤں کی طرز پر' صفائی یا ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایسی عمارات اور باغ بنوائے جو مجموعی طور پر انتہائی شاندار دکھائی دیتے ہیں اور انتہائی جاذب نظر اور خوش کن نظارہ پیش کرتے ہیں"۔

بادشاہ کی باغات اور شجر کاری میں دلچسپی نے ہی اسے ترکستان کی طرز پر باغات بنوانے پر آمادہ کیا۔ وہ بیان کرتا ہے:۔ "میں نے ہر جانب خوبصورت باغات لگوائے: ہر باغ میں' میں نے گلاب اور نرگس کے پودے باقاعدہ طرز میں اگائے جو زمین میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔"

اس کے درباری امراء اور شرفاء نے اس کی تقلید کی' وہ اپنے نمونوں کی شان و شوکت اور اپنے انتظامات کی خوبصورتی کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ آگرہ کے مضافات' انتہائی سرسبز و شاداب اور ہرے بھرے دکھائی دیتے۔ لاہور اور دیپال پور کی طرز پر کنوؤں سے پانی کھینچنے کے لئے رہٹ تعمیر کئے گئے' لہٰذا' ان امراء میں سے جنہوں نے اس انداز میں جمنا کے کناروں پر باغات اور تالاب تعمیر کروائے' بابر' خلیفہ شیخ زین اور یونس علی کے ناموں کا ذکر کرتا ہے۔ بادشاہ لکھتا ہے "ہند کے افراد جنہوں نے اس سے قبل اس شکل میں جگہوں کو نہیں دیکھا تھا اور اس شان و شوکت کے باغات نہیں لگوائے تھے' انہوں نے

جمنا کے ان مقامات کو کابل کا نام دے دیا' جن پر یہ باغات اور جگہیں تعمیر کی گئیں"۔

بادشاہ نے' قلعہ آگرہ کے اندر ایک خالی جگہ پر' سلطان ابراہیم کے محل اور فصیل کے درمیان' کشادہ و وسیع و عریض تہہ خانے تعمیر کروائے' ان کا فرش' پانی کے کنویں کی سطح کے بالکل برابر تھا۔ تین کھلے ایوان تھے' ہر ایوان دوسرے کے مقابلہ پر' تین زینوں کی بلندی پر تھا اور ان سے سیڑھیوں کے زینوں کے ذریعے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ درمیانی منزل کے ساتھ ایک گنبد' رہٹ چلانے کے لئے بیلوں کے گھومنے کی خاطر تعمیر کیا گیا تھا۔ جس انداز سے تالابوں کی تہہ سے پانی کو اوپر کھینچ کر (پانی حاصل کرنے کے لئے انھیں کنوؤں کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا) بالائی باغات تک پہنچایا جاتا تھا وہ بڑا انوکھا تھا' لہٰذا' متعدد رہٹ والے کنویں تعمیر کرائے گئے جو پانی کو اٹھا کر ایک حوض سے دوسرے تک لے جاتے اور اسے فصیل کی سطح تک بلند کر کے باغات کی مختلف سطحوں تک آہستگی سے پہنچاتے تھے۔

بابر' 26 دسمبر' 1530ء کو اڑتالیس سال کی عمر میں' چار باغ میں اپنے محل کے اندر انتقال کر گیا۔ وہ اپنے عظیم اور مہربان دل اور اپنے سہل اور ملنسار مزاج کے ساتھ باوقار طور پر اس دنیا سے رخصت ہوا' جس نے بادشاہت کی عظمت اور شاہانہ شان و شوکت و رنگ رلیوں میں بھی اس کی باوقار اور شاہانہ سطوت' اس کے وفادارانہ ساتھ اور اس کی شگفتہ مزاجی کو کبھی ماند نہیں پڑنے دیا' کسی طرح بھی فطرت سے لطف اندوز ہونے کی حس کو کم نہیں ہونے دیا۔ وہ انتقال کے وقت' ہندوکش سے بنگال کی سرحدوں تک ہندوستان کے تمام علاقوں کا سب سے بڑا حکمران اور کابل کا مالک تھا۔ ابوالفضل کے فصیح و بلیغ الفاظ میں' "وہ دکھوں بھری اس دنیا سے جمنا کے کنارے پر چار باغ میں رخصت ہوا' جسے اس نے خود تعمیر کروایا تھا اور اپنے بے مثال ذوق و شوق کے باعث' اسے سرسبز و شاداب بنایا تھا۔" (9) اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے اس کا بیٹا ہمایوں' آگرہ میں اس سے آن ملا' جس نے بغیر رخصت کے بدخشاں میں اپنی حکومت کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود اس کے والد نے انتہائی محبت و شفقت سے اس کا خیر مقدم کیا' ممکن ہے اس نے اپنے والد کی صحت کی دگرگوں حالت کی خبر سن لی ہو اور موقع پر پہنچنے کی خواہش کی ہو۔ تاہم' آگرہ آنے کے باعث اس کی اپنی صحت بری طرح متاثر ہوئی تھی' لہٰذا' ایک انتہائی عجیب و غریب کہانی بیان کی جاتی ہے کہ شہزادے نے کسی طرح اپنی بیماری کو اتار پھینکا اور وہ اس کے والد میں منتقل ہو گئی' جو بالآخر اس کا شکار ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہمایوں کے طبیبوں نے اس کے معالجہ میں ناامیدی اور بے چارگی کا اظہار کیا تو شفیق باپ نے توہم پرستانہ انداز میں اپنے بیمار بیٹے کے پلنگ کے گرد تین چکر لگائے اور دعا کی۔ کچھ ہی دیر بعد اسے یہ پکارتے ہوئے سنا گیا:"

میں نے اسے دور بھگا دیا ہے! میں نے اسے پرے ہٹا دیا ہے"! تھوڑی دیر بعد وہ تیزی سے بیمار ہونا شروع ہو گیا اور اس کے نتیجے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ تاہم' سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا اور زبردست جدوجہد نے اس کے جسمانی نظام کو بری طرح متاثر کر دیا تھا جس کے باعث اس کی موت تیزی سے قریب آ گئی۔ اس کے جسد خاکی کو عارضی طور پر چار باغ میں دفن کیا گیا' مگر بعد میں اس کی اپنی وصیت کے مطابق اسے کابل لے جایا گیا' جہاں اسے اس کی نشاندہی کئے گئے خوبصورت مقام پر دفن کر دیا گیا۔ ایک رواں اور شفاف ندی ابھی تک اس کے قبرستان کے خوشبودار پھولوں کو سیراب کرتی ہے' جو کابل کے عوام کے لئے ایک بہت بڑی تفریح گاہ ہے۔" (10)

مرحوم بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے ہمایوں کی تیئیس برس کی عمر میں 29 دسمبر' 1530ء کو یا بادشاہ کے انتقال سے تین روز بعد آگرہ کے محل میں تاجپوشی کر دی گئی۔ یہ انتہائی باوقار اور پر عظمت موقع تھا' امراء نے خود کو نئے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اسے اپنی اطاعت پیش کی' لوگوں میں روپیہ پیسہ تقسیم کیا گیا' خطبہ پڑھا گیا اور نئے بادشاہ کے نام کا سکہ مضروب کرایا گیا۔

قنوج کے مقام پر ہمایوں کی زبردست شکست کے بعد شیر شاہ سور افغان نے 1540ء میں آگرہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے خزانوں اور اسلحہ خانوں پر قبضہ کرنے کے بعد' دہلی کی طرف بڑھا۔ افغانوں کے فوجی دستوں نے ستلج کے پار بھی ہمایوں کا تعاقب کیا۔

شیر شاہ کا شمار' ان روشن خیال بادشاہوں میں ہوتا ہے' جنہوں نے اس سلطنت کے سیاہ و سفید پر حکمرانی کی ہے۔ اس کا عدل و انصاف مثالی تھا اور اس نے جس غیر جانبداری سے ملک کا نظم و نسق چلایا' اس نے اس کو ہندوستان کے بادشاہوں میں ایک بلند مقام دلا دیا۔ "خلاصہ التواریخ" کے مصنف نے اس کے انصاف کی ایک مثال پیش کی ہے' جس سے اس بادشاہ کے کردار پر روشنی پڑے گی۔

"ایک روز اس کا سب سے بڑا بیٹا' عادل خاں ہاتھی پر سوار ہو کر اپنے رسالے کے ہمراہ آگرہ کی ایک گلی میں سے گزر رہا تھا' جیسے ہی اس نے اپنا چکر لگایا' اتفاق سے اس کی نظر ایک شہری کی نوجوان بیوی پر جا پڑی' جو اپنے گھر کی بالائی منزل پر برہنہ حالت میں نہا رہی تھی' اس کی دیواریں شکستہ اور ٹوٹی پھوٹی تھیں' لہٰذا کسی ہاتھی پر سوار کوئی شخص' اس کے اندر کی اشیاء کو با آسانی دیکھ سکتا تھا۔ شہزادے پر اس کی نظروں نے جادو کا اثر کیا۔ جس وقت اس نے اسے دیکھا' اسے ایک بیڑا پان پیش کیا اور اس کی الفت و محبت حاصل کرنے کے لئے پان اس کی طرف پھینکا۔ وہ کوئی آسانی سے ہاتھ آنے والی بدخصلت عورت نہیں تھی' لہٰذا جب اس کا شوہر گھر

بتایا تو اس نے یہ سارا ماجرا اس کے گوش گذار کیا۔ خاوند نے اس میں اپنی بڑی بے عزتی محسوس کی اور بادشاہ کے سامنے اپنی شکایت پیش کر دی' وہ اس کے سچ کا قائل ہو گیا۔ اس نے قول دیا کہ اسلامی قانون کے مطابق بدلے کے اصول کو نافذ کیا جائے گا۔ حکم دیا گیا کہ سائل اپنی باری پر ایک ہاتھی پر سوار ہو کر گلی میں سے گزرے اور شہزادے کی بیوی کو اس حالت میں دیکھے جب وہ عریاں حالت میں نہا رہی ہو۔ دربار میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا اور شاہی گھرانے کی ایک خاتون کو سرعام بے عزت کرنے کے حکم سے بادشاہ کے حرم میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بادشاہ اپنے مصمم ارادہ پر کاربند رہا۔ اس کے امراء اور مشیروں نے اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنے کی زبردست کوشش کی' مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بادشاہ نے کہا "ہمارے مذہب کا قانون ایسا ہی ہے اور اسے ہر حالت میں مکمل طور پر نافذ کیا جائے گا۔ اگر مجرم اتفاق سے بادشاہ کا بیٹا ہے تو کوئی بات نہیں' اس کے جرم کو کس لئے سزا سے بری قرار دیا جائے۔ قانون عمل درآمد کے لئے ہوتا ہے' لہٰذا انصاف برتتے ہوئے' ایک شہزادے اور کسی کسان میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔" شکایت کنندہ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کا وقار کافی حد تک بحال ہو گیا ہے' اپنی شکایت واپس لے لی' اس نے کہا کہ اسے اس کا حق مل گیا ہے اور وہ سلطان کے انصاف سے مطمئن ہو گیا ہے' چنانچہ' اس کی پرزور التجا پر اس معاملے کو رفع دفع کر دیا گیا۔ شیر شاہ سوری کے خوشحال دور میں' آگرہ میں اس قسم کا انصاف برتا جاتا تھا۔"

شیر شاہ' فن تعمیر کا ایک بہت بڑا سرپرست تھا' لہٰذا پورے ہندوستان میں اس کے دور میں تعمیر کردہ سرکاری عمارات میں سے' بہت سی آج تک موجود ہیں اور دنیا ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آگرہ میں اس کے دور کی صرف ایک عمارت کے آثار' علاول بلاول یا شاہ ولایت کی انتہائی دلچسپ مسجد کی صورت میں' نائی کی منڈی میں موجود ہیں' جو دیوار کے وسط تک زمین میں دھنس چکی ہے۔

شیر شاہ کے دوسرے بیٹے اور جانشین' سلطان اسلام المعروف سلیم شاہ سور کے دور حکومت میں آگرہ کا امن و امان تباہ ہو گیا۔ آگرہ ابھی تک ہندوستان کا دارالسلطنت تھا۔ سب سے بڑے بیٹے' عادل شاہ کے دعویٰ کو' اس کی عیاشی اور کمزور کردار کے باعث' چھوڑتے ہوئے' سلیم شاہ کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی فوراً اپنے بڑے بھائی عادل شاہ کو آگرہ اپنے پاس آنے کی دعوت دی' اس نے جھوٹ موٹ' اسے اپنی اطاعت پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اسے یہ کہا کہ حالات کی وجہ سے وہ تخت پر بیٹھنے کے لئے مجبور ہو گیا تھا' اس کا مقصد لڑائی جھگڑے کو روکنا تھا اور یہ کہ جیسے ہی وہ دارالسلطنت میں پہنچے گا' وہ اس کے

حق میں دستبردار ہو جائے گا۔ عادل شاہ' آگرہ پہنچا' لہٰذا' دونوں بھائیوں کے درمیان ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ سلیم نے قلعہ کے محافظوں کو تحت احکامات دے رکھے تھے کہ اس کے بھائی کو صرف دو یا تین مصاحبین کے ہمراہ اندر داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ عادل شاہ کو سلیم کے خلوص پر شک گزرا' تو وہ دیوان عام میں اپنے ساتھیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ہمراہ زبردستی گھستا چلا گیا' چنانچہ 'اپنے بھائی کو گرفتار کرنے کے لئے سلیم کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔

سلیم نے اپنے منصوبے کی ناکامی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے' اپنی فصاحت و بلاغت اور خوشامد کے ذریعے وہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی' جسے وہ چالاکی اور چالبازی کے ذریعے حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے اپنی سابقہ توجیہات کو دوہرانا شروع کر دیا کہ اسے شاہی القابات مجبوری اور اپنی مرضی کے خلاف اختیار کرنا پڑے' اس نے صرف سیاسی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے اور عوام میں سرکش طبقوں کی روک تھام کے لئے ایسا کیا تھا' لہٰذا اس نے عادل شاہ پر عنایات و مہربانیوں کے انبار لگا دیئے۔ وہ اس کے قریب گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تخت پر بٹھا دیا۔ عادل اپنے بھائی کے ظاہری خلوص کے دھوکے میں نہیں آیا' مگر وہ آسانی اور آزادی کا دلدادہ تھا' لہٰذا اس نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ تخت پر اس کی حالت غیر محفوظ ہو گی' فوراً نیچے اترا اور اپنی باری پر سلیم شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ اسے بادشاہ کے طور پر سلام کیا اور رسم کے مطابق مبارک باد دی۔ دربار کے امراء نے فوراً اس کی تقلید کی اور سلیم کو اطاعت پیش کرتے ہوئے تحائف اور نذرانے پیش کئے۔ عادل شاہ' بیانہ میں اپنی جاگیروں کی طرف لوٹ گیا۔

تاہم' سلیم اس سے مطمئن نہ ہوا۔ بمشکل دو ماہ گذرے ہوں گے کہ اس نے اعلیٰ رتبے کے ایک خواجہ سرا غازی محمی کو طلائی بیڑیوں کے ایک جوڑے کے ساتھ آگرہ روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ عادل شاہ کو گرفتار کر کے قیدی بنا کے اس کے دربار میں لائے۔ عادل شاہ کا ایک حامی خواص خاں میواتی' جس کی جدوجہد کے باعث دونوں بھائیوں کے درمیان گزشتہ تصفیہ ہوا تھا' سلیم کی طرف سے اس وعدہ خلافی کا سن کر ایک بہت بڑی فوج کے ہمراہ آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ عادل شاہ اور چند سردار اس کے ساتھ آ ملے' جنہوں نے اس شہزادے کی حفاظت کی یقین دہانی کرائی تھی۔

آگرہ کے سامنے (1545ء) ایک جنگ لڑی گئی' جس میں خواص خاں کی کوششوں کے باوجود سلیم کو فتح حاصل ہوئی۔ عادل شاہ میدان جنگ سے فرار ہو کر تیہ کی طرف بھاگ گیا اور اس کے بعد اس کے متعلق کبھی کچھ نہیں سنا گیا۔

جون' 1539ء میں شیر شاہ کے روانہ کئے گئے ایک فوجی دستہ کے ہاتھوں مونگھیر میں



شہنشاہ ہمایوں

شکست کے بعد' ہمایوں نے آگرہ کی طرف روانہ ہونے کی خاطر' ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ' کالپی کی طرف اپنی ہجرت جاری رکھی۔ اس کی فوج جس میں اس کے والد کے آزمودہ کار سپاہی بھی شامل تھے' زیادہ تر ماری گئی یا دریا میں غرق ہو کر تباہ ہو گئی۔ بادشاہ کی ملکہ جسے اس شہنشاہ نے آخری مرتبہ بچانے کی کوشش کی' افغانوں نے قیدی بنا لیا مگر شیر شاہ نے اس کے ساتھ انتہائی مہربانہ اور شفقت آمیز سلوک کیا اور اسے بحفاظت آگرہ بھجوا دیا۔ کچھ دیر بعد ہی ہمایوں آگرہ میں ملکہ سے آن ملا' لہٰذا وہاں تیاریاں کرنے کے بعد ایک بار پھر' اپریل 1540ء میں اپنے دشمن سے جنگ کرنے کے لئے آگرہ سے روانہ ہوا جو اب بنگال پر قابض تھا۔ اس وقت اس کی فوج کو کامران کے 3,000 جوانوں کی کمک پہنچی' جو خود لاہور کی طرف لوٹ آیا تھا۔ قنوج میں ہمایوں کی آخری شکست کے بارے میں پہلے درج کر دیا گیا ہے۔ (II) شکست خوردہ بادشاہ نے اپنی توجہ سندھ کی طرف کی' لیکن جب ملک کے اس حصہ میں از سرنو اپنی بالادستی قائم کرنے کے لئے اس کی کوششیں ناکام ہو گئیں تو وہ ایران کی طرف ہجرت کر گیا' جہاں صفوی بادشاہ' شاہ طہماسپ نے انتہائی شان و شوکت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ (1544ء) شاہ نے ہمایوں کو بحال کرنے کے لئے اپنے بیٹے کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی' اس نے کابل کو بازیاب کرا لیا (اپریل' 1547ء) اور جنوری' 1555ء میں دس سال کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان کو بازیاب کرانے کے لئے روانہ ہوا۔ سرہند کے مقام پر اس کی مڈبھیڑ سکندر شاہ سوری افغان کے ساتھ ہوئی' جس میں اس نے فیصلہ کن فتح حاصل کی' افغان ہمالیہ کے نیچے پہاڑوں کی طرف فرار ہو گئے۔ فتح نے ایک بار پھر سلطنت ہند کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور ایسی حکومت قائم کر دی جو اس قدر خوشحال اور دیرپا ثابت ہوئی کہ اس سے پہلے کوئی نہ ہو گی۔ فاتح کی ہراول فوج نے فوراً دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا (جولائی' 1555ء)

دہلی میں ہمایوں کے انتقال اور اس کے جانشین' نوجوان اکبر کے پنجاب میں جانے کے باعث' عدم موجودگی نے محمد شاہ عادل کے ہندو وزیر ہیمو کو اپنے آقا کے لئے دارالسلطنت کو بازیاب کرانے کی خاطر نیا حوصلہ بخشا۔ ہیمو' اصل میں ایک دوکاندار تھا' جو اپنی صلاحیتوں کے باعث' سلطنت میں سب سے اعلیٰ منصب پر جا پہنچا۔ اس وقت وہ 30,000 جوانوں اور 2,000 ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ آگرہ کے خلاف روانہ ہوا' جب وہ ایک دوست ملک میں سے گزرا تو اس کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ آگرہ کے منتظم مغل افسر نے مشکل ہی سے اس خوفناک حملے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کی تھی' لہٰذا اس نے دہلی کی طرف لوٹنا ہی مناسب سمجھا۔ ایک دوسرے مغل افسر زمان خاں نے 3000 گھڑسواروں کی فوج کے ساتھ' ہیمو کے ایک جرنیل' شادی خاں

کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی' مگر اسے شکست ہوئی اور اس کی تقریباً تمام فوج کاٹ کے رکھ دی گئی۔ ہیمو نے ایک مختصر سے محاصرہ کے بعد آگرہ پر قبضہ کرنے کے بعد اب دہلی پہ چڑھائی کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور اسکندر سوری کے دعویٰ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے' قدیم شہرت کے حامل راجہ بکرماجیت کا لقب اختیار کر لیا۔ پانی پت کی لڑائی (1556ء) میں مغلیہ فوج' بیرم خاں کی قیادت میں بتدریج تو شہرہ کے مقام پر جمع ہو گئی اور اس نے دہلی پر چڑھائی کر دی' ہیمو ایک کثیر فوج کے ساتھ پانی پت کے قدیم میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا' جس نے مہابھارت کے دور سے لے کر اب تک اکثر سلطنت کی قسمت کا فیصلہ کیا تھا۔ ہیمو کو شکست دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ فاتح بیرم خاں اور نوجوان اکبر نے اس لڑائی میں بہادری اور جوانمردی کے بہترین جوہر دکھائے۔ فتح کے بعد' ہمایوں کے ایک جرنیل سکندر ازبک کو آگرہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا گیا' لہٰذا' 1556ء میں بغیر کسی مزاحمت کے اس پر قبضہ کر لیا گیا۔

جدید آگرہ کی بنیاد: ہمایوں کے بیٹے اکبر نے جمنا کے مغربی کنارے پر جدید آگرہ کی بنیاد رکھی' اس نے پایہ تخت اس جگہ منتقل کر لیا تھا۔ پہلے پہل' بادشاہ کا ارادہ اپنا دارالحکومت آگرہ میں وہاں اپنے سب سے بڑے بیٹے سلیم کی پیدائش (بعد میں جہانگیر) کے اعزاز میں فتح پور سیکری میں تعمیر کرنے کا تھا' خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ شہزادہ ایک انتہائی برگزیدہ فقیر حضرت سلیم چشتیؒ کی دعاؤں کے زیر اثر پیدا ہوا' جو اس وقت وہاں رہائش پذیر تھے: نیز' قلعہ کی چار دیواری کے آثار ابھی تک وہاں موجود ہیں۔ یہ آگے وضاحت سے بیان کیا جائے گا کہ کس وجہ سے اس خیال کو ترک کیا گیا۔ کچھ لوگ موجودہ مقام پر دارالسلطنت کے قیام کو' ایک کشتی رانی کے قابل دریا کے علاوہ صحت افزاء آب و ہوا کے باعث' آگرہ کی برتری سے منسوب کرتے ہیں اور دیگر حضرات' اس کو صوفی بزرگ حضرت سلیم چشتیؒ کے حالات سے منسوب کرتے ہیں' جنہوں نے شہنشاہ اکبر کو بتایا کہ فقیر کی رہائش گاہ پر ایک دربار شاہی کی موجودگی' ان کی عبادت و ریاضت میں بری طرح مخل ہو گی اور یہ کہ بادشاہ' اسے کسی نہایت موزوں مقام پر منتقل کر لے اور فتح پور کو فقیر کی روحانی عبادت و ریاضت کے لئے چھوڑ دے۔

ابوالفضل کا بیان: ابوالفضل' ''اکبر نامہ'' میں اکبر کی طرف سے جدید آگرہ کی بنیاد رکھنے کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان پیش کرتا ہے: ''بادشاہ سلامت نے آگرہ کو سلطنت کا دارالسلطنت بنا دیا اور دور حکومت کے تیسرے سال' (1558ء) اپنی رہائش قلعہ میں اختیار کر لی جو پہلے بادل گڑھ کے نام سے مشہور تھا۔ انہوں نے اپنی سلطنت کے امراء کے قیام کے لئے مختلف



شهنشاه اکبر

کرے تفویض کئے' پس' محل کو دولت' مسرت و شادمانی اور خوشحالی کا گہوارہ بنا دیا۔ بادشاہ سلامت کی خصوصی و مہربان توجہ کے باعث شہر ایک مختصر عرصہ میں ہفت اقلیم کا زیور بن گیا۔ یہ ایسا شہر ہے' جس کی آب و ہوا صحت افزاء ہے' گرمی اور سردی اپنے اپنے موسموں میں معتدل ہوتی ہے' اس کی زمین' خراسان اور عراق کے درختوں اور پھلوں کی کاشت کے لئے سازگار ہے' دریائے جون (جمنا) (ہلکے پن اور ذائقہ کے سلسلہ میں جس کے پانی کا شاید ہی کوئی مقابلہ کر سکتا ہو) شہر کے درمیان میں بہتا ہے: اس کے اطراف میں سلطنت کے امراء اور ملازمین نے اتنی خوبصورت اور شاندار عمارات تعمیر کرائی ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ اپنی عالی شان عمارات اور دلکش مضافات کے ساتھ' یہ ایک بار پھر سلطنت کا دارالخلافہ بن گیا ہے۔ آگرہ کے دارالسلطنت میں بادشاہ کی رہائش مقرر کرنے کے خوش قسمت واقعہ کی نشاندہی گوالیار کی فتح سے ہوتی ہے' جو اس خوش گوار واقعہ کے کچھ ہی دیر بعد رونما ہوئی۔ اس وقت سے قلعہ کو دولت خانہ کہا جانے لگا۔"

دور حکومت کے پانچویں برس کے واقعات میں' جمنا کے کناروں پر نئی عمارات اور اس دارالسلطنت کو ترقی دینے اور اسے آراستہ و پیراستہ کرنے کے لئے اختیار کی گئی تدابیر کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اکبر کے اتالیق اور جرنیل بیرم خاں نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا' شاہی فوج نے اسے شکست دے دی۔ آگرہ شہر میں اس کے تمام مکانات بحق سرکار ضبط کر کے' منعم خان خانان قیم خاں کے حوالے کر دیئے گئے۔

ہندوستان کی سلطنت مغلیہ' جس کی بنیاد' ذہین بابر نے رکھی اور جواں ہمت ہمایوں نے اسے از سر نو قائم کیا' اکبر کے دور میں اگرچہ اپنی شان و شوکت کے عروج پر نہ سہی' تکمیل کو پہنچ گئی۔ اکبر کے انتقال کے ڈیڑھ صدی بعد تک یا آگرہ پر جاٹوں کے قبضہ تک سلطنت کا انتظام اس عظیم بادشاہ کے اپنے طویل اور خوشحال دور حکومت میں وضع کردہ انصاف اور رواداری کے اصولوں کے ذریعے کیا جاتا رہا۔ انگریز سب سے پہلے' بادشاہ کے انتقال سے پانچ برس قبل ہندوستان میں نمودار ہوئے اور 1600ء میں مشہور زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملکہ الزبتھ سے اپنا پہلا پروانہ حاصل کیا۔ پورس کے بعد وہ ہندوستان کے بادشاہوں میں پہلا شخص تھا' انگریز جس سے واقف ہوئے اور ہندوستان کا پہلا عظیم حکمران تھا' جس نے ان سے بالمشافہ ملاقات کی۔

اکبر' ملکہ الزبتھ کا ہمعصر تھا اور اس کے دور حکومت کا شمار ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی اہم ادوار میں ہوتا ہے' اکبر اور اشوک (جو اس سے آٹھ سو برس پہلے گذرا) کے درمیان مذہبی رجحانات اور رواداری' راہبوں کے قلع قمع' ماس اور گوشت سے پرہیز' علم و فضل کی حوصلہ

افزائی اور کسی بھی طبقے اور فرقے سے تعلق رکھنے والی رعایا کو امن و آشتی کی فراہمی کے معاملے میں ہم آہنگی انتہائی حیران کن ہے۔ آخر میں اشوک نے مہاتما بدھ میں پناہ حاصل کر لی جبکہ اکبر نے آخر میں اسلام کا کلمہ پڑھ لیا' "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔" (12)

اکبر' ہر روز سہ پہر کے وقت دیوان عام میں عام دربار منعقد کرتا' جو ایک کھلا دربار تھا' اس میں ایک تخت نصب کیا گیا تھا۔ تاہم' تخت پر بیٹھنے کا عادی نہیں تھا' بلکہ ایک چبوترے پر (جو دیوان عام میں ابھی تک محفوظ ہے) اس کے پاؤں کی طرف کھڑا ہو کر احکامات دیتا' جبکہ اس کے تمام وزراء اور امراء اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے۔

یورپی سیاحوں کی تصدیق کے مطابق' اکبر' انصاف برتنے میں خصوصی توجہ صرف کرتا تھا۔ وہ جس شہر میں رہائش پذیر ہوتا وہاں تمام مقدمات کی بذات خود سماعت کرتا تھا۔ "سزا پانے والا کوئی ایسا مجرم نہیں تھا' جس کا اسے علم نہ ہو۔" چوری اور ڈکیتی کی سزا' ہاتھ کاٹنا تھی' جبکہ قاتلوں' زانیوں اور راہزنوں کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ اس وقت تک پھانسی کے حکم پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا تھا' جب تک اکبر ذاتی طور پر اسے تین مرتبہ نہ دہراتا ہو۔ وہ اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے پان یا بظاہر نہار ہاضمہ دار گولیاں پیش کر کے زہر دے دیتا تھا' جنہیں وہ مختلف خانوں پر مشتمل ایک ڈبیہ میں اپنے پاس رکھتا تھا اور جب بادشاہ کسی کو پیشکش کرتا تو وہ اس سے انکار کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ (13)

شام کے وقت' غسلخانہ یا شاہی آرائش خانہ میں ایک نجی دربار منعقد کیا جاتا تھا' جس میں صوبہ جات کے صوبیداروں کی درخواستیں بادشاہ کو پڑھ کر سنائی جاتی تھیں' جو ان کے لئے احکامات جاری کرتا' اس کے علاوہ دیگر سرکاری کاموں کو نپٹایا جاتا تھا۔

مذہبی بحث مباحثوں اور تواریخ کو سننے کے دوران' اکبر ہمیشہ بارہ عالم فاضل افراد کے ہمراہ قالینوں پر بیٹھتا تھا۔

علاؤ الدین خلجی' ہندوستان کا وہ پہلا سلطان تھا' جس نے گجرات کے راجہ رائے کرن کی راجپوت ملکہ' ہندو شہزادی کوئلا دیوی سے شادی کی' (1306ء) راجہ کی زندگی میں ہی اسے قیدی بنا لیا گیا' لہٰذا اس نے اپنے حسن و جمال اور صلاحیتوں کے ذریعے علاؤ الدین کو اس قدر فریفتہ کر لیا کہ اسے اس کی الفت و توجہ کا بہت زیادہ حصہ حاصل ہو گیا۔ اس کی اسی قدر خوبصورت بیٹی

کی شادی بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے خضر خاں سے ہو گئی اور ان کا عشق و محبت' ہندوستان کے عظیم شاعر امیر خسرو کی مشہور و معروف فارسی نظم کا موضوع بن گیا۔ علاؤالدین خارجی خصوصیات کے سلسلہ میں اکبر سے بہت زیادہ مماثلت رکھتا تھا۔ اس کی طرح اس نے ایک ہندو شہزادی سے شادی کی۔ وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے علماء کی تجویز کردہ قرآن پاک کی بالادستی کو بالائے طاق رکھ دیا: اکبر نے بھی اسی طرح کیا۔ وہ پہلا مسلمان سلطان تھا' جس نے نئے مذہب کی بنیاد رکھی اور ایک پیغمبر بننے کی کوشش کی' اسی طرح اکبر نے بھی کیا۔ علاؤالدین کے معاملہ میں غالباً اس کی ہندو بیوی نے اس کے مذہبی ایمان کو درہم برہم کیا تھا' یہی معاملہ اکبر کے ساتھ بھی تھا۔ دونوں ان پڑھ اور جوشیلی طبیعت کے مالک تھے۔ اکبر نے دو راجپوت شہزادیوں سے شادی کی' پہلی راجہ بہاری مل کی بیٹی اور راجہ بھگوان داس کی بہن تھی اور اس کے بعد جودھ پور کی ایک شہزادی' جہانگیر کی والدہ جودھ بائی المعروف مریم زمانی تھی۔ تاہم' علاؤالدین اور اکبر کے درمیان یہی امتیاز ہے کہ اول الذکر نے جنگ اور ظلم و جبر کے نتیجہ میں راجپوت شہزادی سے شادی کی' اکبر نے مفاہمت اور دوستی کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کیا۔ دونوں میں مزید فرق یہ تھا کہ علاؤالدین ایک ظالم و جابر بادشاہ تھا' اس کے برعکس اکبر' فیاض' متحمل مزاج' صلح جو اور خوش اخلاق تھا۔ اکبر متعصب نہیں تھا اور اسے مذہبی جنون بہا کر نہیں لے گیا تھا۔ دونوں کے ادوار میں ہندوستان کی دولت میں اضافہ ہوا' جس کے باعث عیش و عشرت اور ترقیوں کی بہت سی اقسام کی راہ ہموار ہوئی۔

اکبر کو مذہبی اصلاح بہت عزیز تھی: مگر وہ کسی ہندو یا مسلمان سے اس کے مذہب کے باعث نفرت نہیں کرتا تھا۔ اس نے ہندوؤں کو اعلیٰ ترین سرکاری عہدوں پر فائز کیا تھا۔ اس کے دوست اور وزیر ٹوڈرمل نے اس کی اراضی کا جو بندوبست کیا تھا وہ اچھے مشاہدے اور انسانیت پر مبنی تھا۔ ہمعصر یورپیوں کی شہادت کے مطابق' وہ عادات میں سادہ' کفایت شعار' خود پر قابو رکھنے والا اور مفید فنون کا دلدادہ تھا۔ اکبر کی زندگی کا ایک علیحدہ خاکہ پیش کیا گیا ہے' لہٰذا' یہاں پر یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر بیان کر دیا جائے کہ اس کی ہنگامہ خیز زندگی کا خاتمہ کس طرح ہوا۔

ابوالفضل کے قتل سے اکبر کو بہت زیادہ اذیت پہنچی۔ اس کے انتقال سے وہ ایک بااعتماد مشیر اور ایک گہرے دوست سے محروم ہو گیا۔ (14) اسی دوران اسے دیگر آفات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اس کی والدہ حمیدہ بانو بیگم المعروف مریم مکانی کا انتقال ہو گیا۔ اس کا سگا بیٹا' شہزادہ دانیال' 1013ھ (1604ء) میں شراب نوشی کے باعث دکن میں فوت ہو گیا۔ سلیم کے اپنے بیٹے

خسرو سے حسد نے اول الذکر اور موخر الذکر کی والدہ (راجہ مان سنگھ کی بہن) کے درمیان جھگڑا پیدا کر دیا' جو اس قدر و گیر ہوئی کہ اس نے زہر کھا لیا' چنانچہ ' اکبر کے پہلے سے غمزدہ ذہن کو ایک اور دھچکے کا سامنا کرنا پڑا۔ بادشاہ کا اپنا انجام نزدیک آ رہا تھا۔ ولی عہد سلیم کی بغاوت نے اس کے آخری ایام کو تلخ بنا دیا تھا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان مفاہمت کرا دی گئی' لہٰذا' سلیم آگرہ کے دربار میں آیا اور اطاعت پیش کر دی۔ بادشاہ نے اسے شاہی جواہرات استعمال کرنے کا حق عطا کر دیا مگر اسے عارضی طور پر نظربند رکھا۔ اندرونی جھگڑوں نے بوڑھے بادشاہ کی صحت کو گھن لگا دیا تھا' لہٰذا' ستمبر' 1605ء میں اس کی حالت بہت زیادہ ابتر ہو گئی۔ اس کی بھوک بالکل ختم ہو کر رہ گئی اور وہ گزشتہ دس روز سے بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ شہزادہ خرم (بعد ازیں' شاہجہاں) جو اس وقت محض ایک لڑکا تھا' مستقل طور پر اپنے دادا کے بستر کے پاس رہتا تھا' جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا انجام ہونے والا ہے' تو بوڑھے بادشاہ نے اپنے درباری امراء کے علاوہ ولی عہد سلیم کو اپنے کمرہ میں بلوایا۔ جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو اس نے ان سب کی طرف بیچارگی سے دیکھا اور انھیں کہا کہ اگر اس نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہو تو وہ اسے معاف کر دے۔ اب سلیم اپنے والد کے قدموں پر گر پڑا اور زار و قطار رونے لگا۔ مہربان دل اکبر نے اس کی طرف شفقت و محبت سے دیکھتے ہوئے اپنی پسندیدہ تلوار کی طرف اشارہ کیا اور سلیم کو اشارے سے کہا کہ وہ اس اجتماع میں اسے باندھ لے۔ اپنی غشی سے سنبھلنے پر اس نے سلیم کو نصیحت کے چند الفاظ کہے۔ اس نے انتہائی زور دے کر کہا کہ وہ حرم کی خواتین کے آرام کا خیال رکھے اور اپنے پرانے دوستوں اور منحصرین کو کبھی فراموش نہ کرے۔ اس کے بعد اس نے بوڑے ملا کو اپنے پاس لانے کی اجازت دی' جو سلیم کا گہرا دوست تھا' اس کی موجودگی میں اس نے کلمہ پڑھا اور ایک بہترین مسلمان کی طرح فوت ہوا۔

یہ واقعہ' 13 اکتوبر' 1605ء کو اس کی تریسٹھ برس کی عمر میں اور اس کے دور حکومت کے 53 ویں برس' قلعہ آگرہ میں رونما ہوا۔

اکبر کی تجہیز و تکفین کی رسومات سادگی سے ادا کی گئیں۔ اسے آگرہ کے نزدیک سکندرا میں اپنے تعمیر کردہ انتہائی شاندار مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ (15) نعش کو ایک جنازے پر رکھا گیا تھا' سلیم اور اس کے تینوں بیٹے اسے قلعہ سے باہر لائے۔ نوجوان شہزادے شاہی گھرانے کے افسران کی مدد سے اسے سکندرا لے گئے۔ قبر پر سات روز تک سوگ منایا گیا۔ سوگ کے دوران ہر صبح اور شام کو غریبوں میں اشیائے خورد و نوش اور مٹھائی تقسیم کی جاتی تھی اور بیس قاریوں کو مقرر کیا گیا

تھا کہ وہ قبر پر بغیر کسی وقفہ کے ہر رات قرآن پاک کی تلاوت کریں۔ (16)

آگرہ میں اکبرؒ کے دور کی اہم عمارات میں' اسکندرا میں اس کا اپنا مقبرہ' قلعہ آگرہ' محلات اور فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ شامل ہیں۔

مرحوم بادشاہ کے سوگ کا عرصہ ختم ہونے پر' سلیم' قلعہ آگرہ کے مغربی دروازہ سے داخل ہوا' لہٰذا' اکتوبر' 1605ء میں اڑتیس برس کی عمر میں نورالدین جہانگیر کے پر شکوہ لقب کے تحت بطور شہنشاہ ہندوستان اس کی تاجپوشی کر دی گئی۔ فضا لوگوں کے نعرہ ہائے تحسین سے بھرپور تھی۔ مسرت و شادمانی کا ہر انداز میں مظاہرہ کیا گیا اور رنگ رلیاں و ہنسی خوشی روز کا معمول تھیں۔ شاہی نقارہ' چالیس روز تک بجایا گیا اور محل کو ہر رات ہزاروں روشنیوں سے روشن کیا جاتا تھا۔ انعام و اکرام انتہائی فیاضی سے تقسیم کئے گئے۔ راجگان' نوابین' امراء اور شرفاء نے نئے بادشاہ کے آگے سر جھکایا' اس واقعہ کی یادگار کے طور پر قلعہ کے دہلی دروازہ کے محافظ خانہ کے سنگ چینی کے حاشیہ پر ایک عبارت تراشی گئی' جہاں یہ ابھی تک دیکھی جا سکتی ہے' جس کا اختتام اس دعا سے ہوتا ہے "ہمارا بادشاہ جہانگیر' دنیا کا بادشاہ ہو' 1014ھ" نئے شہنشاہ نے اپنے احدی' زمانہ بیگ کو پندرہ سو کے منصب کے ساتھ مہابت خاں کا خطاب عنایت کیا اور اسے شاہی گھرانے کا خزانچی مقرر کیا۔ یہ نئے بادشاہ کے ساتھ اس وقت سے وابستہ تھا' جب بادشاہ ابھی ولی عہد تھا۔ اس کے بچپن کے ایک اور بااعتماد دوست اور ہم مکتب' شریف پسر خواجہ عبدالصمد کو پانچ ہزاری منصب کے ساتھ امیرالامراء کا خطاب دیا گیا۔ سلیم کو اس سے بہت زیادہ انس تھا' لہٰذا جب اس شہزادے نے الہ آباد میں اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی' تو اسے اس کے پاس مفاہمت کے لئے بھیجا گیا۔ شریف نے باپ اور بیٹے کے درمیان رخنہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا' شہزادے نے اس کے ساتھ یہ مبہم سا وعدہ کیا کہ تخت نشین ہونے پر وہ اسے اپنی نصف سلطنت دے دے گا۔ جب اکبر اور سلیم کے مابین مصالحت ہو گئی' تو شریف کو اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا مگر اکبر کے انتقال کی خبر سن کر وہ آگرہ لوٹ آیا اور نئے بادشاہ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی' اس نے اسے امیرالامراء کا خطاب دیا اور اسے شاہی مہر کا انتظام بھی سونپ دیا۔ ابوالفضل کے قاتل' نار سنگھ کو تین ہزاری منصب پر فائز کیا گیا۔ جہانگیر' ہر صبح مجمع کے سامنے جھروکہ میں درشن کراتا' جو اکبر کے دور کی طرح بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے نیچے جمع ہوتا تھا۔ وہ دربار اور غسلخانہ میں شرکت کرتا تھا۔ دوپہر کے وقت' معائنہ جات' کھیل تماشے اور جانوروں کی لڑائیاں ہوتی تھیں' جن میں بادشاہ شرکت کرتا۔ راتیں گہرے دوستوں کے ساتھ رنگ رلیوں اور عیش و نشاط میں گزاری جاتیں' اس انداز کے ساتھ زبردست تضاد تھا'



شہنشاہ جہانگیر

جس میں فلسفی اور بہترین خیالات کا حامل اکبر اپنی راتیں عالم فاضل حضرات کے ساتھ صبح سویرے تک باتیں کرتے ہوئے گزارتا تھا۔

آگرہ کے بارے میں جہانگیر کا بیان: جہانگیر اپنی تزک میں پرانے آگرہ اور اپنے والد اکبر کے ہاتھوں نئے شہر کی بنیاد کے بارے میں درج ذیل حال بیان کرتا ہے:۔ "آگرہ کا شمار ہندوستان کے انتہائی قدیم اور اہم شہروں میں ہوتا ہے۔ دریائے جمنا کے کنارے پر اس کا ایک پرانا قلعہ تھا' مگر میرے والد نے میری پیدائش سے قبل اسے مسمار کر کے اس کی جگہ پر سنگ سرخ کا ایک اتنا شاندار قلعہ تعمیر کروایا کہ جن لوگوں نے دنیا کا سفر کیا تھا' بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سفر کے دوران کسی جگہ بھی اس جیسا کوئی قلعہ نہیں دیکھا۔ اس کی تکمیل پندرہ یا سولہ برس میں ہوئی۔ یہ چار بڑے اور دو چھوٹے دروازوں پر مشتمل ہے اور اسے 35 لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا' جو ایران کے ایک لاکھ اور پندرہ ہزار تمن اور توران کے ایک کروڑ پانچ لاکھ خانیوں کے مساوی ہیں۔ شہر کی آبادی جمنا کے دونوں کناروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ مغربی حصہ' جو انتہائی گنجان آباد ہے' اس کا قطر سات کوس ہے' دو کوس طویل اور ایک کوس چوڑا ہے' مشرقی حصہ' قطر میں اڑھائی کوس' ایک کوس طویل اور آدھ کوس چوڑا ہے۔ عمارات اس قدر تعداد میں ہیں کہ عراق' خراسان اور ماوراالنہر میں ان سے ان کی جسامت کے کئی شہر بنائے جا سکتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے تین اور چار منزلہ مکانات تعمیر کرائے ہیں اور شہر کی آبادی اس قدر زیادہ ہے کہ کوئی شخص دقت کے بغیر کسی گلی میں سے نہیں گذر سکتا۔"

بادشاہ' افغان لودھی بادشاہوں کے دور سے قبل' اس کی تاریخ کے بارے میں اس طرح لکھتا ہے:۔ "افغان لودھیوں کے دور سے قبل آگرہ ایک بہت بڑا شہر تھا اور اس کا ایک قلعہ تھا۔ مسعود سعد سلمان' قلعہ آگرہ پر محمود بن ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی کے قبضہ کے موقع پر' اس شہزادے کی تعریف میں مرتب کردہ ایک نظم میں اس کے قدیم ہندو قلعہ کے بارے میں اس طرح لکھتا ہے:۔

حصار آگرہ پیدا شد از میانہ گرد بسان کوہ برو بارہ ہائے چون کہسار

"گرد و غبار کے درمیان' قلعہ آگرہ دور ہی سے نمایاں' منفرد اور عظیم دکھائی دیا' جس طرح پہاڑ سایہ دار چٹانوں کے ساتھ چھایا ہو' غروب ہوتا ہوا سورج مشکل ہی سے اس کا نقشہ کھینچ سکتا ہے"۔

پھلدار درخت: جہانگیر آگرہ میں اگنے والے غیر ملکی اور دیسی پھلوں اور پھولوں کے بارے میں لکھتا ہے:۔ "آگرہ اور اس کے مضافات میں بہترین قسم کے خربوزے' آم اور دیگر پھل

حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ دیسی پھلوں میں، میں آم کے مربہ کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں۔ بادشاہ سلامت، عرش آشیانی (اکبر) (17) کے دور میں، ولایت (کابل، ہرات وغیرہ) کے زیادہ تر پھل، جو ہندوستان میں نہیں ملتے تھے، انہیں درآمد کیا گیا اور مختلف قسم کے انگور، مثلاً صاحبی (سفید) حبشی (سیاہ) اور کشمشی (بھورا) کو مختلف شہروں میں کاشت کیا گیا۔ مثال کے طور پر لاہور کے بازاروں میں انگور کے موسم میں ہر قسم کا انگور کسی بھی مقدار میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دیگر پھلوں میں، ایک ذکر کئے جانے کے قابل ہے: اسے اناس کہا جاتا ہے اور اسے فرنگ کی بندرگاہوں سے درآمد کیا جاتا ہے۔ اس کی خوشبو شیریں اور ذائقہ بہت مزیدار ہوتا ہے اور آگرہ کے گلفشاں باغ میں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں اگایا جاتا ہے۔

پھول: خوشبودار پھولوں میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے پھول خوشبو کے معاملہ میں دنیا کے کسی بھی ملک کے پھولوں سے برتر ہیں۔ یہاں پر بہت سے ایسے پھول ہیں، کسی بھی جگہ جن کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ سب سے پہلے چمپا (18) کا ذکر کیا جا سکتا ہے یہ پھول شیریں خوشبو سے بھرپور اور بہت زیادہ دلکش ہے، شکل و صورت میں یہ زعفران کے پھول سے مماثلت رکھتا ہے مگر اس کا رنگ زردی مائل سفید ہے۔ پودا بہت بڑا، خوبصورت، پتوں سے لدا ہوا ہوتا ہے اور اس کی شاخیں سایہ دار ہوتی ہیں۔ پھولوں کے موسم میں پورے باغ میں شیریں خوشبو کے لئے ایک درخت ہی کافی ہوتا ہے۔ اس کے بعد کیوڑہ (19) کا پھول ہے، شکل میں اس کا پودا چھوٹا ہوتا ہے، اس کا عطر اتنا تیز اور متاثر کن ہوتا ہے کہ یہ کسی طرح بھی مشک عنبر سے کم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد رائی بیل (20) آتا ہے، جس کا رنگ برف کی طرح سفید ہوتا ہے اور اس کی خوشبو یاسمین کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے پتے متعدد تہوں میں ایک دوسرے کے اوپر تلے اگتے ہیں۔

اس کے علاوہ مولسری (21) کا پھول ہے، اس کا پودا بھی اچھی خاصی جسامت کا ہوتا ہے جس میں یکسانیت اور چھاؤں پائی جاتی ہے۔ اس کی خوشبو بہت بھلی ہوتی ہے۔

سیوتی (22) کیوڑہ کی ایک قسم ہے، فرق صرف یہ ہے کہ کیوڑہ کے پودے میں کانٹے ہوتے ہیں اور مولسری بغیر کانٹوں کے ہوتا ہے۔ یہ زردی مائل رنگت کا جبکہ کیوڑہ سفید ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا پھولوں میں سے چنبیلی (یاسمین) (ولایت کی سفید چنبیلی) سے وہ عطر نکالتے ہیں۔"

1608ء میں کیپٹن ہاکنیز نے انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کی طرف سے ایک خط کے ساتھ شہنشاہ جہانگیر سے ملاقات کی، حاکم گجرات مقرب خاں نے سورت کے مقام پر اس سے ملاقات

کی اور اسے بحفاظت آگرہ لے کر آیا۔ بادشاہ کو ہاکنیز سے ملنے کا بہت اشتیاق ہوا' جو انگریزی کمپنی کے مفاد کو تقویت دینے کے لئے آگرہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ جہانگیر نے اپنے دور حکومت کے اولین سال آگرہ میں بسر کئے۔ فادر کیٹرن کے مطابق' جہانگیر کے دور میں تمام فرنگیوں کو محل میں جانے کی عام اجازت تھی۔ بادشاہ ساری رات ان کے ساتھ شراب نوشی کرتا' حتیٰ کہ ماہ رمضان میں بھی۔

ہاکنیز (جو 11 - 1608ء کے دوران آگرہ میں تھا) کے مطابق' جہانگیر پینتالیس برس کی عمر کا ایک مضبوط جسم والا شخص تھا۔ کوریاٹ' جو غالباً 1615ء میں آگرہ میں تھا' کہتا ہے کہ وہ 53 برس کی عمر کا تھا۔ ہاکنیز نے جہانگیر کی روز مرہ زندگی کے بارے میں ایک دلچسپ حال بیان کیا ہے:۔

"صبح تڑکے کے وقت اپنا منہ مکہ مکرمہ کی طرف کر کے وہ گوہر آبدار' ہیرے' لعل' زمرد' عنبر کی لکڑی اور دیگر قیمتی پتھروں پر مشتمل تسبیح کے دانوں پر اللہ تعالیٰ کے مختلف نام دہراتا۔ اس کے بعد وہ مجمع کا خراج عقیدت وصول کرنے کے لئے جھروکہ میں نمودار ہوتا' جو ہر روز اس کے سامنے میدان میں جمع ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ دو گھنٹوں کے لئے سونے کے لئے چلا جاتا۔ بعد ازاں' حرم سرا کی خواتین کے ہمراہ کھانا کھاتا۔ دوپہر کے وقت وہ دوبارہ محل کے جھروکہ میں لوگوں کو اپنا درشن کراتا اور آدمیوں و جانوروں کے کھیل تماشے دیکھنے کی خاطر وہاں تین بجے تک بیٹھتا تھا۔" "آگرہ میں امراء (جنہیں بیماری بھی نہیں روک سکتی تھی) تین بجے دربار میں جمع ہو جاتے ہیں اور بادشاہ ایک عام دربار میں آتا ہے اور اپنے تخت پر بیٹھ جاتا ہے' ہر شخص اپنے رتبہ کے مطابق اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ وزیر اعظم سرخ جنگلے کے اندر اور باقی ماندہ اس کے بغیر۔ سرخ جنگلا اس مقام سے تین زینوں کی بلندی پر ہے' جہاں باقی لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ افسران لوگوں کو بٹھاتے ہیں۔ لوگوں کو ترتیب سے بٹھانے کے لئے دیگر افسران ہیں۔ بادشاہ کے بالکل سامنے درمیان میں ایک افسر اپنے جلاد کے ساتھ' اسی رتبہ کے دیگر چالیس افسران کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے' جن کے کاندھوں پر تمغے اور دوسروں کے ہاتھوں میں کوڑے ہوتے ہیں۔ یہاں پر بادشاہ ہر روز کچھ دیر تک شکایات سنتا ہے۔" "شام کے وقت بادشاہ غسلخانہ یا نجی کمرہ میں ہوتا' جہاں وزراء منتخب افسران اور امراء بادشاہ سے ملاقات کرتے اور سرکاری کام نپٹائے جاتے تھے۔ سرکاری کاتبین ہر وقت موجود رہتے' حتیٰ کہ بادشاہ سو جاتا اور وہ سب کچھ لکھ لیتے جو کچھ بادشاہ نے کیا ہوتا۔ سونے کی گھنٹیوں پر مشتمل ایک رسہ بادشاہ کے محل میں دو ستونوں سے بندھا ہوتا تھا اور اس کا سرا محل کے سامنے زمین پر لٹک رہا ہوتا تھا۔ ہر کوئی غریب شخص جسے انصاف درکار ہوتا' رسے کو ہلاتا اور بادشاہ گھنٹیوں کے بجنے کی آواز سن کر فوراً اسے بلواتا'

اس کی فریاد سنتا اور اس کو انصاف مہیا کرتا۔"

ہاکنز' غسلخانہ میں جہانگیر کے ساتھ شراب پیتا تھا۔ اس نے اپنے دشمن مقرب خاں کو روپیہ پیسہ بٹورنے اور بادشاہ کو مہیا کرنے کے لئے ایک ہندو لڑکی کو گرفتار کرنے کے الزام میں آگرہ بلوایا۔ اس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی' مگر مقرب نے افسران کو بہت بڑی رشوت دے دی' لہٰذا' اسے دوبارہ احتکام میں لے لیا گیا۔ اس نے ہاکنز سے بذات خود انتقام لیا۔ جہانگیر کو یہ باور کرا دیا گیا کہ اگر انگریزوں نے ایک مرتبہ ہندوستان میں قدم جما لیا تو یہ جلد ہی اس ملک کے مالک بن بیٹھیں گے۔ جہانگیر کو تشویش لاحق ہو گئی۔ لہٰذا اس نے انہیں ہندوستان میں تجارت کرنے سے منع کر دیا۔ ہاکنز اپنی آرمینیائی بیوی (جس سے اس نے آگرہ میں شادی کی تھی) کے ساتھ 1611ء میں اس شہر سے انگلستان کے لئے روانہ ہو گیا۔

جب سر ٹامس رو' بادشاہ جیمز اول کی جانب سے سفیر کی حیثیت سے 1615ء میں سورت پہنچے' تو جہانگیر آگرہ میں نہیں تھا۔ انہوں نے برہانپور سے سفر کر کے مانڈو اور اس کے بعد راجپوتانہ کے قدیم دارالسلطنت چتوڑ کا دورہ کیا اور بادشاہ سے اجمیر میں ملاقات کی' جسے بادشاہ نے اس وقت اپنا صدر مقام بنا لیا تھا۔ رو نے آگرہ یا دہلی کا دورہ نہیں کیا' مگر جہانگیر کے دربار کا ایک مفصل اور دیانتدارانہ حال بیان کیا ہے۔ انگلستان کے بادشاہ کی طرف سے تحائف' باجے' چاقوؤں' ایک کشیدہ کاری سے مزین رومال' ایک قیمتی تلوار اور ایک انگریزی پلنگ پر مشتمل تھے۔ سفیر کے پاس اپنے وفد میں ایک موسیقار بھی تھا' لہٰذا اسے باجا بجانے کا حکم دیا گیا۔ جہانگیر نے پلنگ اپنی چہیتی ملکہ نور محل کو دے دیا۔ انگریزی حاشیہ اتار لیا گیا اور پلنگ کو سنہری مخمل اور آرائشات سے مزین کر دیا گیا۔ جہانگیر نے رو سے کہا کہ اگر انگریز اسے جواہرات بھی دیتے تو کیا ہی اچھا تھا' اس کے لئے سفیر نے جواب دیا کہ جواہرات ہندوستان سے آئے تھے جہاں جہانگیر بادشاہ تھا' تو پھر انگریز اس کے اپنے جواہرات کس طرح واپس لا سکتے تھے؟ رو' مانڈو اور گجرات کی طرف جہانگیر کے ہمراہ گئے اور 1618ء کے اختتام پر اس سے رخصت ہوئے۔

جہانگیر پر نور محل کا اثر و رسوخ لامحدود تھا۔ اس نے بادشاہ اور سلطنت پر بیس برس تک حکومت کی۔ حکومت میں کوئی اہم عہدہ اس کی رضامندی کے بغیر پر نہیں کیا جاتا تھا' نہ ہی کسی بیرونی ملک یا ریاست کے ساتھ اس کی منظوری کے بغیر معاہدہ طے پاتا تھا۔ اس کے نام کا سکہ مضروب کرایا گیا' جس پر یہ عبارت درج تھی' "جب سے نور محل کا نام اس پر درج ہوا ہے' سونے کو نئی قدر و قیمت حاصل ہو گئی ہے"۔ اس کا والد وزیر بن گیا اور اس کے بھائی آصف خاں کو وزارت کے سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا گیا۔



نور محل

جہانگیر کا حرم سرا چھ ہزار عورتوں پر مشتمل تھا' جن میں کنیزیں' خادمائیں' خاتون سپاہی اور محافظ بھی شامل تھیں۔ وہاں پر' چینی' شامی' جارجیائی' ترکی' ایرانی' حبشی اور ہندو عورتیں موجود تھیں۔ قلعہ آگرہ میں جہانگیر کے محل میں آج تک درباروں' کمروں اور غلام گردشوں کی بے شمار بھول بھلیاں دیکھی جا سکتی ہیں' جن میں ان خاتون خدمتگاروں اور محافظوں کو ان ایوانوں کے انتہائی خوبصورتی سے رنگے اور تراشیدہ شاہانہ کمروں کی نگرانی کے لئے تعینات کیا جاتا تھا' جو کبھی کسی اعلیٰ منصب کی خاتون یا کسی سردار کی بیوی کا خوبصورت گھر ہوا کرتے تھے۔

ثمن برج: محل کا وہ حصہ جہاں' نور محل نے اپنی زندگی کا زیادہ تر عرصہ بسر کیا' ابھی تک قلعہ آگرہ میں موجود ہے۔ یہ ثمن برج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو بعد میں ہندوستان کے سابق وائسرائے لارڈ میو کے احکامات کے تحت مرمت کروایا گیا۔ اس پر ابھی تک نور محل کی فنکارانہ صلاحیتوں' مہارت اور بہترین مشاہدہ کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس کے نجی کمروں اور بالکونی کو قلعہ کی بلند دیواروں پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ نور محل نے ان کمروں میں' اپنے بہادر خاوند شیر افگن کے قتل کے بعد اور جہانگیر سے شادی کرنے سے قبل اپنی بیوگی کے تنہا دن گذارے' جہانگیر نے اسے چار برس تک نظر انداز کئے رکھا' حتیٰ کہ اسے دیکھنے سے بھی انکار کر دیا' یہاں پہ اس کے عاشق بادشاہ نے (جو کبھی اس سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا) اسے یکسر فراموش کر دیا۔ مگر اس کی سابقہ سرپرست' جہانگیر کی والدہ' مہربان دل مریم زمانی (جودھ پور کی شہزادی) نے انتہائی مہربانی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ نور محل نے ان کمروں کو غیر معمولی شان و شوکت اور عظمت سے آراستہ کر دیا۔ تمام نمونے اس کے اپنے تھے اور مہارت' اس کی ذاتی ہدایت کے تحت' اس کی کنیزوں کے ہاتھوں کی تھی۔ حرم کی جملہ خواتین' زیورات اور ریشم کی گلکاری کے سلسلہ میں اس سے مشورہ کرتی تھیں اور اس نے محل میں انتہائی جدید انداز اور فیشن کو متعارف کروایا تھا۔ حرم سرا اس کی خوبصورتی اور صلاحیتوں سے گونج اٹھا تھا۔ ان کمروں میں اتفاق سے جہانگیر نے ایک صبح اسے سفید ململ کے سادہ لباس میں دیکھ لیا' تو اس کے لئے اس کا عشق دوبارہ جاگ اٹھا۔ اس نے فوراً اس کی گردن میں چالیس موتیوں کی ایک مالا ڈال دی' جسے وہ خود پہنا کرتا تھا' ہر موتی کی قیمت' 4000 سٹرلنگ پونڈ تھی' یوں نور محل کو شاہی کمروں میں منتقل کر دیا گیا اور وہ اس کی چہیتی ملکہ بنا دی گئی۔

جہانگیر نے امن کے ساتھ حکومت کی' مگر 1623ء میں اس امن و امان کو آگرہ میں اس کے بیٹے شاہجہاں کی بغاوت نے درہم برہم کر دیا۔ شہزادہ اپنی فوج کے ہمراہ مانڈو سے آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔ جہانگیر نے وہاں شاہجہاں کے پہنچنے سے قبل شاہی خزانہ کو منتقل کرنے کے لئے

آصف خاں کو آگرہ روانہ کیا۔ شاہجہاں نے آگرہ شہر پر قبضہ کر کے لوٹ مار مچا دی' مگر شاہی خزانے پر مشتمل قلعہ پر قبضہ کرنے میں اسے ناکامی ہوئی۔ روم کے ایک معزز اطالوی باشندے' ڈیلا ویلی (23) کے پیش کردہ کوائف کے مطابق' (جس نے انھیں سورت میں آگرہ سے موصول ہونے والے خطوط کی سند پر تحریر کیا ہے) شاہجہاں اور اس کے سپاہیوں نے اس موقع پر انتہائی خوفناک بربریت کا مظاہرہ کیا۔ آگرہ کے شہریوں پر تشدد کر کے انھیں اپنے جمع شدہ خزانوں سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا گیا اور متعدد بہترین خواتین سے زیادتی کی گئی اور ان کی عصمت دری کی گئی۔ (24)

جملہ یورپین سیاح جنھوں نے جہانگیر کے دور میں آگرہ کا دورہ کیا' نے انتہائی شاندار انداز میں اس کی دولت اور شان و شوکت کے بارے میں لکھا ہے۔ ساتویں صدی کے آغاز میں کاٹنبیکے اس کے بارے میں سر تھامس سمتھ کو لکھتے ہوئے کچھ یوں کہتا ہے' "مکمل طور پر پتھر سے تعمیر کردہ ایک عظیم اور پر شکوہ شہر' جس میں زبردست تجارت و کاروبار ہے' پورا شہر اس دور کے لندن کے مقابلہ میں بھی زیادہ دلکش ہے۔" فنچ اس کے امراء اور شرفاء کی شان و شوکت کو دیکھتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ وہ اپنی داشتاؤں کو ایک مرتبہ پہنے ہوئے کپڑے دوبارہ نہیں پہننے دیتے تھے' مگر یہ کہ انھیں زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا کہ وہ مزید استعمال کے لئے مناسب نہیں سمجھے جاتے تھے' آگرہ کے متعدد امراء اس قدر امیر کبیر تھے کہ ہر ایک کے پاس ملازمت میں ایک ہزار مشعلچی تھے۔ ایڈورڈ ٹیری اور تھامس کوریاٹ میں سے ہر ایک آگرہ کو ایک پر شکوہ شہر' مغل اعظم کے دارالسلطنت کے شایان شان بتاتا ہے۔

ایڈورڈ ٹیری' جو سر تھامس رو کی سفارت کے ہمراہ بطور پادری آیا تھا' آگرہ کا شمار مغلوں کے تحت 37 بڑے صوبہ جات میں کرتا ہے' جسے اس سیاح نے اپنی کتاب کے باب دوئم میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ آگرہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔ "آگرہ ایک اہم اور بہت امیر صوبہ ہے' یہ اہم شہر' عظیم بادشاہ کا دارالسلطنت' شمال میں عرضاً 28 درجے اور نصف ہے۔ دریائے جمنا کے ذریعے اسے خوب اچھی طرح پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ اور لاہور' اس سلطنت کے دو اہم اور منتخب شہر ہیں' جن کے درمیان' چار سو میل لمبی سڑک ہے (جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں)' اس کے دونوں جانب بڑے بڑے سایہ دار درخت ہیں۔ سیاحوں نے اسے دیکھا' انھوں نے اس ٹھنڈے سائے کے آرام و سکون کو اس پوری دنیا کے انتہائی نایاب اور مفید کاموں میں سے ایک پایا۔" (25)

تھامس ہربرٹ' جس نے جہانگیر کے دور میں آگرے کی سیاحت کی' اسے لندن کی طرح طویل اور تنگ گلیوں کے ہمراہ نیم دائرہ شکل کا بتاتا ہے۔ ذکر کیا گیا ہے کہ اکبر نے احمد آباد سے فتح یاب واپسی کے بعد' مسمار کیے جانے والے پرانے قلعہ کی جگہ پر جدید قلعہ کی تعمیر کا آغاز کیا۔ وہ آگرہ کو ایک گنجان آباد اور خوشحال شہر بتاتا ہے۔ گجرات سے واپسی پر جہانگیر نے اجین کا دورہ کیا اور اس کے بعد وہ آگرہ آگیا' جہاں اپنے دوسرے بیٹے پرویز کی مداخلت کے ذریعے اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو کے ساتھ مصالحت کر لی۔ کچھ گھومنے پھرنے کے بعد وہ لاہور روانہ ہوا اور وہاں سے 1627 کے گرم مہینوں میں کشمیر چلا گیا' دمہ کے باعث وہ واپس آنے پر مجبور ہو گیا' مگر موت نے 12 اکتوبر 1627ء کو اسے راستے میں راجوڑی کے مقام پر آلیا۔ اس کے جسد خاکی کو لاہور لایا گیا اور اس کی وصیت کے مطابق اسے دریائے راوی کے کنارے نور محل کے باغ میں دفن کیا گیا۔

جہانگیر کے دور میں آگرہ میں تقریباً ساٹھ عیسائی تھے۔ رو' کے مطابق' بادشاہ کچھ کچھ اطالوی زبان جانتا تھا' کیونکہ جب شہزادے اور عیسائیوں کے مابین کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی' تو اسے بھرے دربار میں خرم (شاہجہاں) کو "مائیو فیگلو' مائیو فیگلو" پکارتے سنا گیا۔ آگرہ کے پروٹسٹنٹ قبرستان میں ابھی تک ان درجنوں یورپیوں کی قبریں موجود ہیں' جنہوں نے لازماً اس وقت ہندوستان کا دورہ کیا ہو گا۔

جہانگیر کے دور کی اہم عمارات میں' سکندرا میں مقبرے کا ایک حصہ' آگرہ کے محل میں جہانگیری محل اور اعتمادالدولہ کا مقبرہ شامل ہیں ان سب میں ہندوؤں کا اثر و رسوخ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے محلہ چھیپی ٹولا میں علی وردی خاں کا حمام اور کشمیری بازار میں معتمد خاں کی مسجد' جہانگیر کے محل کے امیر خواجہ سرا بلند خاں کے نام سے مشہور مینار اور باغ بھی ہے۔

جہانگیر کے آخری سانس کے ساتھ ہی نور محل کا اختیار ختم ہو گیا۔ اس وقت دربار دو دھڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ نورجہاں اپنے داماد' مرحوم بادشاہ کے چوتھے بیٹے شہریار کی جانشینی کی حمایت میں تھی۔ اس کا بھائی آصف خاں اپنے داماد شاہجہاں کی جانشینی کا آرزو مند تھا۔ جہانگیر کے سب سے بڑے بیٹے خسرو کو اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرنے کی پاداش میں سزا کے طور پر اندھا کر دیا گیا۔ مگر جہانگیر اپنے بیٹے سے محبت و شفقت کے باعث ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھتا تھا۔ شاہجہاں' جس کے سلطنت کے متعلق اپنے گہرے منصوبہ جات تھے اس نے جہانگیر کو اس بناء پر نابینا شہزادے کو اپنے ساتھ دکن لے جانے کی اجازت دینے پر آمادہ کیا کہ ایسے بیٹے کو اپنے

پاس رکھنا ظلم ہے' جسے اس کی آنکھوں کے سامنے بصارت سے محروم کر دیا گیا ہو۔ جیسے ہی بیچارہ شہزادہ اس کے اختیار میں آیا' شاہجہاں نے خفیہ طور پر اسے ہلاک کرنے کے ذرائع ڈھونڈ لئے۔

جیسے ہی دربار میں جہانگیر کے انتقال کی خبر پہنچی' تو آصف خاں نے دہلی میں خسرو کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ داور بخش المعروف بولاکی اور تخت کے جائز وارث کو جو ابھی نوجوان تھا' تخت پر بٹھانے کے لئے فوری اقدامات کئے۔ تاہم' حکمت عملی کے تحت ایسا ان امراء اور شرفاء کو مطمئن کرنے کے لئے کیا گیا' جنہیں' بدقسمت خسرو کے قتل سے بہت زیادہ اذیت پہنچی تھی اور جو جائز وارث کی حیثیت سے مرحوم کے سب سے بڑے بیٹے کو تخت پہ دیکھنا چاہتے تھے: نیز' اس کے علاوہ شاہجہان کو وقت فراہم کرنے کے لئے بھی ایسا کیا گیا جو اس وقت دکن میں تھا۔ دریں اثناء شہریار نے لاہور میں شاہی اختیارات حاصل کر لئے تھے' آصف خاں بولاکی کو کامیابی سے لاہور لے گیا' جہاں شہریار کو قیدی بنا کر بصارت سے محروم کر دیا گیا۔ بعد ازاں' نوجوان بادشاہ کو آگرہ لایا گیا' جہاں اس نے شاہی اختیارات حاصل کر کے آصف خاں کو اپنا وزیر بنا لیا۔ اب آصف خاں کو فوج اور سلطنت دونوں کا مکمل اختیار حاصل تھا۔ اس وقت وہ بے شمار افسران اور امراء کو اپنے ساتھ ملا کر شاہجہاں کے مفادات کی راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تاہم' اپنے اس منصوبہ کو چھپانے اور نوجوان بادشاہ (جو گرچہ ناتجربہ کار تھا مگر اس میں ذہانت کی کمی نہیں تھی) کے شکوک و شبہات کو دبانے کی خاطر' آگرہ میں یہ اعلان کرا دیا گیا کہ شاہجہاں زبردست بیمار ہے۔ اس کے بعد یہ مشتہر کرا دیا گیا کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ نوجوان بادشاہ سے' شاہجہاں کی وصیت کے مطابق' اسے سکندرا میں اکبر کے مقبرہ میں دفن کرنے کی درخواست کی گئی۔ بولاکی نے اپنے حریف کی موت کی خبر سن کر بہت زیادہ خوشی محسوس کرتے ہوئے وزیر کی تجویز کی منظوری دے دی۔ ایک خالی جنازے کے پیچھے ایک ماتمی جلوس انتہائی دکھ کے ساتھ آگرہ سے اکبر کے مقبرہ کی طرف روانہ ہوا۔ زندہ مردہ (شاہجہاں) بذات خود بھیس بدل کر پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ آصف خاں نے نوجوان بادشاہ پر زور دیا کہ آداب مجلس کا یہ تقاضا ہے کہ جب مرحوم شہزادے کی نعش شہر سے ایک یا دو فرلانگ کے فاصلے پر آ جائے تو بادشاہ کو اس کے احترام میں آگرہ سے باہر جانا چاہئے' کیونکہ وہ بالآخر اس کے والد کا بھائی تھا۔ چنانچہ' اس مشورہ پر عمل پیرا ہو کر وہ ایک مختصر سے حفاظتی دستے کے ہمراہ نعش کا استقبال کرنے کے لئے باہر روانہ ہوا۔ راجپوتوں کے دستے جنازہ کے پیچھے آ رہے تھے' لہٰذا شاہجہاں آہستگی سے اس کے قریب پہنچ کر خفیہ طور پر اس میں داخل ہو گیا' اس کے سانس لینے کے لئے اس میں ایک سوراخ کافی تھا۔ ازاں بعد' جنازے کو ایک خیمہ میں لے جایا گیا' جہاں پر وہ تمام اہم سردار' جو آصف خاں کے



شہنشاہ شاہجہاں

ساتھ ملے ہوئے تھے' مردہ شہزادے کو جیسے خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ٹیورنیئر کہتا ہے کہ "اس لمحہ آصف خاں نے دیکھا کہ اس کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آن پہنچا ہے' تو اس نے پوری فوج کی آنکھوں کے سامنے جنازے کے تابوت کو کھول دیا' تمام جرنیلوں اور افسروں نے شاہجہاں کو بطور بادشاہ سلامی پیش کی۔" نوجوان بادشاہ' جو ابھی تک راستے میں تھا' جب اس نے دیکھا کہ تقریباً بھی امیر اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں تو وہ وہاں سے فرار ہو کر لاہور آ گیا۔

فوراً بگل بجائے جانے لگے' چنانچہ' ایک پر جوش ہجوم کے نعروں میں شاہجہان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا وہ شاہانہ انداز میں قلعہ آگرہ میں داخل ہوا اور اسی لمحہ اس کے مبارک دور حکومت کا آغاز ہو گیا۔ پس' تھامس ہربرٹ نے اپنے سفرنامہ میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے:۔ وہ انتہائی دھوم دھام اور شان و شوکت کے ساتھ آگرہ میں داخل ہوا اور فوراً اپنی تاجپوشی کے احکامات دیئے' چنانچہ' اس کی سلطنت کے امراء اور شرفاء کے ایک اجتماع میں یہ رسم ادا کر دی گئی۔ اس کے بعد ایک باضابطہ اعلان کے ذریعے اس نے سلطان شہاب الدین محمد کا نام اختیار کیا۔

شاہجہاں نے تخت نشین ہونے پر' ان پرتگیزیوں سے انتقام لیا' جنہوں نے اس وقت اسے مدد فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا' جب اس نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور جو پرویز کی فوج میں شامل ہو کر اس کے خلاف لڑے تھے۔ ان میں سے پانچ یا چھ سو کو قیدی بنا کر آگرہ روانہ کر دیا گیا۔ بعض کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا؛ دوسروں کو موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔

خاں جہاں لودھی' جسے شہنشاہ جہانگیر نے دکن میں اعلیٰ کمان سونپی تھی' نے مالوہ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ شاہجہاں کے تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اطاعت کر لی' لہٰذا اسے دربار میں مدعو کیا گیا' جہاں اس کا خوب خیر مقدم کیا گیا۔ تاہم' کسی وجہ سے اس کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا' تو اس نے ایک رات اندھیرا پھیلتے ہی اپنی فوج کو جمع کیا اور اپنی خواتین کو ہاتھیوں پر سوار کرا کے درمیان میں رکھ کے اپنے بارہ بیٹوں کے ہمراہ نقارے بجاتے ہوئے اور اپنے 2,000 آزمودہ کار افغانوں کی حفاظت میں اچانک آگرہ کو چھوڑ دیا۔ وہ دکن کی طرف روانہ ہوا' جہاں بادشاہ نے بذات خود پیش قدمی کی تھی۔ متعدد جھڑپوں کے بعد خان جہاں کو دکن سے بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا' مگر ایک راجپوت نے بندیل کھنڈ میں اسے نیزہ مار کر ہلاک کر دیا۔ (1630ء) اس مہم میں بادشاہ اپنی چہیتی بیوی ارجمند بانو (جو نورجہاں کی بھتیجی تھی) سے ہاتھ دھو

بیٹھا' وہ 1629ء کے اختتام پر برہانپور میں انتقال کر گئی۔ دکن میں جنگ جاری رہی اور بادشاہ دکن میں مہابت خان کو اعلیٰ کمان سونپ کر 1632ء میں آگرہ لوٹ آیا۔ کچھ وقت تک محل میں زبردست اصلاحات کی گئیں اور اب شاہجہاں نے جمنا کے کنارے پر اپنی مرحومہ بیوی کے مقبرہ کی تعمیر کا آغاز کر دیا' جسے مشرقی دنیا کا عجوبہ بننا تھا۔ 1639ء میں شاہجہاں نے نئی دہلی کی بنیاد رکھی' جسے اس نے شاہ جہان آباد کا نام دیا اور دارالسلطنت وہاں منتقل کر لیا۔

1657ء میں بادشاہ کو ایک خطرناک بیماری نے آلیا۔ لہٰذا اس کے سب سے بڑے بیٹے دارا شکوہ کو عارضی طور پر حکومت کا انتظام سونپ دیا گیا۔ دارا شکوہ ایک بلند حوصلہ' فیاض شہزادہ تھا' جس کے مذہبی خیالات' اکبر کی طرح وسیع اور آزاد تھے۔ اورنگزیب کو جب اپنی بمن روشن آراء کے ذریعے اپنے والد کی بیماری کی اطلاع ملی' تو وہ بیجاپور کے بادشاہ عادل شاہ کے ساتھ فوری معاہدہ کرنے اور اپنے دوسرے بیٹے سلطان معظم کو دکن کے انتظامات سپرد کرنے کے بعد دکن سے روانہ ہوا۔ بادشاہ کے دونوں بیٹوں' شجاع حاکم بنگال اور مراد حاکم گجرات نے اپنے اپنے صوبوں میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اپنی فوجوں کو دارالسلطنت کی طرف روانہ کیا۔ اورنگزیب' مراد کے ساتھ شامل ہونے کے لئے روانہ ہوا۔ دارا اپنے بھائیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آگرہ سے روانہ ہوا' لہٰذا جون 1658ء کے آغاز میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا آگرہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر سماگڑھ کے مقام پر ہوا' دارا کو مکمل طور پر شکست ہو گئی اور وہ دہلی کی طرف فرار ہو گیا۔

لڑائی کے تین روز بعد اورنگزیب آگرہ کی طرف روانہ ہوا اور فصیل کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا اور یکدم شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس نے محل کے اندرونی معاملات میں کسی طرح بھی مداخلت نہیں کی' اس کا مقصد بوڑھے بادشاہ کو گرفتار کرنے کے لئے مناسب موقع تلاش کرنا تھا۔ دریں اثناء اس نے جھوٹ موٹ یہ افواہ پھیلا دی کہ شاہ جہاں کا انتقال ہو گیا ہے' یوں اس نے قلعہ میں داخل ہونے کے لئے جھوٹ موٹ کا بہانہ تراش لیا۔ دوسری جانب شاہجہاں نے یہ باور کرانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا کہ وہ زندہ ہے۔ اپنے بیٹے کے رویہ پر آگ بگولا ہو کر بوڑھے بادشاہ نے میر حاجب (ڈیوڑھی والا) کو بلوایا اور اسے کہا کہ وہ اورنگزیب کو یہ باور کرا دے کہ اس کا باپ زندہ ہے اور یہ کہ دارالسلطنت میں اپنے قیام کو طویل کرنے کے لئے اس کے پاس اب کوئی بہانہ نہیں رہا' اس لئے اسے چاہئے کہ وہ فوراً دکن کی جانب اپنی سلطنت کی طرف لوٹ جائے' اس صورت میں جو کچھ ہوا ہے اسے فراموش کر دیا جائے گا۔ اورنگزیب' جو اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا' نے فاضل خاں کے بیان پر یقین نہ کرنے کا بہانہ کیا اور

جواب دیا کہ اسے پورا یقین ہو چکا ہے کہ وہ یتیم ہو چکا ہے اور یہ کہ اسی بناء پر اس نے تخت کے لئے لڑائی کی ہے' یہ سوچتے ہوئے کہ اپنے بھائیوں کی طرح اس کا بھی حق ہے: اس نے زور دیا کہ اگر بادشاہ زندہ ہے تو بہت اچھا ہے وہ اس کا فرض شناس بیٹا ہے اور ہمیشہ ایک ادنیٰ خادم کی طرح اس کے احکامات کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہے' مگر اس کو اگر یہ یقین دلا دیا جائے کہ وہ زندہ ہے' تو وہ اس بات کا آرزو مند ہے کہ اس کو دیکھے اور اس کے پاؤں کو بوسہ دے' اس کے بعد وہ دکن میں اپنی سلطنت کی طرف لوٹ جائے گا اور شاہی احکامات پر پوری طرح عمل پیرا ہو گا۔

فاضل خاں نے یہ جواب بادشاہ تک پہنچا دیا' تو بادشاہ نے فوراً اپنی مجوزہ ملاقات کی منظوری کا اظہار کر دیا۔ مگر اورنگزیب جو اپنے باپ سے زیادہ ہوشیار اور مکار تھا' نے فاضل خاں کو یہ باور کرا دیا کہ وہ اس وقت تک قلعہ میں داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا' جب تک اس میں موجود حفاظتی فوج کو مکمل طور پر ہٹا نہیں لیا جاتا۔ شاہجہاں نے اس مطالبے کی معقولیت کو دیکھتے ہوئے قلعہ کی فوج کو ہٹانے کا حکم دے دیا' چنانچہ حفاظتی فوج نے قلعہ خالی کر دیا۔ روشن آراء بیگم نے حرم سے اورنگزیب کو ایک پیغام بھیج کر اسے مسلح تاتاری عورتوں کی موجودگی سے خبردار کیا کہ اگر وہ قلعہ میں ایک مضبوط حفاظتی دستہ کے بغیر داخل ہوا تو وہ اسے گرفتار کر کے قتل کر دیں گی۔ اورنگزیب تدبیر پر تدبیر اختیار کرتا گیا۔ وہ اپنے باپ سے ملاقات کو روز بروز مختلف حیلے بہانوں سے ٹالتا رہا' ایک مرتبہ یہ دلیل پیش کرتا کہ وہ ملاقات کے لئے کسی مبارک گھڑی کا انتظار کر رہا ہے اور دوسری مرتبہ یہ کہ اسے اہم سرکاری کام سرانجام دینے ہیں۔ اس اثناء میں اورنگزیب نے امراء اور اعلیٰ افسران کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے سلطان محمود نے اپنے باپ کے احکامات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے محل کا محاصرہ کر لیا۔ شاہ جہاں نے اپنے محل کے میناروں سے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ اس نے فصیلوں پر توپیں نصب کرا دیں' مگر اس سے محاصرین پر کوئی اثر مرتب نہ ہوا۔ اورنگزیب نے اب ایک اور چال چلنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے بااعتماد خوجہ سرا کو ایک پیغام دے کر شاہجہاں کے پاس بھیجا کہ اس کی فوج نے اس کے احکامات کے بغیر قلعہ پر حملہ کر دیا ہے' چنانچہ' اس کے بھتیجے محمود کو اطاعت پیش کرنے اور معافی کی درخواست کرنے کے لئے بھیجنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے: اس کے علاوہ اس نے کہلوا بھیجا کہ جیسے ہی ان کی صحت میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے وہ بذات خود اپنے والدین کے پاس حاضری دے گا۔

شاہ جہاں نے اپنے پوتے کا استقبال کرنے کی اجازت دے دی۔ محمود نے حفاظتی فوج کے

سپاہیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور قلعہ میں داخل ہو کر بغیر کسی دشواری کے محل پر قبضہ کر لیا۔ راستے میں آنے والے سپاہیوں' محافظوں' غلاموں' خوجہ سراؤں' خواتین کو قتل کرتے ہوئے وہ سپاہیوں کی ایک مضبوط فوج کے ساتھ محل کے اندر داخل ہوتا چلا گیا۔ وہ شاہجہاں کے ایوان شاہی میں داخل ہو گیا۔ بوڑھے بادشاہ کے گرد کھڑی ہوئی تاتاری عورتیں مجسموں کی طرح بے حس و حرکت رہیں۔ اس کے بعد محمود نے خود شاہجہاں سے مخاطب ہو کر کہا' "حضور والا! آپ کے بڑھاپے نے آپ کو حکومت کرنے کا اہل نہیں چھوڑا۔ اپنی بیویوں کے ہمراہ پائیں محل میں چلے جائیں اور باقی ماندہ زندگی امن کے ساتھ بسر کیجئے۔ ہم آپ سے کسی قسم کا انتقام نہیں لیں گے' مگر آپ نے تخت کو بے عزت کر دیا ہے: آپ اسے اپنے بچوں کے حوالے کر دیں۔"

(26)

اس مطالبے پر محافظ تاتاری عورتوں نے زبردست نعرہ بلند کیا: مگر محمود ان کے برابر تھا' لہٰذا شاہجہاں نے حالات کے مطابق ہار مان لی اور اپنی بیویوں کے ہمراہ اندرونی کمروں میں چلا گیا اور ایک قیدی بن گیا۔ شاہجہاں نے محمود کو دوسری مرتبہ پاس بلا کے اسے اس شرط پر تاج اور آگرہ کے قبضہ کی پیش کش کی کہ وہ اپنے باپ کی وفاداری چھوڑ دے' جس نے اپنے سگے باپ کو معزول کر دیا ہے' اس لئے اس بات کا امکان بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی چھوڑے گا۔ محمود نے کچھ دیر کے لئے اس معاملہ پر غور کیا' مگر اس نے اس ترغیب کی مخالفت کرتے ہوئے بادشاہ سے محل کی چابیاں حاصل کر لیں۔ تب اس کے ساتھ ہی اورنگزیب آگرہ اور قلعہ کا مالک بن گیا۔ بادشاہوں کی تبدیلی سے آگرہ کا امن و امان خراب نہیں ہوا۔ شائستہ خاں کو اس مقام کا نیا حاکم مقرر کیا گیا۔

شاہجہاں نے اپنے بیٹے کے رویہ سے آگ بگولا ہو کر فرار ہونے کی کوشش کی' اس نے اپنے راستے میں آنے والے چند محافظوں کو قتل کر دیا۔ اس بات پر اورنگزیب اسے قید سخت میں رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ دروازوں اور راستوں میں اینٹوں سے چنائی کرا دی گئی اور سابق بادشاہ کے کمرہ پر سخت پہرہ بٹھا دیا گیا۔ سیاح ٹیورنیئر لکھتا ہے' "یہ انتہائی حیران کن امر ہے کہ شہنشاہ کے کسی خادم نے بھی اسے اپنی مدد کی پیش کش نہیں کی' اس کی پوری رعایا اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور یہ کہ انہوں نے اورنگزیب کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے چڑھتے سورج کی طرف نگاہیں موڑ لیں: شاہجہاں اگرچہ زندہ تھا' مگر وہ اسے اپنے ذہن سے نکال چکے تھے۔ اگر اتفاق سے وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے اس کی بدقسمتی پر دکھ محسوس کیا بھی' تو خوف نے انہیں خاموش کر دیا اور انہیں اس بادشاہ کو یکسر طور پر چھوڑنے پر مجبور کر دیا' جس نے ان پر ایک باپ کی طرح

انتہائی شفقت و محبت سے حکومت کی' جس کی مثال بادشاہوں میں نہیں ملتی۔ حالانکہ وہ ان امراء کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتا تھا' جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہتے تھے۔ اس نے عوام کے آرام و سکون کے لئے تمام چیزوں کا انتظام کر رکھا تھا کیونکہ وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے' مگر انہوں نے اس بحران میں کسی قسم کا اظہار نہیں کیا۔"

سیاح برنیئر جو اس وقت (1658ء) آگرہ میں تھا' نے بھی اسی قسم کی حیرانگی کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :——— "در حقیقت' میں بڑی مشکل سے اپنی اس خفگی کا اظہار کر سکتا ہوں' جب میں نے محسوس کیا کہ عمر رسیدہ اور غمگین بادشاہ کے حق میں ایک حرکت یا آواز بھی نہیں سنی گئی' اگرچہ وہ امراء جو اپنے خالقوں کے آگے گھٹنے ٹیکتے تھے' اپنے رتبہ اور دولت کے لئے شاہجہان کے شکر گزار تھے' جس نے دربار کی رسم کے مطابق انہیں غربت کی پست حالت سے اٹھا کر سرفراز کیا تھا اور ان میں بہت سوں کو مکمل غلامی سے نجات دلائی تھی۔"

شاہجہاں نے اپنے انتقال سے قبل نئی دہلی کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا' جو ابھی تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی۔ اورنگزیب نے اس خدشے کے تحت کہ مبادا ہاتھی پر سوار بوڑھے بادشاہ کی موجودگی لوگوں میں جوش و خروش برپا کر کے اس کے حق میں کوئی جماعت نہ پیدا کر دے' اس شرط پر اس تجویز کی منظوری دے دی کہ بادشاہ بذریعہ کشتی دہلی کا سفر کرے گا اور اسی راستے سے واپس آگرہ آ جائے گا۔ شاہجہاں نے اپنے بیٹے کی پابندی کو دیکھتے ہوئے نئے شہر کے سفر کا خیال ترک کر دیا' مگر اسے اس ذلت اور بے عزتی پر سخت شرم و خجالت محسوس ہوئی۔

قید سخت کے سوا' اورنگزیب نے شاہجہاں کے ساتھ قید خانے میں احترام برتا' حتیٰ کہ اس نے اس وقت اپنے بیٹے کی دیدہ و دانستہ بے عزتی کی تھی' مگر اس کے باوجود اس سے معتدل سلوک کیا گیا۔ پس' تخت نشین ہونے سے چند روز پیشتر اورنگزیب نے شاہجہاں کو پیغام بھجوایا کہ براہ مہربانی شاہی جواہرات بھیج دیں' تاکہ وہ اپنی رسم تاجپوشی کے موقع پر انہیں پہن سکے۔ بوڑھا بادشاہ اس پیغام پر غصے سے لال پیلا ہو گیا' اس نے بار بار ہاون دستہ لانے کے لئے کہا اور اپنے تمام قیمتی پتھروں اور موتیوں کو پیس ڈالنے کی دھمکی دی' تاکہ اس کا بیٹا انہیں کبھی بھی حاصل نہ کر سکے۔ اورنگزیب نے تحمل سے کام لیا اور اپنے والد کی قید کی سختی میں نرمی کرنے کے لئے دہلی سے اسے تحائف بھیج دیئے۔ برنیئر کے مطابق' بعد ازیں' شاہجہاں نرم پڑ گیا اور اس نے اپنی مرضی سے اورنگزیب کو ان جواہرات میں سے چند جواہرات بھجوا دیئے جنہیں پیس ڈالنے کی اس نے دھمکی دی تھی۔

بوڑھے بادشاہ نے قید کے دوران اپنا لہجہ بلند رکھا' حتیٰ کہ موت نے اسے آ لیا۔ ایک

مرتبہ آگرہ کے حاکم نے قیدی بادشاہ کی بے عزتی کر دی' شاہجہاں نے جواب میں حاکم کو منہ پر جوتوں سے پیٹ ڈالا۔ حاکم نے محافظوں کو بادشاہ کے گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ مگر کوئی بھی شخص اس بادشاہ پر ہاتھ ڈالنے کی جرات نہ کر سکا' جس کا ایک دیوتا کی طرح احترام کیا جاتا تھا۔

شاہجہاں آگرہ میں شاہانہ انداز میں سات برس تک زندہ رہا اور دسمبر' 1666ء میں قلعہ آگرہ میں انتقال کر گیا۔

"عالمگیر نامہ" کے مصنف' ملا محمد کاظم نے شاہجہان کے انتقال سے متعلق کیفیت بیان کی ہے۔ یہ دلچسپ ہے' کیونکہ قلعہ آگرہ سے وابستہ حالات کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کی تصنیف سے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

"مسلسل بیماری کے نتیجہ میں بادشاہ بہت کمزور ہو گیا تھا اس کی جسمانی قوت ختم ہو چکی تھی اور اسی کے باعث اس پر مختلف بیماریوں کا حملہ ہو گیا تھا' چنانچہ ایک کا علاج دوسری کے لئے براہ راست مضر ثابت ہوتا تھا۔ بہترین اطباء نے اس کے معاملہ کو انتہائی پیچیدہ خیال کیا۔ انتہائی لاغری اور کمزوری کے باعث اس کے ہاتھ پاؤں کانپتے تھے اور کوئی دوا اثر نہیں کرتی تھی۔ آخر کار سوموار کی شب کی پہلی گھڑی 28 رجب (1666ء) میں اس کا معاملہ بالکل امید سے باہر ہو گیا اور موت کی علامات واضح ہو گئیں۔ بادشاہ نے اس آزمائش کی گھڑی میں حوصلہ قائم رکھا اور آخری دشمن سے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس نے اپنا ذہن اللہ کی طرف لگا لیا اور باآواز بلند ان ہزاروں نعمتوں کے لئے قادر مطلق کا شکریہ ادا کیا جو اس نے اسے عطا کی تھیں۔ اس کے بعد اس نے انتہائی خلوص اور عاجزی کے ساتھ اس دنیا میں کیے گئے اپنے گناہوں کی معافی کے لئے دعا کی۔ ازاں بعد اس نے بقائمی ہوش و حواس کلمہ طیبہ پڑھا' جس وقت وہ کلمہ پڑھ رہا تھا اس کی مہربان بیٹی ملکہ جہاں بیگم (جہاں آراء) اور خاندان کی دیگر خواتین نے رونا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے انہیں خدا کی مرضی پر راضی برضا رہنے کی تلقین کی۔ اس نے ان سے تسلی کے چند الفاظ کہے اور اس کے فوراً بعد اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔"

"ملکہ جہاں بیگم کے حکم سے قلعہ کا کمانڈر رعد انداز خاں اور خواجہ پھول غسلخانہ میں حاضر ہوئے۔ قلعہ کے دروازوں کی کھڑکیاں کھول دی گئیں اور آدمیوں کو بھیج کر ماتمی رسومات کی ادائیگی کے لئے انتہائی قابل احترام سید محمد قنوجی اور اکبر آباد کے قاضی القضاۃ قاضی قربان کو بلوایا گیا۔ وہ طلوع آفتاب سے دو گھڑی پیشتر آ گئے۔ اگرچہ بادشاہ نے سن بلوغت کے وقت سے نماز پنجگانہ میں سے ایک بھی نماز قضا نہیں کی اور ماہ رمضان کا ایک روزہ بھی نہیں چھوڑا تھا' اس کے باوجود انہیں ایک بہت بڑی رقم کی صورت میں عوضانہ دیا گیا' جسے اس مقصد کے لئے

علیحدہ کر لیا گیا تھا۔ ملکہ جہاں کے حکم سے مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کو ثمن برج میں بلوایا گیا' جہاں بادشاہ نے آخری سانس لیا تھا۔ اس مقام سے اس کے جسد خاکی کو اس کے ساتھ ہی ایک ایوان میں منتقل کر دیا گیا' جہاں اسے اسلامی طریقہ سے غسل دیا گیا۔ اس کے بعد نعش کو ایک تابوت میں بند کر کے اس پہ قرآن پاک کی آیات پڑھی گئیں۔ آخر میں نعش کو صندل کی لکڑی کے ایک جوف میں رکھا گیا اور تابوت کو سوگواروں کے ایک جلوس کے آگے آگے مذکورہ برج کے دروازہ نشیب میں سے قلعہ سے باہر لایا گیا' جو بند رہا کرتا تھا مگر اسے اس موقع کے لئے کھولا گیا۔ تب' نشیب دروازہ کے سامنے شیر حاجی دروازہ میں سے جلوس کے گذرنے کے بعد تابوت کو قلعہ کی چار دیواری سے باہر لایا گیا۔ آگرہ کا صوبیدار خوشدر خاں دیگر سرکاری افسران کے ہمراہ صبح صادق کے وقت دریا کے کنارے پہ پہنچا' تو تابوت کو دریا کے پار لے جا کر پورے اعزاز کے ساتھ ممتاز زمانی کے مزار کے پہلو میں' اس کی یاد میں، مرحوم بادشاہ کے تعمیر کردہ مقبرہ میں دفن کر دیا گیا' جو اب قبر میں بھی اس کے پاس آگیا تھا۔ تدفین سے قبل قابل احترام بزرگ سید محمد' قاضی قربان اور دیگر عالم فاضل اور جلیل القدر بزرگوں نے تابوت پر دعا مانگی۔"

شاہجہاں 76 برس تک زندہ رہا اور اس نے 31 برس تک حکومت کی۔

بادشاہ کے انتقال کے وقت اورنگزیب کا سب سے بڑا بیٹا اور ولی عہد سلطنت شہزادہ محمد معظم (بعد میں بادشاہ شاہ عالم بہادر شاہ) آگرہ سے سات کوس کے فاصلے پہ خیمہ زن تھا' اسی رات بادشاہ کی اچانک موت کی خبر اسے ملی تو وہ اگلے روز شہر پہنچا اور تیسرے روز قلعہ کی طرف گیا اور اپنی پھوپھی بیگم صاحب اور شاہی خاندان کی دیگر خواتین سے تعزیت کی۔ "اس روز شہزادہ کے حکم سے علماء و فضلاء نے پورا قرآن پاک پڑھا اور آیات کی تلاوت کی گئی۔ حقیقی طور پر شاہانہ انداز میں عید میلاد النبیؐ منانے کے لئے محفل میلاد کا انعقاد کیا گیا اور خیرات کے طور پر غریبوں اور محتاجوں میں بہت بڑی بڑی رقموں کی صورت میں روپیہ پیسہ تقسیم کیا گیا۔" (27)

اورنگزیب اس وقت دہلی میں تھا جب اس کے والد کا انتقال ہوا۔ اس کے انتقال کی خبر سن کر وہ آنسو بہائے نہ رہ سکا۔ ۱۱ محمد کاظم لکھتا ہے:- "حالانکہ بادشاہ سلامت ایک مضبوط ذہن اور ایک مصمم اور غیر لچکدار مزاج کے حامل تھے مگر اپنے باپ کے انتقال کی خبر سن کر وہ اس بری طرح روئے کہ وہاں موجود درباریوں اور امراء کو بہت دکھ ہوا۔"

"بادشاہ' شہزادوں اور حرم کی خواتین نے سفید کپڑے پہن لئے اور پورے دربار نے سوگ منایا۔ منتخب بادشاہ نے اپنے امراء سے کہا:- "میری یہ خواہش تھی کہ میں اپنے والد کے آخری لمحات کے وقت اس کا آخری دیدار کرنے کے لئے اس کے پاس موجود ہوتا' اس کی تجہیز و تدفین

میں حصہ لیتا اور اس طرح اس کی دعائے خیر حاصل کرتا۔ مگر بدقسمتی سے ان میں سے کوئی خواہش بھی پوری نہیں ہوئی اب میں فوراً اکبر آباد روانہ ہو جاؤں گا اور اپنے والد کے مزار پر حاضری دوں گا اور اس اہم شہر میں اپنی بہن اور شاہی خاندان کے دیگر افراد سے تعزیت کروں گا۔"

چنانچہ شاہی پڑاؤ مستقیر الخلافت (28) (آگرہ) کی طرف روانہ ہوا۔ نیا بادشاہ منازل پہ منازل طے کرتا ہوا چھٹے روز آگرہ پہنچ گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ قلعہ میں داخل ہونے سے قبل اس موقع پر بادشاہ کو دارا شکوہ (عالمگیر کے مورخین نے اسے دارا بے شکوہ کہہ کر پکارا ہے' جو شکوہ کے برعکس ہے) (29) کے مکان میں عارضی طور پر ٹھہر جانا چاہئے۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پر حاکم آگرہ خوشدر خاں اور دارالسلطنت کے دیگر شرفاء اور افسران نے بادشاہ کا استقبال کیا۔ بادشاہ اپنے قافلہ شاہی کے ہمراہ بذریعہ کشتی' پہلے سے طے شدہ انتظام کے تحت موضع بہادر پور سے آگرہ آیا اور دارا شکوہ کے مکان میں ڈیرہ جما لیا۔ اگلے روز اس نے اپنے والدین کے مزارات پہ حاضری دی اور ان کی روح کے ایصال ثواب کے لئے فاتحہ خوانی کی۔ اپنے والدین کی قبروں کو دیکھ کر اس نے دوبارہ آنسو بہانے شروع کر دیئے۔ تب مقبرہ کے ملازمین اور خدمتگاروں میں بارہ ہزار روپے تقسیم کرنے کے بعد اس نے مقبرہ کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھی۔ اگلے روز وہ قلعہ میں داخل ہوا اور بیگم صاحب اور حرم کی دیگر خواتین سے تعزیت کی اور ان سے تسلی آمیز اور محبت کے الفاظ کہے۔

بیگم صاحب نے اس موقع پر اپنے بھائی کو جواہرات سے بھرا ہوا ایک بہت بڑا طشت پیش کیا۔ تب اس نے خاندان کی خواتین کو سوگ ختم کرنے کا حکم دیا اور انہیں ان کی حیثیت اور رتبے کے مطابق قیمتی ملبوسات عنایت کئے۔ طلوع آفتاب سے دو گھڑیوں کے بعد وہ شہر کی طرف لوٹ آیا۔ دو دن کے بعد بادشاہ' بیگم صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے دوبارہ قلعہ میں گیا' اس کی تقلید میں سلطنت کے جملہ امراء اور سرکاری افسروں نے اسے سلامی پیش کی اور روپے کی صورت میں نذریں پیش کیں۔ شہزادی نے ہر ایک کے منصب اور رتبے کے مطابق انہیں خلعت عنایت کئے۔ چند روز کے بعد نئے بادشاہ نے دوبارہ اس کے پاس حاضری دی' اور شہزادی نے نثار کی رسومات ادا کیں' یعنی اس نے بادشاہ کی بھلائی کے لئے روپیہ پیسہ نچھاور کیا۔ بادشاہ روزانہ مقبرہ کی طرف جاتا اور فاتحہ پڑھتا تھا۔ اس نے وہاں دو مرتبہ مولود کی محفلوں کا انعقاد کیا اور ان موقعوں پر ہزاروں روپے مولویوں اور ناداروں میں تقسیم کئے گئے۔

چونکہ یہ مناسب خیال کیا گیا کہ بادشاہ کو مستقیر الخلافت (آگرہ) میں اپنا قیام طویل کر دینا



شہنشاہ اورنگزیب

چاہیے' اس لئے اس نے دارالخلافت (شاہ جہان آباد) سے اپنے اہل خانہ کو بلوا بھیجا۔ چنانچہ میر خوجہ سراؤں' عبد النبی خاں' مخلص خاں اور خدمت خاں کو اس مقام سے ایک بہت بڑی جماعت کے ہمراہ زنانہ کی بیگمات اور خواتین کو ہاتھیوں پہ آگرہ تک لانے کے لئے روانہ کیا گیا۔ عید کا تہوار آ رہا تھا' اس لئے مزید حکم دیا گیا کہ تخت طاؤس کے علاوہ تہواروں پہ استعمال ہونے والی آرائش و سجاوٹ کی تمام اشیاء بھی آگرہ لائی جائیں۔

عید کے تہوار کے موقع پر بادشاہ' ایک طلائی ھودا سے مزین ہاتھی پہ سوار ہو کر جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ دوپہر سے پہلے واپس آ کر اس نے دربار عام کے ایوان میں ایک عظیم الشان استقبالیہ کا انعقاد کیا' وہ ایک بادشاہ کی شان و شوکت و جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا اور پہلی مرتبہ شاہجہاں کے تخت طاؤس پر براجمان ہوا' جسے اس نے اس قدر رسوائی کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ عالمگیر کا مورخ محمد کاظم یہاں بادشاہ کی مدح سرائی میں بہت فیاضی سے کام لیتا ہے' جس نے ایک بادشاہ کی حقیقی فیاضی کے ساتھ امراء و شرفاء کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اس کے بعد غسلخانہ میں ایک اجلاس بلایا گیا اور وہاں جمع شدہ افسران اور امراء کی موجودگی میں سرکاری کام نپٹایا گیا۔ عید کے پہلے تہوار کے موقع پر تین روز تک خوشیاں منائی گئیں۔ بادشاہ نے اس موقع پر بیگم صاحبہ کو ازراہ مہربانی ایک لاکھ طلائی مہریں عطا کرنے کے علاوہ اس کے بارہ لاکھ سالانہ وظیفہ میں پانچ لاکھ روپے کا اضافہ بھی کیا' اپنی دونوں چھوٹی بہنوں' پرہیز بانو بیگم اور گوہر آراء بیگم کو ایک ایک لاکھ روپیہ عنایت کیا۔ شہزادہ محمد معظم نے دو لاکھ روپے اور ایک خصوصی خلعت فاخرہ کے ساتھ قیمتی جواہرات سے مزین بازو بند اور کنگن حاصل کئے' اس کے علاوہ اس کے چندرہ ہزاری پیادہ اور بارہ ہزاری سوار منصب میں 2000 سواروں کا اضافہ کیا گیا: نیز شہزادہ محمد عظیم کو ایک لباس' پروں کا ایک تاج اور ہیروں کے جڑاؤ کا ایک خنجر عطا کرنے کے علاوہ اس کے بارہ ہزاری پیادہ اور ہفت ہزاری سوار فوج کے منصب میں 2000 سواروں کا اضافہ کیا گیا: اس کے بعد (مسلمان اور ہندو) امراء' راجاؤں' نوابوں کی ایک لمبی فہرست آتی ہے' جنہیں خلعتیں عطا کی گئیں اور ان کے منصب میں اضافہ کیا گیا۔ دور حکومت کے پانچویں برس سرکاری خزانے کو آگرہ سے دہلی منتقل کر دیا گیا' مگر اس دور میں یعنی دور حکومت کے نویں برس خزانے کو دوبارہ آگرہ لے جانے کا حکم دیا گیا۔ نامدار خاں کو ایک گھوڑا اور جواہرات سے مرصع زین و ساز و سامان پیش کر کے یہ فرض سونپا گیا' یوں خزانے کو 1400 ارابس یا بیل گاڑیوں کے ذریعے دہلی سے آگرہ لا کر بحفاظت قلعہ میں جمع کر دیا گیا۔

1638ء میں ڈیوک آف ہولسٹین کے ایک خواص وینڈ ہلسلو نے آگرہ کا دورہ کیا' جس

نے ڈیوک کی جانب سے شاہ کے لئے روانہ کی گئی سفارت کے عملہ کے ساتھ ایران کا سفر کیا تھا۔ وہ اسے اصفہان (جس کی شان و شوکت اس وقت سب سے زیادہ تھی) سے کم از کم دو گنا بڑا ایک خوبصورت شہر بتاتا ہے۔ یہ شاہجہان کی پسندیدہ رہائش گاہ تھی۔ مشرق کی جملہ اقوام آگرہ میں تجارت کرتی تھیں؛ نیز گلیاں کشادہ تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ بہترین دوکانات بنی ہوئی تھیں۔ سیاحوں کے لئے وہاں اسی کارواں سرائے تھیں' ہر ایک کو ایک نگران کے سپرد کیا گیا تھا۔ سیاح نے بازار' دربار' غسلخانہ' محل (یا حرم) اور جھروکہ کے بارے میں مفصل حال بیان کیا ہے۔ وینڈ۔ملسلو 1640ء میں ہندوستان سے روانہ ہوا' لہٰذا اس کے آگرہ سے روانہ ہونے کے بعد شاہجہان نے نئی دہلی کو دارالسلطنت مقرر کر لیا تھا۔

فرانسس برنائر زیادہ سیاسی بصیرت کے ساتھ بارہ برس تک (67-1655ء) ہندوستان میں رہا' اس نے اپنے سفرنامہ میں وینڈ۔ملسلو کی طرح آگرہ کے بارے میں بیان پیش کیا ہے۔

آگرہ میں شاہجہان کی اہم عمارات' محل کے اندر شیش محل' موتی مسجد اور مشہور زمانہ تاج محل ہیں۔

ا۔ملفن سٹون نے شاہجہان کے تحت ہندوستان کی زبردست خوشحالی کے بارے میں بہترین انداز میں لکھا ہے' فیاضی کے معاملہ میں اس کا موازنہ رومن شہنشاہ سیویرس سے کیا ہے' گبن کے صفحات میں جس کی شان و شوکت کو لازوال بنا دیا گیا ہے۔ غیر ملکی جنگوں میں مصروف رہنے' عیش و عشرت میں رغبت' شان و شوکت' مشہور و معروف عمارات اور کاموں کی تعمیر (جس پہ کروڑوں روپے کی لاگت آئی) کے باوجود اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئی اور اس نے سکوں' سونے کی سلاخوں اور جواہرات کی صورت میں بہت بڑے ذخائر اپنے پیچھے چھوڑے۔ ٹیورنیئر کے مطابق "شاہ جہاں نے اپنی رعایا پر ایک بادشاہ کی بجائے' اس طرح حکومت کی' جس طرح ایک باپ اپنے خاندان اور بچوں کا خیال رکھتا ہے"۔ نئی دہلی جیسے اس قدر عالی شان دارالخلافہ کی بنیاد' نجی ثروت کے علاوہ زبردست سرکاری دولت کی شہادت پیش کرتی ہے۔

شاہجہان کی معزولی اور قید کے ساتھ ہی آگرہ کی خوشحالی کے دنوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اورنگزیب نے مختصر عرصہ تک وہاں رہائش اختیار کی۔ مگر جلد ہی یہ ایک دوسرے درجے کا شہر بن کر رہ گیا' یعنی صوبائی حاکم کی رہائش گاہ بن گیا' جو ہمسایہ جاٹ سرکش قبیلوں کی روک تھام کے سلسلہ میں بہت کمزور ثابت ہوا۔ بادشاہ' دکن کے دور دراز صوبہ میں بوڑھا ہو چکا تھا اور گرچہ اس کی قوت مشاہدہ' مستقل مزاجی اور انتہائی باریک تفصیلات پہ توجہ نے سلطنت کے اجزاء کو یکجا رکھا ہوا تھا' مگر عدم رواداری' جس کا اس نے اپنی پوری زندگی میں مظاہرہ کیا' اپنی

رعایا کے مختلف طبقوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک اور ہندوستان میں عوام کے ایک بہت بڑے طبقہ کو اس کی طرف سے پہنچنے والی اذیت نے تیمور کی حکومت کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے لئے راہ ہموار کر دی۔

جہاں آراء اور روشن آراء دو بہنیں: وہ دو اہم شخصیتیں' جنہیں شاہ جہاں کے دور کی مغلیہ تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہوا' وہ اس کی دونوں بیٹیاں' جہاں آراء بیگم اور روشن آراء بیگم تھیں۔ جہاں آراء یا بیگم صاحب' شاہجہان کی اپنی انتہائی محبوب شریک حیات ممتاز الزمانی المعروف تاج محل سے دوسری اولاد تھی۔ بادشاہ پر اس کے لامحدود اثر و رسوخ اور دربار میں اس کے عمل دخل کے بارے میں پہلے ہی حوالہ دے دیا گیا ہے۔ برنیئر کے مطابق وہ متناسب اعضاء کی انتہائی حسین و جمیل خاتون تھی اور اپنے باپ کی بہت زیادہ چہیتی تھی۔ اسے اپنی چہیتی بیٹی پہ بہت زیادہ اعتماد تھا۔ وہ اپنے والد کی سلامتی پر خصوصی توجہ دیتی تھی اور اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھی کہ کسی ایسے کھانے کو شاہی دسترخوان پر نہیں جانے دیا جاتا تھا' جسے اس کی آنکھوں کے سامنے تیار نہ کیا گیا ہو۔ اس نے اپنے والد کی خوش طبعی کو باقاعدہ بنایا تھا اور سلطنت کے انتہائی گھمبیر مسائل اس کے ذریعے حل ہوتے تھے۔ اس نے شاہی خزانے سے بہت بڑے بڑے وظائف حاصل کئے اور ان امراء سے نہایت قیمتی تحائف وصول کئے' جن کے معاملات اس کے سپرد تھے' یوں اس نے بہت زیادہ دولت جمع کر لی تھی۔ اس نے اپنے بھائی دارا کی حمایت کی اور دربار میں اس کے مفادات کی راہ ہموار کی' جبکہ اس کی چھوٹی بہن روشن آراء نے اورنگزیب کی جماعت کا ساتھ دیا۔ برنیئر کے مطابق دارا نے جہاں آراء کی شکل میں ایک قیمتی حمایتی پا کر اس سے وعدہ کیا کہ تخت نشین ہونے پر وہ اسے شادی کرنے کی اجازت دے دے گا۔

سیاح کہتا ہے "یہ وعدہ اس لئے قابل ذکر ہے' کیونکہ ہندوستان میں کسی شہزادی کی شادی شاذو نادر ہی ہوا کرتی تھی' اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی شخص کو شاہی گھرانے کی شہزادی سے شادی کے شایان شان نہیں سمجھا جاتا تھا: نیز اس بات کا خدشہ بھی محسوس کیا جاتا تھا کہ ہو سکتا ہے شوہر طاقت ور ہو کر تخت و تاج کی خواہش کرنے لگے۔"

روشن آراء اپنی بڑی بہن کے مقابلہ میں کم خوبصورت تھی اور بذلہ سنجی و ذہانت کے معاملہ میں بھی زیادہ قابل ذکر نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ مزاج کی تیز و چست و چالاک اور مکاری میں کسی طرح کم نہیں تھی۔ وہ جاسوسوں کے ذریعے دربار میں ہونے والی کارروائیوں کی خبر اورنگزیب کو پہنچاتی رہتی' جو اس قدر اہم اور قیمتی تھیں کہ اس نے نہ صرف چالاک شہزادے کو اطلاع کے مطابق' آگرہ میں اپنے باپ کے پھیلائے ہوئے پھندے سے بچ نکلنے میں کامیاب

کرایا بلکہ حقیقی طور پر تخت تک اس کے راستے کو بھی ہموار کیا۔

آگرہ سے ۹ میل مشرق کی جانب ساگڑھ کی لڑائی کا نتیجہ' اورنگزیب اور مراد بخش کی مشترکہ افواج کے ہاتھوں دارا شکوہ کی شکست پر ہوا۔ اورنگزیب نے عدم دلچسپی کے بھیس میں بادشاہت کے لئے اپنے منصوبوں کو پوشیدہ رکھ کر یہ کہتے ہوئے مراد کو فریب دیا:۔ "میں خدا کے در کا فقیر ہوں۔ ایک فقیر کی طرح رہتا ہوں اور میری تمنا ایک فقیر کی طرح مرنے کی ہے۔ سلطنت اور ملک مراد کا ہے"۔ اس نے خلیل اللہ خاں کی طرف مڑتے ہوئے کہا کہ صرف مراد بخش اکیلا ہی تاج پہننے کے لئے مناسب ہے اور یہ کہ اس کی مہارت اور بہادری کے باعث دارا پر فتح حاصل ہوئی' وہ صرف اس کے نائب کے طور پر فرائض ادا کر رہا ہے۔ فتح سے تین یا چار روز بعد اورنگزیب اور مراد آگرہ کے دروازہ کے سامنے نمودار ہوئے اور محل سے تقریباً ایک فرسنگ کے فاصلہ پر ایک باغ میں خیمہ زن ہو گئے۔ تب اورنگزیب کے ایک با اعتماد خوجہ سرا کو بوڑھے بادشاہ کے پاس روانہ کیا گیا' جس نے اپنے آقا کی جانب سے بادشاہ کو سلام پیش کیا اور بیٹے کی جانب سے اپنے قابل احترام والدین کے لئے لامحدود احترام اور محبت کی یقین دہانی کرائی۔ حالیہ واقعات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا گیا۔ جنہیں دارا کے منحوس منصوبوں سے منسوب کیا گیا تھا۔ اور اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی کہ شہزادے' بادشاہ کے احکامات حاصل کرنے اور ان پر عمل درآمد کے لئے آگرہ آئے ہیں۔

شاہجہاں نے جھوٹ موٹ اپنے بیٹے کے رویہ کے لئے اپنی غیر مشروط منظوری کا اظہار کر دیا اور اپنے ایک قابل اعتماد خوجہ سرا کو روانہ کیا' جس نے "اپنے آقا کی طرف سے اورنگزیب کو بتایا کہ بادشاہ کو دارا کے غیر مناسب رویہ اور نااہلیت کا کس قدر احساس ہے اور شہزادے نے جس محبت اور اطاعت کے ساتھ یاد دہانی کرائی ہے' وہ اس کا احترام کرتا ہے۔ بلآخر اسے اپنے مشفق والد کے پاس حاضر ہونے کی دعوت دی گئی' تاکہ معاملات کی آئندہ صورتحال کے بارے میں انتظامات کئے جا سکیں۔ شاہجہان نے چالاکی اور فریب کے ذریعے اورنگ زیب کو پھانسنے کی کوشش کی' مگر اسے اس بات کا احساس نہ رہا کہ اس کا فرض شناس بیٹا ان دونوں معاملات میں تمام آدمیوں سے سبقت لے جا چکا ہے' اورنگزیب کو اس کی بہن روشن آراء نے قلعہ میں طاقتور اور قوی ہیکل تاتاری عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے آگاہ کر دیا تھا' جو حرم سرا میں خاتون محافظوں کے فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ یعنی جیسے ہی وہ محل میں داخل ہو گا تو وہ ہتھیاروں کے ساتھ اس پہ چڑھ دوڑیں گی۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بیگم صاحب' بادشاہ کو دن یا رات میں کسی وقت بھی اکیلا نہیں

چھوڑتی اور وہ مکمل طور پر اس کے زیر اثر ہے۔ روشن آراء کی مہیا کردہ معلومات کے ذریعے وہ اچھی طرح اس بات سے واقف تھا کہ جہاں آراء کو دارا سے کس قدر وابستگی ہے۔ اس نے اسے مطلع کیا کہ دارا کی شکست کے بعد بادشاہ نے طلائی مہروں سے لدے ہوئے دو ہاتھی اسے بھجوائے' اس طرح اس نے نئی فوج جمع کرنے اور جنگ کو طول دینے کے لئے اسے ذرائع فراہم کر دیئے۔ اس نے بوڑھے بادشاہ کے قول و قرار کے خلوص پہ بہت زیادہ شک کا اظہار کیا' تاہم اس نے اس کے سامنے اپنے ذہن کو عیاں کرنا' نامناسب خیال کیا۔ شہزادے نے خود پر اپنے والد کی مہربانیوں کی بارش کا شکریہ ادا کیا' مگر قلعہ کی چار دیواری کے اندر داخل ہونے کی جرات نہیں کی' حالانکہ اس نے بادشاہ کے بلاوے کی تعمیل کرنے کا دن مقررہ کر دیا تھا' مگر وہ روز بروز اپنی حاضری کو ٹالتا رہا۔ کئی روز تک معاملات اسی طرح چلتے رہے' مگر آخر کار اورنگزیب کے بیٹے سلطان محمود کی ثابت قدمی اور مہارت نے بوڑھے شیر کو پنجرے میں بند کر دیا۔ یہ چالاک نوجوان' جس نے محل کے قرب و جوار میں پہلے ہی بہت بڑی تعداد میں مسلح افراد تعینات کر دیئے تھے' بادشاہ کے لئے ایک پیغام لے جانے کا بہانہ کر کے اس میں داخل ہو گیا' اس کے فوراً بعد مسلح سپاہی اندر داخل ہوئے اور محافظوں پر (جو کسی تصادم کے لئے تیار نہیں تھے) اچانک حملہ کر کے انہیں نکال باہر کیا۔ پس شہزادے نے چند منٹوں میں قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ برنائر کہتا ہے" "اگر کسی شخص کو حیرانگی ہوئی تھی تو وہ شاہجہان تھا' اس نے دیکھا کہ اس نے دوسروں کے لئے جو پھندہ تیار کیا تھا وہ خود اس کا شکار ہو گیا ہے اور وہ خود ایک قیدی بن گیا ہے"۔ بوڑھے بادشاہ نے بے سود ہی اپنے پوتے کو ایک پیغام رساں بھیج کر التجا کی وہ اسے آزاد کر دے اور اپنے تاج اور قرآن پاک پہ قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ اگر وہ وفادار رہے تو اسے بادشاہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ نوجوان شہزادے نے اپنے والد کے لئے فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی پیشکش کی پرواہ نہیں کی اور بادشاہ کے کمروں میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے بادشاہ سے قلعہ کے ہر دروازہ کی چابی کا تقاضا کیا' تاکہ اورنگزیب "بادشاہ کی قدم بوسی" کے لئے سکون قلب کے ساتھ آسکے۔ بوڑھے بادشاہ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کے اپنے آدمی اس کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں' دو روز کے بعد بادل نخواستہ چابیاں حوالے کر دیں۔ اورنگزیب نے اپنے قابل بھروسہ خوجہ سرا اعتبار خاں کو قلعہ کا حاکم مقرر کیا اور شاہجہاں و بیگم صاحب کو قید سخت میں ڈال دیا۔ قلعہ کے متعدد دروازوں میں دیواریں چن دی گئیں اور بادشاہ اور اس کے دوستوں کے درمیان آمدورفت کو موثر طور پر روک دیا گیا۔ اس کی قید اس قدر سخت تھی کہ بادشاہ کو حاکم کی اجازت کے بغیر اپنا کمرہ چھوڑنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

جب دارا شکوہ اپنے منافق بھائی اورنگزیب کے ہاتھوں ایک بے یارو مددگار قیدی بن گیا' تو اپنے بھائی کے لئے روشن آراء کی گہری عداوت کی آگ بری طرح بھڑک اٹھی۔ جب اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے' آیا کہ دارا کو قلعہ گوالیار میں قید کرنے کے لئے وہاں روانہ کر دیا جائے' دہلی میں علماء کا دوسرا اجلاس بلایا گیا تو روشن آراء نے اصل منصوبہ کے مطابق' یا بغیر کسی تاخیر کے عمل درآمد کے لئے' سخت ترین سزا تجویز کرنے کے سلسلہ میں' دانشمند خاں' خلیل اللہ خاں اور شائستہ خاں سے ملاقات کر کے اس کے خلاف اپنی دشمنی کا انکشاف کیا' آخرکار اس پہ عمل درآمد کر دیا گیا۔

ہندوستان کے تخت پر اورنگزیب کے خود کو مستحکم کرنے کے بعد اس کی بہن روشن آراء بیگم کو وہی حقوق اور اختیارات حاصل ہو گئے' جیسے شاہجہان کے دور میں اس کی بڑی بہن جہاں آراء کو حاصل تھے۔ اس نے اپنے والد کے دور میں اورنگزیب کے لئے بہت سخت محنت کی تھی' اور اصل میں اسی کی مدد سے وہ تخت نشین ہوا تھا۔ اب وہ حرم سرا کی مالکہ بن گئی تھی۔ شاہجہاں کے دور میں اپنی بڑی بہن کی طرح اسے وسیع و عریض عملہ رکھنے اور سرکار سے بہت بڑے بڑے وظائف حاصل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے خدم و حشم اور سازو سامان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اسے پہلے رتبہ کی ایک ملکہ کے تمام حقوق حاصل تھے۔ اس کے اختیار نے ولی عہد شاہ عالم کی والدہ' ایک راجپوت شہزادی' سلطانہ اول کے اثر و رسوخ کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ سیاح برنئیر نے روشن آراء کے شاہانہ جلوس کے بارے میں ایک مفصل بیان پیش کیا ہے: "وہ ایک سنہری پالکی میں انتہائی شان و شوکت کے ساتھ باہر آتی' جو مختلف رنگوں کی شاندار ریشمی جالیوں سے آراستہ ہوتی تھی' اس کے اردگرد کشیدہ کاری سے مزین سنجاف اور قیمتی پھندنے لگے ہوتے تھے۔ سامنے سے کھلی اس شاندار پالکی کو دو خوبصورت اونٹوں یا دو چھوٹے ہاتھیوں کے درمیان باندھا ہوا ہوتا تھا۔ پالکی کے سامنے عمدہ لباس میں ملبوس ایک نوجوان کنیز ہاتھ میں مور کے پروں کی جھاڑی پکڑے چل رہی ہوتی' جس کی مدد سے وہ شہزادی پر سے مکھیاں اڑاتی" ہاتھیوں پہ شہزادی کے سفر کے بارے میں برنئیر بیان کرتا ہے:۔ "اپنے ذہن کو آخری حد تک دوڑایئے' مگر آپ کو ایک بھاری بھرکم ہاتھی پہ سونے اور لاجورد سے جگمگاتے ہودا میں بیٹھی روشن آراء بیگم اور اس کے پیچھے اس کے گھرانے سے وابستہ خواتین سے بھرے ہوئے تقریباً اپنے جیسے شاندار ہودوں سے مزین دیگر پانچ یا چھ ہاتھیوں کے نظارہ سے زیادہ عظیم الشان اور جاذب نظر منظر کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ شہزادی کا ہاتھی مسلح خاتون محافظوں' تاتاری اور کشمیری دوشیزاؤں کے دستہ میں گھرا ہوتا تھا' جنہوں نے شاندار ملبوسات زیب تن کئے ہوتے تھے

اور وہ خوبصورت زینوں سے آراستہ گھوڑوں پہ سوار ہوتی تھیں۔ شہزادی اور ان کے درمیان قیمتی لباس میں ملبوس میر خوجہ سرا گھوڑوں پہ سوار ہوتے تھے۔ اس کے بعد بڑی چھڑیوں کے ساتھ ہرکارے اور خلوم آتے' جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں شاہی نشانات اٹھائے ہوتے تھے' وہ ملکہ کے سامنے سڑک کے دائیں اور بائیں جانب کافی لمبے راستہ پر سفر کرتے۔ دربار کی اہم خاتون' شہزادی کی طرح اور اسی انداز میں خدمتگاروں کے جلو میں ہاتھی پر سوار ہوتی' ساز و سامان کے لحاظ سے اس کا رتبہ روشن آراء کے بعد کا ہوتا تھا۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی خاتون اور اسی طرح خواتین کے ساتھ پندرہ یا سولہ ہاتھی گذرتے' ہر ایک کا اپنے رتبہ اور منصب کے مطابق عملہ ہوتا تھا۔ ساٹھ یا اس سے زائد ہاتھی شاہانہ انداز اور زرق برق ولاتعداو خلوموں کے ساتھ گذرتے۔ برنیئر کے مطابق یہ نظارہ اس قدر عظیم الشان اور جاذب نظر ہوتا تھا کہ اگر اس نے اس شاندار مظاہرے کو فلسفیانہ غیر جانبداری کے ساتھ نہ پرکھا ہوتا تو وہ بھی ان تخیلات کا شکار ہو جاتا' جو کہ زیادہ تر ہندوستانی شاعروں کے ذہنوں میں آتے ہیں' جب وہ ہاتھیوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ بہت سی دیویوں کو نظرِ بد سے چھپا کر لے جا رہے ہیں۔"

سال 1664ء میں اورنگزیب کی صحت بری طرح متاثر ہو گئی۔ اس کی نقاہت بڑھتی چلی گئی' جس نے اسے کئی گھنٹوں تک مدہوش کئے رکھا۔ روشن آراء کے پاس اس کے کمرے کا تمام انتظام تھا' جس پہ تلواروں اور کمانوں سے مسلح تاتاری عورتوں کا پہرہ تھا۔ بادشاہ کی صحت کے بارے میں انتہائی سخت راز داری برتی گئی' حتیٰ کہ حرم سرا کی عورتوں کو بھی اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ آیا بادشاہ زندہ ہے یا فوت ہو چکا ہے۔ اس وقت جب بادشاہ کی زندگی خطرے میں تھی تو روشن آراء نے بادشاہ کے انتقال کی صورت میں خود سرفرازی کے منصوبوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے بادشاہ کی پہلی راجپوت بیوی سے اس کے سب سے بڑے بیٹے شاہ عالم کو (جس کی عمر اس وقت 19 برس تھی) قطع نظر کرتے ہوئے' اس کی جگہ مسلمان سلطانہ سے اپنے چھوٹے بھائی اعظم شاہ (جس کی عمر اس وقت محض چھ سال تھی) کو تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے بادشاہ کے ہاتھ سے مہر والی انگوٹھی اتارنے کی تدبیر کر لی اور اعظم شاہ کے حق میں مختلف راجاؤں' صوبیداروں اور حاکموں کو اس کی مہر کے تحت خطوط جاری کر دیئے۔ اس کی حکمت عملی میں اپنے نابالغ بھائی کی طویل کمسنی کے دوران بطور قائمقام فرائض سرانجام دینا اور بعد میں جائز وارث کو بے دخل کر کے تخت و تاج کو اپنے لئے حاصل کرنا شامل تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا' اس بارے میں حرم سرا کی خواتین کو شک گذرا۔ سلطانہ اول نے دروازوں کی خاتون محافظوں کو زبردست رشوت پیش کی' تو انہوں نے اسے بیمار بادشاہ کے کمرہ میں جانے

کی اجازت دے دی۔ راجپوت سلطانہ نے دیکھا کہ اس کا خاوند بے ہوش پڑا ہے اور اسے پہچاننے کے قابل نہیں۔ دریں اثناء' روشن آراء نے بے جا مداخلت کرنے والی سلطانہ کو دیکھنے پر اسے اس بری طرح پیٹنا شروع کر دیا کہ اس کا چہرہ زخمی ہو گیا اس کے بعد اسے کمرہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ (30)

یہ اورنگزیب کی جوانی کے دور کی بیوی راجپوت سلطانہ کی زبردست بے عزتی تھی' کیونکہ حرم کی خاتون اول کی حیثیت سے اس کا بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا۔ وہ اس قدر بے خوف ہو گئی تھی کہ محل میں اپنے بتوں کے سامنے لوبان جلاتی تھی' اس طرح اس کا خاوند جو ایک راسخ العقیدہ مسلمان سمجھا جاتا تھا' اس نے کبھی بھی اس کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کی۔ اس نے شاہ عالم کو مطلع کر دیا کہ اس کی پھوپھی کے ہاتھوں وہ کس سلوک سے دوچار ہوئی ہے' لہٰذا اس نے روشن آراء کے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لئے تدابیر اختیار کر لیں۔ آگرہ میں اس بات کی امید کی جانے لگی کہ اورنگزیب انتقال کر جائے اور شاہجہان جو ابھی تک قید میں ہے وہ اپنے آباؤ اجداد کے تخت پر بحال ہو جائے۔ مگر اورنگزیب کی دہشت اس قدر زیادہ تھی کہ بغاوت کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

اورنگزیب صحت یاب ہو گیا اور اس نے دہلی میں' دربار عام منعقد کیا۔ رعایا کے ادنیٰ ترین شخص کو بھی ایوان عام میں داخلے کی اجازت دی گئی' اپنے بادشاہ کو تخت پہ بیٹھا ہوا دیکھ کر لوگوں کی خوشیوں اور اطمینان کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے اپنی بہن سے اپنی گمشدہ مہر والی انگوٹھی کے بارے میں دریافت کیا' مگر وہ اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ حرم سرا میں بہت بدنام ہو گئی تھی اور خواتین و خوجہ سراؤں نے اس کی سازشوں اور منصوبوں کے بارے میں ہر قسم کی کہانیوں سے اورنگزیب کے کان بھر دیئے تھے۔ روشن آراء کی طرف سے اپنی ملکہ اول کی بے عزتی پہ بادشاہ آگ بگولہ ہو گیا۔ سلطانہ کو تسلی دینے کے لئے اس نے اسے نئے خطابات اور اعزازات سے سرفراز کیا اور انتہائی دگرگوں حالات کے تحت اس کے صبر و تحمل کی بہت زیادہ تعریف کی۔ روشن آراء نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے محل کو چھوڑنے اور شہر میں رہنے کے لئے اپنی خواہش کی اطلاع بھجوائی۔ مگر اس کی درخواست کو قبول کرنے سے اس بناء پر انکار کر دیا گیا کہ وہ بادشاہ کی کمسن بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرتی تھی۔

دریں اثناء' بادشاہ کی اپنی صاحبزادیاں جوان ہو گئی تھیں' اب ان کے اور ان کی پھوپھی روشن آراء کے درمیان جذبہ رقابت پیدا ہو گیا تھا۔ کیٹرن کے مطابق "سب سے بڑی بیٹی زیب النساء' ایک انتہائی اولوالعزم شہزادی تھی۔ کبھی وہ اپنی پھوپھی کی دلیریوں میں حصہ دار بن

کر اس کے لئے ایک قیمتی ساتھی ثابت ہوئی تھی' مگر اب وہ اس سے لڑتی جھگڑتی تھی اور اسے جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو اپنی پھوپھی کی بے قاعدگیوں کے بارے میں معلومات فراہم کر دیں۔ روشن آراء جلد ہی منظر عام سے غائب ہو گئی۔ کہا جاتا ہے اسے زہر دے کر راستے سے ہٹا دیا گیا۔ یہ سب کچھ بادشاہ کی کشمیر روانگی سے قبل ہوا۔"

زیب النساء بیگم (اپنے شاعرانہ نام مخفی سے زیادہ مشہور) نے اب حرم سرا میں اپنی پھوپھی کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ وہ 5 فروری 1639ء کو ایک مسلمان ملکہ کے بطن سے پیدا ہوئی۔ بادشاہ نے اس کی تعلیم و تربیت پر ذاتی توجہ صرف کی۔ لہٰذا وہ جلد ہی ایک عالم فاضل اور باکمال خاتون بن گئی۔ کمسنی ہی میں اس نے قرآن پاک حفظ کر لیا' اس مبارک کام کے لئے بادشاہ نے اسے 30 000 طلائی مہروں کے انعام سے نوازا۔ وہ عربی اور فارسی میں پوری دسترس رکھتی تھی اور مختلف انداز کے خطوط' مثلاً" نستعلیق (31) نسخ (32) اور شکستہ (33) میں مہارت رکھتی تھی اور بہترین نثر اور شاعری لکھتی تھی۔ وہ چند کتابوں کی مصنف بھی تھی۔ اس کا کتب خانہ بہت وسیع تھا' جو مذہبی اور ادبی موضوعات کی کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ اس نے عالم' فاضل حضرات شعراء' ادیبوں' پرہیز گار اشخاص اور خطاطی میں ماہر افراد کے ایک بہت بڑے عملہ کو ملازم رکھا ہوا تھا۔ ملا صفی الدین عرض بیگی اس کے حکم سے کشمیر میں ٹھہر گیا اور اس نے تفسیر کبیر کا ترجمہ لکھا' جو اس کے نام کی نسبت سے زیب التفاسیر کہلاتا ہے۔ دیگر متعدد مجموعہ جات اور اصلی تصانیف اس کے لئے وقف تھیں۔ زیب النساء کو دربار میں اور اپنے باپ پر جو اختیار حاصل تھا وہ جانا پہچانا تھا۔ اسے عربی اور فارسی میں مکمل دسترس حاصل تھی' اس بناء پر' اپنی دانشمندی اور سوجھ بوجھ کے ذریعہ اسے مکمل طور پر دربار کی سیاست پر اختیار حاصل ہو گیا تھا۔ منوچی کے مطابق "اس کی مغلوں کے فرمانروا کی طرح پرستش کی جاتی تھی۔" اب وہ (1664ء) چھبیس برس کی ہو گئی تھی۔ بادشاہ ابھی تک کنویں سے بہت دور تھا۔ زیب النساء نے اسے صحت کی بہتری کے لئے کشمیر کا سفر کرنے کا مشورہ دیا' اس کے طبیبوں نے بھی اس جگہ کی تبدیلی کی سفارش کی تھی۔ شہزادی نے خود سرفرازی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس معاملہ پر زور دیا۔ وہ دنیا کو دربار میں اپنی برتری دکھانے کے لئے بے چین تھی اور اپنی باری پر اپنی پھوپھی کی طرح دھوم دھام میں اور پر شکوہ ساز و سامان کے ساتھ دکھاوا کرنے کی خواہاں تھی۔ جب تک آگرہ میں اورنگزیب کا باپ زندہ تھا' وہ کشمیر روانہ ہونے میں پس و پیش سے کام لے رہا تھا۔ دوسری طرف اس بات کا خدشہ تھا کہ آنے والی گرمیوں کی تپش اس کی صحت کے لئے مضر ہو سکتی تھی' اس طرح اس کی بیماری کے عود کر آنے کا ڈر بھی تھا۔ چنانچہ' دہلی میں قیام جان کو خطرہ میں ڈالنا تھا' کشمیر کو روانگی

اپنی سلطنت کو خطرہ میں ڈالنا تھا۔ پدر کشی کے بارے میں غور کیا گیا۔ بادشاہ نے اس موضوع پر اپنی بیٹی سے مشورہ کیا۔ زیب النساء نے اپنے والد کے خدشات کو دور کیا اور اسے اس جرم کے ارتکاب سے روکا۔ بوڑھا بادشاہ اب اپنی عمر کے پچھترویں برس میں تھا' چنانچہ' اس نے اپنے باپ سے استدعا کی کہ اسے اپنی زندگی کے چند ایام سکون سے گذارنے دے۔

زیب النساء کی نصیحت کے باوجود' اورنگزیب پر پدر کشی کے ارتکاب کا زبردست شک و شبہ کیا جاتا ہے۔ ایک یورپی طبیب (جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا) کو بوڑھے بادشاہ کے علاج کے لئے بلوایا گیا' لیکن جلد ہی بعد میں اس کے انتقال کا اعلان کر دیا گیا۔ زیب النساء نے اس موقع پر اپنے والد کو مبارک باد دی۔

اورنگزیب نے اب پر سکون ذہن کے ساتھ' دہلی سے کشمیر روانگی کے لئے مبارک گھڑی معلوم کرنے کی خاطر اپنے نجومیوں سے مشورہ کیا۔ چنانچہ' جب وقت مقرر کر لیا گیا تو بادشاہ 6 دسمبر کو سہ پہر تین بجے شہر سے روانہ ہوا۔ برنیئر کے مطابق "اس وقت اس کے ساتھ 35000 سوار (جو ہر وقت اس کے محافظ کے ہمراہ ہوتے تھے) اور 70 بھاری توپوں (جن میں زیادہ تر پیتل کی تھیں) کے علاوہ 10'000 پیادہ سپاہی تھے۔ اس کی بیٹی زیب النساء پوری شان و شوکت کے ساتھ اس کے ہمراہ تھی۔ اس کا انتقال 1113 ہجری (1701ء) میں یا اپنے والد کے انتقال سے چھ برس قبل ہوا۔"

ایلفن سٹون کے مطابق "آگرہ اور متھرا کے گردو نواح میں آباد جاٹوں نے اورنگزیب کے دور کے آخری حصہ کے دوران زبردست ابتری پھیلا دی۔ شاہی گھرانے کے ایک شہزادے کی قیادت میں ان کے خلاف ایک منظم فوج روانہ کی گئی اور گڑبڑ کو فرو کر دیا گیا۔"

اورنگزیب 1707ء میں انتقال کر گیا' اس کے دور کی اہم عمارات میں' قلعہ میں ایوان عام (جس کی تاریخ 1684ء دی گئی ہے) اور اس کی طرف سے تاج محل میں ممتاز محل اور شاہجہان کے مزارات کے گرد سنگ مرمر کی خوبصورت جالی ہے' جو اس کی طرف سے اپنے والدین کے لئے آخری خراج عقیدت کی گواہی ہے۔ اورنگزیب کے انتقال پر جب اس کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ معظم اور اس کے بھائی شہزادہ عظیم کے مابین بادشاہت کے لئے جدوجہد شروع ہوئی' تو سب سے زیادہ گڑبڑ کا مقام آگرہ تھا۔ ان بھائیوں نے اپنا اپنا دعویٰ کرنے کی خاطر اس کے مضافات میں بہت بڑی افواج جمع کر دیں۔ معظم کی افواج آگرہ کے نزدیک جمع ہو گئیں۔ جاٹ سردار چورامن اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ عظیم شاہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ دکن سے

روانہ ہوا۔ آگرہ کے جنوب میں کچھ فاصلے پر ایک خونریز جنگ لڑی گئی، جس میں عظیم شاہ اپنے دو نوجوان بیٹوں کے ہمراہ مارا گیا اور اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کو (جو اس وقت کمسن تھا) قیدی بنا لیا گیا۔ حاکم آگرہ مختیار خاں، جس نے اپنے سسر عظیم شاہ کا ساتھ دیا تھا، کو قیدی بنا لیا گیا۔ معظم نے شاہ عالم بہادر شاہ کے نام کے تحت اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ججن (34) میں ایک مسجد اور اقامت گاہ کی تعمیر سے اس فتح کی یاد منائی گئی۔

بہادر شاہ کے انتقال پر معمول کے مطابق اس کے بیٹوں کے درمیان بادشاہت کے لئے کشمکش شروع ہو گئی۔ مرحوم بادشاہ کے دوسرے بیٹے عظیم الشان کو سب سے بڑے بیٹے جہاندار شاہ نے شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا اس نے تخت نشین ہونے پر ذوالفقار خان کو اپنا وزیر مقرر کیا، جس نے فتح حاصل کرنے کے لئے اہم کردار ادا کیا تھا۔

عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر، جو بہادر شاہ کے انتقال کے وقت بنگال میں تھا، نے اپنے چچا سے جنگ کرنے کی خاطر الہ آباد میں ایک فوج جمع کر دی۔ اس منصوبہ میں اس کے والد کے ایک پرانے ساتھی حاکم بہار سید حسین علی اور اس کے بھائی حاکم الہ آباد سید عبد اللہ نے اس کی مدد کی۔ ایک بار پھر آگرہ کا نواحی علاقہ بادشاہت کے لئے ایک عظیم لڑائی کا میدان بن گیا۔ فرخ سیر ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور شہر کے قریب جہاندار شاہ اور اس کا وزیر ذوالفقار خاں 70،000 جوانوں کی ایک فوج کے ساتھ اس سے آن ملے۔ جنگ میں زبردست مقابلہ ہوا اور جہاندار شاہ کو شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا۔ مفتوح بادشاہ بھیس بدل کر دہلی کی طرف بھاگا، مگر اسے اس کے وزیر کے ہمراہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جنگ کا مقام کج بھاری ہے، جس کی شناخت آگرہ کے قریب دہلی کی طرف جانے والی شاہراہ پر، بج پوری سے کی گئی ہے۔(35)

فرخ سیر ابھی تک میدان جنگ میں تھا کہ اس نے یکدم بادشاہت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ، یکم جنوری 1713ء کو فجر کے وقت وہ تخت نشین ہوا اور دربار عام منعقد کیا۔(36)

ایک طاقتور زمیندار چورامن جاٹ، جو آگرہ کے مضافات میں آباد تھا، ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، جسے گزشتہ بادشاہوں کے دور میں اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ اس خاندان کو اس قدر عروج حاصل ہو گیا تھا کہ چورامن کے آباؤ و اجداد کے رویہ کی سزا دینے کے لئے شاہی فوج کو روانہ کرنا ضروری ہو گیا۔ چورامن دوبارہ سرکش ہو گیا، تو بادشاہ نے ستمبر 1717ء میں جے پور کے راجہ جے سنگھ سیوائی کو اسے سزا دینے کے لئے مقرر کیا۔ اس موقع پر بادشاہ نے راجہ کو ایک

ہاتھی' جواہرات کا ایک جوڑا اور کئی لاکھ روپے دیئے اور اسے ایک اعلیٰ فوجی منصب پر ترقی دی۔ وزیر سید عبداللہ کے بھائی سید خاں جہاں کو بھی ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ راجہ کی مدد کے لئے بھیجا گیا۔ پورے ایک سال تک جاٹوں کے قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا گیا۔ آخر کار سرکش سردار نے وزیر عبداللہ کے ذریعے اطاعت پیش کر دی اور بادشاہ کو اپنی ذاتی اطاعت پیش کرنے کے لئے دہلی روانہ ہوا۔

فرخ سیر عام طور پر آگرہ کے محل میں رہائش رکھتا تھا۔ اسے معزول کر کے 1719 میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس کے بعد سید بھائیوں کے مقررہ کردہ برائے نام بادشاہ' رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ اس کے جانشین بنے۔ ان میں سے ہر ایک نے چند ماہ حکومت کی اور ان کا انتقال ہو گیا۔ موخرالذکر کے دور حکومت میں' اس مقام کے حاکم اور افسران کے علاوہ' قلعہ کے ماتحت دیہاتوں کی رضاکار فوج نے اورنگزیب کے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ اکبر کے بیٹے نیکو سیر (جس کی بہن کی شادی رفیع القدر' یا رفیع الدولہ سے ہوئی تھی) کو قلعہ آگرہ کے قید خانہ سے باہر نکالا اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ توپوں کی سلامی سے اس کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا اور اس کے نام کے طلائی و نقرئی سکے مضروب کرائے گئے (37) آگرہ شہر کے باشندوں نے بھی شہزادہ کی حمایت کی' انہوں نے سلطنت کی جڑوں کو ہلا دینے والی آویزشوں کو دیکھتے ہوئے بخوشی اسکی حمایت اختیار کر لی۔ سید بھائی' جو فرخ سیر کے زوال کا باعث بنے تھے اور جنہیں اب بادشاہ گر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا تھا' جب دہلی کے دربار میں نیکو سیر کی تخت نشینی کی خبر پہنچی تو انہیں بہت زیادہ تشویش ہوئی۔

امیر الامراء سید حسین علی خاں نے حیدر قلی خان کو ایک فوج کے ساتھ پیشگی طور پر آگرہ کے خلاف روانہ کر دیا اور وہ خود تقریباً" 25,000 جوانوں کی ایک فوج کے ہمراہ 7 شعبان کو اس شہر کی طرف بڑھا۔ اس وقت راجہ دھیرج جے سنگھ 10'000 سواروں کی ایک فوج کے ساتھ اور راجہ بھیلہ رام نیکو سیر کے ساتھ مل گئے۔ شعبان کے اختتام پر قطب الملک سید عبداللہ' کمسن بادشاہ رفیع الدولہ کو اپنے ہمراہ لے کر مہاراجہ اجیت سنگھ' دیگر امراء اور 30'000 سے زائد سواروں کی ایک فوج کے ساتھ' دہلی سے آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ قلعہ آگرہ کا محاصرہ کر لیا گیا' مورچہ بندی کی گئی اور توپیں نصب کر دی گئیں۔ بھاری گولہ باری شروع کر دی گئی۔ چنانچہ' قلعہ کے باہر اور اندر متعدد مکانات مسمار ہو گئے۔ محاصرہ تین ماہ تک جاری رہا۔ آخر کار قلعہ میں اشیائے خورد و نوش کی قلت پیدا ہونا شروع ہو گئی تو محافظوں کو انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہتھیار پھینکنے کی تجویز کو قبول کر لیا گیا' اور انہیں زندگی و ناموس کی سلامتی کی یقین دہانی کرا دی

گئی۔ چابیاں حوالے کر دی گئیں۔ اس طرح قلعہ کا قبضہ حاصل کر لیا گیا۔ نیکو سیر اور اس کے اہم ساتھیوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ اس بغاوت کے بانی مترسین نے خنجر سے خودکشی کر لی۔

قلعہ پر قبضہ کے بعد امیر الامراء حسین علی خاں نے اس میں داخل ہو کر ان تمام خزانوں، جواہرات اور قیمتی اشیاء پر قبضہ کر لیا، جنہیں تین صدیوں سے وہاں جمع کیا گیا تھا اور جنہیں سکندر لودھی کے دور سے یکے بعد دیگرے بادشاہوں نے اکٹھا کیا تھا۔ "وہاں پہ نورجہاں بیگم اور ممتاز محل کے اثاثے بھی موجود تھے۔ مختلف اطلاعات کے مطابق، جن کی مالیت دو سے تین کروڑ روپے تک تھی۔ خاص طور پر وہاں سچے موتیوں کی ایک چادر بھی تھی، جسے شاہجہان نے ممتاز محل کے مزار کو ڈھانپنے کے لئے بنوایا تھا، اسے برسی کے موقع پر جمعہ کی رات کو اس پر بچھایا جاتا تھا، اس کی مالیت کئی لاکھ روپے تھی۔ وہاں پہ نورجہاں کا آفتابہ اور سچے موتیوں اور سنہری کام کی کشیدہ کاری سے مزین اور قیمتی یاقوتوں اور زمردوں کے حاشیہ سے آراستہ اس کا تکیہ بھی تھا"۔ (38) بڑے بھائی عبد اللہ خاں نے اس مال غنیمت سے کچھ حاصل نہیں کیا، حتیٰ کہ چارہ ناچار بعد اسے کینہ پروری کے باعث اکیس لاکھ روپے دیئے گئے۔ آگرہ کے خزانوں کے بارے میں بھائیوں کے مابین جھگڑے کا تصفیہ حسین علی خاں کے دیوان رتن چند کی مداخلت سے طے ہو گیا۔ (39)

رفیع الدولہ کے انتقال پر سید بھائیوں نے بہادر شاہ کے ایک بیٹے نجستہ اختر المعروف جہاں شاہ کے بیٹے روشن اختر کو تخت پر بٹھا دیا۔ نوجوان شہزادہ اس وقت اٹھارہ برس کی عمر کا تھا، اور اپنے چچا جہاندار شاہ کی تخت نشینی کے وقت سے، دہلی کے قلعہ سلیم گڑھ میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ تخت نشینی کی رسم فتح پور میں ادا کی گئی۔ نئے بادشاہ نے ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ پایہ تخت کو آگرہ منتقل کر دیا گیا، جہاں بادشاہ دو برس تک رہا۔ جلد ہی بادشاہ اور سید بھائیوں کے درمیان بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چن قلیچ خاں عرف آصف جاہ (جس کی اولاد دکن کے نظاموں کے طور پر مشہور ہے) جو اورنگزیب کے تحت دربار میں پروان چڑھا تھا، نے سید بھائیوں کی بالادستی کا جوا اتار کر دکن میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اب وہ برہانپور کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ سید بھائیوں نے بادل نخواستہ آگرہ خالی کر دیا۔ مگر دلاور علی خاں جو وزیر کی فوج کی کمان کر رہا تھا، اس کی زیر قیادت فوج کو شکست ہو گئی۔ اس شکست کی خبر آگرہ پہنچی تو اس سے بادشاہ اور بظاہر اس سے وابستہ تمام لوگوں کو خفیہ طور پر مگر حقیقی اطمینان ہوا، مگر اس سے دونوں بھائیوں کے لئے زبردست خوف و ہراس پیدا ہو گیا (40) تقریباً اسی وقت (اکتوبر 1720ء) ایک کرائے کے قاتل سے حسین علی خاں کو قتل کرا دیا گیا۔ زندہ بچ جانے والے بھائی عبد اللہ

نے تیمور کے گھرانے کے شہزادوں میں سے ایک کو تخت پر بٹھانے کے لئے دو اعلیٰ منصب کے امیروں کو دہلی روانہ کیا۔ چنانچہ' رفیع القدر کے بیٹے اور بہادر شاہ کے پوتے شہزادہ ابراہیم کو ابوالفتح ظہیرالدین محمد ابراہیم کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ عبد اللہ خاں نے دو روز کے بعد وہاں پہنچنے پر نئے بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس نے اپنے نام سے نئے اعزازات اور عہدے عطا کئے اور اس کی مدد کے لئے فوج جمع کرنا شروع کر دی۔ جاٹوں کا راجہ چورامن اور اس کے مرحوم بھائی حسین علی خاں کے متعدد سپاہی (جنہوں نے بادشاہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا) اس کے ساتھ مل گئے۔ دوسری طرف محمد شاہ کو راجہ جے سنگھ سیوائی کی طرف سے 4000 سواروں اور چند رو ہیلہ سرداروں کی فراہم کردہ افواج کی کمک پہنچی۔ آگرہ میں سلطنت کے دفاع کے لئے ایک فوج منظم کی گئی۔ دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ آگرہ اور دہلی کے درمیان ہوئی۔ عبد اللہ خاں کو شکست دے کر قیدی بنا لیا گیا۔ اس کی جان بخشی کر دی گئی' غالباً" اس کے مقدس شجرہ نسب کے باعث ایسا کیا گیا۔ اس فتح کے بعد محمد شاہ دہلی روانہ ہوا اور پایہ تخت بھی وہاں منتقل ہو گیا۔

مذکورہ بالا فتح کے بعد آصف جاہ کو وزیر مقرر کیا گیا۔ مگر بعد میں جلد ہی بادشاہ اور اس کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا' یوں مغلیہ بادشاہت میں تیزی سے زوال کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ سعادت خاں المعروف برہان الملک (جس کی اولاد میں سے بعد میں اودھ کے نواب بنے) کو اس کی اودھ کی حکومت کے علاوہ آگرہ کا پہلا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ اپنی سابقہ حکومت کو دیکھنے کی خواہش کے ساتھ وہ رائے نیل کنٹھ نگر ایک قابل شخص کو آگرہ میں اپنے نائب کی حیثیت سے چھوڑ کر 1722ء میں لکھنؤ روانہ ہوا۔ اس نائب کا ہمسایہ جاٹ زمیندار کے ساتھ کچھ اختلاف تھا۔ ایک روز وہ تفریح کی خاطر ایک ہاتھی پہ سوار ہو کر خدم و حشم کے ایک پر تکلف جلوس کے ہمراہ باہر گیا' اس وقت ایک جاٹ ایک بلند و بالا درخت پہ بیٹھا اپنے موقع کی تلاش میں تھا' اس نے بڑی آسانی سے بے شمار نوکروں اور خادموں کے درمیان رائے نیل کنٹھ پر اپنی بندوق کا نشانہ باندھا اور پہلی ہی گولی سے اسے ہلاک کر دیا۔ مجرم اپنا مقصد حاصل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس زیادتی کی خبر دربار میں پہنچی تو جاٹوں کے دیرینہ دشمن' جے پور کے راجہ جے سنگھ سیوائی کو آگرہ کا حاکم مقرر کر کے ان ہدایات کے ساتھ وہاں روانہ کیا گیا کہ وہ نائب حاکم کے قتل کا بدلہ لے۔

راجہ جے سنگھ جاٹوں کے سردار چورامن کے خلاف روانہ ہوا اور اس نے اس کے قلعہ تون کا محاصرہ کر لیا۔ فوری انتظام سے اس نے سردار کے خونی رشتہ داروں کے درمیان اختلاف پیدا کر کے اس کے بھتیجے بدر سنگھ کا تعاون حاصل کر لیا' جو قلعہ پر حملہ کے وقت اس سے آن

ملا۔ چورامن کے بیٹے محکم سنگھ کا اپنے باپ کے ساتھ جھگڑا ہو گیا اور اس نے بھرے دربار میں اسے گالیاں نکال دیں۔ اس چیز نے بوڑھے سردار کو اس قدر شرمندہ کر دیا کہ اس نے زہر کھا کر خود کشی کر لی۔ محکم سنگھ نے راجہ جے سنگھ کی برتر طاقت اور صلاحیتوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا' چنانچہ' اس نے اسے آنجہانی سردار کی زمینداری پر مقرر کر دیا اور دربار سے اس تقرری کی توثیق کرالی۔ (41)

1736ء میں ملہار راؤ ہولکر کی قیادت میں مرہٹہ گھڑ سوار آگرہ تک گھس آئے۔ ماسوائے سیواجی' بالاجی وشوا ناتھ کے بیٹے باجی راؤ نے (جو پیشواؤں میں سب سے قابل تھا) جمنا کے پار علاقہ میں اپنی یورشیں اور لوٹ مار بپا کر دی۔ شاہی جرنیلوں میں سے دو قابل ترین جرنیلوں' خان دوراں اور قمر الدین خاں نے باجی راؤ کے خلاف پیش قدمی کی' جبکہ اودھ کے صوبیدار سعادت خاں نے ملہار راؤ پر زبردست حملہ کیا' جس نے اسے مراجعت پہ مجبور کر دیا۔ اس کے بعد صوبیدار آگرہ کی طرف مڑا تو اس نے بادشاہ کو ایک مبالغہ آمیز خط لکھا' جس میں اس مزاحمت کو بڑھا چڑھا کر ایک زبردست فتح کے طور پر پیش کیا گیا۔

دہلی میں نادر شاہ نے لوٹ مار کے بعد صوبوں کے حاکموں سے خراج وصول کئے۔ چنانچہ' آگرہ نے اپنا حصہ بھی پیش کیا۔ 1748ء میں بادشاہ محمد شاہ کے انتقال کے بعد جاٹوں کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا' لہٰذا اس کے بیٹے اور جانشین احمد شاہ کے دور میں مشہور زمانہ چورامن کے بھتیجے سورج مل نے اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ اس نے اودھ کے صوبیدار سعادت خاں کے بیٹے صفدر جنگ کی حقیقی معنوں میں مدد کی' جسے روہیلوں کے خلاف وزیر مقرر کیا گیا تھا' انھیں گھمسان کی جنگ میں شکست دے کر ہمالیہ کے زیریں پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا گیا۔ اس کے بعد' جلد ہی وزیر صفدر جنگ اور بادشاہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا' جس نے آصف جاہ کے پوتے غازی الدین کو سپہ سالار کے اعلیٰ منصب پر ترقی دے دی تھی۔ اس اقدام کا نتیجہ خانہ جنگی پر ہوا' مگر وزیر نے صلح کرنے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ بادشاہ اب غازی الدین کے تکبر سے متنفر ہو گیا اور اس نے اس کے خلاف سازش کی۔ مگر اسے معزول کر کے قیدی بنانے کے بعد بصارت سے محروم کر دیا گیا۔

بہادر شاہ (شاہ عالم اول) کے پوتے اور جہاندار شاہ کے بیٹے عز الدین کی عالمگیر ثانی کے لقب کے تحت بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا اور غازی الدین کو اس کا وزیر مقرر کیا گیا۔ اس انقلاب کے فوراً" بعد صفدر جنگ انتقال کر گیا۔ لہٰذا اودھ کی صوبیداری پر شجاع الدولہ اس کا جانشین بنا۔

احمد شاہ درانی کے تیسرے حملہ کے دوران' اس فاتح نے دہلی کی طرف پیش قدمی کرنے کے بعد اپنے وزیر ولی خاں کی قیادت میں آگرہ اور متھرا کی طرف ایک مہم روانہ کی اور آگرہ کا محاصرہ کو لیا۔ اس وقت درانی بادشاہت کے ایک سرکردہ سردار جہان خاں کو جاٹوں سے خراج وصول کرنے کے لئے روانہ کیا گیا' اس نے جاٹوں کے ایک قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ آگرہ کے مغل حاکم فاضل خاں نے انتہائی دلیری سے شہر کا دفاع کیا' مگر گرمیوں کے موسم میں بہت زیادہ شدت پیدا ہو جانے کے باعث درانی فوج میں اموات واقع ہونا شروع ہو گئیں تو شاہ ولی خاں واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔ حملہ آوروں نے متھرا شہر کے مضافات میں اچانک حملہ کر کے اپنے نقصان کی تلافی کر لی' انہوں نے ایک مذہبی تہوار پر اس میں لوٹ مار مچا دی اور بے یارومددگار پجاریوں کو عمر اور جنس کا لحاظ رکھے بغیر تہ تیغ کر دیا۔ ان کارروائیوں کے بعد احمد شاہ ابدالی اپنی آبائی سلطنت کی طرف لوٹ گیا۔ (42)

احمد شاہ ابدالی اس ملک سے لوٹنے پر ایک قابل اور صاحب کردار روہیلہ امیر نجیب الدولہ کو شاہی افواج کا سپہ سالار مقرر کر چکا تھا۔ اس چیز نے غازی الدین کے حسد کی آگ کو بھڑکا دیا۔ اس نے ملہار راؤ ہولکر کی قیادت میں مرہٹوں کو بادشاہ کے خلاف اپنی مدد کے لئے بلا لیا۔ نجیب الدولہ اپنے وطن سہارنپور کی طرف لوٹ گیا۔ ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد دہلی کے شاہی قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ بادشاہ نے دروازے کھول دیئے اور غازی الدین کا اپنے وزیر کی حیثیت سے استقبال کیا۔ اسی دوران ایک مرہٹہ حاکم نے قلعہ آگرہ کا انتظام سنبھال لیا۔

اب وزیر غازی الدین نے بادشاہ کے خلاف سازش کی اور جب وہ ایک انتہائی تقدس مآب درویش (جس کے بارے میں باور کرایا گیا کہ وہ دہلی کے قریب قلعہ فیروز آباد کے کھنڈرات میں ٹھہرا ہوا ہے) سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہوا اور اسے خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اپنی پالکی سے نیچے اترا تو اس نے ایک وحشی ازبک کے ذریعے اسے قتل کرا دیا۔

مرحوم بادشاہ کے بیٹے علی گوہر کو شاہ عالم ثانی کے لقب کے ساتھ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ مرہٹوں کی طاقت اب اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی' ان کی سرحد شمال میں دریائے سندھ اور ہمالیہ تک اور جنوب میں تقریباً" جزیرہ نما کی حدود تک پھیل چکی تھی۔ (43) مگر احمد شاہ ابدالی نے جنوری 1761ء میں پانی پت کے مقام پر لڑی جانے والی مشہور لڑائی میں ان پر ایک مہلک ضرب لگائی۔ نجیب الدولہ' جسے ابدالی بادشاہ نے سپہ سالار مقرر کیا تھا' نے انتہائی طاقت اور کامیابی کے ساتھ زوال پذیر سلطنت کے معاملات کا انتظام کیا۔ وہ آپ کے اضلاع سے مرہٹہ ضلعداروں کو

نکال باہر کر کے آگرہ میں جاٹ حفاظتی فوج کو داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ (44) سورج مل جس نے 30'000 جاٹوں کی ایک فوج کے ساتھ مرہٹہ پیشوا کو کمک بھیجی تھی' پانی پت میں مرہٹوں کی تباہی کا باعث بنا: اس نے آگرہ کے اہم قلعہ کے مرہٹہ حاکم کو معزول کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور وہاں جاٹ فوج تعینات کر دی۔ اس وقت بدنام زمانہ والٹر رینہارٹ (سمرو) سردار کے ساتھ مل گیا' جو ایک فوجی دستہ اور چند توپوں کے ساتھ اپنے سابقہ محسن اودھ کے نواب وزیر کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شریر جاٹوں کے قبضہ کے دوران سکندرا کے دروازوں کے مینار اڑا دیئے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مقبرہ میں مقدس نوادرات کے طور پر رکھے جانے والی زرہ بکتر اور کتابوں کو اڑا لیا گیا اور مشہور زمانہ تاج محل کے عظیم الشان نقرئی دروازے بھی چرا لئے گئے' جن کی قیمت ایک لاکھ روپے سے زائد بتائی جاتی ہے۔

اس کے بعد جلد ہی سورج مل اور مغلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ سورج مل دہلی سے چھ میل کے فاصلہ پر شاہدرہ کے مقام پر ایک جنگ میں مارا گیا۔ اس کے سر کو مغلیہ فوج کے جھنڈے کے طور پر ایک گھڑ سوار کے نیزے پر لٹکا دیا گیا۔ اس کا بیٹا جواہر سنگھ اس کا جانشین بنا' جس نے آگرہ میں رہائش اختیار کر لی' تھوڑے ہی عرصہ بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے اسے جے پور کے راجہ کے اشارے پر ہلاک کیا گیا۔

ایک مرتبہ جب جواہر سنگھ نے آگرہ میں جہانگیر کے سیاہ سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھنے کا خیال کیا تو روایت کے مطابق پتھر کے درمیان ایک لمبی دراڑ پڑ گئی۔

اس وقت جاٹوں کی طاقت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ان کا دارالحکومت بھرت پور میں تھا اور ان کا علاقہ شمال مغرب کی طرف الور اور جنوب مغرب کی جانب آگرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پورے علاقہ پر سورج مل کے زندہ بچ جانے والے بیٹے رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ مرہٹے دوبارہ نمودار ہوئے اور انہوں نے 1770ء میں پورے دوآب پر قبضہ کر لیا۔ 1772ء میں انہوں نے آگرہ سے ایک فوج روانہ کی' جس نے بھرت پور کے جاٹوں سے مل کر شاہی فوجوں کو دہلی کی طرف مراجعت کرنے پر مجبور کر دیا۔

1773ء میں مادھو راؤ پیشوا کے انتقال کے باعث مرہٹہ فوجوں کی جنوب کی طرف واپسی پر مرزا نجف خان نے دہلی میں وزیر کا منصب سنبھالا اور اودھ کے وزیر شجاع الدولہ کی مدد سے ان کی فوج کو آگرہ اور ان صوبوں سے نکال دیا' جن پر ابھی تک بادشاہ کا قبضہ تھا۔ (45) جاٹوں نے آگرہ بازیاب کرا لیا تھا' مگر 1774ء میں وزیر نے انہیں بھی بے دخل کر دیا۔ شاہی وزیر نے ان سے قلعہ آگرہ چھین لیا اور ایک مغل افسر محمد بیگ ہمدانی کی قیادت میں اس میں اپنی حفاظتی

فوج تعینات کر کے اس پر قبضہ کر لیا' جس نے اگلے دس برس تک آگرہ کے حاکم کا عہدہ سنبھالے رکھا۔ نجف خاں اپنے باتحتو مغلوں اور ایرانیوں کے جلو میں صوبیداری شان و شوکت کے ساتھ آگرہ میں زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کے اہم ماتحت اس کا متبنیٰ بیٹا' سرو' نجف قلی (ہندو سے مسلمان ہونے والا) محمد بیگ ہمدانی اور وزیر کا بھتیجا مرزا شفیع تھے۔

سرو کا انتقال 4 مئی 1778ء کو آگرہ میں اور مرزا نجف خاں کا انتقال دہلی میں ہوا' جہاں حلیم الطبع بادشاہ شاہ عالم نے اسے 20 اپریل 1782ء کو بلوایا تھا۔ مرزا نے کافی عرصہ تک آگرہ کے صوبہ اور جاٹ علاقوں کے فالتو محصولات کی وصولی کے ساتھ براہ راست ملکی انتظام سنبھال رکھا تھا۔

وزیر کے انتقال پر مرحوم کے ایک قریبی رشتہ دار افراسیاب خاں کو امیر الامراء کے خطاب کے ساتھ وزیر منتخب کر لیا گیا۔ اب مرحوم وزیر کے پیچھے رہ جانے والوں میں مقابلہ بازی شروع ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں ایک انتہائی وحشت ناک سانحہ پیش آیا۔ 23 ستمبر 1783ء کو مرحوم وزیر کے بھتیجے مرزا شفیع کو (جو اس وقت آگرہ میں تھا) محل میں داخل ہونے سے روک دیا گیا' کیونکہ وہ سیر سپاٹا کے بعد واپس آیا تھا۔ افراسیاب خاں کو اس اہانت کا ذمہ دار گردانتے ہوئے مرزا نے اس کے خلاف مخالفانہ رویہ اختیار کر لیا۔ بعد ازیں' اس جھگڑے کا صلح صفائی کے ساتھ تصفیہ کرنے کی خاطر قلعہ کے دہلی دروازہ کے سامنے مرزا اور محمد بیگ ہمدانی کے درمیان ایک میدان میں ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ جیسے ہی وہ ہاتھی' جن پر دونوں امراء بیٹھے ہوئے تھے ایک دوسرے کے قریب آئے تو مرزا نے خوش آمدید کہنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا' اس پر محمد بیگ نے فوراً" اپنی پستول پکڑ کر اس کے بازو کے نیچے فائر کیا اور اسے ہلاک کر دیا۔ بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ جواں بخت کے بیان کے مطابق' کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب ایک مصاحب نے کیا تھا' جو حودا کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا' غالباً" وہ ہمدانی کا بھتیجا اسماعیل بیگ تھا۔

1784ء میں مغلوں اور مادھوجی سندھیہ کی متحدہ افواج باغی حاکم محمد بیگ کو سزا دینے کے لئے آگرہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ بادشاہ نے بذات خود آگرہ کی طرف روانہ ہونے کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا' مگر وزیر خزانہ نجیب الدولہ نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ نومبر 1784ء میں مرزا شفیع کے بھائی زین العابدین نے وزیر اعظم افراسیاب خاں کو قتل کر کے اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لے لیا۔

اس کی موت نے معاملات کو سہل بنا دیا' چنانچہ' اس کی بنائی ہوئی جماعت حوصلہ ہار گئی۔

محمد بیگ نے اپنے سپاہیوں کا ساتھ چھوٹ جانے پر خود کو سندھیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ قلعہ آگرہ 27 مارچ 1785ء کو حوالے کر دیا گیا اور افراسیاب خاں کی ایک کروڑ روپے مالیت کی جائیداد فاتح کے ہاتھ لگ گئی۔ اب سندھیہ کو ہندوستان میں بالادستی حاصل ہو گئی۔

1787ء میں سندھیہ کی قیادت میں مرہٹوں اور جے پور کے راجہ پرتاپ سنگھ' جودھ پور کے راجہ جے سنگھ' اودھے پور کے رانا اور میواڑ کے دیگر چھوٹے سرداروں کی متحدہ فوج کے درمیان ایک جنگ لڑی گئی۔ مرہٹوں کی جانب امباجی' انجیا' لپا کھنڈی اور جنرل ایم ڈی بونیگنے تھے۔ محمد بیگ اور اس کا بھتیجا اسماعیل بیگ (ایک نڈر سردار) متحدہ سرداروں کی طرف مغلیہ گھڑسوار فوج کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ جنگ جے پور کے علاقہ کے اندر لال سوتی کے مقام پر لڑی گئی۔ محمد بیگ مارا گیا' مگر مرہٹوں کی حالت بری ہو گئی اور وہ الور کی طرف پلٹ گئے۔ اسماعیل بیگ ایک ہزار سواروں' چار پلٹنوں اور چھ توپوں کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس پر سندھیہ نے جاٹوں کے راجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ شرائط طے کیں اور قلعہ آگرہ کو مضبوط کمک پہنچائی' جس کی حفاظتی فوج کو اس کے ایک بہترین جرنیل لکوا دادا کی کمان میں دے دیا گیا تھا۔ (46)

1787ء کے موسم برسات کے اختتام پر ایک اور شخصیت منظر عام پر نمودار ہوئی۔ یہ ایک روہیلہ سردار ضابطہ خاں کا بیٹا غلام قادر تھا' جس نے دہلی دربار میں امیرالامراء کے رتبہ کی خواہش کی تھی۔ مذہب کی آڑ میں اس نے مسلمانوں کے حق کو بحال کرنے کی زبردست کوشش کی اور اس کوشش میں اسماعیل بیگ نے اس کی مدد کی' بادشاہ جو اس وقت ابھی تک مرہٹوں کے حق کی حمایت کر رہا تھا' معلوم ہوا کہ اس نے راجپوت سرداروں کے ساتھ خط و کتابت کی ہے' جنہوں نے اس کے کچھ ہی دیر بعد مرہٹوں کو ایک اور بھاری شکست سے دو چار کر دیا۔ اس پر سندھیہ اپنی فوج کو لکوا دادا کی قیادت میں قلعہ آگرہ میں بند کر کے گوالیار کی طرف لوٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اسماعیل بیگ نے قلعہ آگرہ کا تنگ محاصرہ کر لیا۔ ان کارروائیوں کے بعد غلام قادر اپنے سرکردہ ساتھیوں کے ذریعے شاہ عالم سے متعارف ہوا' جس نے اسے امیرالامراء کے رتبہ سے سرفراز کیا' بادشاہ نے بذات خود اس کے سر پر جواہرات سے مزین سربند باندھا۔

تب' غلام قادر اپنی افواج اور آگرہ کے سامنے اسماعیل کی افواج میں اشتراک پیدا کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ محاصرہ چند ماہ تک جاری رہا۔ جس وقت یہ کارروائیاں ہو رہی تھیں' آگرہ میں 88-1787ء کے موسم سرما کے اختتام پر یہ خبر پہنچی کہ سندھیہ نے دکن سے ملنے والی بہت بڑی کمک کے ساتھ چنبل کو عبور کر لیا ہے۔ اسماعیل بیگ اور غلام قادر نے فی الفور آگرہ کا محاصرہ

اٹھایا اور مرہٹوں کی آگے بڑھتی ہوئی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ 24 اپریل 1788ء کو فتح پور سیکری کے قریب بھرت پور کی سڑک پر ایک زبردست لڑائی لڑی گئی' جس میں رانا خاں کی قیادت میں مرہٹوں کو شکست ہوئی' وہ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بھرت پور کی طرف فرار ہو گئے۔ اس کے بعد غلام قادر شمال کی طرف بڑھا' جبکہ اسماعیل بیگ نے آگرہ کا دوبارہ محاصرہ کر لیا۔

جودھ پور کے راجپوت راجگان کی طرف سے ایک سفارت کے ذریعے ایک اچھی خاصی نذر اور اجمیر کے قلعہ کی طلائی چابی کی پیشکش کے لالچ میں آ کر بزدل شاہ عالم نے سندھیہ اور اپنے وزیر کے خلاف فوری اقدامات اٹھائے۔ اس نے مرزا جواں بخت کو آگرہ کا برائے نام حاکم مقرر کیا۔ اس شہزادے نے اسماعیل بیگ کی مدد سے قلعہ اور صوبہ پر قبضہ کرنے کے لئے زبردست کوششیں کیں۔ اس کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور غلام قادر نے اس پر حملہ کیا مگر وہ بال بال بچ گیا اور برطانوی علاقہ بنارس کی طرف فرار ہو گیا' جہاں 1788ء میں شکستہ دلی کے باعث انتقال کر گیا۔

مرہٹہ جرنیل لکوا دادا ابھی تک قلعہ آگرہ میں قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ رانا خاں نے ہتھیل کے مقام پر دکن سے ایک تازہ دم فوج کے ساتھ سندھیہ سے اشتراک کر لیا تو سندھیہ کمک پا کر ایک مرتبہ پھر اپنے جرنیل کی مدد کے لئے روانہ ہوا۔ اس موقع پر مشرق کی طرف سے حملہ کیا گیا۔ اسماعیل بیگ نے سواروں کے ایک غضبناک حملہ کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا' تاہم اس سے پہلے کہ غلام قادر جمنا پار کر کے مغلوں کے ساتھ شامل ہوتا' جنرل ڈی بوئیگنے کی قیادت میں مرہٹہ پیدل اور سوار فوج نے مسلمانوں کی فوج کو پسپا کر دیا۔ اس لڑائی میں اسماعیل بیگ بری طرح زخمی ہو گیا اور بپھرے ہوئے دریا کو عبور کر کے فرار ہو گیا۔ (جون 1788ء)

غلام قادر اور اسماعیل بیگ دونوں اتحادیوں نے دہلی کے قریب شاہدرہ کے مقام پر اپنی بکھری ہوئی فوج کو جمع کیا۔ اس منظر نے سورج مل کی شکست کی یاد تازہ کر دی ہو گی۔

غلام قادر نے سندھیہ کا جوا اتار پھینکنے کے لئے شاہ عالم سے گفت و شنید کی تو بادشاہ نے اس کے مشورہ پر عمل کرنے سے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا اس دیدہ دلیر شخص نے ہر قسم کا بھیس اتار کر دہلی کے محل پر گولہ باری شروع کر دی۔ مادھوجی سندھیہ نے چھوٹی چھوٹی امدادی افواج کمک کی صورت میں بھیجیں' مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور اتحادیوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ کو معزول کر کے اندھا کر دیا گیا۔ (10 اگست 1788ء) آئندہ مارچ میں مرہٹہ نے غلام قادر کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور 1792ء میں اسماعیل بیگ کو آگرہ میں قید خانہ میں ڈالنے کے لئے روانہ کر

دیا گیا' جہاں وہ اسی سال اپنے انتقال تک رہا۔

1799ء میں مرہٹہ حاکم کی بغاوت کے باعث' سندھیہ کی ملازمت میں جنرل پیرن نے تقریباً" دو ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ایک ولندیزی افسر جان ہیسنگ چند سال تک آگرہ کا کمانڈار رہا۔ اس نے 1803ء میں قلعہ میں انتقال کیا۔ (47)

11 ستمبر' 1803 کو جنرل (بعد میں لارڈ) لیک کی حاصل کردہ فیصلہ کن فتح سے دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ 14 ستمبر کی یادگار تاریخ کو انگریز فوج نے اس سورما کی قیادت میں جمنا کو پار کیا اور دہلی میں داخل ہو گئی۔ بدقسمت بوڑھے نابینا بادشاہ شاہ عالم کو قید سے رہائی دلائی گئی اور اس کی آزادی اور رتبے کو بحال کر دیا گیا۔ 24 ستمبر کو جنرل لیک اپنی فوج کے ہمراہ دہلی سے آگرہ کی طرف روانہ ہوئے۔

4 اکتوبر کو آگرہ پہنچنے پر وہ قلعہ سے طویل توپ کے گولہ کے فاصلے پر خیمہ زن ہو گئے۔ اس وقت ولندیزی افسر جان ہسنگ اور تقریباً" چھ دیگر فرانسیسی اور یورپی جانبازوں کی برائے نام قیادت میں آگرہ کی حفاظتی فوج' 4,500 لڑاکا جوانوں پر مشتمل تھی' مگر سپاہیوں نے ان پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے بغاوت کر دی اور انہیں قید میں ڈال دیا۔ اس فوج کے علاوہ قلعہ کے اندر سپاہیوں کی تین پلٹنیں' جنہیں دہلی میں شکست دی گئی تھی اور 26 توپوں کے ساتھ میجر براؤن رگ کی زیر کمان حال ہی میں دکن سے پہنچنے والی پیرن کے پانچویں بریگیڈ کی چار پلٹنیں بھی تعینات تھیں۔ حفاظتی فوج نے انہیں داخلے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا' کیونکہ قلعہ میں 25 لاکھ روپے کا خزانہ موجود تھا' جو ملک کی لوٹ مار سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر انہیں داخلہ کی اجازت دے دی گئی تو لوٹ مار کا سامان ان کے ساتھ بانٹنا ہو گا۔ چنانچہ' فوج نے شہر اور پشتے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ دہلی کی سڑک پر باقاعدہ فوج کی بارہ پلٹنوں نے محاصرہ فوج کے عقب میں مورچہ سنبھال لیا' اس کا مقصد یہ تھا کہ محاصرہ کی طوالت کی صورت میں بادشاہی شہر کو بچایا جا سکے۔

آزمودہ کار برطانوی جنرل نے معاملات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اپنی فہم و فراست اور قوت ارادی کے ساتھ محاصرہ کا آغاز کرنے سے پیشتر قلعہ کے باہر موجود فوج کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا' تاکہ انہیں شہر اور فصیل سے نکالا جا سکے۔ چنانچہ' 10 اکتوبر کی صبح کو شہر پر حملہ کرنے کے لئے بریگیڈیئر جنرل کلارک کی قیادت میں مقامی پیدل فوج کی دو پلٹنیں علیحدہ کیں' ایک پلٹن قلعہ کے مغرب کی طرف سے دشمن پر حملہ کرنے کے لئے کرنل میک کولو کی قیادت میں اور دوسری پلٹن جنوبی طرف سے ان پر حملہ کرنے کے لئے کیپٹن ورسلے کی قیادت میں۔

دشمن نے چند روز تک تیز اور سخت مزاحمت کی' مگر آخر کار انہیں شکست دے کر ان کے مورچہ سے نکال دیا گیا۔ انگریزوں کی جانب 213 افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ دشمن کے 600 افراد مارے گئے۔ ان کی تمام توپیں' جن کی تعداد 26 تھی' قبضہ میں لے لی گئیں۔ اس شکست نے دشمن کا حوصلہ اس قدر پست کر دیا کہ انہوں نے اس شرط پر برطانوی جرنیل کے آگے ہتھیار ڈال دیئے کہ انہیں سندھیہ کی ملازمت میں ملنے والی تنخواہوں کے برابر تنخواہ پر حکومت برطانیہ کی ملازمت میں لے لیا جائے گا۔

شہر پر قبضہ کے بعد برطانوی جرنیل نے فوراً قلعہ کے خلاف محاصرہ کی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ 16 اپریل کو توپوں سے ملی جلی گولہ باری کی گئی' مگر اگلے روز قلعہ کی فوج نے قلعہ حوالے کرنے کی شرائط پر صلح کرلی۔ کچھ دیر بحث مباحثہ کے بعد شرائط کو منظور کر لیا گیا اور 18 تاریخ کو قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس فتح کے ذریعے قلعہ میں جمع شدہ 25 لاکھ روپیہ اور 162 توپیں فاتحین کے ہاتھ لگیں۔ ان توپوں میں پیتل کی ایک بہت بڑی توپ بھی تھی' جو تاریخ میں آگرہ کی عظیم توپ کے نام سے مشہور ہے۔ گورنر جنرل نے اسے بادشاہ جارج سوئم کو فتح کی نشانی کے طور پر پیش کرنے کی خاطر انگلستان روانہ کرنے کا ارادہ کیا' لہٰذا توپ کو ایک کشتی پر لاد دیا گیا' مگر وہ جمنا کے گہرے پانی میں ڈوب گئی اور اس کے بعد اسے کبھی باہر نکالا نہ جا سکا۔

لیفٹیننٹ گورنر کے عہدہ کا قیام

نئے فتح کیے گئے ضلع آگرہ کو 1805ء میں ایک ضلعدار کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ شامل کردہ اور فتح کیے گئے صوبوں کے لئے حکومت کا صدر مقام کمشنروں کے ایک بورڈ کی قیادت میں فرخ آباد میں مقرر کیا گیا' آگرہ کی ضلعداری کو اس کا ماتحت بنا دیا گیا۔

1833ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ازسرنو تجدید شدہ اقرار نامہ کے تحت 1835ء میں شمال مغربی صوبہ جات کے لئے آگرہ میں پہلے لیفٹیننٹ گورنر کے عہدہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آگرہ کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس میٹکاف تھے اور آگرہ بائیس برس کے عرصہ تک شمال مغربی صوبہ جات کا دارالحکومت رہا۔

1838ء میں شمال مغربی صوبہ جات اور پنجاب میں ایک زبردست قحط پڑ گیا' اسی برس عیسائی مشنریوں نے سکندرا خیرات گھر کے نام سے مشہور ایک خیراتی ادارہ قائم کیا۔

حکومت برطانیہ کے مضبوط اور خوشحال دور کے تحت آگرہ کی تاریخ میں 1857ء کی فوجی بغاوت تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس وقت تشکیل شدہ آگرہ کا صوبہ دہلی کے ضلع

پر مشتمل تھا' لہٰذا بغاوت کی خبر میرٹھ سے آگرہ پہنچائی گئی' جس کا شمار اس کی ماتحت ضلعداریوں میں ہوتا تھا۔ حکومت کا پایہ تخت ہونے کے باعث اس عظیم بحران کی خبر آگرہ سے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو پہنچائی گئی' انہوں نے انتہائی اطمینان سے اس خبر کو سنا اور ملک میں امن و امان بحال کرنے کی خاطر تدابیر اختیار کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ اس وقت حکمران لیفٹیننٹ گورنر مسٹر جان رسل تھے' جن کا شمار ملک کے قابل ترین اور انتہائی ہوشیار افسران میں ہوتا تھا۔ وہ عوام کی توقعات پر پورا اترے۔ کانپور اور فرخ آباد سے تشویش ناک بیانات موصول ہونے پر آگرہ میں سرکردہ انتظامی اور فوجی افسروں کا ایک اجلاس بلایا گیا' اس میں جملہ عیسائی خاندانوں کو قلعہ میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 31 مئی کی صبح کو اس مقام کی مقامی رجمنٹوں کو غیر مسلح کیا گیا۔ جولائی کے آغاز میں وہ باغی آگرہ کی طرف بڑھے' جنہوں نے نیمچ اور نصیر آباد میں بغاوت برپا کر دی تھی' ان کی تعداد 4000 پیادہ' 1500 سوار فوج اور 11 توپوں پر مشتمل تھی۔ بریگیڈیئر پولوہیل ایک مختصر فوج کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے' شہر کے مضافات میں سوچیتا کے مقام پر ایک تیز جھڑپ ہوئی' جس میں انگریزی فوج کو مراجعت پر مجبور کر دیا گیا۔ شہر کے ہجوم نے اس کے بعد ہونے والے ہنگامہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یکدم بغاوت کر دی' شہر میں لوٹ مار مچا کر بے شمار یورپی باشندوں کو ہلاک کر دیا۔ بنگلوں پر گولہ باری کی گئی اور سرکاری دفاتر کو نذر آتش اور مسمار کر دیا گیا' نیز 6 جولائی کو مقامی کوتوال نے دہلی کے بادشاہ کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ تاہم' باغی شہر میں داخل نہیں ہوئے مگر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہونے کے لئے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیفٹیننٹ گورنر اس بیماری کا لقمہ بن گئے' جس کے باعث وہ کافی عرصہ سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ ان کی نعش کو دیوان عام کے سامنے دفن کر دیا گیا۔ انگریز افسران تین ماہ تک قلعہ میں بند رہے' جبکہ مختلف مقامات سے باغیوں کے خلاف گاہے بگاہے حملے کئے جاتے رہے۔

ستمبر میں دہلی کے قبضہ پر اس شہر کے مفرور اور وسطی ہند کے باغی آگرہ کی طرف بڑھے۔ اسی دوران کرنل گریٹ ہیڈ کی فوج باغیوں سے جنگ کرنے کے لئے بروقت پہنچ گئی' جنہیں ایک مختصر لڑائی کے بعد شکست فاش دے دی گئی وہ منتشر ہو کر تیزی سے فرار ہو گئے۔ شہر اور اس کے گردونواح میں امن و امان بحال کر دیا گیا۔ آئندہ اکتوبر میں میجر کاٹن کی قیادت میں فوج نے فتح پور سیکری کے باقی مفروروں کی باقیات کو ایک بھاری شکست سے دوچار کیا' چنانچہ' پورے ضلع میں امن و امان بحال کر دیا گیا۔

بغاوت کے دنوں سے آگرہ ایک عظیم ہندوستانی شہر کی صورت اختیار کر کے بالائی

ہندوستان میں ریلوے نظام کا مرکز بن گیا۔ 1861ء میں ضلع آگرہ میں ایک زبردست قحط پڑ گیا۔ 1867ء میں آگرہ میں پہلی صنعتی نمائش منعقد ہوئی' جس میں ضلع کی تیار کردہ مصنوعات اور قدرتی اجناس کی بہت بڑی تعداد میں نمائش کی گئی۔

دارالحکومت کی منتقلی:

1868ء میں شمال مغربی صوبہ جات کے صدر مقام کو آگرہ سے الہ آباد منتقل کر دیا گیا' (جہاں سے اسے 1835ء میں منتقل کیا گیا تھا) اور ہائی کورٹ نے اپنی باری پر مئی 1869ء میں اپنا صدر دفتر آگرہ سے الہ آباد منتقل کر لیا۔ اس وقت سے آگرہ ایک ڈویژن اور ضلع کے صدر مقام کی حیثیت سے رتبہ میں کم ہو کر ایک صوبائی شہر بن گیا۔ اس کے باوجود مشرق کے بہترین شہروں میں سے ایک شہر کی حیثیت سے اس کو شہرت حاصل ہے۔

1860ء کے موسم سرما کے دوران لارڈ کیننگ نے وائسرائے کی حیثیت سے شمالی صوبہ جات کا دورہ کیا' لہٰذا راجپوتانہ اور وسطی ہندوستان کے وفادار سرداروں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا' ہزایکسی لینسی نے بغاوت کے دوران ان کی نمایاں خدمات کے عوض ان کے لئے انعامات کا اعلان کیا۔

چین میں ملکہ عالیہ کے مختار کل سفیر لارڈ ایلجن (48) جنہوں نے وہاں پر معاملات کو بڑی کامیابی سے نپٹایا تھا' مارچ' 1862ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے لارڈ کیننگ کے جانشین بنے۔ 1863ء کے موسم سرما میں لارڈ ایلجن نے آگرہ میں اپنے پیشرو کی طرح راجپوتانہ اور وسطی ہندوستان کے سرداروں کے لئے ایک عوامی استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ یہ ایک انتہائی پرشکوہ نظارہ تھا' جس میں آگرہ اور ارد گرد کے علاقہ کے امراء اور شرفاء اپنی ملکہ کے نمائندے کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ آگرہ ہی سے انہوں نے ہمالیہ کا سفر اختیار کیا' ملک کے لئے یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ وہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

سر (بعد میں لارڈ) جان لارنس نے نومبر' 1866ء میں آگرہ میں گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنا عظیم دربار منعقد کیا۔ یقیناً یہ مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے اس دربار کے مقابلہ میں زیادہ جاذب نظر تھا' جو انہوں نے کچھ عرصہ پیشتر اسی طرح کی تاریخی اہمیت کے شہر لاہور میں منعقد کیا تھا۔ راجپوتانہ اور بندیل کھنڈ کے 84 سرداروں نے ان کے بلاوے کا جواب دیا۔ وہاں پر اس منظر کا نظارہ کرنے کے لئے تقریباً 350 سردار اور مقامی شرفاء کے علاوہ مکمل طور پر 1,00,000 افراد آگرہ اور اس کے ارد گرد جمع ہوئے۔ وہاں پر جمع ہونے والے شہزادوں میں دو عظیم مرہٹہ گھرانوں میں سے ایک کا سردار مہاراجہ سندھیہ بھی موجود تھا۔ اس کے بعد دو پرانے راجپوت

خاندانوں جودھ پور اور جے پور کے روسا اور بھوپال کی مشہور زمانہ بیگم آئی۔ خلعت بخشی کے دربار میں جودھ پور اور کرولی کے مہاراجوں کو نائیٹس گرینڈ کراس آف دی سٹار آف انڈیا بنا دیا گیا۔ کرولی کا مہاراجہ بغاوت کے دوران نمایاں طور پر وفادار رہا اور وہ باغیوں کے ساتھ لڑا۔ بلرام پور کے مہاراجہ نے اودھ میں سرچارلس ونگ فیلڈ اور دوسروں کی جان بچائی تھی اور موراسو کے راجہ نے بھی کانپور سے آنے والے مفروروں کے ساتھ ایسا ہی کیا' انہوں نے سرجان لارنس سے اپنے اپنے اعزازات حاصل کئے' جنہوں نے اپنی ایک مختصر تقریر میں ہر ایک کی خدمات کو بڑی گرمجوشی سے سراہا۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک برطانوی وائسرائے نے وہاں پر موجود سرداروں اور شرفاء سے ان کی اپنی زبان میں خطاب کیا۔ ہزایکسی لینسی کی بزبان اردو تقریر اپنی نوعیت کا ایک نمونہ تھی۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوستانہ اور مشفقانہ' خلق دوست اور سنجیدہ ہونے کے باعث اس نے اپنے سامعین پر ایک گہرا تاثر مرتب کیا اور اسے انتہائی توجہ سے سنا گیا۔ جمع ہونے والے تمام افراد کا اس مشہور شہر میں دلی طور پر خیر مقدم کرنے کے بعد (جو اپنے پر شکوہ تاج محل کے باعث مشہور تھا اور سب سے بڑھ کر گزشتہ ادوار میں یہ اس عظیم بادشاہ کا پایہ تخت رہ چکا تھا' جس سے اس نے اپنا نام "اکبر آباد" حاصل کیا) سرجان لارنس نے کہا:۔

"عظیم آدمی جب زندہ ہوتے ہیں تو اکثر ان کے دوست اور ساتھی ان کے ان اچھے کاموں یا خصائل کی تعریف کرتے ہیں' جو ان میں موجود نہیں ہوتے' اصل سچ کے سوا اس زندگی کے بعد ہر چیز کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس جیسے آدمی جس قسم کی بھی شہرت حاصل کرتے ہیں' ان میں سب سے زیادہ قابل قدر ایک منصف اور خیر خواہ حکمران کی شہرت ہے" سرجان لارنس کی تقریر ہمدردانہ مشورہ اور نصیحت سے بھرپور ہے۔ انہوں نے کہا "فاتحوں اور سورماؤں کے نام فراموش کر دیئے گئے ہیں' مگر ان میں سے نیک اور دانشمند سرداروں کے نام ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ہندوستان سے اب جنگ اور غارت گری کے دن چلے گئے ہیں' جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ یہاں موجود چند سرداروں کو وہ وقت یاد ہو گا اور یقیناً سبھی نے یہ سنا ہو گا کہ غارت گروں اور فسادیوں کے ہاتھوں سے نہ تو کسی حکمران کا محل' نہ کسی کسان کی جھونپڑی اور نہ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کی انتہائی مقدس عمارات محفوظ تھیں۔ ان دنوں تمام صوبوں میں غارت گری اور ظلم و جبر کا بازار گرم تھا: نیز' ملک کے وسیع و عریض خطوں میں کسی ایک واحد گاؤں میں بھی مشکل ہی سے ایک آدھ چراغ جلتا تھا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت نے ان سب کا خاتمہ کر

دیا ہے۔ اب کوئی ویرانہ یا اجاڑ بیابان باقی نہیں ہے۔ اب کافی حد تک یہ گنجان آباد دیہاتوں سے آباد ہو گیا ہے اور ہر جگہ بہت زیادہ سبزہ دکھائی دیتا ہے' جبکہ یہاں کے باشندے اب انگریزی حکومت کے زیر سایہ مقابلتاً" حفاظت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔" سرجان نے سرداروں کو مشورہ دیا کہ "وہ اپنے ہمسائیوں کے ساتھ جھگڑوں اور اپنے جاگیرداروں کے ساتھ فسادات اور ابھی تک کم تسلی بخش طریقوں میں اپنا وقت ضائع مت کریں۔ اگر کوئی سردار اپنی ریاست کی نگرانی کے سلسلہ میں اپنے مناسب فرض کی ادائیگی میں غفلت برتتا ہے تو وہ یہ کس طرح توقع کر سکتا ہے کہ اس کا نائب اس کے لئے اس کی ادائیگی کرے گا؟ ایک اچھی حکومت کی یقین دہانی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اچھے قوانین اور بہترین منتخب افسران احتیاط کے ساتھ نگرانی کریں' ایک مستعد پولیس اور مال کا بہترین انتظام یکساں طور پر ضروری ہے تاکہ لوگ حفاظت سے زندگی بسر کر سکیں اور اپنی صنعت کے فوائد حاصل کر سکیں۔ نوجوانوں کی تعلیم کے لئے سکول اور بیماروں کے علاج معالجے کے لئے ہسپتال قائم کئے جائیں۔" وائسرائے نے کہا' "حکومت برطانیہ اس سردار کا احترام کرے گی' جو اپنے ملک کے بہترین بندوبست میں نمایاں کردار ادا کرے گا۔"

سرجان لارنس کی تقریر نے مختصر طور پر حکومت کا نظریہ پیش کر دیا اور یہ شاہی فصاحت و بلاغت کے ایک نمونہ کے طور پر ہمیشہ لوگوں کے معیار پر پورا اترے گی۔

1870ء میں ملکہ عالیہ قیصر ہند وکٹوریہ کے دوسرے بیٹے شہزادہ ایلفرڈ ڈیوک آف ایڈنبرگ نے آگرہ کو اپنی تشریف آوری سے عزت بخشی' لہذا وفادارانہ خیر مقدم اور خوشیوں کے ہر قسم کے اظہار کے ساتھ ان کا استقبال کیا گیا۔

جنوری' 1876ء میں ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز نے اپنے دورہ سے اکبر کے دارالسلطنت کو عزت بخشی' ان کا انتہائی پرتپاک اور شاندار استقبال کیا گیا۔ 26 جنوری کو چودہ سرداروں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ سب سے پہلے ایک راجپوت کا بہترین نمونہ ایک مشہور شکاری' بندی کا راجہ مہاراؤ آیا۔ شہزادہ نے یہ کہہ کر اس کا دل جیت لیا کہ "انہوں نے سنا ہے کہ اس نے لارڈ ولیم بینٹنک کے منعقد کردہ دربار میں شرکت کی اور گھڑ سواری کے بہترین کمالات سے انہیں مبہوت کر دیا تھا" اس کے بعد صحرا کا بادشاہ' بیکانیر کا راجہ آیا۔ اس کے بعد کشن گڑھ کا مہاراجہ آیا' شہزادے کو یہ سن کر انتہائی مسرت ہوئی کہ اس نے خود کو آب پاشی کے کاموں کے لئے وقف کر دیا تھا اور انتہائی فائدہ مند تالاب بنوائے اور دیگر عوامی کام کئے تھے۔ تب' بھرت پور کا مہاراجہ آیا۔ بھرت پور کے بعد الور کے سردار نے خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے ٹونک کا نواب' دھولپور کا رانا' اور چبا کا مہاراجہ (جو ایک

شکاری اور کھلاڑی تھا) نواب رامپور (ایک شاعر اور ادیب) جسے شہزادہ نے جی۔ سی' ایس۔ آئی کا نشان عطا کیا' رتیا کا مہاراجہ راؤ' چکاری کا مہاراجہ' تیہری کا راجہ' شیوپورہ کا مہاراجہ اور علی پورہ کا جاگیردار آئے۔ اگلے روز شہزادہ نے ان سرداروں کے پاس جوابی دورہ کیا۔ حکمران لیفٹیننٹ گورنر سرجان سٹریچے نے ایک سول سروس بال کا انتظام کیا' بالآخر' شاندار تقریبات اور سکندرا و فتح پور سیکری کے سیر سپاٹا کے بعد ہز رائل ہائی نس دھول پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

لارڈ لینڈز ڈاؤن نے دسمبر' 1890ء میں ایک بہت بڑی تقریب میں آگرہ واٹر ورکس کا افتتاح کیا۔

اکتوبر 1895ء میں ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ایلجن نے آگرہ کا دورہ کیا' میونسپل کارپوریشن نے ہز ایکسی لینسی کو ایک خیر مقدمی سپاسنامہ پیش کیا' جس میں انہوں نے اس حسن اتفاق کا تذکرہ کیا کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ممتاز ایلجن خاندان کے کسی فرد نے آگرہ کا دورہ کیا ہے' کیونکہ بلدیہ کو یہ اچھی طرح یاد ہے کہ جب لارڈ ایلجن کے والد محترم فروری' 1863ء کو دربار میں صدارت کرنے کی خاطر ایک جاذب نظر فوجی دستہ کے ساتھ ہشیون پل سے گذرے تھے۔ اس وقت سے اب تک بہت زیادہ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ اس وقت آگرہ ایسٹ انڈیا ریلوے کا اسٹیشن تھا' آنجہانی لارڈ ایلجن جب پہاڑوں کی طرف روانہ ہوئے تو انہوں نے گھوڑے کی پشت پر اپنا سفر جاری رکھا۔ اب ریلوے اسٹیشن کی چھت کے نیچے تین ریلوے لائنیں یکجا ہو گئی ہیں اور بعد میں بمبئی' بڑھودا اور سنٹرل انڈیا ریلوے نے متھرا سے چوتھی ریلوے لائن کا سروے مکمل کر لیا ہے۔ 1863ء سے آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے' نئے ہسپتال قائم کئے گئے ہیں اور تعلیم و حفظان صحت کے میدان میں بہت زیادہ ترقی کر لی گئی ہے۔ مقامی طبقہ کے مذہبی گروہوں کے درمیان تعلقات کا حوالہ دیتے ہوئے (جو بگڑ گئے تھے اور جب سابقہ وائسرائے نے آگرہ کا دورہ کیا تو لارڈ لینڈز ڈاؤن کی تقریر کا موضوع بن گئے تھے) کارپوریشن نے کہا کہ ہم ان کے شکر گزار ہیں' جنہوں نے شہروں کی ایک بہت بڑی تعداد کے اچھے احساس کی مدد سے اپنی فہم و فراست اور فیصلے کے تحت لوگوں کی حفاظت کی' اسکے بعد کسی بھی قسم کی مخالفانہ کارروائی نہیں ہوئی اور دونوں جانب احساسات پہلے کے مقابلہ میں زیادہ نرم ہو گئے۔

ہز ایکسی لینسی نے اس طرح جواب دیا:-

"آگرہ کی میونسپل کمیٹی کے صاحبو! ——— مجھے آپ نے جو سپاسنامہ پیش کیا ہے اور جس انداز میں آپ نے میرا خیر مقدم کیا ہے' اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اس کے

باعث میری 32 سال پرانی یاد تازہ ہو گئی ہے' جب میں یہاں سے بہت دور انگلستان میں محض ایک لڑکا تھا' مجھے یقین ہے کہ میں اس وقت بھی آپ کا حصے دار تھا' صاحبو میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ 30 برس میں ہونے والی تبدیلیاں' جن کی طرف آپ نے میری توجہ دلائی ہے' اس قدر زیادہ ہیں کہ آپ ان کا ادراک بمشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی میں بھی اپنے والد کی طرح اس عظیم شہر کی دلچسپی کے بارے میں معاملات کا مطالعہ کرنے کے لئے یہاں آؤں گا اور ان فقید المثال مقامات کو دیکھوں گا' جنہوں نے اسے پوری دنیا میں شہرت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ حضرات' مجھے یہ ریکارڈ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے' جو آپ مجھے پیش کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اس کا شمار بھی ترقی میں ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے' آبادی میں 20 فیصد اضافہ ہو گیا ہو' مگر یہ شاید ضروری نہیں کہ خوشحالی کی دلالت کرتا ہو۔ مزید 20,000 یا 30,000 افراد کے لئے خوراک اور مزید کئی ہاتھوں کے لئے ملازمت تلاش کرنا کوئی آسان معاملہ نہیں ہے' مگر اس معاملہ کے دیگر حقائق ایک کافی اور اطمینان بخش وضاحت پیش کرتے ہیں۔ 1863ء میں میرے والد کے سفر کا یہ خاص مقصد تھا کہ ریلوے کی ترقی کا جائزہ لیا جائے' جو اس وقت اس شہر اور کلکتہ کے درمیان رابطے کو مکمل کرنے والا تھا۔ میری رائے کے مطابق' نہ تو گزشتہ 30 سال میں اور نہ ہی آئندہ تیس برس میں کسی چیز نے ریلوے کی توسیع کے مقابلہ میں حقیقی طور پر ہندوستانی سلطنت کے عوام کی حالت کو بہتر کیا اور نہ ہی کرے گی' ریلوے کے معاملہ میں آپ بہت زیادہ خوش قسمت ہو گئے ہیں۔ 30 برس پہلے آپ نے ریلوے کے نظام کے اولین فوائد حاصل کئے۔ اب میرے خیال میں ہندوستان کے چند شہر ہی اس معاملہ میں آپ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ میں اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور آپ اسے اپنے خیال سے نکال نہیں سکتے۔ آبادی اور خوشحالی میں اضافہ آپ جیسے حضرات کے لئے ذمہ داریوں میں بھی اضافہ کر دیتا ہے' جنہیں عوام کو صحت فراہم کرنے کا فرض بھی سونپا جاتا ہے۔ میں ان مشکلات کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں' جو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب ہم مخصوص اقدامات اٹھانے اور خصوصی کاموں کی انجام دہی کی اہمیت کو دیکھتے ہیں اور ذرائع اور اخراجات واضح نہیں ہوتے۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہوا ہوں کہ آپ نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت ہند نے اس معاملہ میں بلدیاتی اداروں سے فیاضانہ سلوک کیا ہے اور یہ بھی کہ آپ نے اس بات کو بھی تسلیم کر لیا ہے کہ شاہی خزانے سے بھی تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بطور کاروباری افراد کے مجھے یہاں آپ کو اس بات کی یاد دہانی کرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جب ہم شاہی خزانے کی حالت کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اس کا اطلاق محض زر نقد کو شمار کرنے

پر نہیں ہوتا جو کسی لمحے بھی خزانے میں ہو سکتا ہے' مگر یہ کہ ہمیں دیگر معاملات پر بھی غور کرنا ہوتا ہے اور خاص طور پر ان مطالبات کا بنظر غائر جائزہ لینا پڑتا ہے' جو ایک عام ٹیکس دہندہ پر عائد کئے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے گزشتہ دو سال کے دوران حکومت ہند نے عام ٹیکس دہندہ پر مطالبات کو بڑھا دیا تھا۔ اور ہم نے گزشتہ چند گھنٹوں میں یہ دیکھ لیا ہے کہ حساس آلہ' (زر کی منڈی) جس پر آدمیوں کے کاروباری معاملات کا انحصار ہوتا ہے' اچانک بہترین اعداد و شمار میں گڑ بڑ پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ' میں ہر جگہ اس رائے کا اظہار کئے جانے سے انکار نہیں کرتا کہ حکومت کی مالی امیدیں روشن ہو رہی ہیں۔ اگر اس وقت میں آپ کو اس تعاون (جو ہم آپ کو پیش کر سکتے ہیں) کی جائز اور باعزت شرائط میں حقیقی تبدیلی کی توقع کراؤں تو میری امیدیں درست نہیں ہوں گی۔ مگر صاحبو' اگر میں یہ کہوں کہ آپ اپنی حب الوطنی کی کوششوں میں ثابت قدم رہیں تو آپ اسے مذاق نہیں سمجھیں گے۔ مجھے اس بات پر پورا یقین ہے' جو کچھ آپ نے اپنے سپاسنامہ میں کہا ہے کہ آپ اس فیاضانہ اور حب الوطنی کے جذبہ کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے' اس کے بارے میں آپ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے تعلیم اور ہسپتالوں کے قیام کے عظیم مقاصد کے سلسلے میں اپنے سرکردہ شہریوں کی مدد اور تعاون حاصل کیا ہے۔ اور لیڈی ڈفرن فنڈ کی صدر لیڈی ایلجن کے توسط سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے یہاں پر ہندوستانی خواتین کی فلاح و بہبود اور ان کے علاج معالجہ کے لئے کی جانے والی عظیم کوششوں کو خلوص دل کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ صاحبو' میں اس بات میں بہت زیادہ خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے آج اپنے جد امجد کی اس سنجیدہ نصیحت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے' جس کا اشارہ آپ اپنے سپاسنامہ کے اختتامی پیراگراف میں کر چکے ہیں۔ آپ نے رائے کی رواداری اور منتظم کے جبرو تشدد کے معاملہ میں لارڈ لینڈز ڈاؤن کی وضع کردہ حکمت عملی پر بلا خوف و خطر عمل درآمد کے سلسلے میں مقامی حکام کی فہم و فراست کو سراہا ہے' حکومت ہند نے بھی اس کا ساتھ دیا ہے۔ مگر امن و امان کے لئے آلہ کار کے طور پر منتظم کی کارروائی کے ساتھ لوگوں کے اچھے احساس کو شامل کرتے ہوئے مجھے بھی اتنی قدر خوشی محسوس ہو رہی ہے اور میں مختلف مذہبی خیالات کے سرکردہ افراد کی جانب سے ملک کے مختلف حصوں میں کی جانے والی کوششوں کا ذکر بھی کروں گا' میں ان کا بہت مشکور و ممنون ہوں کہ نیک خواہشات کو بڑھانے اور جھگڑے کی وجوہات کو دور کرنے کے لئے بہت کچھ کیا گیا ہے۔ مجھے یہ یقین ہے کہ وہ اس کو فراموش نہیں کریں گے' بلکہ اس بات کو بہت زیادہ سراہیں گے کہ ان پر کس قدر ذمہ داری عائد ہے۔ اگر آپ کی خواہش کے مطابق میں دوبارہ آگرہ کا دورہ کرنے کے قابل ہوا' تو میں یہ

امید کر سکتا ہوں کہ میں مفاہمت کے اس جذبہ کے پھیلاؤ اور ترقی کا حوالہ دینے کے قابل ہوں گا' جو ان متعدد افراد کی مستقل خواہش ہے' جو ہندوستان کو بہترین طور پر ترقی کرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اسی روز دوپہر کے وقت (25 اکتوبر) ہزایکسی لینسی نے رسمی طور پر کراؤلی کے مہاراجہ' دھولپور کے مہاراجہ رانا اور رام پور کے نواب کا خیر مقدم کیا۔ ماسوائے کراؤلی کے مہاراجہ کے جو ہندوستانی زبان میں گفتگو کرتا تھا گفت و شنید انگریزی میں کی گئی۔ وائسرائے نے فتح پور سیکری اور سکندرا میں اکبر کے مقبرہ کا دورہ کیا۔ 28 تاریخ کو ہزایکسی لینسی نے بھداور کے مہاراجہ' منی پور کے راجہ' آوا کے راجہ' پیروا کے راجہ اور متھرا کے مشہور و معروف کروڑ پتی ساہوکار سیٹھ لچھمن داس کو استقبالیہ دیا۔ یہ راجگان قدیم راجپوت خاندانوں کی اولاد ہیں' ان میں سے بھداور اور آوا کے راجاؤں نے مرہٹہ جنگ اور بغاوت کے دوران حکومت کے لئے بہترین خدمات سرانجام دیں۔

28 اکتوبر کی صبح کو ہندوستان میں واحد نوعیت کی فوج بیکانیر شترسوار فوج نے ہزایکسی لینسی کے سامنے پریڈ کی۔ ٹھاکر دیپ سنگھ کی زیر قیادت اس کی تعداد 440 تھی۔ ہر لحاظ سے اس کی تنظیم کو مکمل تسلیم کیا گیا۔ جب یہ 420 گز لمبی قطار کی شکل میں مرتب ہوئی تو اس کے نظارے نے تمام تماشائیوں کو حیران کر دیا۔ ایک عینی شاہد' سول اینڈ ملٹری گزٹ' لاہور میں اس کے بارے میں لکھتا ہے:۔ "یہ انتہائی جاذب نظر دکھائی دی' جبکہ صاف ستھری خاکی رنگ کی وردیوں کے ساتھ سرخ استرکاری اور جوانوں کی پگڑیوں میں راجپوتانہ کے طرے' اونٹوں کی بہترین حالت اور ان کی حرکات و سکنات کی حیران کن پھرتی کی سب لوگوں نے بہت زیادہ تعریف کی۔"
ہزایکسی لینسی فوج کی اس ترکیب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ٹھاکر دیپ سنگھ کی وضع قطع اور چستی کی تعریف کی۔ ہزایکسی لینسی نے آگرہ میں اہم آثار قدیمہ دیکھے اور 30 تاریخ کو اکبر کے شہر میں اپنے پہلے دورہ کے خوشگوار تاثرات اپنے ساتھ لے کر وہاں سے گوالیار روانہ ہو گئے۔

حوالہ جات

(1) ملا عبدالحمید لاہوری کی "بادشاہ نامہ" کے مطابق' آگرہ کو اکبر آباد کا نام شاہ جہاں نے دیا تھا' اس نے حکم دیا کہ تمام سرکاری خط و کتابت میں اس شہر کو اس کے بانی اور اس کے دادا کے نام پر اکبر آباد لکھا جائے۔

(2) خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ آگرہ کا نام ہندی لفظ' اگر سے اخذ کیا گیا' اس کا مطلب "نمک دان" ہے' کیونکہ یہ زمین شور زدہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی دور میں اس جگہ پر بخارات کے ذریعے نمک بنایا جاتا تھا۔ کچھ افراد آگرہ کے نام کو اگروال بنیاؤں سے منسوب کرتے ہیں' جو متحدہ صوبہ جات میں بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

(3) شاعر سلمان کے خیال کے مطابق' محمود' محمود غزنوی کا ایک پڑپوتا تھا۔ مزید یہ معلوم ہو گا کہ جہانگیر نے بھی اپنی تزک جہانگیری میں اس مصنف کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ' اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ دہلی کے لودھی افغان بادشاہوں کا دارالسلطنت بننے سے قبل آگرہ ایک اہم شہر تھا۔

(4) فرشتہ۔

(5) پورے ہندوستان میں ابھی تک اس بزرگ کے احترام میں "چھڑیوں کا میلہ" منعقد ہوتا ہے۔ اس میلے میں لمبے بانسوں یا چھڑیوں کی نمائش کی جاتی ہے' جنہیں سر' ماتھے یا زیریں جبڑے کے دانتوں پر متوازی اور استادہ رکھا جاتا ہے۔

(6) فرشتہ۔

(7) کوہ نور ہیرے کی مکمل سرگزشت کے لئے ملاحظہ کیجئے' میری کتاب' "تاریخ لاہور" صفحات' 376 - 378

(8) ارسکن کی' تزک بابری' صفحہ' 357

(9) اکبر نامہ' جلد اول' صفحہ' 91 ایڈیشن' 1893ء

(10) برنئر کا سفر نامہ بخارہ' جلد دوم' صفحات' 123 - 121

(11) ملاحظہ کیجئے' صفحہ 60 وغیرہ

(12) ونیلر۔

(13) اکبر کے دونوں قریبی جانشینوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ شاہ جہاں مجرموں کو سانپ سے ڈسوانے کا حکم دیتا تھا۔

(14) ابوالفضل کی موت پر اکبر نے جو دکھ محسوس کیا' اس کے لئے ملاحظہ کیجئے' "حیات ابوالفضل"

باب '3-

(15) اسے جہانگیر نے مکمل کروایا۔ ملاحظہ کیجئے' باب دوئم۔

(16) وہیلر۔

(17) یہ القابات' چغتائی بادشاہوں کو بعد از وفات دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ' تیمور کو صاحبقران' بابر فردوس مکانی' ہمایوں جنت آشیانی' اکبر عرش آشیانی' جہانگیر جنت مکانی اور شاہ جہاں کو فردوس آشیانی اعلیٰ حضرت کہا جاتا تھا۔

(18) چمپلیہ ہیمپکا۔

(19) ہینڈاس اوڈور میٹیس۔

(20) جیسمینم زامباک۔

(21) بانسری

(22) چینی گلاب' روزا گیگنٹو لینفیرا۔

(23) وہ ایک رومن کیتھولک تھا اور اس نے 1623ء میں تجسس' وقت کے علم و فضل سے واقف ہونے اور مصر اور ہندوستان کے مذہب میں موجود ہم آہنگی کو دریافت کرنے کی غرض سے ہندوستان کا دورہ کیا۔ وہیلر۔

(24) وہیلر۔

(25) "مشرقی ہند کا بحری سفر" از ایڈورڈ ٹیری' صفحہ 81۔

(26) وہیلر۔

(27) عالمگیر نامہ۔

(28) شاہجہان اور اورنگ زیب کے دور کی فارسی تواریخ میں آگرہ کو مستقر الخلافت' دہلی کو دار الخلافت' لاہور کو دار السلطنت اور ملتان کو دار الامان کہا گیا ہے۔

(29) عام طور پر اورنگزیب اچھے اور برے شگون کا خیال نہیں کرتا تھا اور انتہائی محتاط تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ آگرہ میں بحیثیت بادشاہ اپنے پہلی مرتبہ کے داخلہ کے معاملہ میں اسے توہم نے گھیر لیا تھا۔

(30) مینوسی کے ذریعے' وہیلر۔

(31) ایک بہترین گول خط۔

(32) عربی رسم الخط۔

(33) ایک رواں خط۔

(34) سیر المتاخرین کے مطابق 'لڑائی کا مقام اکبر آباد کے نزدیک ''اجاجو'' ہے۔

(35) سیر المتاخرین۔ باب اول۔

(36) سیر المتاخرین' باب اول۔

(37) خفی خاں کی منتخب التواریخ۔

(38) خفی خاں۔

(39) ایلیٹ۔

(40) سیر المتاخرین۔

(41) سیر المتاخرین۔

(42) عبدالکریم کی سرگزشت۔

(43) ایلفن سٹن' جلد دوئم' صفحہ 637

(44) کینے کی ''سلطنت مغلیہ'' 1866 کا ایڈیشن' صفحات' 76 اور 78۔

(45) ٹیلر کی ''تاریخ ہندوستان'' صفحہ' 508' 1883ء کا ایڈیشن۔

(46) کینے' صفحہ' 149

(47) اس کے مزار کے بیان کے لئے ملاحظہ کیجئے' باب دوئم۔

(48) خوش قسمتی سے اس وقت ان کے صاحبزادے کے پاس ہندوستان کے وائسرائے کا اعلیٰ منصب ہے۔

باب دوئم

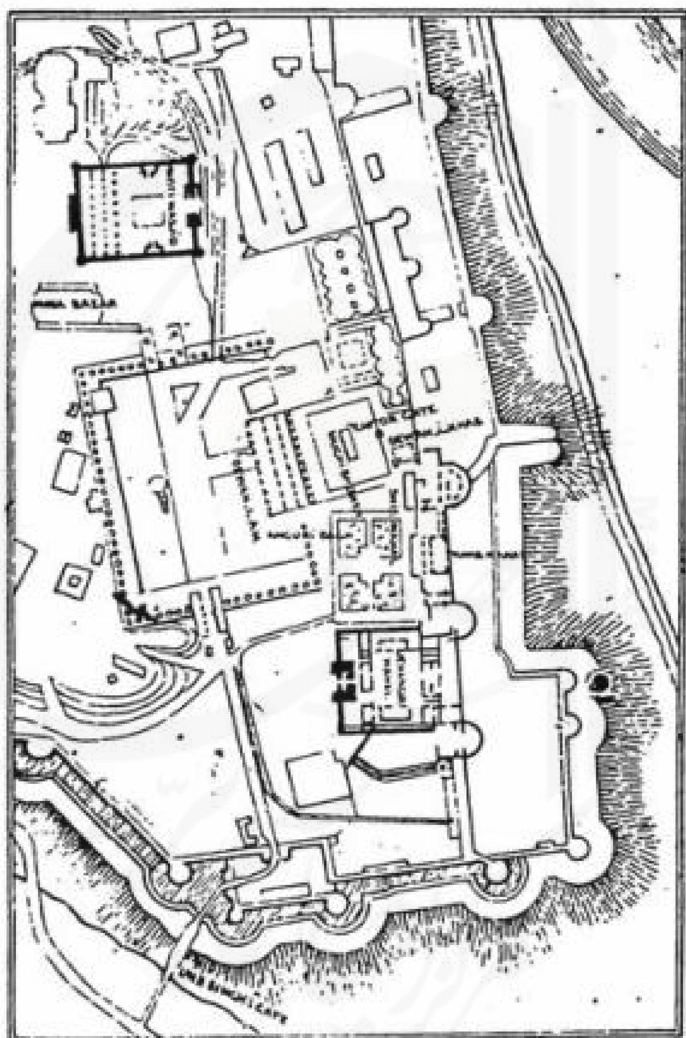
بیانی

قلعہ

قدیم قلعہ: وہ قدیم قلعہ جس کا ذکر جہانگیر نے کیا ہے' (اس جگہ اکبر نے اپنا قلعہ تعمیر کروایا) اسے سلیم شاہ سوری نے تعمیر کروایا اور اسے بادل گڑھ کا نام دیا۔ سکندر اور ابراہیم کے درمیان جنگ کے دوران پرانا قلعہ دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ اس واقعہ کی تاریخ' الفاظ' آتش بادل گڑھ میں ملتی ہے' ابجد کے قاعدہ کے مطابق' یہ 962 ہجری بمطابق 1556ء کے مساوی تاریخ بناتے ہیں۔

موجودہ قلعہ: موجودہ قلعہ' جو دریائے جمنا کے کنارے ایک وسیع و عریض اور جاذب نظر عمارت کی صورت میں موجود ہے' اسے اکبر نے 1571ء میں تعمیر کروایا' اس کا شمار ہندوستان کی عظیم ترین عمارات میں ہوتا ہے۔ اسے مکمل طور پر اس کے بانی اکبر ہی نے نہیں تعمیر کروایا تھا' بلکہ اس کا زیادہ تر حصہ اس کے جانشینوں نے بنوایا: مگر فن تعمیر کی ایک کامیابی اور اسلامی طرز تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہونے کی حیثیت سے اس کا نقشہ تیار کرنے کا سہرا اسی شہنشاہ کے سر جاتا ہے۔

یہ ڈیڑھ میل کے دائرہ کی شکل میں ہے اور اس کے اردگرد سنگ سرخ کی دوہری دیوار ہے' بیرونی دیوار زمین سے تقریباً" 40 فٹ بلند اور اندرونی دیوار بغلی پشتوں' بیشمار برجیوں اور کنگورے دار فصیلوں کے ساتھ بیرونی دیوار سے 30 فٹ اونچی ہے۔ پتھروں کو جوڑ کر انہیں لوہے کے کڑوں سے باندھا گیا ہے' جو ان میں سے گذارے گئے ہیں۔ ہر طرف اس کی بنیاد پانی کی سطح تک پہنچتی ہے۔ پہلے قلعہ کے اردگرد موجود خندق اور فصیل اب ختم ہو چکی ہے۔ اندرونی خندق 30 فٹ چوڑی ہے اور اس کے کناروں پر بھربھرا پتھر لگا ہوا ہے' یہ ابھی تک موجود ہے۔ اس خندق کے اوپر پل تختہ کو پار کرنے کے بعد ہم دہلی دروازہ کے نام سے مشہور اس کے بڑے یا شمالی دروازہ میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ پختہ اینٹوں سے تعمیر کردہ دس فٹ چوڑی ایک انتہائی جاذب نظر اور بہت بڑی عمارت ہے' اس کے پہلوؤں میں سنگ سرخ کے ہشت پہلو دو بہت بڑے مینار ہیں' جن میں سفید سنگ مرمر کے زیباتشی نقش و نگار کی خبت کاری کی گئی ہے' یوں یہ ایک برج دکھائی دیتا ہے۔ بالائی اور زیریں کمرے محافظ خانوں کے طور پر استعمال ہوتے



قلعه آگره

ہیں' جبکہ چوٹی سے ارد گرد کے علاقہ کا ایک نہایت عمدہ اور وسیع و عریض منظر دکھائی دیتا ہے۔ قلعہ کے دہلی دروازہ کے ساتھ ایک پرانے خالی محافظ خانہ کے اوپر محرابی دروازہ پر اکبر کے دور کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:-

عصر شہنشاہ خلافت پناہ ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ فی سن 1008ھ

"بادشاہوں کے بادشاہ' خلافت پناہ ظل اللہ' جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے دور میں سال 1008ھ' (1599ء)-"

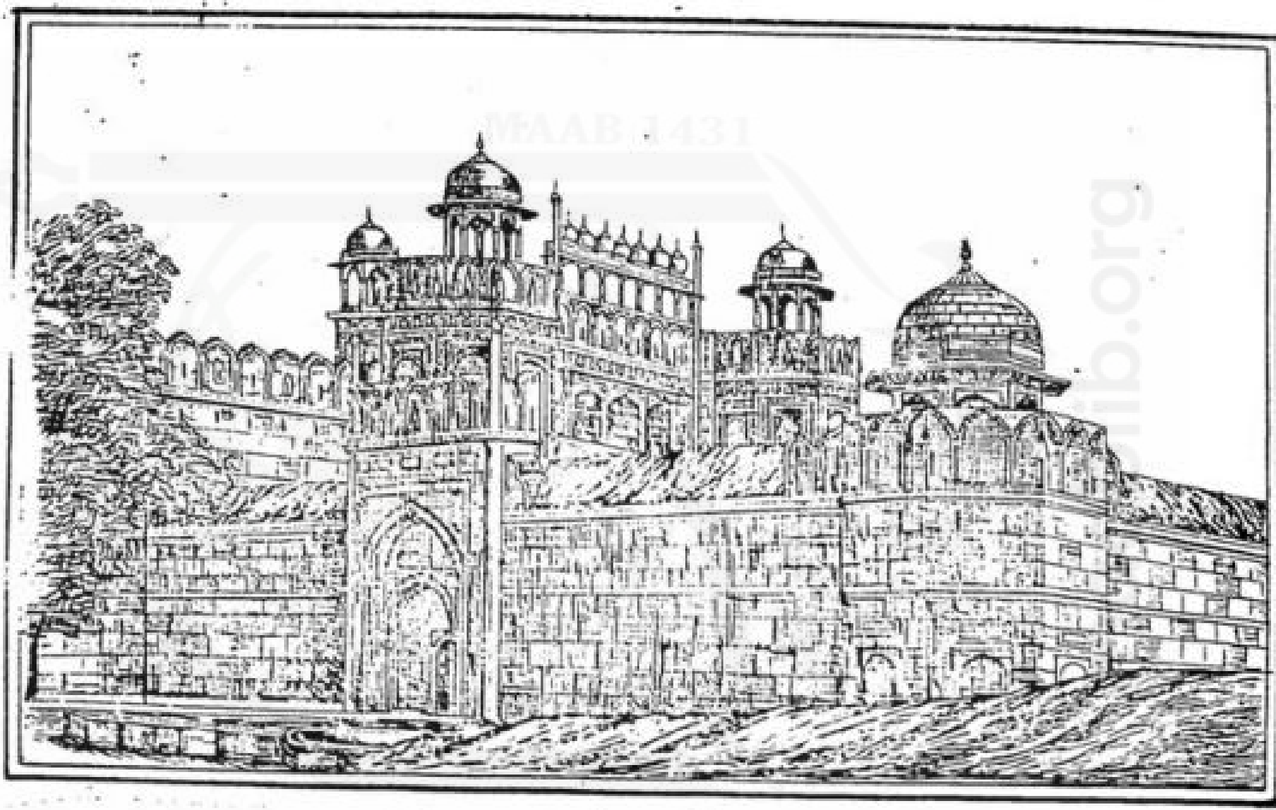
پتھر کے شکستہ ہو کر بتدریج گرنے کے باعث بد وضع ہونے کی وجہ سے باقی ماندہ عبارت ناقابل فہم ہے' اس کی عبارت ابھرے ہوئے حروف میں ہے۔ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس عمارت کو اکبر کے دور میں 1008 ہجری یا 1599ء میں تعمیر کیا گیا۔

اسی محراب پر سابقہ عبارت کے نیچے جہانگیر کے دور کی مندرجہ ذیل نظمیں درج ہیں:-

شاہ جہاں چون گرفت جائے بتخت شرف
تخت ز رفعت نہاد بر سر چرخ پا
دست دعا بر کشاد پیر فلک از نشاط
گفت کہ بادا مدام حکم تو فرمان روا
خواست نہانی کند سال جلوسش رقم
بود در اندم لبش برز دعا و ثناء
میل دو چشم عدو کردہ ز آتش بگفت
باد جہاں بادشاہ شاہ جہانگیر ما
قائلہ و راقمہ محمد معصوم البکری

ترجمہ: جب بادشاہ عالم دلفریب تخت پر تشریف فرما ہوئے تو تخت نے فخر محسوس کرتے ہوئے اپنے قدم آسمان پر رکھ لئے۔ بوڑھے آسمان نے زبردست خوشی و انبساط کے ساتھ دعا کے لئے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے اور کہا "کہ یہ بادشاہت ہمیشہ قائم رہے! جب نہانی نے بادشاہ سلامت کی تخت نشینی کی تاریخ لکھنے کی خواہش کی تو اس کے لبوں پر اس وقت تعریف و توصیف جاری ہو گئی' دشمن کی آنکھوں کو دہکتے ہوئے انگاروں سے اندھا کرنے کے بعد اس نے کہا:

ہمارا بادشاہ جہانگیر دنیا کا بادشاہ ہو!



قلعہ (دریا کے سامنے)

اس کا مصنف اور مرتب کنندہ' محمد معصوم ابکیرا ہے۔

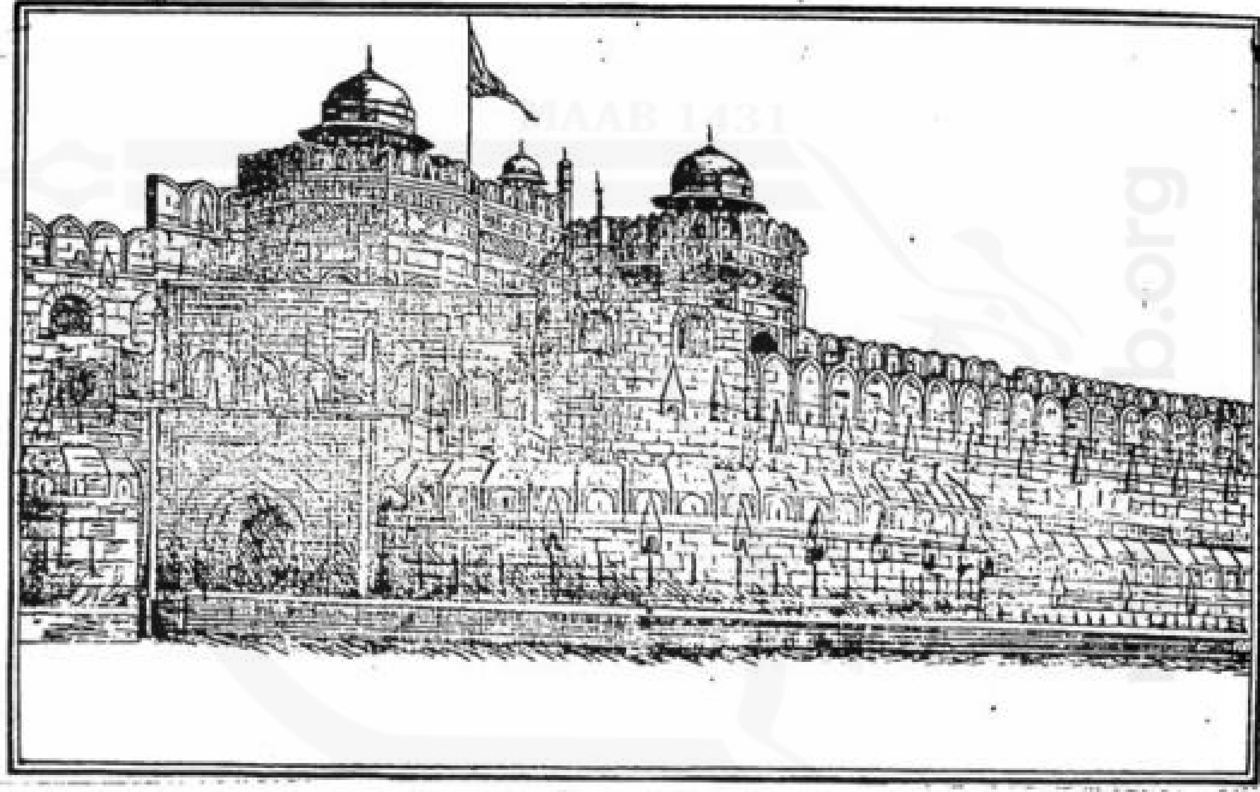
عظیم الشان میناروں کے درمیان دو گنبدوں کے نیچے ایک راہداری ہے' یہ گنبد نیچے لٹکے ہوئے مخروطی حاشیوں میں سے نہایت شاہانہ انداز میں ابھرے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد باہمی برآمدوں اور چھوٹے محرابی دروازوں پر مشتمل اور کندہ کاری و پچی کاری سے مزین خوبصورت عمارات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

نقار خانہ: ان عمارات کے ارد گرد نقار خانہ ہے' جو عوام کے لئے دربار کی کارروائی کے اوقات کا اعلان کرتا تھا۔ یہ شاندار دروازہ محل کے وسط میں 500 x 370 کے ایک عالی شان صحن کی طرف کھلتا ہے' جس کے ارد گرد وسیع و عریض محرابیں ہیں' وہ گزشتہ دور میں ایک چھت دار صحن کے طور پر کام دیتا تھا۔

ہاتھی پول دروازہ: قلعہ اور پشتہ کے درمیان کھلی جگہ کی طرف اندرونی دروازہ ہاتھی پول کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پر اکبر کے دور میں فقید المثال مہارت سے تیار کردہ دو ہاتھیوں کے اپنے سواروں جے مل اور پتو کے سمیت سنگین مجسمے ہیں' جو چتوڑ کے راجپوت سورماؤں کے طور پر ان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چالاک بادشاہ نے ان کی یاد کا احترام کرتے ہوئے یہ بنوائے تھے۔ (49)

درشن دروازہ: یہ درشن دروازہ کہلاتا ہے' جس کا ذکر ولیم فنچ نے کیا ہے' اس نے جہانگیر کے دور میں آگرہ کا دورہ کیا تھا۔ یہاں پر بادشاہ ہر روز طلوع آفتاب کے وقت اپنے امراء اور وزراء (جو ایک مچان کے اوپر کھڑے ہوتے تھے) اور جھروکہ کے نیچے جمع ہونے والے مجمع کو اپنا درشن کرواتا تھا۔ اکبر بھی ہر صبح کو ایسا ہی کرتا تھا' وہ اس جھروکہ میں سورج کی پوجا کرتا اور نیچے میدان میں جمع ہونے والا مجمع اکبر کی پوجا کرتا تھا۔ یہاں پر صبح کو کچھ دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوتا اور نیچے میدان میں جانوروں کی لڑائی دیکھتا۔ وہ تربیت یافتہ ہاتھیوں' اونٹوں' بھینسوں' مینڈھوں اور بارہ سنگھوں کی لڑائی میں بہت زیادہ خوشی محسوس کرتا اور مرغوں کی لڑائی' پہلوانوں' بازی گروں' مسخروں' رقاصوں اور بانڈی بازوں کے کرتبوں سے تفریح حاصل کرتا' مرد اور عورتیں گویے انتظار میں رہتے' جبکہ چالاک بازی گر اور مسخرے اپنی پھرتی اور مہارت کا مظاہرہ کر رہے ہوتے۔ (50)

امر سنگھ دروازہ: قلعہ کے جنوب کی طرف امر سنگھ راجپوت کے نام سے مشہور امر سنگھ

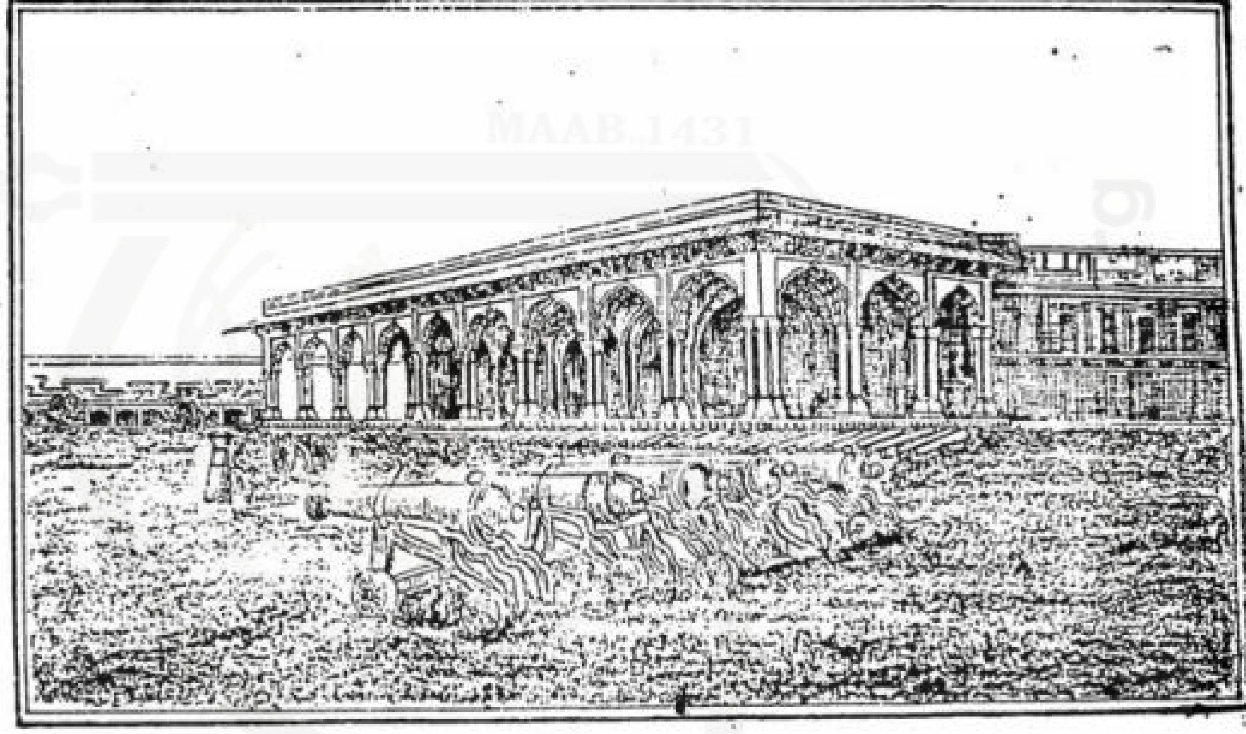


شاہی قلعہ (جامع مسجد کے سامنے کا رخ)

دروازہ ہے۔

دیوان عام: اس عظیم صحن کے ایک طرف اکبر کا دربار عام ہے' جہاں دربار کے استقبالیے منعقد کئے جاتے اور کاروبار سلطنت کی انجام دہی کی جاتی تھی۔ یہاں پر بادشاہ ایک چبوترے پر رکھے ہوئے تخت پر روزانہ بیٹھا کرتا (جیسا کہ ہم اب بھی اسے دیکھتے ہیں) تھا' اس کے اردگرد سنگ مرمر کی منبت کاری کی گئی ہے۔ یہاں پر وہ اپنا شاندار دربار منعقد کرتا' ہندوستان کے فرمانروا سرداروں اور غیر ممالک کے سفیروں اور ایلچیوں کا خراج عقیدت وصول کرتا' انصاف مہیا کرتا اور احکامات جاری کرتا تھا۔ اس چبوترہ کے پاؤں کی طرف جہاں تخت رکھا ہوا تھا' زمین سے تین فٹ بلند' سفید سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا تختہ ہے' جہاں وزراء بادشاہ کو دستی گزارشات پیش کرنے اور اس کے احکامات وصول کرنے اور آگے پہنچانے کے لئے کھڑے ہوا کرتے تھے۔ پہلے اس کے چاروں طرف چاندی کا کٹہرا لگا ہوا تھا' مگر اب وہ غائب ہو چکا ہے۔ ایوان لمبائی میں 192 فٹ اور چوڑائی میں 64 فٹ ہے۔ یہ ایک کھلا برآمدہ نما ہے' چھت کو باقاعدہ فاصلوں پر بنے ہوئے اور سفید سنگ مرمر کی مشرقی طرز میں بنی ہوئی محرابوں سے وابستہ بلندوبالا ستونوں کی تین قطاروں نے سہارا دے رکھا ہے' جس سے اس کی وضع قطع بڑی عالی شان نظر آتی ہے۔ مشرقی جانب ایک بلند و بالا مستطیل شہ نشین ہے' جس میں بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا کرتا تھا۔ سرتھامس رو کے پادری لیڈورڈ ٹیری نے تخت کے بارے میں ذکر کیا ہے "کہ اس پر چاندی کے زینوں کے ذریعے پہنچا جا سکتا تھا' اس کے اوپر جواہرات سے آراستہ 4 نقرئی شیروں کو مزین کیا گیا تھا' جنہوں نے خالص سونے کی ایک چھتری کو سہارا دے رکھا تھا۔" شہ نشین خالص سنگ مرمر کی ہے' اس میں خوبصورتی سے تراشے گئے طاقچے ہیں اور پچی کاری کے ساتھ منبت کاری کی گئی ہے۔ اکبر کے دور میں درباری ایوان میں خوشبویات اور عطریات سے بہت زیادہ خوشبوئیں پھیلائی جاتی تھیں۔ اس موضوع پر علامی ابوالفضل اپنی آئین اکبری میں لکھتا ہے:۔ "دیوان عام کو عنبر' صندل کی لکڑی' قدیم نسخوں اور بادشاہ کے ایجاد کردہ اجزاء کے مطابق تراکیب سے مسلسل معطر رکھا جاتا ہے: مختلف شکلوں کے طلائی اور نقرئی عود دانوں میں ہر روز لوبان جلایا جاتا ہے' جبکہ خوش کن خوشبودار پھول بہت بڑی تعداد میں استعمال کئے جاتے ہیں۔"

تخت شاہی کو جنگلوں کی قطاروں کے ذریعے علیحدہ کیا گیا تھا' درمیان والا زمین سے بلند تھا اور اس کے گرد سرخ رنگ کا جنگلا تھا' وہاں پر شہزادگان' سفراء' سلطنت کے اعلیٰ افسران اور اعلیٰ منصب کے امراء اور وزراء بیٹھا کرتے تھے۔ بیرونی جنگلا میں خالی جگہ دوسرے درجہ کے سرداروں سے بھری ہوتی تھی' جبکہ دوسرے جنگلا کے باہر بہت بڑی کھلی جگہ مجمع کے لئے

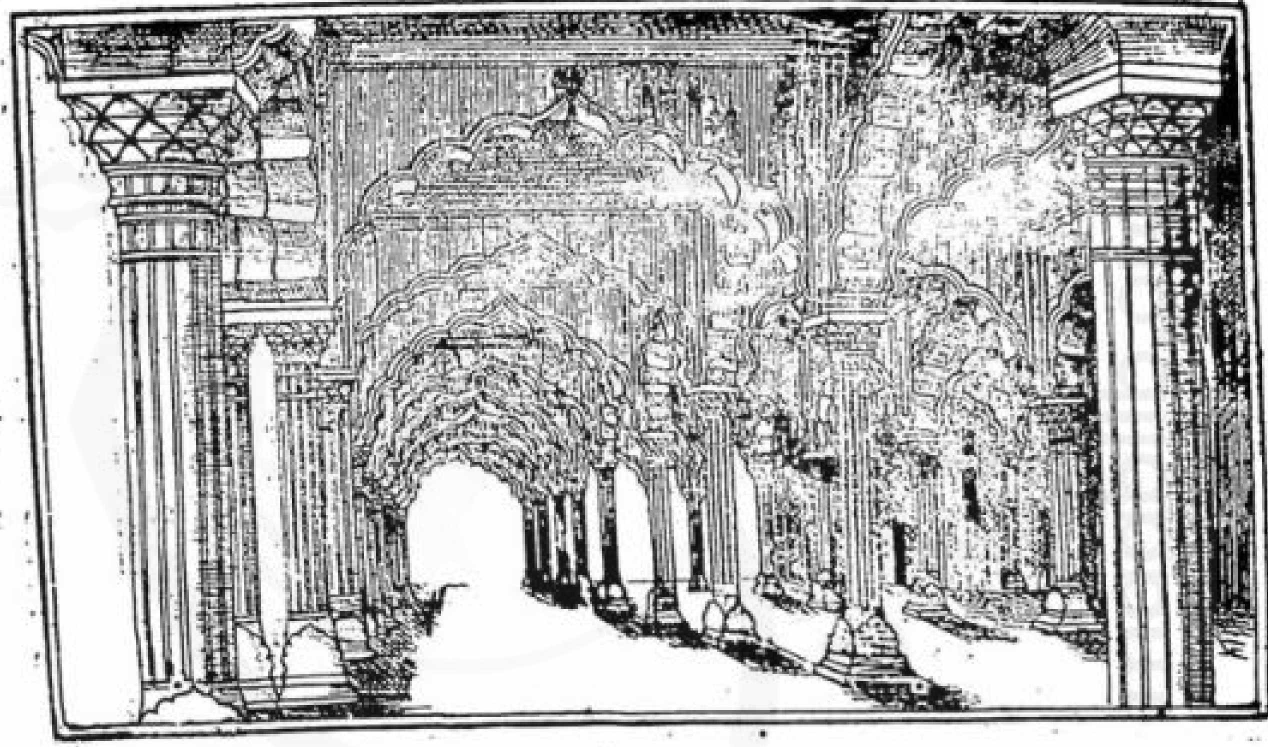


دیوان عام

مخصوص تھی۔ سب کے سب خاموشی کے ساتھ مودب کھڑے ہوتے تھے اور انہیں بادشاہ کا مکمل درشن حاصل ہوتا تھا۔ (51) اس وسیع و عریض دربار میں احدی زرہ بکتر میں ملبوس پریڈ کرتے' جبکہ قیمتی سازوسامان سے آراستہ ہاتھی گھوڑے اس نظارے کی چمک دمک میں بہت زیادہ اضافہ کرتے' جو حقیقی معنوں میں شاہانہ ہوا کرتا تھا۔

سجدہ کی رسم: اکبر نے تاتاری مغلوں کی طرز پر سجدے کی رسم کو دوبارہ شروع کر دیا اور یہ رسم اس کے جانشینوں کے دور حکومت میں بھی ادا کی جاتی رہی۔ (52) جیسے ہی کوئی آدمی پہلے جنگلے میں داخل ہوتا (جو خواص کو عوام سے علیحدہ کرتا تھا) تو اس کے دونوں جانب موجود نقیب اسے تخت شاہی تک لے جاتے' ان کے ہاتھوں میں لعل و زمرد سے آراستہ نیزے ہوتے' وہ ایک بلند اور بارعب آواز میں بادشاہ کے القابات دہراتے جاتے تھے۔ یہاں وہ شخص اپنا پہلا آداب پیش کرتا اس کے بعد وہ سرخ جنگلے کی طرف وزراء کے درمیان میں سے گذر کر جاتا' جہاں وہ دوسری مرتبہ آداب پیش کرتا' تب' چبوترے کی طرف جا کر وہ تیسری مرتبہ آداب بجا لاتا اور یکدم خود کو شہزادوں' راجاؤں' مہاراجاؤں' نوابوں' امراء' وزراء اور نہایت امیر کبیر زمین داروں کے درمیان پاتا۔ نوبت خانہ اور تخت شاہی کے درمیان کا راستہ ایک سو بیس گز پر مشتمل تھا: نیز لوگوں سے تقاضا کیا جاتا کہ وہ بادشاہ تک پہنچتے ہوئے جھکتے چلے جائیں۔ روئے زمین پر اس نظارے سے زیادہ بڑھ کر کوئی چیز شان و شوکت اور رعب و داب والی نہیں تھی۔ زمرد' ہیرے جواہرات' قیمتی دھاتوں' سچے موتیوں' لعل و گوہر کے ساتھ جگمگ کرتے ہوئے' پورے مجمع کی جان' بادشاہ اور فرمانروا راجاؤں کا انبوہ کثیر سونے اور ہیرے جواہرات کے ایک ٹھوس ڈھیر کی نمائندگی کر رہے ہوتے۔ غیر ملکی سفیر اور سلطنت کے گنے چنے امراء زرق برق پوشاک اور پر تکلف لباس اور ملک کی بہترین اور منتخب قیمتی اشیاء کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوب رعب داب پیدا کرتے تھے۔ ایک مکمل سکوت طاری ہو جاتا۔ سب لوگ مجسموں کی طرح بے حس و حرکت مکمل خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوتے' کوئی ذی روح بادشاہ کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ ماسوائے میر بندوبست کے' مجمع کے لئے بادشاہ کے باآواز بلند القابات اور خطابات کا اعلان کرنے کے' کوئی بھی اپنی آواز بلند کرنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ رعایا کا ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی بادشاہ سے گذارش کرنے کا خواہش مند ہوتا' تو بادشاہ اس کی بات سننے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اگر وہاں جمع ہونے والے مجمع میں دور سے بھی کوئی درخواست پیش کی جاتی' تو اسے فوراً بادشاہ کے پاس لایا جاتا اور اس کے مندرجات اسے پڑھ کر سنائے جاتے۔

گزشتہ دور میں دیوان عام کو اسلحہ خانہ کے طور پر استعمال کیا گیا' مگر 1876ء میں شمال مغربی



دیوان عام (اندرونی منظر)

صوبہ جات کے لیفٹیننٹ گورنر سرجان سٹریچی نے انتہائی مہربانی اور بذوق انداز میں اسے بحال کر دیا۔ اس عمارت کے کشادہ ایوان میں اس وقت ہزرائل ہائی نس' پرنس آف ویلز کی دعوت کی گئی' جب انہوں نے جنوری' 1876ء میں مغلوں کے دارالسلطنت کا دورہ کیا۔ ایک دیوار میں نصب سنگ مرمر کی تختی پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے ——

"عزت مآب' سرجان سٹریچی' جی' سی' ایس' آئی کی نئی نسل کے لئے خدمات کی خوشگوار یاد میں ان کی نمایاں ہمدردی اور دوسروں کی بروقت دیکھ بھال کو فراموش نہ کرتے ہوئے ہندوستان تاج محل اور ان کے زیر انتظام ان صوبہ جات کی قدیم تاریخ اور فن کی دیگر مشہور یادگاروں کے بچاؤ اور حفاظت کے لئے شکر گذار ہے۔ یہ تختی ان کے دوست' ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل' ارل آف لٹن کے حکم سے نصب کی گئی' 1880ء"

دیوان عام کے سامنے صحن میں لیفٹیننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ جات مسٹر جان کولون کی یاد میں پتھر کا ایک سادہ سا مزار ہے' جو 1858ء میں بنگال آرمی کے باغیوں کے محاصرہ کے دوران قلعہ میں انتقال کر گئے تھے۔

جہانگیر کا حوض: مذکورہ بالا مزار کے قریب جہانگیر کا حوض ہے' یہ عجیب و غریب چوکور حوض ایک بہت بڑا ... ہے' جسے ... ہی پتھر میں سے تراشا گیا ہے' اپنی جسامت اور تعمیر کے لحاظ سے یہ فنکارانہ قدروقیمت کی ایک انوکھی چیز ہے۔ یہ تقریباً 5 فٹ اونچا' 4 فٹ گہرا' 5 فٹ چوڑا اور قطر میں 35 فٹ ہے۔ اس کے بیرونی حصہ میں فارسی رسم الخط میں بے شمار عبارات درج ہیں۔ مگر حروف اس قدر بدوضع ہو گئے ہیں کہ عبارات کو پڑھا نہیں جا سکتا۔ عبارت کے سالم حصوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حوض کو 1019ھ (1516ء) کو اس سال اکبر شاہ کے بیٹے جہانگیر شاہ کے لئے تعمیر کیا گیا' جب بادشاہ نے نورجہاں کے ساتھ شادی کی۔ اس قابل ذکر حوض پر درج مندرجہ ذیل دو اشعار کو پڑھنے سے قبل میں نے کچھ وقت صرف کیا' جو اس طرح پڑھے گئے:-

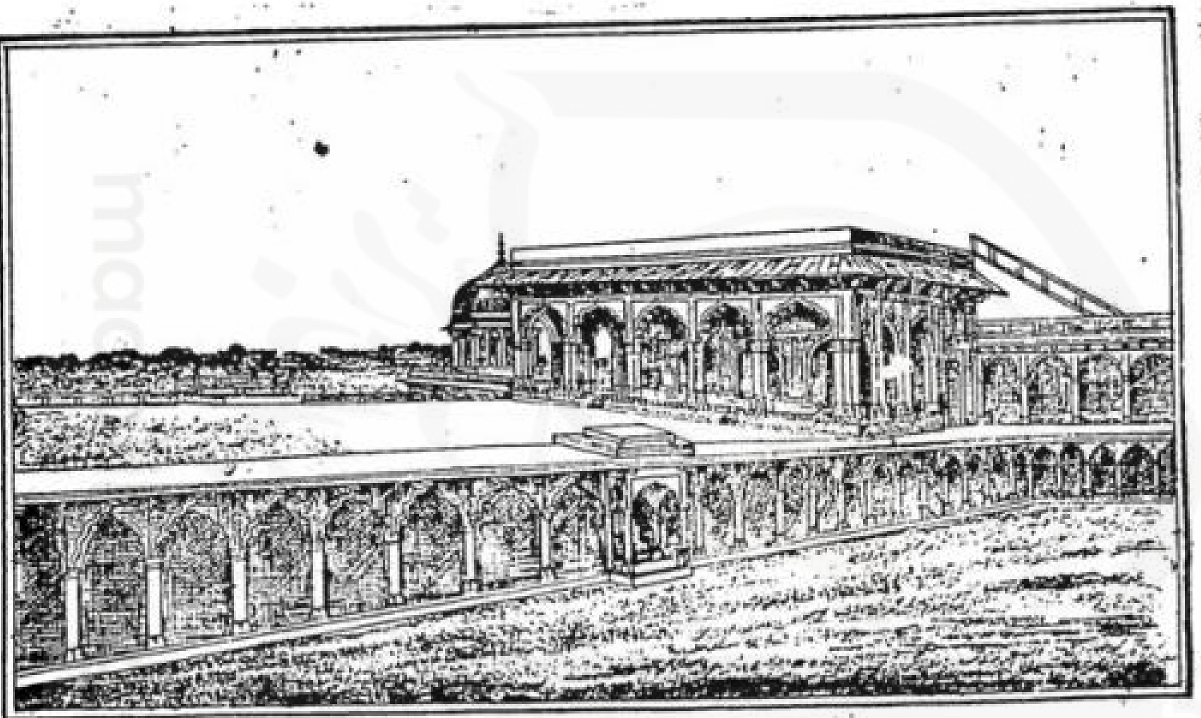
پناہ ملک و دین شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ
شہنشاہی کہ از تدبیر او شد کار تقدیرے
طلب کردند چون از خضر سال او خرد گفتا
نہان شد از خجالت زمزم از حوض جہانگیری

ترجمہ: پناہ ملک و دین شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ' وہ بادشاہ کہ تدبیر اور تقدیر نے اس سے کامیابی حاصل کی۔ خضر (53) نے اس کی تعمیر کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا تو خرد نے جواب دیا: زمزمہ (54) نے جہانگیر کے حوض کو دیکھ کر شرم سے اپنا چہرہ چھپا لیا" (55)

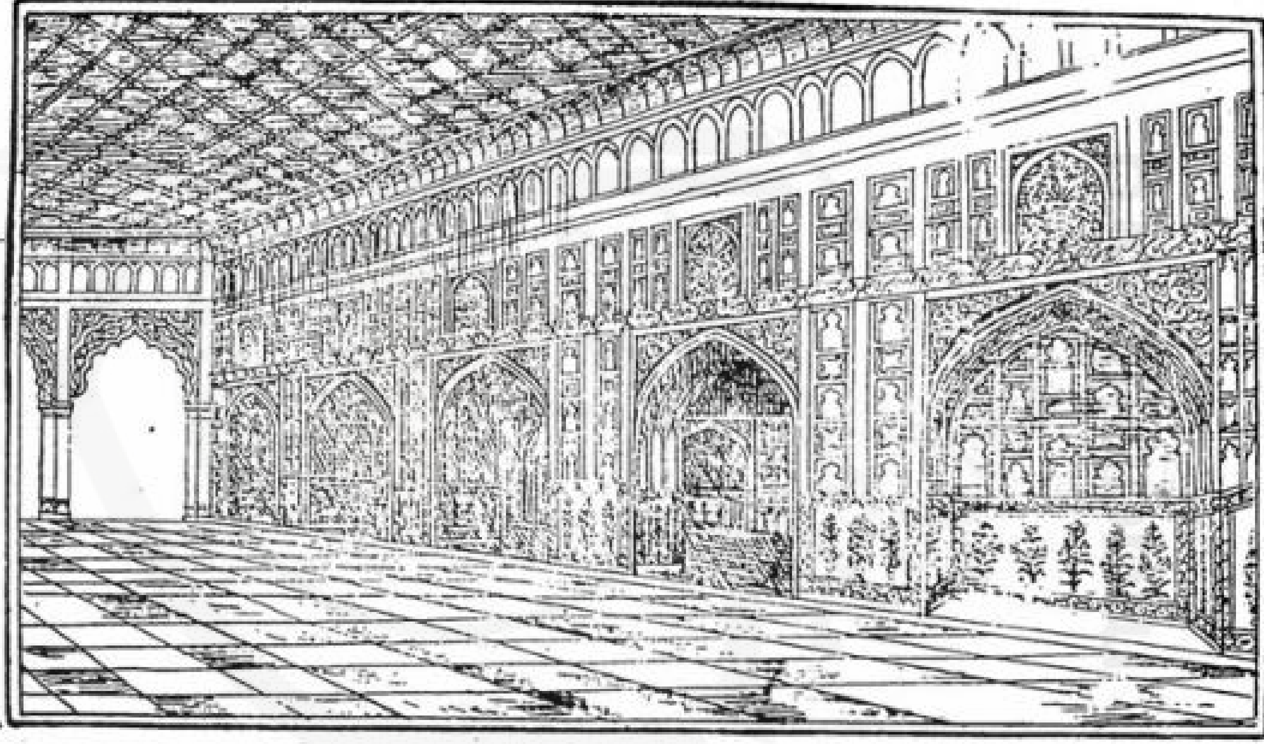
ایوان کے دائیں اور بائیں جانب جالیوں سے مزین برآمدے ہیں' حرم کی خواتین ان میں سے دربار کی کارروائی دیکھا کرتی تھیں۔ تخت کے عقب میں ایک دروازہ بادشاہ اور اس کے بااعتماد نوکروں کے' زنانہ میں داخلہ کے لئے تھا۔

مچھی بھون: یہی دروازہ مچھی بھون میں جانے کے لئے ہے۔ مصنوعی نہروں کے ذریعے جمنا کا پانی محل کے صحن میں لایا جاتا اور مچھلیوں کے ذخیرہ کے لئے اسے یہاں جمع کیا جاتا' جو بادشاہ اور اس کی چہیتی بیویوں اور درباریوں کے لئے تفریح کا سامان پیدا کرتیں' وہ انہیں پکڑ کر لطف اٹھاتے تھے۔ یہ جگہ سفید سنگ مرمر کے ایک مستطیل کمرہ پر مشتمل ہے' اس میں انتہائی خوبصورتی سے نقش و نگار تراشے گئے ہیں' یہ اسلامی طرز تعمیر میں خوبصورتی سے تراشیدہ محرابوں کے سنگ مرمر کے ایک کھلے برآمدہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ دونوں اطراف میں موجود کمرے دفتروں کا کام دے رہے ہیں۔ مچھی بھون اور چھوٹی مسجد (مینا مسجد کے نام سے مشہور' جسے پہلے پہل محل کے افراد استعمال کیا کرتے تھے) کے درمیان چتوڑ کے کانسی کے دروازے ہیں' جنہیں شہنشاہ اکبر 1567 میں اس قلعہ کے مشہور محاصرہ کے بعد یہاں لایا تھا۔ (56) سورج مل جاٹ نے مچھی بھون کے سنگ مرمر کے تمام تالاب اور حوض کھدوا ڈالے اور ان کو بھرت پور کے قریب ڈیگ کے مقام پر لے گیا' جہاں اس نے چمن گھر' بارہ دریاں اور اشنان گھاٹ تعمیر کروائے' جو آج تک سیاحوں کی تعریف و توصیف کا موجب بنتے ہیں۔ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک کے دور میں دیوان عام اور اس کی قریبی عمارات کے سنگ مرمر کے منبت کاری کے کام کی بہت بڑی تعداد کو بھی نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا گیا۔ مگر آنجہانی لارڈ میو اور سابقہ وائسرائے لارڈ نارتھ بروک نے کثیر سرمایہ کے ذریعے عمارات کی مرمت کروادی۔

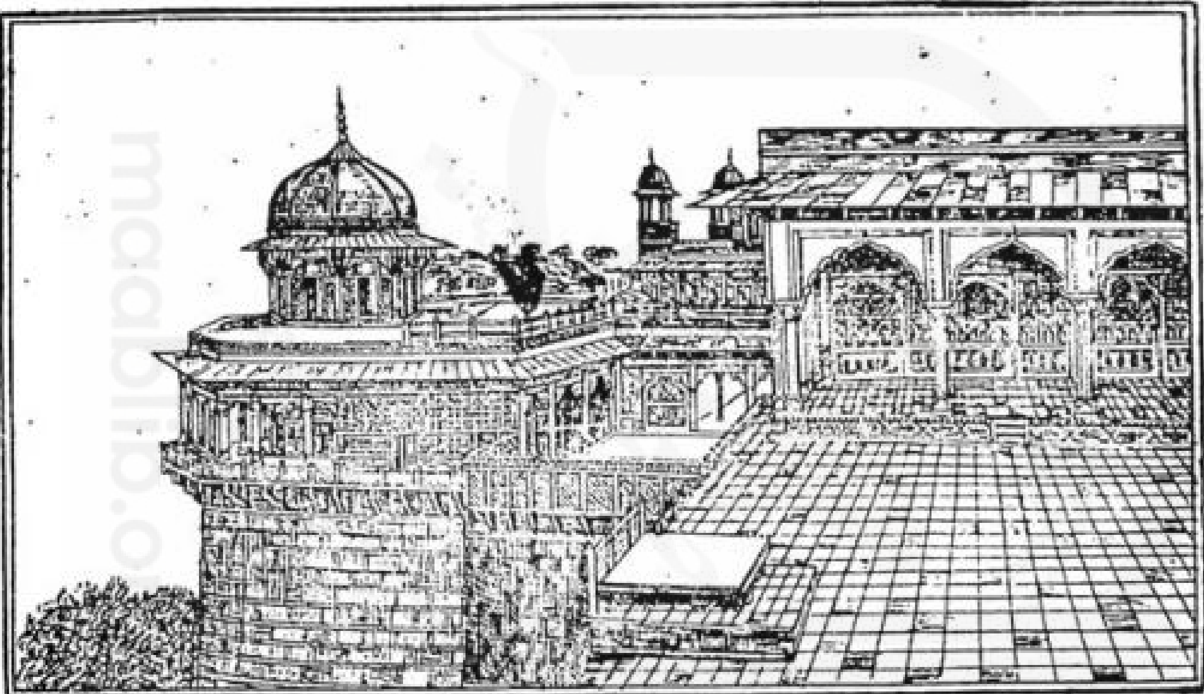
دیوان خاص: مذکورہ بالا عمارت کے شمال کی جانب ایک بلند برآمدے سے دریا کی طرف دیوان خاص کا رخ ہے۔ یہ سفید سنگ مرمر کا ایک مستطیل کمرہ ہے' جس کی لمبائی 64 فٹ اور 9 انچ' چوڑائی 34 فٹ اور اونچائی 22 فٹ ہے۔ اس کے دو شاندار ایوان ہیں' جنہیں انتہائی خوبصورتی سے تراشا گیا ہے' وہ محراب دار ستونوں کی قطار کے ذریعے اسی قدر وسیع سنگ مرمر کے ایک کھلے برآمدہ سے وابستہ ہیں۔ یہ ایوان تکمیل کا نمونہ ہیں۔ ستون اور محرابیں' جنہیں اسلامی طرز پہ تعمیر کیا گیا ہے' انہیں نہایت شاندار انداز میں تراشا گیا ہے اور ان میں منبت کاری کی گئی ہے' جبکہ دیواروں کو گلدانوں اور پھولوں کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا



دیوان خاص



دیوان خاص (اندرونی منظر)



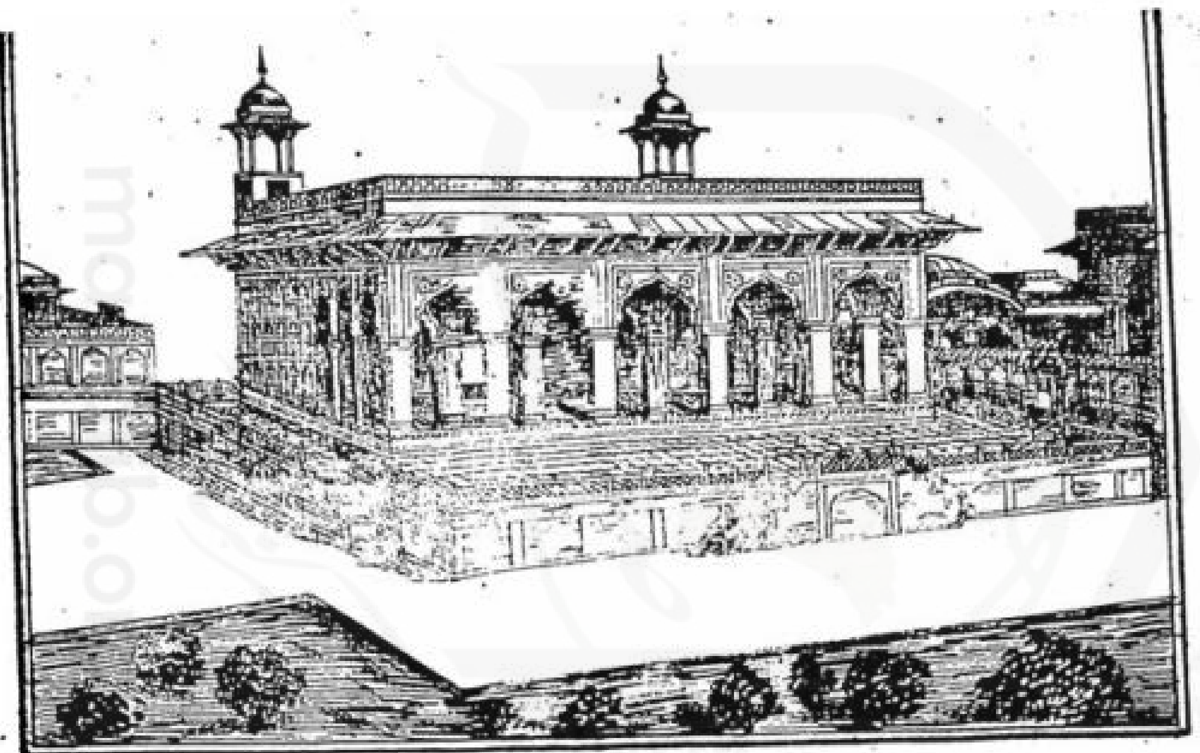
دیوان خاص ـــــ شاہی تخت اور ثمن برج

ہے۔

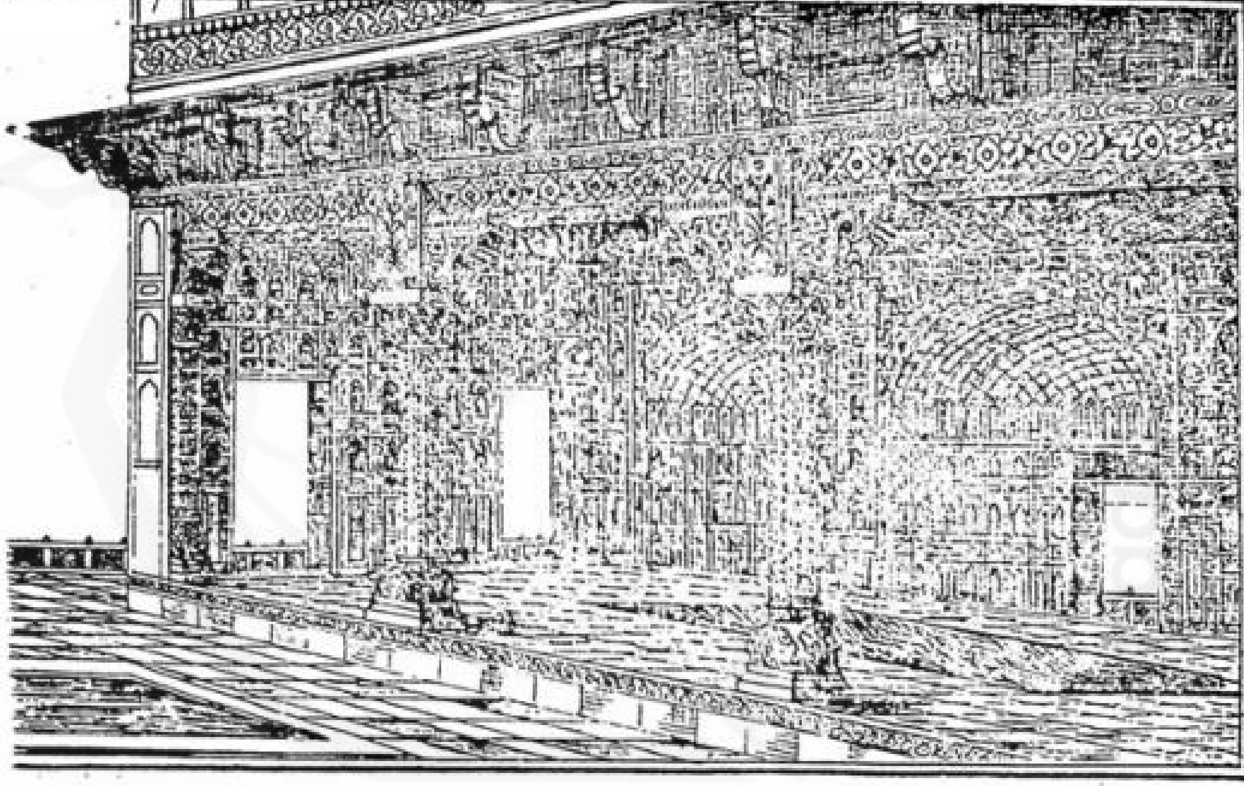
فرانسیسی سوداگر اور جوہری ٹیورنیئر، جس نے 1640ء میں اس وقت آگرہ کا دورہ کیا، جب شاہجہان ابھی تخت پر جلوہ افروز تھا، کچھ اس طرح دیوان خاص کے بارے میں بیان کرتا ہے (57):-

"دربار (یعنی دیوان عام) کے آخر پر بائیں ہاتھ ایک دوسرا دروازہ ہے، جو ایک دوسرے بڑے ایوان میں داخل ہونے کے لئے ہے، یہ بھی برآمدوں سے گھرا ہوا ہے، اس کے نیچے بھی محل کے چند افسران کے لئے چھوٹے کمرے ہیں۔ اس دوسرے ایوان سے آپ تیسرے میں داخل ہوتے ہیں، جہاں بادشاہ کے کمرے واقع ہیں۔ شاہجہاں نے دائیں ہاتھ میں واقع ایک عظیم برآمدے کی محراب پر چاندی چڑھانے کا ارادہ کیا، اس کے لئے ایک فرانسیسی آگسٹائن ڈی بورڈیوکس کو اس کی تکمیل کا کام سونپا گیا، مگر مغل اعظم نے جب یہ دیکھا کہ اس کی سلطنت میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے، جسے اس بدتمیزی کے ساتھ اس معاملہ میں بات چیت کرنے کے لئے گوا روانہ کیا جا سکے، تو یہ کام نہ کیا گیا۔ چونکہ آگسٹائن کی قابلیت کو خدشہ لاحق ہو گیا، اس لئے کوچن سے واپسی پر اس کو زہر دے دیا گیا۔ اس برآمدے میں سنہری اور لاجوردی پھول بوٹے بنائے گئے ہیں اور فرش پر قالین بچھایا گیا ہے۔ برآمدے کے نیچے دروازے ہیں، جو انتہائی چھوٹے چوکور کمروں میں داخلہ کے لئے ہیں۔ میں نے ان میں سے صرف انہیں دو یا تین کو دیکھا، جن کو ہمارے لئے کھولا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ دوسرے بھی اسی طرح کے ہیں۔ دربار کی دیگر تینوں اطراف کھلی ہیں اور وہاں سہارے کی بلندی تک ایک سادہ سی دیوار ہے۔ ایک جانب دریا کے رخ آگے کو باہر نکلا ہوا دیوان ہے، جہاں بادشاہ اس وقت آ کر بیٹھتا ہے، جب وہ اپنے بازی گروں کو دیکھنے اور ہاتھیوں کی لڑائی سے لطف اندوز ہونے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ دیوان کے سامنے ایک برآمدہ ہے، جو ایک ڈیوڑھی کا کام دیتا ہے۔ شاہ جہاں کا منصوبہ تھا کہ اس کو مکمل طور پر لعل اور زمرد کی جالیوں سے مزین کر دیا جائے، جو قدرتی لحاظ سے یہ تصور پیش کریں گی کہ سبز انگور سرخ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ مگر یہ منصوبہ چونکہ بہت زیادہ مہنگا ثابت ہوا، اس لئے اسے ترک کر دیا گیا۔"

خاص محل: دیوان خاص کے آگے دریا کے رخ زنانہ یا حرم ہے، جسے خاص محل یا شاہی حرم کی خواتین کے نجی کمرے کہا جاتا ہے۔ محل کی بنیادیں سنگ سرخ کی ہیں، دریائے جمنا دیواروں کے ساتھ ساتھ سترفٹ نیچے بہتا ہے مگر اس کے تمام کمرے، راہداریاں اور شہ نشین سفید خاص سنگ مرمر کے ہیں، ان کو انتہائی واضح طور پر تراشا گیا ہے اور پھولوں اور بیل بوٹوں سے



خاص محل



محل کا اندرونی منظر

بڑی ظلمت کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہے۔ شاہجہاں نے اس خوبصورت عمارت کو نئی دہلی سے قبل تعمیر کروایا تھا؛ نیز' ملمع کاری سے مزین چھتوں اور گنبدوں کے ساتھ اس کی پر تکلف بارہ دریاں پھولدار پچی کاری کا بہترین نمونہ ہیں اور انتہائی شاندار اور خوبصورت ہیں۔ یہ سب سنگ یشب' عقیق' لاجورد' سنگ سلیمان اور سنگ ستارہ سے جگمگ کرتے ہیں۔ برآمدوں اور چھجوں میں اس قدر کشادہ اور خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں کہ ایک امریکی سیاح کے مطابق"" جب انہیں نیچے سے دیکھا جائے تو ان کی مشابہت فیتے کی جھالر سے بہت ملتی جلتی نظر آتی ہے۔" ایک حصہ کی دوسرے سے وابستگی اور عمارت کے مختلف حصوں میں قائم مکمل آہنگی' طرز تعمیر کی عمدگی اور سب سے بڑھ کر ان کی شان و شوکت' ان کے تعمیر کنندہ کے ذوق کا ثبوت ہیں اور انہوں نے حیران مشاہد کو تعریف اور حیرانگی کے جذبہ سے سرشار کر دیا ہے۔ کوئی کمرہ' بارہ دری' کوئی برآمدہ یا کھڑکی نامکمل نہیں ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے' جیسے شاہی ایوانوں کو ابھی ابھی ان کے مکینوں نے خالی کیا ہو اور عظیم بادشاہ کے گھرانے کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ آنکھوں کے سامنے اس کے روزمرہ معمول کے سرکاری فرائض اور اس کی نجی زندگی کے مشاغل اور گھریلو زندگی کے بارے میں واضح اور جیتی جاگتی تصویر لے آتے ہیں۔

برآمدہ: دریا کے رخ پر ایک برآمدہ میں خالی جگہوں کے نشانات ہیں۔ ان خالی جگہوں میں دیواروں کے ساتھ بنے ہوئے شیشہ پر تیمور سے لے کر دیگر مغلیہ شہنشاہوں کی تصاویر رکھی ہوئی تھیں۔ بھرت پور کا جاٹ راجہ سورج مل ان تصاویر کو اپنے ساتھ لے گیا اور جاٹوں کی لوٹ مار کی نشانی کے طور پر ان جگہوں کو خالی چھوڑ گیا۔

یہاں اور وہاں' وقت اور لوٹ مار کے مضر اثرات نمایاں ہیں۔ دیوان خاص کے سامنے ایک چھوٹے سے صحن میں سنگ مرمر کی جالیوں میں توپ کا ایک گولہ پھٹنے کے باعث شاہی بارہ دری کی جالی میں ایک شگاف پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سندھیہ کی فوج کے کمانڈر جنرل پیرن کی گولہ باری کا نتیجہ تھا جس نے 1803ء میں قلعے کا محاصرہ کر کے زیادہ تر حملے کے لئے اس حصہ کو منتخب کیا تھا۔ سنگ مرمر میں جڑے ہوئے' عقیق کے متعدد پھولوں اور شگوفوں اور سنگ ستارہ اور جواہرات کے پتوں کو انتہائی بے شرمی سے اکھاڑ لیا گیا ہے جبکہ چمکدار فوارے اور تالاب خشک ہیں۔

خاص محل کی دیواروں پر فارسی کی مندرجہ ذیل نظمیں درج ہیں:-

ازیں دلکشا قصر عالی بنا	ہو اکبر آباد شد عرش سا	(مثنوی)
بود کنگرش از جبین سپہر	نمایان چو دندان سین سپہر	

نجود در این سرائے' مرود　　کند سرنوشت بد از جبہ رود.

شرافت یکی آیہ در شان او　　سعادت در آغوش ایوان او　　(ابوبکرؒ)

رہ جور از بیش و کم بستہ است　　بزنجیر عدلش ستم بستہ است

بنازم بزنجیر کہ عدل شاہ　　ہمہ چشم شد در رہ داد خواہ

بر احوال مردم چنان در حساب　　کہ داند چہ بینند شبہا بہ خواب　　(اللہ محمؐ)

در ایوان شاہی بصد احتشام　　چو خورشید بر چرخ بادا مدام

چو ایوان او عالم آرائے شد　　سر خان زو آسمان سائے شد

شہنشاہ آفاق شاہ جہاں　　کہ ناز دبلو روح صاحبقران　　(عمرؓ)

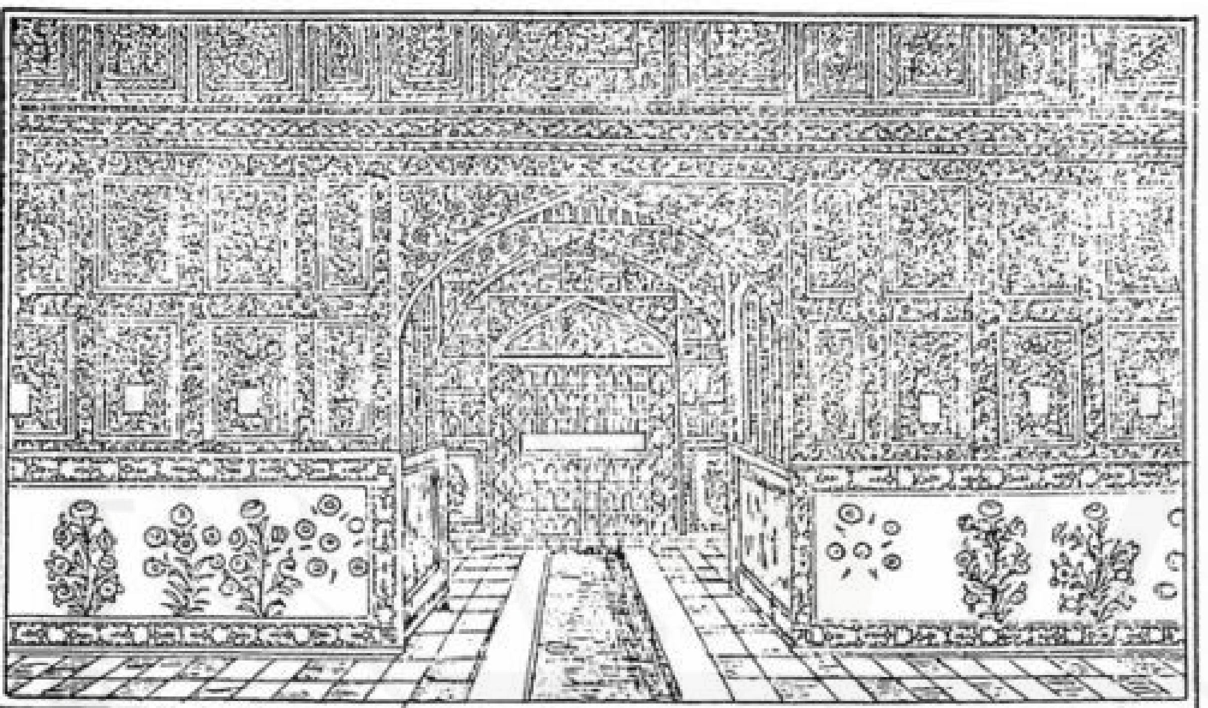
باین رونق و زیب و زینت مکان　　ندیدہ بروئے زمین آسمان

بود صحن بامش چو سیمائے مہر　　بزیرش فلک چو سایہ سپہر

بتاریخش اندیشہ آورد رو　　در فیض شد باز از چار سو

چنین گفت طبع حقایق شناس　　سعادت سرائے و ہمایوں اساس

ترجمہ: کشادہ بنیاد کے اس دلکشا محل کی تعمیر سے اکبر آباد نے اپنا سر نویں آسمان (58) تک بلند کر دیا ہے۔ اس کی کنگورے دار دیواریں آسمان کی پیشانی کو چھوتی ہیں اور لفظ س (59) کے دندانوں کی طرح واضح ہیں۔ اس دلفریب عمارت کے دروازہ کے سامنے سر بسجود (60) ہونے سے پیشانی پر سے بدقسمتی کا لکھا مٹ جاتا ہے' اس کی شان میں صرف ایک لفظ شرافت ہے' سعادت اس کے ایوان کی آغوش میں رہتی ہے۔ کسی بھی طرف ظلم و ستم کا راستہ بند کر دیا گیا ہے' اس کی زنجیر عدل (61) سے ظلم و ستم کے ہاتھ باندھ دیئے گئے ہیں۔ مجھے بادشاہ کی زنجیر عدل پر فخر ہے' کیونکہ یہ ہر وقت عدل کے متلاشی لوگوں سے انصاف کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ اسے لوگوں کی خفیہ حالت کا اس قدر علم ہوتا ہے کہ یہ اس بات کو بھی جانتی ہے کہ وہ اپنے خوابوں میں کیا دیکھتے ہیں۔ دعا ہے' یہ ایوان شاہی میں اس طرح تزک و احتشام سے رہے' جس طرح سورج آسمان میں رہتا ہے۔ جب بادشاہ کے اس ایوان نے دنیا کو آراستہ کیا تو زمین کا سر فخر سے آسمان کو چھونے لگا۔ بادشاہ عالم شاہجہاں' جو صاحب قران کی روح کا ناز ہے۔ (62) اس نے اس قدر خوبصورتی' شان و شوکت اور جاہ و جلال کے حامل محل کی بنیاد رکھی کہ آسمانوں نے سطح زمین پر کبھی اس طرح کی کوئی عمارت نہیں دیکھی ہوگی' اس کی بالائی منزل کا صحن چاند کی پیشانی کی طرح چمکتا ہے: آسمان اس کے نیچے ایک سائے کی طرح رہتا ہے۔ جب میں نے خرد سے اس کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا تو سخاوت کے دروازے ہر جانب سے مجھ پر کھل گئے۔



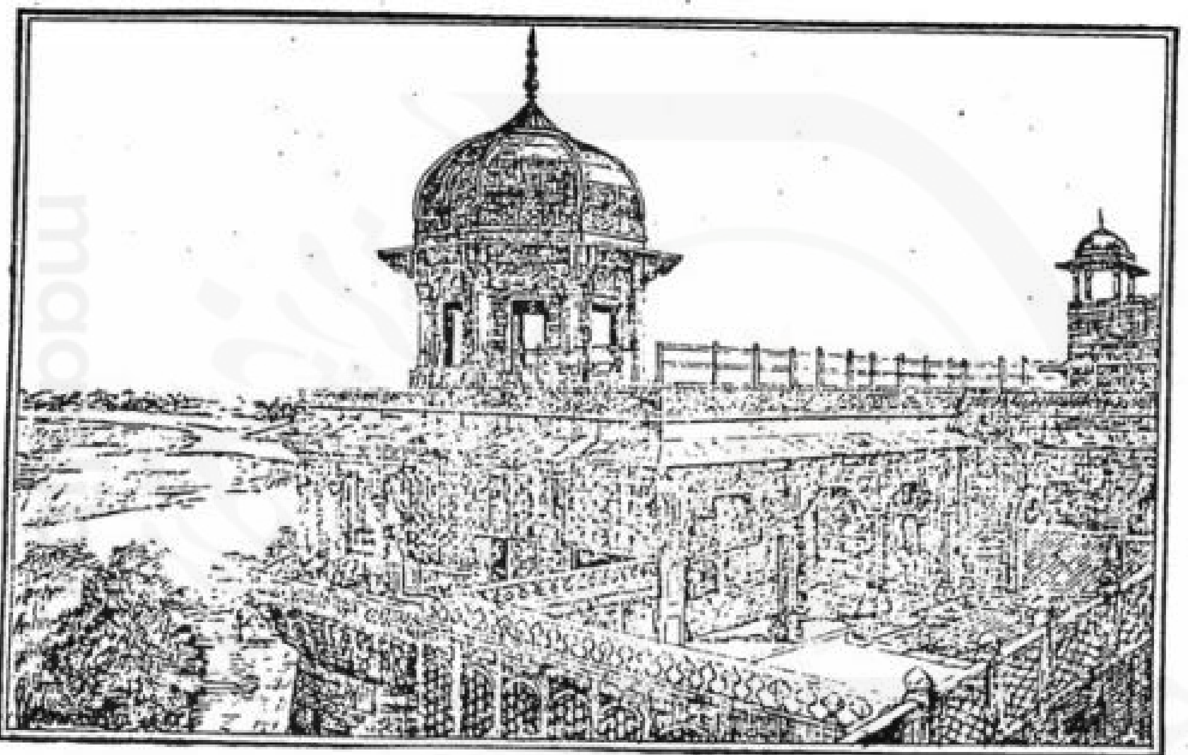
شیش محل

چنانچہ' ہر وقت بچ کی جانب کھڑے رہنے والے ذہن نے کہا: یہ خوش قسمت بنیاد کا ایک خوشحال محل ہے۔ (63)

انگوری باغ: خاص محل کے سامنے انگوری باغ ہے' جس میں ابھی تک سرسبز جھاڑیاں' گلاب' چنبیلی کے پھول اور انگوروں کی بیلیں اگتی ہیں اور اس میں شاندار فوارے اور باغیچے ہیں۔ یہ 170 x 235 کا ایک بہت بڑا ایوان ہے' اس کے تینوں جانب کمروں کے تین جوڑے ہیں' ان سب کو اکبر نے حرم کے استعمال کی غرض سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے اردگرد ستونوں کی قطاریں ہیں اور چوتھی جانب سنگ مرمر کی ایک کشادہ بارہ دری ہے۔ اس ایوان کا تعلق شیش محل اور شاہی حماموں کے ساتھ ہے۔ 1857ء کے پر آشوب ایام کے دوران برطانوی افسران اور ان کے خاندان پناہ حاصل کرنے کے لئے انہیں کمروں میں جمع ہوئے تھے۔

شیش محل: انگوری باغ کے شمال کی طرف ایک چھوٹا سا راستہ خواتین کے کمروں کے انتہائی قابل ذکر حصہ شیش محل کی طرف جاتا ہے: اس کو اس لئے شیش محل کہا جاتا ہے کہ دیواروں میں ابرق کے ساتھ شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگائے گئے ہیں' جو چھوٹے چھوٹے اور ننھے منے آئینوں کے عکسوں کا تصور پیش کرتے ہیں۔ یہ چمکدار عمارت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ مرکز میں ایک خوبصورت فوارہ ہے' جس کا پانی سنگ مرمر کے حوضوں میں چلا جاتا ہے' انہیں اتنے انوکھے انداز میں تراشا گیا ہے کہ اس کے اوپر حرکت کرتا ہوا پانی مچھلی معلوم ہوتا ہے۔ جن دیواروں پر یہ نقلی جھرنا اچھلتا کودتا ہے' شمال کی جانب سے انہیں اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ انہیں اندرونی جانب سے بھی روشن کیا جا سکتا ہے' چنانچہ' چاروں طرف لگے ہوئے صاف و شفاف ہزاروں آئینے اور ان کے نیچے پانی کی چادر سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی اور نیچے گرتی ہوئی پھوار کے باعث نکلتی ہوئی شعاعیں انتہائی زرق برق اور سحر انگیز نظارہ پیش کرتی ہیں۔ یہ نظارہ الف لیلوی داستان کی تمام تر زیب و زینت کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ سنگ مرمر کے وہ جھنڈے' جن کے ساتھ ان روشن کمروں کے فرش ہموار کئے گئے تھے انہیں کھود کر نکال لیا گیا ہے۔

حمام: زنان خانہ کے قریب حمام' غسل کرنے کے لئے متعدد کمروں پر مشتمل ہے۔ سینکڑوں چشموں سے اٹھنے والا پانی کمرے میں ایک دلکش خنکی پیدا کر دیتا ہے' جبکہ نمایاں ابھار میں کندہ کاری اور سنگ مرمر کی اعلیٰ چمک نے کام کی پختگی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حمام سے سنگ سرخ کے دو راستے جمنا کی طرف جاتے ہیں' جو دیواروں کے ساتھ گذرتا ہے۔ ان میں سے ایک



ثمن برج

حرم شاہی کی بیگمات اور ان کی کنیزوں کے لئے اور دوسرا جہانگیر کی ہندو ملکہ جودھ بائی کے لئے تھا۔ شاہی محل کے برآمدوں سے دوسرے کنارے پر باغات اور کھجور کے درختوں کے ذخیروں کا ایک خوبصورت نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ دریا سے تقریباً" ایک میل نیچے کی جانب ہندوستان کا عجوبہ تاج محل ہاتھی دانت اور ہیرے سے تراشیدہ ایک محل کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

پچیسی: اگلے ایوان میں سفید اور سیاہ سنگ مرمر کے چوکور خانوں کے ساتھ فرش بندی کی گئی ہے' جو پچیسی کے تختہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ کھیل مشرقی تختہ نرد کی ایک قسم ہے۔ اس کشادہ تختہ میں ہر خانہ اتنا چوڑا ہے کہ ایک آدمی اس میں بیٹھ سکتا ہے۔ عام کھیلوں میں ہاتھی دانت کے ٹکڑے یا مورتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ مگر کہا جاتا ہے کہ اکبر اور اس کی بیویاں اس تختہ پر زرق برق لباس میں ملبوس لڑکیوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اس کھیل میں ان کے مقام کو ظاہر کرنے کے لئے انہیں علامات کے ذریعے علیحدہ کیا گیا تھا' وہ کھلاڑیوں کی چھڑی کی حرکت کے مطابق ایک خانہ سے دوسرے میں چلتی رہتی تھیں۔

ثمن برج: پچیسی تختہ کے ایوان کی ایک جانب ملکہ عالیہ کی خلوت گاہ ثمن برج ہے۔ اس کو شاہجہاں نے تعمیر کروایا اور یہیں پر بادشاہ نے اپنی جوانی کی بیوی کے درخشندہ مقبرہ کی طرف آنکھیں گھما کر آخری سانس لیا' اس کی شفیق بیٹی جہاں آراء اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ (64) یہ عمارت خالص سنگ مرمر کی ہے اور اس میں انتہائی واضح طور پر کندہ کاری اور منبت کاری کی گئی ہے۔ اس کے وسط میں گلاب کے پھول کی شکل میں سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا مگر صاف ستھرا حوض ہے۔ یہ وہ حوض ہے' جسے بادشاہ کی چہیتی بیوی' تاج محل کی خاتون' ارجمند بانو بیگم منہ ہاتھ اور پاؤں دھونے کے لئے استعمال کیا کرتی تھی۔ اس کو قیمتی پتھروں سے آراستہ کیا گیا تھا' ان سب کو جاٹ اپنے ساتھ لے گئے۔ دیوار کے اوپر دو چھوٹی کھڑکیاں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بڑی سلطانہ انہیں اپنے جواہرات اور زیورات رکھنے کے لئے استعمال کیا کرتی تھی۔ وہاں تک ایک سنہری سیڑھی کے ذریعے جا سکتے ہیں۔ اسی برج سے شاہی بیگمات نیچے کھلے میدان میں جانوروں کی لڑائی دیکھا کرتی تھیں۔ بادشاہ دوسری جانب سنگ مرمر کے تخت پر جلوہ افروز ہوتا تھا۔

دریا کے رخ پر کھلا برآمدہ' جہاں اب سنگ مرمر کا تخت موجود ہے' پہلے اس پر چھت موجود تھی اور یہ دیوان خاص کا ایک حصہ تھا۔ مگر بھرت پور کے راجہ نے ایوان کو مسمار کر دیا اور اس کا سازو سامان اس نے اتار لیا۔ اس کے پتھروں میں سے سنگ مرمر کے پانچ ٹکڑے عجوبہ کے طو کر گئے' جبکہ تک قو



عک رر کا تخت

کتاب کو لکھا جا رہا تھا۔ (65) سفید سنگ مرمر کے محل (جسے شاہجہاں کا دیوان خاص کہا جاتا ہے) کے شمال کی طرف فن سنگ تراشی کے طور نمونہ یعنی سیاہ سنگ مرمر کے ایک تخت کو دیکھا جا سکتا ہے۔

سیاہ سنگ مرمر کا تخت:

جسے بمعہ چاروں ٹانگوں کے مکمل طور پر ایک ہی ٹکڑا سے تراشا گیا ہے' 10 فٹ ساڑھے سات انچ لمبا' 9 فٹ 10 انچ چوڑا اور 6 انچ موٹا ہے۔ یہ پتھر 1 فٹ 4 انچ اونچا ہے اور اسے ہشت پہلو پایوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ اس میں مکمل طور پر ایک طویل دراڑ آ گئی ہے' جسے سورج مل جاٹ کے بیٹے بھرت پور کے راجہ جواہر سنگھ غاصب جاٹ کے قدموں کی نحوست سے منسوب کیا گیا ہے' جس نے 1765ء میں عارضی طور پر آگرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ سریع الاعتقاد لوگ بیان کرتے ہیں کہ جاٹ سردار کے ناپاک قدموں کے باعث نہ صرف اس میں پہلو بہ پہلو دراڑ پیدا ہو گئی' بلکہ اس میں دو جگہوں سے خون پھوٹ پڑا' اس کے تھوڑی ہی دیر بعد غاصب کو محل میں ھلاک کر دیا گیا' جبکہ اس کے باپ کو نجیب الدولہ کے ساتھ لڑائی میں قتل کر دیا گیا۔ تاہم' تخت پر سرخ نشانات کی موجودگی معدنی ملاوٹ کے باعث ہے۔ اس تخت کو شہنشاہ جہانگیر دیوان خاص میں اپنے وزیروں کے ساتھ استعمال کیا کرتا تھا۔ اس پتھر کے چاروں طرف فارسی کے بڑے بڑے حروف میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

چون شاہ سلیم وارث تاج و نگین — بر تخت نشست و بست گیتی آئین
شد اسم مبارکش جہان گیر چو ذات — وز نور عدالت لقبش نورالدین
بادشاہی کہ تیغ او سا زد — چوں دو پیکر سر عدو بدو نیم
باشد این تختگاہ فرخندہ — تکیہ گاہ خدایگان کریم
تحک خسرو ان پائی ملک — مہو مہ را عیار برز دو سلیم
مسند با صفا زنور و ضیا — گوہر بی بہا چو در یتیم
بہے تاریخ او بفکر شدم — عدوے جستم از خدائی حکیم
تافلک تختگاہ' خورشید است — گفت مانند سریر شاہ سلیم

ترجمہ: جب شاہ سلیم وارث تخت و تاج تخت پر بیٹھا اور حکومت کا انتظام سنبھالا' تو اس کی فطرت کے مطابق اس کا نام جہانگیر بن گیا اور اپنے انصاف کی روشنی سے اس نے نورالدین کا لقب حاصل کیا۔ ایسا بادشاہ' جس کی تلوار ستارہ جوزا کی طرح دشمن کے سر کو دو ٹکڑوں میں کاٹتی ہے' اس کا مبارک تخت مستقبل کے کئی بادشاہوں کی پناہ ہو! فرشتوں سے برابری کے لئے یہ

ان جیسے بادشاہوں کا امتحان ہے' سورج کے سونا اور چاند کی چاندی کے لئے کسوٹی ہے۔ یہ شاندار تخت چمک دمک اور شان و شوکت کے معاملہ میں ایک گراں بہا اور قیمتی موتی کی طرح ہے۔ اس کی تاریخ کے بارے میں سوچنے کے لئے میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد چاہی' آخر کار آواز آئی' جب تک آسمان سورج کے لئے تخت رہے' اس وقت تک بادشاہ سلیم کا تخت قائم رہے' 1011 ہجری

جنوبی طرف (مرکز) شمالی جانب (مرکز)

سریر حضرت سلطان سلیم اکبر شاہ ہمیشہ باد مزین بنور مہر اللہ

ترجمہ: سلطان سلیم اکبر شاہ کا تخت ہمیشہ اللہ کی مہربانی کے نور سے زیب و زینت حاصل کرے۔

مشرقی جانب عبارت کے نیچے مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

"اسم سامی پیش از جلوس شاہ سلیم وبعد ازان نور الدین محمد جہان گیر بادشاہ غازی۔"

تخت نشینی سے قبل اس کا قابل فخر نام شاہ سلیم اور بعد میں نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی تھا۔

بلند مرتبہ باد از فلک ز حکم الہ سریر شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ

ترجمہ: اکبر شاہ کے بیٹے جہانگیر شاہ کے تخت کا مرتبہ اللہ کے حکم سے آسمان سے بھی بڑھ جائے۔

مندرجہ ذیل گوشوارہ تخت پر عبارات کے اصلی مقامات کو ظاہر کرتا ہے:

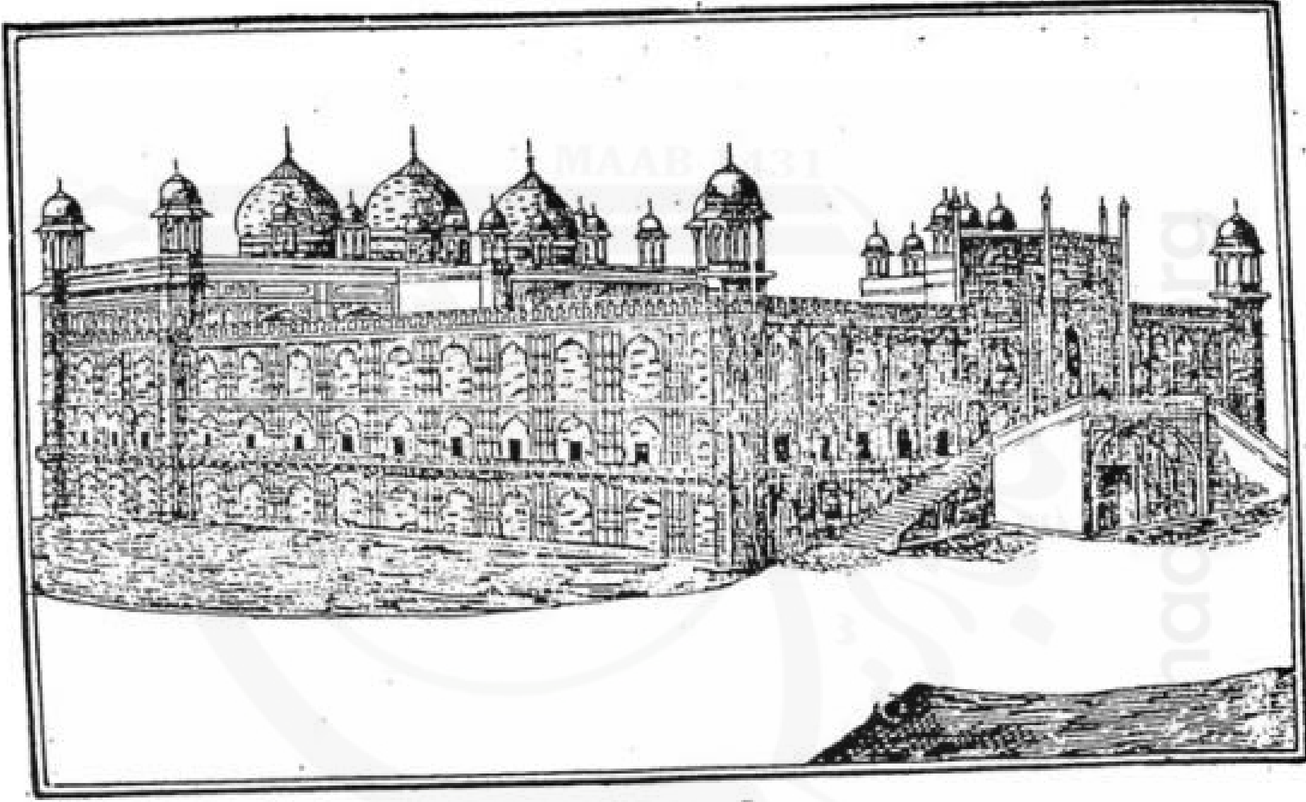
تخت خسروان پای ملک مروہ راعیار برزد و سلیم مسند یاصفا ز نور و ضیا گوہر بے بہا چو در یتیم

باشد این تختگاہ فرخندہ یا حافظ ہمیشہ باد مزین بنور مہر الہ یا حفیظ تکیہ گاہ خدا ایگان کریم

تا فلک تختگاہ خورشید ست گفت ماند سریر شاہ سلیم بادشاہی کہ تیغ او سازد چون دو پیکر سرعدو بدو نیم

بہر تاریخ او بفکر شدم سریر حضرت سلطان سلیم اکبر شاہ مژدہ جستم از خدائی حکیم

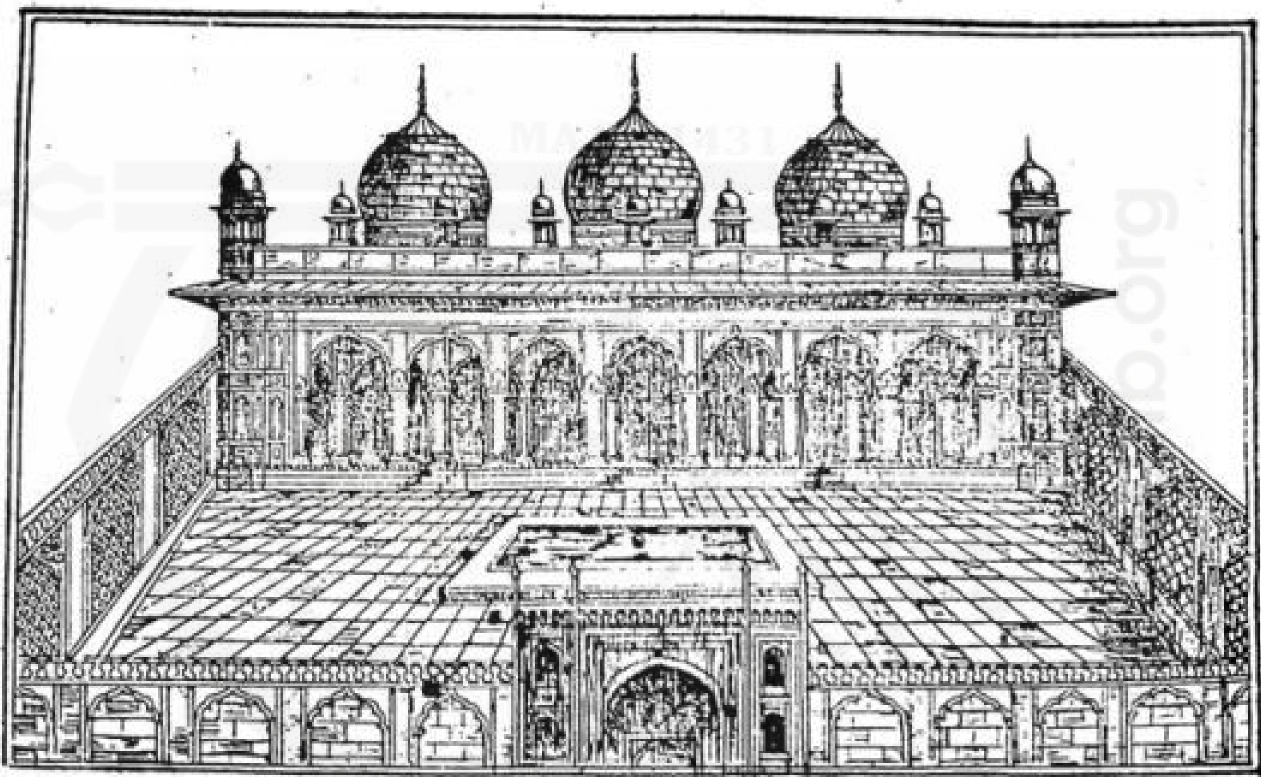
موتی مسجد: قلعہ میں سب سے زیادہ خوبصورت عمارت شاعرانہ اور مناسب نام کی حامل موتی مسجد ہے۔ یہ دیوان عام کے شمال میں ایک بلند ٹیلے پر استادہ ہے' وہاں رسائی سیڑھی کے طویل



موتی مسجد (بیرونی منظر)

زینوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ جب سنگ خارا کے بھدے زینوں کے ذریعے ایک سادہ سے دروازہ میں داخل ہوں' تو اس بات کی قطعی توقع نہیں ہوتی کہ اس قدر عظیم الشان عمارت بھی یہاں موجود ہو سکتی ہے۔ کوئی شخص اچانک اپنے سامنے ایک عظیم الشان' سحر انگیز اور ممتاز عمارت کو پا کر حیران رہ جاتا ہے' جس میں شاہانہ اور عظیم الشان ہونے کے ساتھ ساتھ نزاکت' سادگی' عمدہ ذوق اور لطافت بھی پائی جاتی ہے۔ مصنف کہتا ہے" یہ ایک خوشگوار حیرانگی ہے جو حیران مشاہد کو پرجوش تعریف و ستائش سے سرشار کر دیتی ہے۔ آپ اپنے سامنے دیکھتے ہیں کہ سفید سنگ مرمر کی ایک عبادت گاہ اپنے دلنشین صحن کی چاندی کی سطح سے نہایت عمدگی سے بلند ہوئی ہے۔ مسجد کی پیمائش 187 x 234 فٹ ہے۔ چوکور صحن میں بڑی بڑی سفید سلوں کا فرش لگایا گیا ہے' اس کے اردگرد اسی پتھر کا ایک متبرک برآمدہ اور ستونوں کی قطاریں ہیں۔ فرگوسن کہتا ہے' "مسجد کی خوبصورتی اس کے صحن میں پائی جاتی ہے' جو فرش سے لے کر گنبدوں کی چوٹی تک مکمل طور پر سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔" اس وسیع و عریض صحن کی حد یعنی دروازے سے تقریباً 100 فٹ کے فاصلے پر 150 x 10 فٹ کے کمرو پر مشتمل عظیم مسجد ہے' جسے ستونوں کی تین قطاروں نے سہارا دے رکھا ہے' جو انتہائی نزاکت سے تیار کردہ اسلامی طرز کی محرابوں کے ذریعے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ سفید سنگ مرمر کے تین دلکش گنبد بمعہ اپنے سنہری کلسوں کے برآمدوں سے انتہائی خوبصورت انداز میں ابھرے ہوئے ہیں اور فصیل سے کافی حد تک اونچا اٹھے ہوئے ہیں' جس کی وجہ سے صحیح معنوں میں اس کی وضع قطع میں عظمت پیدا ہو گئی ہے۔ مسٹر ٹیلر کی پرجوش زبان میں' "قلعہ کے دور دراز مناظر میں یہ گنبد چاندی کے بلبلے دکھائی دیتے ہیں' جیسے ایک لمحہ کے لئے دیواروں پر رکھے ہوں اور ہوا کا جھونکا انہیں اڑا کر لے جائے گا۔"

یورپی فنکاروں اور سیاحوں نے اس عمارت کو کلی طور پر مکمل قرار دیا ہے' حالانکہ اس کی طرز تعمیر خالصتاً" اسلامی ہے' اس کے باوجود اس میں ڈورک فن کی سادگی پائی جاتی ہے۔ اس کا پورا نقشہ زندگی سے بھرپور ہے' آیا اس کا مشاہدہ اس کی پیمائشوں کے درست تناسب سے یا اس کے نقشہ کی قابل تعریف مہارت سے کیا جائے' یہ مسجد بجا طور پر فنون لطیفہ کے طالب علم' سیاح اور تماشائی کی یکساں طور پر ستائش کا موجب بنتی ہے۔ ایک ممتاز مصنف اس کی زبردست خوبصورتی کے بارے میں لکھتا ہے' "بے شک یہ مساجد کا موتی ہے' کوئی نقش چوبی اس سے انصاف نہیں کر سکتا اس کو دیکھ کر لازماً" تعریف کی جاتی ہے۔" ایک دوسرا مصنف دہلی میں شاہجہاں کی عظیم الشان مسجد کے ساتھ اس کا موازنہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے'



موتی مسجد (اندرونی منظر)

"حالانکہ ' دہلی کی دیوہیکل جامع مسجد اپنے ڈیل ڈول اور بہت بڑی جسامت کے باعث مردانہ معلوم ہوتی ہے ' جبکہ زیر بحث مسجد کو اس کی نزاکت و لطافت کے بارے میں بات کرتے ہوئے ' کم از کم زنانہ کہا جا سکتا ہے۔" پس مسٹر ٹیلر کے مفصل قلم نے اس کی خوبصورتی میں کچھ اس طرح رنگ آمیزی کی ہے: "یہ اس قدر خالص اور بے عیب عبادت گاہ ہے (جو سچی عبادت کا جذبہ ابھارتی ہے) کہ بحیثیت ایک عیسائی کے ' میں نے یہ سوچ کر خود کو عاجز محسوس کیا کہ ہمارے عظیم مذہب نے اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس مسجد سے سبقت لے جانے کے لئے اپنے معماروں میں جوش و خروش پیدا نہیں کیا۔" اس دور کے مصنف (سر رچرڈ ٹیمپل) بیان کرتے ہیں: "اس بے داغ مسجد سے زیادہ ' آدمیوں میں گہری مذہبی فلاحت کا جذبہ ابھارنے کے لئے اس سے زیادہ مناسب جگہ کوئی نہیں۔" ایک اور مصنف کہتا ہے: "یہ صرف خدائے واحد کی عبادت کرنے کے لئے انسان کی خودنمائی کے ذریعے وقف کردہ ایک خالص ترین نمونہ ہے۔" اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اس کے متعلق جس جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے ' یہ اس کی مستحق ہے۔

صحن کے وسط میں نمازیوں کے وضو کے لئے ایک خوبصورت فوارہ ہے۔ پتھر کے ایک چبوترے پر ایک سورج گھڑی بھی ہے ' مسجد اطراف میں سیڑھی کے زینوں کے ذریعے محل کے مخصوص کمروں سے وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ بغلی کمرے بھی ہیں ' جنہیں حرم کی بیگمات کی عبادت کے لئے سنگ مرمر کی جالیوں سے علیحدہ کیا گیا ہے۔ مسجد میں 600 نمازیوں کی گنجائش ہے۔ سامنے والی محراب پر جنجتی کے اوپر سیاہ سنگ مرمر کے حروف میں درج عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اسے شاہجہان نے 1063ھ (1654) میں تعمیر کروایا۔

مسجد کی عمارت جسے 57 - 1056ھ (1648ء) میں شروع کیا گیا ' کی تعمیر کو سات برس کا عرصہ لگا اور اسے 1063 ھ (1652ء) میں یعنی شاہجہاں کی حکومت کے 26 ویں برس میں مکمل کیا گیا۔ اس پر تین لاکھ روپے لاگت آئی۔

مسجد کے اندر مغربی کونے کی طرف سہارا دینے والے ستونوں کی پہلی قطار کے اوپر جنجتی پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:-

این کعبہ نورانی و بیت المعمور ثانی کہ صبح در جنب صفائی آن
شامیست تیرہ و خورشید از فرط ضیائی آن چشمیست خیرہ - کرسی پایہ ارش
باسارق عرش ہمدوش و گنبد فیض بارش باوراق فردوس ہم آغوش
بنیان عالی شانش تبیان لمسجد اسس علی التقوی ' وذروہ سپہر

افرازش ترجمان فاستوی دعو بالافق الاعلی۔ ہر گلدستہ اش دستہ
نورے بانوار کواکب بستہ۔ یا فوارہ فیضی چشمہ آفتاب جستہ۔ ہر کلس
زرینش شمع فروغ بخش قنادیل آسمانی۔ ہر محراب نور آگینش ہلال
نوید رسان عید جاودانی۔ بر اطرافش قلعہ لال فام مستقر الخلافہ اکبر
آباد کہ بازمردین حصار سبع سیارہ پیوستہ۔ گوی ہالہ ایست دور بدر
منور کہ بر فیضان سحاب رحمت برہانیست متین۔ یا دایرہ ایست گرد
مہر انور کہ بر ترشح امطار کرامت نشانیست مبین۔ ہمانا بہشتی
قصریست والا۔ از یک لولوے لالا۔ کہ از سر آغاز معمورہ دنیا مسجدے
سراسر از سنگ مرمر مصفا عدیل آن بر روی کار دنیا مدہ۔ و از بدو ظہور
عالم معبدے منور و مجلی نظیر آن جلوہ ظہور نداوہ۔ بفرمان خاقان
سلیمان احتشام و سلطان خلیل احترام چہرہ افروز سلیمانی بانی مبانی
جہانبانی شہنشاہ عرش بارگاہ ظل اللہ۔ خلائق پناہ۔ موسس ارکان خلافت
مرصص بنیان عدل و رافت بہ یمن قدمش زمین را بر آسمان ہزاران ناز
و از فور نعمش آسمان را بازمین فروان نیاز۔ بخت و دولت را از عشق
خدمتش دوام بیداری۔ ملک و ملت را باجمال طلعتش کمال ہواداری۔
باو بہشت از خاک درگاہ فلک جاہش دریوزہ گرے۔ آتش دوزخ از آب
شمشیر دشمن کاہش وظیفہ خورے۔

بنائے ملک راز و استواری اساس عدل راز و پایداری
مدام از چشمہ تیغ ظفر خیز کند پیمانہ کفار لبریز
جنابش را فلک خدمت گذارے جبینش را سحر آئینہ دارے

قطب آسمان دین پروری و شریعت نوازی۔ مرکز دوران عدل گستری
و مملکت طرازی ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ
جہان بادشاہ غازی بنایافت و در عرض ہفت سال بصرف سہ لکھ روپیہ
آخر سال بست و ششم جلوس اقبال مانوس مطابق سنہ ہزار و شصت
و سنہ 1063 ہجری مایہ ابیہ انجام در بدو تاج اختتام بر سر گرفتہ۔ ایزد
بجمال میامن نیت حق طویت این پادشاہ دین پناہ ہمگنان را توفیق
ادائے طاعات و اکتسابے حسنات روز افزوں کناد و اجر دلالت و ہدایت آن را

بروزگار فرخندہ آثار این حق گزین حقیقت آگاہ عاید گرواجو۔ آمین۔ یارب العالمین

ترجمہ: یہ پرنور کعبہ اور بیت المعمور ثانی اس قدر درخشاں ہے کہ اس کے مقابلہ میں صبح روشن گہری شام معلوم ہوتی ہے۔ اس کی چمک دمک کا تاثر اس قدر ہے کہ اس کے مقابلہ میں سورج اس آنکھ کی طرح معلوم ہوتا ہے' جو روشنی سے چکاچوند ہو جاتی ہے۔ اس کی مضبوط بنیاد اس قدر بلند ہے کہ عرش تک جا پہنچی ہے' اس کے فیض بخش مینار فردوس کے ساتھ ہم آغوش ہیں۔ اس کی عالی شان بنیاد اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ وہ مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ اس کے کلس چمک دمک میں نصف النہار سورج سے سبقت لے گئے ہیں' جب یہ منطقۃ البروج میں سے گزرتے ہیں تو بلندی میں اس سے بڑھ جاتے ہیں۔ سورج کی پتیوں جیسی اس کی ہر کرن روشن ستاروں کے جھرمٹ سے وابستہ روشنی کا گلدستہ معلوم ہوتی ہے یا سورج سے نکلتی ہوئی خیر خواہ کرنوں کا ایک فوارہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کا ہر سنہری کلس آسمان کے ستاروں کو روشنی فراہم کرتا ہے: اس کی ہر درخشاں محراب نئے چاند (ہلال) کی طرح ہے اور ہمیشہ عید کے تہوار کی طرح اس کی پذیرائی کی جاتی ہے۔ اس کے دونوں جانب اکبر کے دارالسلطنت کا' سنگ سرخ سے تعمیر کردہ قلعہ ہے۔ یہ مسجد اس قلعہ کے لئے اسی طرح ہے' جس طرح سات سیارے آسمان کے لئے ہیں۔ کوئی اسے چاند کے گرد ایک ہالہ کہتا ہے' جو رحم کے بادلوں کی آمد کا یقینی ثبوت ہے۔ یا یہ روشن سورج کے گرد ایک دائرہ ہے' جو مہربان بارش کی آمد کی بلاشبہ علامت ہے۔ فی الحقیقت' یہ قیمتی موتی سے بنایا گیا بہشت کا ایک بلند و بالا محل ہے : کیونکہ آباو دنیا کے آغاز سے لے کر مکمل طور پر خالص سنگ مرمر کی اس طرح کی مسجد کبھی بھی نہیں بنائی گئی : نیز' تخلیق کے وقت سے لے کر اب تک چوٹی سے پیندے تک اس قدر منور اور درخشاں مسجد کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

سلیمانؑ کی شان و شوکت والے بادشاہ' ابراہیمؑ کی توقیر والے سلطان' اسلام کے خط و خال کو آراستہ کرنے والے' سلطنت کے بانی' شہنشاہوں کے شہنشاہ' (جس کا دربار مرتبہ میں عرش کے برابر ہے) ظل سبحانی' خلائق پناہ' طاقت ارکان خلافت پایہ بنائے عدل و انصاف (زمین جس کے قدموں کی برکت سے آسمان کے مقابلہ میں ہزار ہا لحاظ سے زیادہ عظمت محسوس کرتی ہے) کے حکم سے اسے تعمیر کیا گیا۔ اس کے تحائف کی فیاضی کے باعث آسمان زمین کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے اس کی خدمت کی محبت کے بموجب خوشحالی اور دولت ہمیشہ اپنے فرائض سرانجام دینے کے لئے تیار رہتی ہے۔ اس کی وضع قطع کے حسن و جمال سے سلطنت و مذہب نے بہت زیادہ دلکشی حاصل کی ہے۔ جنت کی ہوائیں اس کی عبادت گاہ کی خاک کی آرزو کرتی

ہیں۔ آسمانوں کی طرح پر عظمت ہے۔ دوزخ کی تباہ کن آگ اس کی تلوار (جو دشمنوں کو نیست و نابود کرتی ہے) کی چمک سے کچھ حصہ مانگنے کی درخواست کرتی ہے۔

سلطنت کی بنیادیں اس سے طاقت حاصل کرتی ہیں۔ عدل کی بنیاد اس سے پائیداری حاصل کرتی ہے۔ اس کی فاتح تلوار ہمیشہ کافروں کو ہلاک کرتی ہے: آسمان اس کا ایک غلام ہے۔ سحر اس کے چہرے کے لئے آئینہ بردار ہے:

آسمانی دین اور شریعت کے محور' عدل و انصاف اور مملکت طرازی کے دائرہ کے مرکز ابوالفتح شہاب الدین محمد' صاحب قران ثانی' شاہجہان بادشاہ غازی نے اس عمارت کو مبارک حکومت کے 26 ویں برس کے آخر میں بمطابق 1063ھ سات سال کے عرصہ میں تین لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا۔

خدائے وحدہ' لاشریک اس سے اس قدر راضی ہو جائے کہ اس دین پناہ' بادشاہ کے اچھے ارادوں کی برکت سے لوگوں میں عبادت کرنے اور نیک کام کرنے کی خواہش بڑھ جائے! اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت اور راہنمائی کے نتیجہ میں پروردگار کے پسندیدہ اس نیک بادشاہ کی نجات ہو جائے' یا رب العالمین' (آمین)"

نگینہ مسجد: مچھی بھون کے شمال مغربی کونے کی طرف ایک راستہ چھوٹی سی مگر 60 فٹ مربع شکل کی ایک خوبصورت نگینہ مسجد کی طرف جاتا ہے۔ اس کو اورنگ زیب نے زنانہ کی خواتین کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ موتی مسجد کی طرز پر مکمل طور پہ سفید سنگ مرمر سے تعمیر کرانے کے باعث اسے اس کی چھوٹی نقل کہا جا سکتا ہے۔ ایک بلند جگہ پر دریائے جمنا کے رخ اس کے ساتھ کمروں کا ایک جوڑا ہے' جس میں شاہجہان کے اولوالعزم بیٹے اورنگ زیب نے اسے قابل احترام قید میں رکھا ہوا تھا' چنانچہ' یہ کمرہ ابھی تک اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ کہاں رہا کرتا تھا۔ تاج محل کی خاتون اور جوانی کے ایام کی بیوی کی یاد میں اپنی تعمیر کردہ یادگار کو دیکھے بغیر اسے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ مخالف دیوار میں ایک گڑھا ہے' جہاں وضو کے لئے گرم پانی ذخیرہ کیا جاتا تھا۔

محمود کے مقبرہ کے دروازے: وہ کمرے (جو اصل میں اس وقت شاہجہان کے زیر استعمال تھے' جب وہ ہندوستان کا فرمانروا بادشاہ تھا) بھی "سومنات" کے مشہور دروازوں سے آراستہ ہونے کے باعث قابل توجہ ہیں۔ جنرل بولوک کی زیر کمان لارڈ ایلن بورو کی منظم فوج افغانستان میں انگریزوں کی فتح کی نشانی کے طور پر ان دروازوں کو غزنی سے لائی تھی۔ یہ دروازے

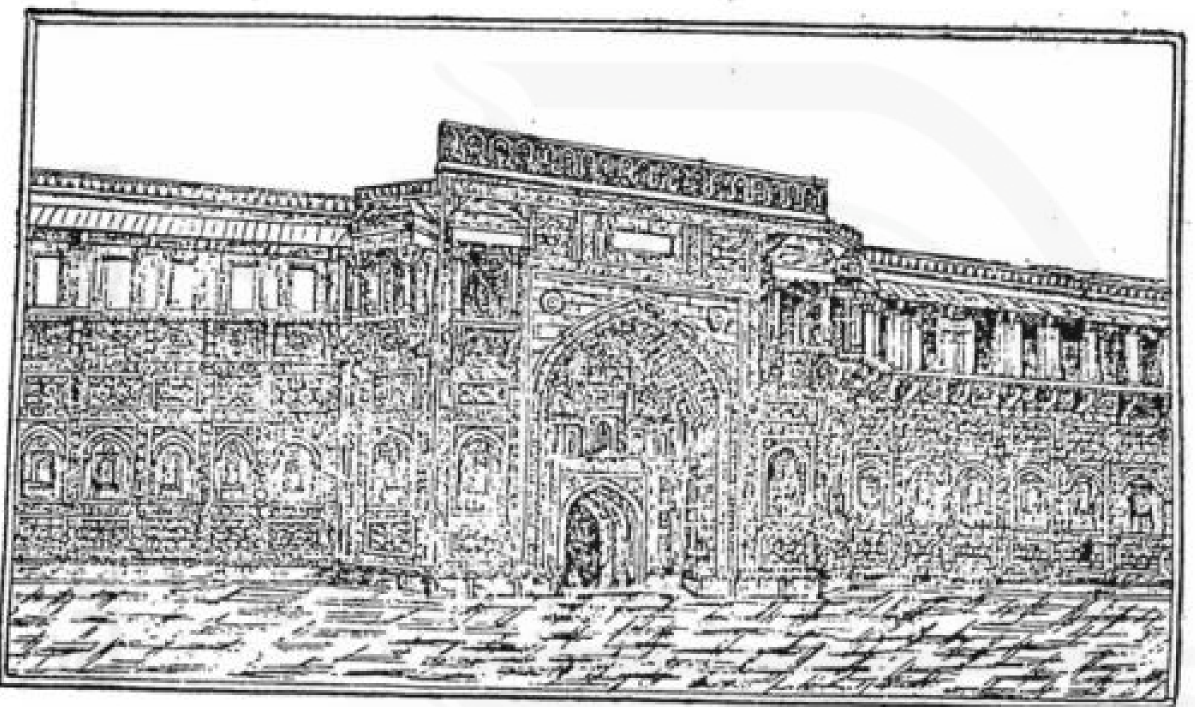
12 فٹ بلند' 9 فٹ چوڑے ہیں اور ان میں انتہائی جانفشانی سے کندہ کاری اور منبت کاری کا کام کیا گیا ہے۔ گورنر جنرل نے ہندوستان کے مقامی حکمرانوں اور لوگوں سے مذکورہ دروازوں کے بارے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "فاتح برطانوی فوج سومنات کے ان دروازوں کو فتح کر کے افغانستان سے لائی ہے' اور یہ کہ 800 برس پہلے کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا گیا ہے"۔ یہ اعلان اس بیان کی حد تک ہی درست تھا کہ ان دروازوں کو غزنی میں محمود کے مقبرہ سے لایا گیا تھا۔ مگر انھیں سومنات کے دروازے خیال کرنا ایک غلطی تھی' جن کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا تھا کہ محمود انھیں اپنے ساتھ لے گیا اور اس نے مسلمانوں کی فتح کی تصدیق کے طور پر اپنے انتقال کے بعد انھیں اپنے مقبرہ میں نصب کرنے کی وصیت کی تھی۔ اصل دروازے صندل کی لکڑی کے تھے اور اپنے باریک اور نفیس نقش و نگار کے باعث بہت زیادہ مشہور تھے۔ بہترین منصفوں کے ذریعے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ وہ آگ لگنے کے باعث جل کر تباہ ہو گئے تھے اور یہ کہ جب مقبرے کو از سرِ نو مرمت کر کے اس کا احیاء کیا گیا تو دیودار کے دروازوں کا ایک نیا جوڑا نصب کر دیا گیا۔ ایک بغور جائزہ کے مطابق' اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ حاشیہ میں کوئی عبارات درج ہیں' لہٰذا ہندوؤں کے 33 ملین دیوتاؤں میں سے نہ تو کسی ایک کی شبیہہ موجود ہے اور نہ ہی کوئی اور ہندووانہ علامت ہی ان پر عیاں ہے۔ اس کے باوجود عظیم دور کی واضح نشانیوں کے حامل ہونے اور اس عظیم ترین ایشیائی فاتح (جس کی خواہش صرف اس کی قبر ہی میں سکون حاصل کر سکتی تھی) کی آخری آرام گاہ کے تبرکات ہونے کے باعث دلچسپ ہیں۔ چوبی چوکھٹوں میں زیبائشی کام چھوٹے خانوں میں خوبصورت حاشیہ بندی پر مشتمل ہے' ہر ایک میں دو باہمی تکونوں کی شکل میں چھ کونوں کا ایک ستارہ ہے اور ان میں انتہائی متبرک منبت کاری اور بیل بوٹے بنائے گئے ہیں' ان کے اردگرد گل رنگ نقش و نگار پر مشتمل رواں حاشیے ہیں' یہ سب اسلامی دور کی غمازی کرتے ہیں۔

مینا بازار: مینا مسجد کے کمروں کے ساتھ ایک دروازہ ایک خوبصورت برآمدہ کی طرف کھلتا ہے' جس کے صحن کے ساتھ سرخ بھربھرے پتھر کے ایوان بنے ہوئے ہیں۔ اس جگہ زنانہ کی بیگمات اپنی خوبصورت اور فنکارانہ اشیاء لا کر فروخت کیا کرتیں اور بادشاہ اور اس کی بیویاں خریداروں کا کردار ادا کرتے تھے۔ یہیں پر جہانگیر نورجہاں کے زبردست عشق میں گرفتار ہو گیا۔ جب وہ اپنی نوجوانی کے ایام میں اپنی والدہ (جو اکبر کے خزانچی کی بیوی تھی) کے ہمراہ مینا بازار میں شرکت کے لئے آئی تو دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں۔ مستقبل میں ہندوستان کا شہنشاہ اس کی بانکی چال' مسکراہٹ آمیز خوبصورت طفلانہ معصومیت کے حامل اور خوشنما چہرے' لانبے قد' دلفریب جسم

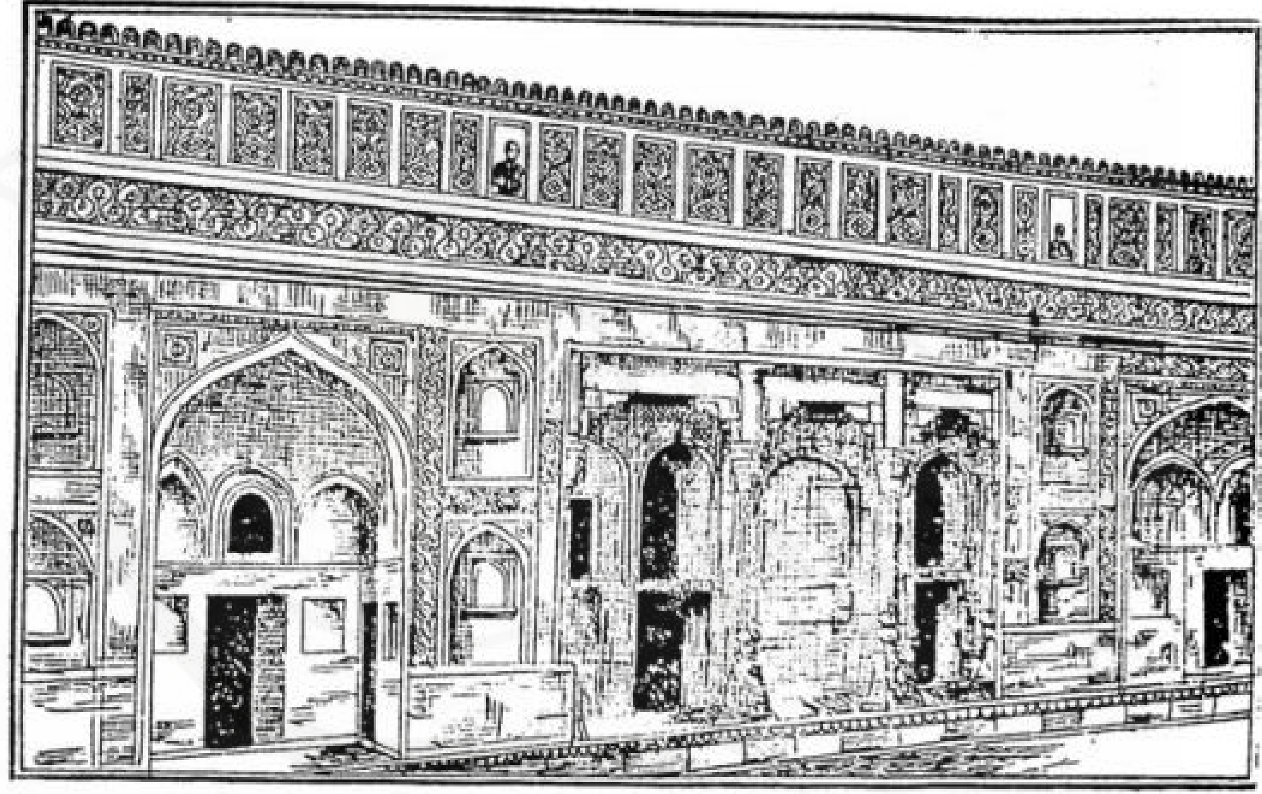
اور سرو کی طرح پتلی کمر کے سحر میں کھو کر رہ گیا' حالانکہ وہ بذات خود ایک خوبصورت بدن' لانبے قد' چوڑے چکلے سینہ' لمبے بازوؤں اور تیز آنکھوں کا مالک تھا۔ یہ عشق باہمی تھا۔ مذکورہ صحن اب لان ٹینس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

جہانگیری محل: خاص محل کے جنوب میں اور امر سنگھ دروازہ کے قریب سنگ سرخ کی ایک عظیم الشان عمارت ہے' جسے جہانگیری محل کہا جاتا ہے' انتہائی شاندار اور خوبصورت عمارت ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے' جس میں انتہائی نزاکت اور باریکیت سے کندہ کاری کی گئی ہے اور سفید سنگ مرمر کے ابھرواں حاشیے بنائے گئے ہیں: نیز دونوں صحنوں میں سرخ بھربھرے پتھر کا فرش لگایا گیا ہے۔ ان میں سب سے بڑا 70 فٹ مربع شکل کا ہے۔ مذکورہ عمارت کی خصوصیت اس کی محرابوں میں پائی جاتی ہے' چھتیں سرخ سنگ خارا کے پہلوؤں پر رکھی ہوئی ہیں' جنہیں اسی پتھر کے انتہائی خوبصورت اور بہترین کندہ کاری سے مزین ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ عمارت انتہائی پختہ ہے' فرگوسن کہتا ہے' "یہ تفصیل لحاظ سے انتہائی شاندار ہے' نیز وقت نے ہندوستان کے متعدد محلوں کی قسمت سے قطع نظر اس کے نقوش کی خوبصورتی کو تباہ کئے بغیر صرف مدھم کیا ہے۔" ایک زمانہ میں اندرونی جانب کے پتھروں اور اندرونی چھتوں پر خوبصورت اور دلفریب سنہری نقش و نگار بنے ہوئے تھے: مگر یہ سب زمانے کی دست برد کے ہاتھوں مٹ گئے ہیں: نزاکت اور باریکیت کے ساتھ تراشیدہ ہندوانہ طرز کی وحدانی محرابیں دونوں جانب پرندوں کے جوڑوں کے اوپر روایتی نرگس کے پھولوں کا حاشیہ اور دریا کے رخ سنگ سرخ کی عمارت کی اندرونی چھت پر کندہ کاری سے تراشیدہ ہاتھیوں کی مورتیاں' یہ سب مشرقی طرز تعمیر کی بے مثل آرائش اور ہندوانہ رجحانات کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ محل جہانگیر کی بیوی اور جودھ پور کے راجہ موتھ کی بیٹی جودھ بائی کی رہائش گاہ تھا' جسے مسلمان مورخین مریم زمانی کہتے ہیں' ایک دیوار کے طاق میں ہندو دیومالا کے ایک سرکردہ دیوتا ہنومان جی کی مورتی رکھی ہوئی تھی' جسے اورنگ زیب نے مسمار کرا دیا' زنانہ کے عقب میں ایک ڈھکا ہوا راستہ تھا' جسے جالیوں کے ذریعے عمارت سے جدا کیا گیا تھا۔

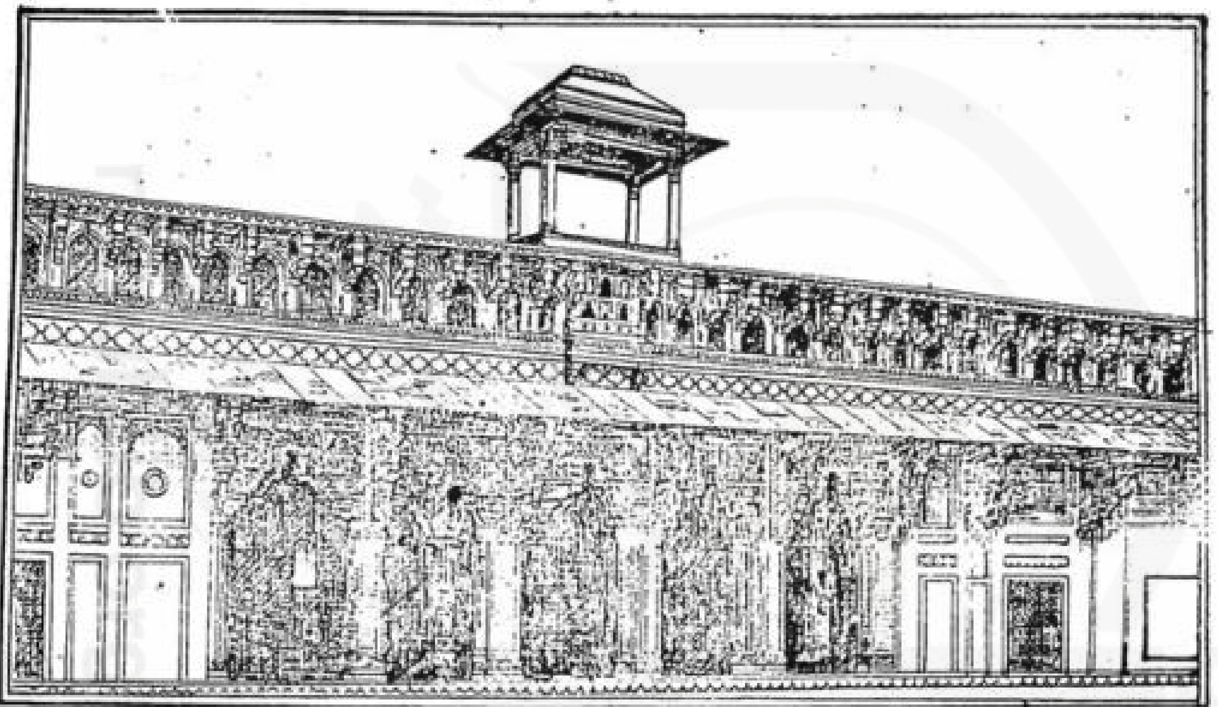
آنکھ مچولی: یہ وہی جگہ تھی' جہاں جب شاہی خاندان کے افراد آرام کرنے کے لئے جاتے تو محافظ عورتیں ان کے لئے نگرانی کے فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ وہاں پر مخصوص طرز تعمیر کے کمرے بھی ہیں' جن میں شاہی گھرانے کے افراد آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ بالائی منزل بھاری بھرکم طرز تعمیر' باریک کندہ کاری اور لطیف زیبائشی کام سے آراستہ دو شہ نشینوں پر مشتمل ہے'



جہانگیری محل (بیرونی منظر)



شہنشاہ جہانگیر کا محل



قلعہ آگرہ میں مہارانی جودھا بائی کا محل (بیرونی منظر)

ان میں سے ایک کو جدید طرز پر بنا لیا گیا ہے اور اسے ایک وارنٹ آفیسر کی رہائش گاہ میں تبدیل کر لیا گیا ہے' دوسرا اسی حالت میں ہے۔ چھت پر چند حوض بھی ہیں' جن میں دریائے جمنا کا پانی جمع کیا جاتا تھا اور اسے تانبے کی نالیوں کے ذریعے محل کے مختلف حصوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ ہر نالی پر چسپاں تمغہ کے اوپر محل کا نام کندہ ہے۔

تہہ خانے: محل کے عجوبوں میں انوکھی طرز کے تہہ خانوں کا شمار بھی ہوتا ہے' وہاں خاص محل کے جنوب میں واقع کشادہ زینوں کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ ان بھول بھلیوں کی کھڑکیاں جمنا کی طرف ہیں' جنہیں جہانگیری محل کی بنیاد سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ عمارات ایک کثیر رقبہ پر پھیلی ہوئی ہیں جن کی حد ایک باؤلی تک جا کر ختم ہوتی ہے۔ ان محرابی چھتوں والے کمروں میں بادشاہ اور اس کی دلفریب حرم موسم گرما میں سورج کی تپش اور جھلسا دینے والی گرم ہواؤں سے پناہ حاصل کرتے تھے۔ پانی کے فوارے چلا کر ماحول کو ٹھنڈا اور پر لطف بنا دیا جاتا۔ یہاں پر بادشاہ اپنی خوشگوار واپسی کے وقت صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی میں دوڑتا' شاہی گھرانے کے افراد کو ناچ گانے کی صورت میں تفریح مہیا کی جاتی' یہ کمرے رنگ رلیوں اور دلفریب چکاروں سے گونج اٹھتے۔ باؤلی میں دیوار کے پانی کے ارد گرد راستوں پر قالین بچھا کر ان پر نرم مخمل کے گاؤ تکیے رکھے جاتے' جن پر بیٹھ کر حرم شاہی کی بیگمات ہنسی مذاق اور خوش گپیوں میں مصروف ہوتیں' جبکہ بے پرواہ ملاح نچلی جانب دریا میں کشتی کھیتے ہوئے بلند و بالا دیواروں کو گھور کر حیران ہوتا کہ ان قہقہوں کا کیا مطلب ہے۔ باؤلی کی حد پر ان عورتوں کو قید کرنے کے لئے ایک اندھیرا اور خوفناک کمرہ بنوایا گیا تھا' جو بداطواری کے جرم کی مرتکب پائی جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے ان میں سے ایک تہہ خانے کا راستہ تاج محل اور سکندرا سے وابستہ ہے۔ مگر ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

ابوالفضل' بادشاہ کے دور حکومت کے نویں سال کی تاریخ میں اکبر کی طرف سے قلعہ آگرہ کی بنیاد رکھے جانے کا حال بیان کرتا ہے (1564ء):———

قلعہ کی تعمیر پر لاگت: "جب دریائے جمنا کے کنارے پر پرانے قلعہ کی عمارات امتداد زمانہ سے شکستہ ہو گئیں'(66) تو بادشاہ کے حکم سے اس کی جگہ پر سنگ سرخ سے ایک نیا قلعہ تعمیر کیا گیا۔ اس منصوبے کو ماہر مہندسوں (انجینیروں) اور باکمال اہل حرفہ نے تیار کیا تھا۔ دیوار کی چوڑائی 30 بادشاہی گز اور بلندی 60 گز مقرر کی گئی۔ یہ چار دروازوں پر مشتمل ہے' جو دنیا کے چاروں کونوں پر دولت اور خوشحالی کا دروازہ کھولتے ہیں۔ 3000 سے 4000 معمار اور اہل حرفہ روزانہ کام پر لگائے جاتے' اس طرح قلعہ کی تعمیر پر آٹھ برس صرف ہوئے۔

اس عمارت کا نگران امیر البحر قاسم خاں (67) تھا۔ اس پر 7 کروڑ ٹنکا یا 35 لاکھ روپے لاگت آئی۔"

قلعہ میں مدفون مزارات دریافت ہوئے۔

مفتاح التواریخ کے مصنف مسٹر بِیل کے مطابق' جب 1218ھ (1803ء) میں اکبر آباد (آگرہ) کا قلعہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا تو اس میں جج کی عدالت تعمیر کی گئی۔ بیالیس سال بعد یا 1845ء میں پرانے کمرہ عدالت کو مسمار کرنے کے احکامات موصول ہوئے' تو اسی مقام پر اس کی جگہ ایک نئی عدالت تعمیر کی گئی۔ پرانی دیواروں کی بنیادیں کھودنے پر جمن جمن کٹورہ کے نام سے مشہور مینار سے ایک سو قدم کے فاصلے پر چار مزارات دریافت ہوئے' ان میں سے دو عبارات کے بغیر ہیں مگر دوسرے دو فارسی عبارات کے ساتھ سنگ مرمر کے تعویذ پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ایک عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس مزار کا تعلق کسی ایسے امیر سے ہے' جس کا انتقال اکبر کے 46 ویں الٰہی برس یا 1010ھ (1601ء) میں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب اکبر خاندیس میں عسکری کارروائیوں میں مصروف تھا اور ولی عہد شہزادہ سلیم نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ قلعہ میں دو مزارات کے محل وقوع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق شاہی خاندان کے انتہائی محبوب افراد سے ہے' جن کا قبل از وقت انتقال ہو گیا تھا' چنانچہ' اپنے عزیزوں کے لئے انتہائی دکھ کا اظہار کیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک عبارت کچھ اس طرح تھی:

آہ واویلا رہ آن جانان من | رفت و مارا ساخت درغم مبتلا
سال فوتش چون بجستم از خرد | گفت باسن کائے غریب بے ریا
یکہزار و دہ ز ہجرت بود کان | رفت سوئے خلد ازیں دار فنا
گوش کن تاریخ شمسی وادگر | از الٰہی گشت نازل این ندا
روح پاکش رامیس گویم بصدق | در بہشت عدن یا رب باد جا

آہ! صد افسوس! میرا پیارا
مجھے غمزدہ چھوڑ کر رخصت ہو گیا ہے۔
جب میں نے خرد سے اس کی وفات کے سال کے بارے میں دریافت کیا؟
تو اس نے جواب دیا' اے غریب بے ریا انسان!
یہ 1010 الٰہی تھی۔
وہ اس فانی دنیا سے بہشت کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایک اور شمسی سال سنو:

وہ 46 ویں اپنی برس میں فوت ہوا۔

میں نے انتہائی خلوص دل کے ساتھ اس کی مقدس روح کے لئے دعا کی۔

اے خدا اسے بہشت عدن میں جگہ عطا فرما!

جب مسٹر بیل نے 1264ھ (1847ء) میں اپنی کتاب لکھی تو اس وقت مندرجہ بالا عبارت کا حامل تعویذ موجود تھا۔

ایک دوسرے مزار پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔۔۔۔۔

واحسرتا کہ جان جہان از جہان برفت　　بے اوبماند قالب بے جان و جاں برفت

لازم بود کہ زار بگریم بہ ہائے ہائے　　خود بود ماہ چون زجہان نوجوان برفت

فرزند آنکہ بود مرا روح وہم روان　　برمانکرو مہر بسویش روان برفت

تاریخ فوت او زخرد جستم و بگفت　　برگ گلے و شاخ گل از بوستان برفت

حبیب حیات چاک بکن کا تبا کر　　کان طوطی شکر لب شیریں زبان برفت

ترجمہ: "افسوس! جان جہاں دنیا سے رخصت ہو گیا ہے' اس کے بغیر جسم بے روح اور بے جان ہے' یہ لازم ہے کہ میں زار و قطار رو کر ہائے ہائے پکاروں! کیونکہ وہ چاند کی مانند تھا اور نوجوانی میں رخصت ہو گیا۔ میرا بیٹا' جو مجھے جان کی طرح عزیز تھا' اس نے میرے اوپر ترس نہیں کھایا اور اس کے پاس چلا گیا ہے۔ جب میں نے خرد سے اس کی تاریخ وفات کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب دیا' برگ گل و شاخ گل گلستان سے رخصت ہو گئے ہیں' اے کاتب! تمہارے اوپر لازم ہے کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو' کیونکہ شیریں لب اور شیریں زبان طوطا رخصت ہو گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے مندرجہ بالا نظمیں ایک شفیق باپ نے اپنے نوجوان بیٹے کی اپنے سے پہلے افسوسناک موت کی یاد منانے کے لئے لکھیں' انسانی زندگی کس قدر مختصر اور ناپائیدار ہے اور اس کے معاملات کس قدر تغیر پذیر اور غیر یقینی ہیں۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ شفیق باپ یا ماتم کنندہ کی شاعرانہ روانی سے پتہ چلتا ہے زندگی جس کے لئے افسوس بن کر رہ گئی تھی نہ تو وہ باقی رہا اور نہ ہی آسمان سے باتیں کرتے ہوئے محلات اور پر تکلف عمارات کے مکیں ہی اس دنیا میں رہے' دنیا کی فانی اور عارضی نوعیت کی نشانی کے طور پر وہ فراموش شدہ اور ویران پڑی ہیں: اور مزید یہ کہ زندگی میں اس پیارے انسان کی کس نشانی کا پتہ چلا ہے جو صدیوں بعد محض حادثے کے باعث خاک میں مل گیا ہے۔

Tempara mutantim elnos mutamurin illis.

تاج محل

قلعہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر مشرق کا عجوبہ' ہندوستانی فن تعمیر کا جوہر اور شان و شوکت' مشہور زمانہ تاج محل واقع ہے۔ دریائے جمنا کے خم پر واقع ہونے کے باعث یہ اپنے اصل مقام کے مقابلہ پر شہر کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ سڑک دریا کے کنارے پر ہے اور اسے 1838ء کے قحط میں بے حال مفلس لوگوں کی محنت سے تعمیر کیا گیا۔ اسی فٹ چوڑا کنارہ بہت عمدہ ہے: نیز دریا کے کنارے کے ساتھ واقع کشادہ گھاٹوں کے باعث شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ دریا کے کنارے پر بے شمار مندر' مینار' بارہ دریاں اور دیگر شاندار عمارات شہر کے نظارے کو بہت زیادہ دلکش اور دیدہ زیب بنائے ہوئے ہیں۔ کسی زمانہ میں قلعہ اور تاج محل کے درمیان جگہ شرفاء کے تفریحی محلات اور سلطنت مغلیہ کے امراء کی شاہانہ عمارات' شاندار محلوں اور چمن ہائے گل رنگ سے بھرپور تھی' مگر ماسوائے بڑے بڑے ٹیلوں اور مٹی کے بدشکل ڈھیروں کے اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ برنئر' جس نے ان عمارات کا مشاہدہ کیا تھا' "انہیں محراب دار نئے گھروں کی ایسی قطار بتاتا ہے' جن کی مماثلت دہلی میں اہم گلیوں کی عمارات سے بہت ملتی تھی۔" (68) انہیں ہمعصر مورخین' بادشاہ نامہ کے مصنف ملا عبدالحمید اور عمل صالح کے مصنف محمد صالح نے بھی دیکھا تھا۔ وہاں پر وسیع و عریض بازار تھے' جن میں ہندوستان کے مختلف علاقوں اور دور دراز ملکوں کے سوداگر ہر قسم کی اشیاء فروخت کیا کرتے تھے اور کاروباری طبقوں نے پختہ اینٹوں کی عمارات اور دوکانیں تعمیر کرائی تھیں' ان میں وہ اشیاء فروخت کے لئے رکھا کرتے تھے۔ کنارہ یا ساحل بناتے وقت پختہ اینٹوں کی پرانی عمارات اور بنیادیں دریافت ہوئیں' جن میں سے اکثر دس فٹ تک موٹی اور اس قدر ٹھوس تھیں کہ انہیں بارود سے اڑانا پڑا۔

ارجمند بانو بیگم کی سرگزشت: ارجمند بانو بیگم المعروف ممتاز الزمانی یا ممتاز محل' مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ (جس کی بیٹی نورجہاں' جہانگیر کی بیوی تھی) کے بیٹے مرزا ابوالحسن آصف



ارجمند بانو بیگم المعروف تاج محل

خاں یا آصف جاہ کی صاحبزادی تھی۔ اس ناطے سے وہ شاہ جہاں کی سوتیلی ماں نورجہاں کی بھتیجی ہوئی۔ بھتیجی بھی اپنی پھوپھی کی طرح اپنے بے پناہ حسن و جمال اور کمالات کے لئے مشہور تھی۔ جس طرح نورجہاں نے اپنی خوبصورتی اور دلکشی سے بے پرواہ' جہانگیر کو فریفتہ کیا تھا' اسی طرح ممتاز نے تخت گیر شاہجہاں کو اپنی خوبصورتی سے مغلوب کیا۔ دونوں نے اپنی باری پر اپنے بادشاہوں اور خاوندوں پر بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل کیا۔

جب شاہجہاں کی عمر پندرہ برس اور آٹھ ماہ تھی' تو جہانگیر نے اس کی منگنی ممتاز الزمانی سے کر دی' پانچ سال اور تین ماہ گذرنے کے بعد شاہجہان بیس سال اور گیارہ ماہ کی عمر کو پہنچا تو اس کی شادی ممتاز محل سے کر دی گئی۔ شادی کے وقت دلہن کی عمر 19 برس 8 ماہ اور 9 دن تھی۔ شادی جمعہ کی رات 9 ربیع الاول 1021ھ' (1612ء) کو انجام پائی۔ مشفق باپ نے ایک مبارک موقع پر اپنے ہاتھوں سے دلہا کی پگڑی پر موتیوں کا سہرا باندھا۔ شادی کی رسومات اعتماد الدولہ کے محل میں ہوئیں' شہنشاہ جہانگیر نے اپنی آمد سے اس موقع کو عزت بخشی' پانچ لاکھ روپے کا جہیز مقرر ہوا۔ اس جوڑے کو پوری زندگی ایک دوسرے سے گہری الفت رہی۔

یاد رہے کہ ممتاز الزمانی کے ساتھ شادی سے قبل شاہ جہاں ایک بیوی کا شوہر تھا۔ اس شادی سے ایک برس اور آٹھ ماہ قبل مظفر حسین مرزا (ابن سلطان حسین مرزا' ابن بہرام مرزا ابن شاہ اسماعیل صفوی شاہ ایران) کی صاحبزادی کے ساتھ اس کی نسبت طے ہوئی۔ یہ شادی رجب' 1019ھ کو اس وقت ہوئی' جب شاہجہاں کی عمر 19 برس سے زیادہ تھی۔ اس بندھن کے نتیجہ میں 12 جمادی الآخر' 1020ھ کو پرہنر بانو بیگم پیدا ہوئی۔ ممتاز محل سے شادی کے ساڑھے پانچ برس بعد (عبدالحمید کے مطابق' حکمت عملی کے تحت) اس کی شادی عبدالرحیم خان خاناں کے بیٹے شاہ نواز خاں کی صاحبزادی سے کر دی گئی۔ یہ شادی آگرہ میں ہوئی' اس کے نتیجہ میں اس کا بیٹا شہزادہ جہاں افروز پیدا ہوا وہ ایک برس اور نو ماہ کی عمر میں برہانپور میں فوت ہو گیا۔ ان دونوں شادیوں کے باوجود بادشاہ کو ممتاز الزمانی سے اس قدر وابستگی تھی کہ وہ اس کی پکی ساتھی بن گئی تھی اور بادشاہ اس سے کسی وقت بھی' حتیٰ کہ ہندوستان کے دور دراز مقامات مثلاً دکن جیسے علاقوں میں اپنی فوجی مہمات میں مصروف ہونے کے باوجود بھی جدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتی اس سے کسی طرح بھی احتراز نہ برتا جاتا۔ اس نے خاص طور پر سزائے موت پانے والوں کی عام معافی کے لئے بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی' اس بناء پر اس نے بادشاہ کا اختیار شاہی استعمال کرتے ہوئے جن متعدد اشخاص کی سفارش کی تھی' انہوں نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی۔

ممتاز الزمانی سے شاہجہان کے چودہ بچے یعنی آٹھ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں' ان میں سے سات بادشاہ کے انتقال کے وقت زندہ تھے۔

بچوں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

1- حور النساء (بیٹی) 8 صفر 1022ھ کو آگرہ میں پیدا ہوئی۔ تین برس اور ایک ماہ کی عمر میں 1025ھ میں فوت ہوئی۔

2- جہاں آراء بیگم (بیٹی) المعروف بیگم صاحب بروز ہفتہ' 21 صفر 1023ھ کو پیدا ہوئی' جب شاہجہاں میواڑ کے رانا کے خلاف مہم میں مصروف تھا۔

محمد دارا شکوہ (بیٹا) میواڑ سے بادشاہ کی واپسی پر ہفتہ کی رات' 29 صفر' 1024ھ کو اجمیر میں پیدا ہوا۔

4- محمد شاہ شجاع اتوار کی رات' 18 جمادی الاآخر 1025ھ کو اجمیر میں پیدا ہوا۔

5- روشن آراء بیگم (بیٹی) 2 رمضان المبارک' 1026ھ کو برھانپور میں پیدا ہوئی۔

6- محمد اورنگ زیب (بیٹا) ہفتہ کی شب' 15 ذیقعد' 1027ھ کو پیدا ہوا۔

7- امید بخش (بیٹا) 11 محرم' 1029ھ کو سرہند کے نواح میں پیدا ہوا' 1031ھ کو برھانپور میں فوت ہو گیا۔

8- ثریا بانو بیگم (بیٹی) 20 رجب 1030ھ کو پیدا ہوئی' 1037ھ میں سات برس کی عمر میں انتقال کر گئی۔

9- ایک اور بیٹا 1031ھ میں پیدا ہوا' مگر چند روز بعد فوت ہو گیا' اس کا نام نہیں دیا گیا۔

10- مراد بخش (بیٹا) بروز بدھ' 25 ذوالحجہ' 1033ھ کو قلعہ روہتاس میں پیدا ہوا۔

11- لطف اللہ (بیٹا) صفر' 1036ھ' میں پیدا ہوا' رمضان المبارک' 1037ھ میں ایک برس 7 ماہ کی عمر میں فوت ہو گیا۔

12- دولت افزاء (بیٹا) 1037ھ میں پیدا ہوا' اگلے سال فوت ہو گیا۔

13- 1039ھ میں ایک بیٹی پیدا ہوئی' اسی برس فوت ہو گئی۔

14- گوہر آراء بیگم (بیٹی) آخری اولاد بدھ کی شب' 17 ذیقعد 1040ھ (1630ء) کو برھانپور میں پیدا ہوئی۔

ملکہ اپنے آخری بچہ کو جنم دیتے ہوئے انتقال کر گئی۔

بادشاہ نامہ اور عمل صالح کے مصنفین' دونوں ہمعصر مورخین نے ممتاز الزمانی کے آخری لمحات کے بارے میں رقت انگیز حال بیان کیا ہے۔

ملکہ ممتاز محل حاملہ تھی' لہٰذا جب معمول کے مطابق' زچگی کا وقت قریب آیا' تو وہ اچانک بیمار ہو گئی اور زچگی کے دوران منگل کی صبح اور بدھ کی نصف شب تک درد زہ میں مبتلا رہی' یہ 17 ذیقعد' 1040ھ (1630ء) کی تاریخ تھی۔ آدھی رات کے بعد اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا: مگر کسی اندرونی ابتری کے باعث اس کی بیماری بڑھ گئی اور اسے غشی کے دورے پڑنے لگے۔ آخر کار جب اس نے دیکھا کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے' تو اس نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی شہزادی جہاں آراء بیگم سے کہا کہ وہ زنانہ کے ایک کمرہ سے اس کے شوہر بادشاہ کو بلوائے' بادشاہ اس وقت وہیں تھا۔ وہ تیزی سے ملکہ کے کمرے میں آیا اور اپنی قریب المرگ پیاری بیوی کے بستر کے سرہانے بیٹھ گیا۔ ممتاز الزمانی نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ انتہائی مایوسی سے بادشاہ کی طرف دیکھا اور اسے نصیحت کی کہ' جب وہ اس دنیا میں نہ رہے' تو اس کے بچوں اور اس کے بوڑھے ماں باپ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے۔ تب' اپنے شریک حیات پر آنکھیں جمائے وہ طلوع آفتاب سے تین گھڑی پیشتر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئی۔

پورے دربار نے سوگ منایا۔ بادشاہ نے سفید جبہ زیب تن کر لیا اور شہزادگان' سلطنت کے امراء اور سرکاری افسران و نوکروں نے ماتمی لباس پہن لیا۔

اس کی عمر: انتقال کے وقت ممتاز الزمانی کی عمر 39 برس 4 ماہ اور 4 دن تھی۔ شاعر بے بدل خاں نے اس مصرعہ میں اس کی تاریخ وفات تلاش کی ہے:۔۔۔۔۔

جائے ممتاز محل جنت باد

ترجمہ: "ممتاز محل کا ٹھکانہ بہشت ہو۔"

مندرجہ بالا سے 1040ھ (1630ء) مادہ تاریخ حاصل ہوتا ہے۔

امانت کے طور پر ملکہ کے جسد خاکی کو برہانپور میں دریائے تپتی کے پار زین آباد کے باغ میں دفن کر دیا گیا۔ بادشاہ اس وقت وہاں خیمہ زن ہو کر دکن میں خان جہاں لودھی کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا۔ نعش کو ایک قطعہ زمین میں دفن کر دیا گیا' جس کے درمیان ایک خوبصورت فوارے نے زین آباد کے چمن محل کو زینت بخشی ہوئی تھی۔

منگل کی سہ پہر مہینے کی 25 تاریخ کو بادشاہ نے دریائے تپتی کو عبور کیا اور ملکہ کے عارضی مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے زین آباد کے باغ میں گیا۔ جب تک وہ برہانپور میں خیمہ زن رہا' اس کا یہ معمول تھا کہ ہر جمعہ کو مزار پر حاضری دیتا۔ وہ اس قدر غم میں ڈوب گیا تھا کہ اس نے ایک ہفتہ تک سلطنت کے کسی امیر سے ملاقات نہیں کی اور خاص عام کی جھروکہ کھڑکی میں بھی نمودار نہیں ہوا اور نہ ہی کسی قسم کا کاروبار سلطنت انجام دیا۔ اس کو ایک سے زائد مرتبہ یہ کہتے سنا گیا

کہ اگر سلطنت کا بار گراں اس کے کاندھوں پر نہ ہوتا اور شرع اسلامی اسے کسی ایسے پیارے کی موت پر افسوس و غم کے اظہار پر سختی سے منع نہ کرتی (جو ہر حال میں خالق کی مرضی کے پوری طرح تابع ہوتا ہے) تو وہ کچھ اس قدر غمزدہ ہو گیا ہے کہ یکدم تاج و تخت چھوڑ کر اس کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس نے دو برس تک ہر قسم کی تفریحات کو چھوڑ دیا' خاص طور پر موسیقی اور موسیقی کے آلات سننا' جواہرات پہننا' عطریات کا استعمال' بہترین غذا کھانا اور قیمتی ملبوسات زیب تن کرنا یکسر ترک کر دیا۔ عید کے تہوار یا دیگر تقریبات کے موقع پر جب شاہی گھرانے کی خواتین رسم کے مطابق اس کے گرد جمع ہوتیں تو بادشاہ ان سب میں اپنی محبوب بیوی کو نہ پا کر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکتا۔ جب کبھی وہ مرحومہ کے کمرہ میں جاتا اور اپنی محبوبہ کو وہاں نہ پاتا تو اس کے بعد بھی کافی عرصہ تک اسکی آنکھیں اشک بار رہتیں۔ ملا عبدالحمید (جس نے یہ بیانات پیش کئے ہیں) کہتا ہے کہ ممتاز الزمانی کے انتقال کے وقت بادشاہ کی داڑھی میں بیس سے زیادہ سفید بال نہیں تھے' مگر ملکہ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد اس کے سفید بالوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

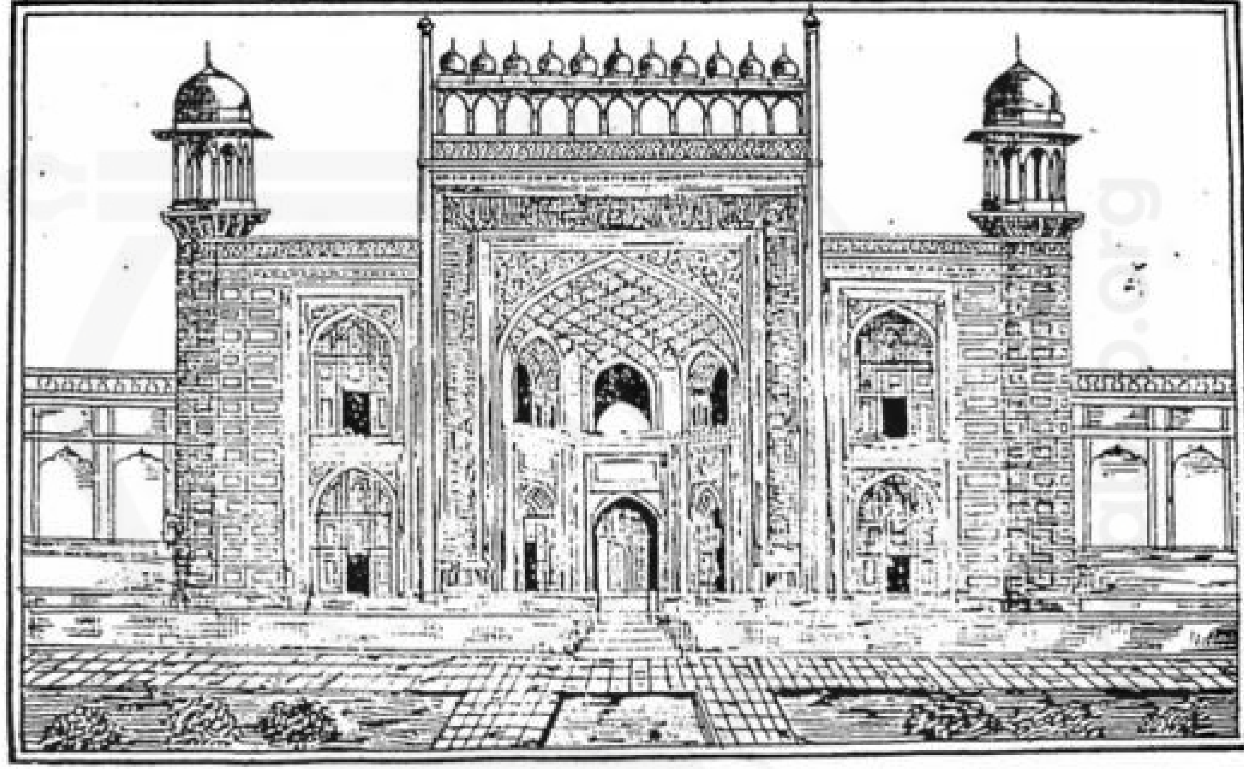
ملا محمد صالح کے مطابق' ممتاز محل کے انتقال کے کافی عرصہ بعد تک دربار میں ہر سال ذیقعد کے مہینہ میں سوگ منایا جاتا رہا' اس وقت بادشاہ سفید کپڑے زیب تن کر لیتا اور تمام امراء ماتمی لباس پہن لیتے۔

بیگم صاحب: بادشاہ کو اپنی سب سے بڑی صاحبزادی جہاں آراء بیگم سے بہت زیادہ وابستگی و الفت تھی۔ ایک کروڑ روپے سے زائد مالیت کے جواہرات' زیورات' سونے اور چاندی کے سکوں میں سے بادشاہ نے نصف بیگم صاحب کو اور نصف حصہ دوسرے بچوں کو دیا۔ مرحوم ملکہ کے انتظام میں شاہی گھرانے کے تمام نوکر چاکر بیگم صاحب کے زیر انتظام کر دیئے گئے۔ مرحومہ کو حاصل چھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ اس کے انتقال پر چار لاکھ روپے کے اضافہ کے ساتھ بیگم صاحب کو منتقل کر دیا گیا۔ اس میں سے نصف زر نقد اور نصف ایک جاگیر پر مشتمل ہوتا تھا۔ مرحومہ کے میر سامان مرزا اسحاق بیگ یزدی کو بیگم صاحب کا دیوان مقرر کیا گیا اور ستی النساء خانم کو اس کی والدہ کے دور کی طرح اس کی مہر اور گھریلو معاملات کا نگران مقرر کر دیا گیا۔

اس افسوسناک واقعہ کے چھ ماہ بعد بروز جمعہ' 17 جمادی الاول 1041ھ (1631ء) کو مرحوم ملکہ کے جسد خاکی کو شہزادہ محمد شاہ شجاع بہادر اور ستی النساء خانم (جو مرحوم ملکہ کے دور میں شاہی گھرانے کے انتظام کی سربراہ تھی اور اسے اس کا بھرپور اعتماد حاصل تھا' اور عبدالحمید کے الفاظ میں وہ اس کے مزاج کو بخوبی سمجھتی تھی' اب وہ بیگم صاحب اور شاہی طبیب وزیر خاں

(69) کے تحت شاہی گھرانے کے امور کی نگران تھی) کے زیر نگرانی دارالخلافت اکبر آباد (آگرہ) روانہ کر دیا گیا۔ بادشاہ کے حکم سے برہانپور سے لے کر ملکہ کی آخری آرامگاہ آگرہ تک تمام راستے میں غریبوں اور محتاجوں میں خوراک اور چاندی کے سکوں کی صورت میں نقدی تقسیم کی گئی۔ مقبرہ کے لئے منتخب کردہ مقام شہر کے جنوب کی طرف تھا۔ اصل میں یہ راجہ مان سنگھ کا محل تھا' مگر اب اس کے پوتے راجہ جے سنگھ کی ملکیت تھا۔ بادشاہ نے اس عمارت کے عوض راجہ کو خالصہ ریاست میں ایک بلند و بالا عمارت عنایت کر دی اور اس مقام کو مرحوم ملکہ کے مقبرہ کے لئے استعمال کر لیا گیا۔ اس مقام پر تدفین 15 جمادی الثانی' 1041ھ کو عمل میں لائی گئی۔ پہلے پہل اس مزار پر ایک عارضی گنبد تعمیر کر دیا گیا' تاکہ یہ عام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہے: مگر بادشاہ کے حکم سے اس پر اور اس کے اردگرد ایک ایسی عمارت تعمیر کی گئی' جو آج تک دنیا کے ایک عجوبہ کے طور پر قائم ہے۔ تخمینہ کے مطابق' اس عمارت پر پچاس لاکھ روپے کی لاگت آئی۔

تاج محل کا بیان: ایک بہت بڑا بیرونی دروازہ ایک انتہائی کشادہ احاطہ کی طرف کھلتا ہے' جس کے اردگرد پختہ اینٹوں کے محرابی کمرے ہیں اور اس کو چار دروازوں نے آراستہ کیا ہوا ہے۔ یہ کارواں سرائے ہے' جہاں سرکاری خرچ پر مسافروں اور غریبوں کو ٹھہرایا جاتا اور ان کی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ بہترین مشاہدوں نے اس کے بارے میں بالکل درست کہا ہے کہ "تاج محل اپنی جگہ پر بہت خوبصورت ہے' مگر وہ اگر بالکل اکیلا کھڑا ہوتا' تو اس کی نصف دلکشی ختم ہو جاتی۔" یہ انتہائی پاکیزہ عمارات مختلف خوبصورتیوں اور منصوبہ جات کا حسین امتزاج ہیں' ہر کوئی ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر درستگی اور مکمل تناسب کے ساتھ وابستہ ہے کہ اس نے مجموعی طور پر تاج محل کو ایک ایسی عمارت بنا دیا ہے کہ دنیا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب آپ کارواں سرائے میں داخل ہونے پر اس کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ ایک دم آپ پر عیاں نہیں ہو جاتی۔ بلکہ ایک شرمیلی دوشیزہ کی مانند اپنا چہرہ چھپائے رکھتی ہے' اس کے سامنے عظیم الشان دروازہ اس کی انتہائی عمدہ شکل کو چھپانے کے لئے نقاب کا کام دیتا ہے۔ پتھر کے ایک کشادہ راستہ پر گذر کر آپ سنگ سرخ کے ایک بہت بڑے دروازہ میں داخل ہوتے ہیں' یہ ایک بہت شاندار عمارت ہے' جس پر انتہائی عرق ریزی سے باریک کندہ کاری کا کام اور قرآن پاک کی آیات درج ہیں۔ اس پر سفید سنگ مرمر کے 26 گنبد ہیں جو تقریباً 45 مربع فٹ کے ایک ہشت پہلو کمرہ سے ابھرے ہوئے ہیں' جس کی چھت گنبد نما ہے اور اس کے برآمدے انتہائی مناسب انداز میں بنائے گئے ہیں۔ اندرونی راستہ کے دائیں اور بائیں سطح زمین سے تقریباً



تاج محل کا دروازہ

آٹھ فٹ بلند چبوترے ہیں' جن پر سوداگر اپنی اشیاء فروخت کے لئے رکھتے ہیں۔

صدر دروازہ ایک کشادہ چار دیواری کی طرف کھلتا ہے' جو مشرق سے مغرب تک 1860 فٹ اور شمال سے جنوب تک 1000 فٹ ہے۔ اس کے اردگرد سنگ سرخ کی بلند دیواریں ہیں' جن کے کونوں پر برجیاں اور تین اطراف میں ایک دروازہ ہے اور چوتھی جانب کا رخ دریائے جمنا کی طرف ہے۔ آہستگی کے ساتھ جیسے ہی اس نیم گنبد سے گذریں جس کی محراب اوپر کی جانب معلق ہے' تو سیڑھی کے زینے اتر کر آپ کے سامنے خوبصورت تاج محل اپنی ہزاروں رعنائیوں کے ساتھ عیاں ہو جاتا ہے۔ آپ کے سامنے آپ کو سماوی معبد کی طرح ایک خالص اور بے داغ روضہ دکھائی دیتا ہے' جو بیک وقت انتہائی شان و شوکت کے ساتھ اپنی وضع کی یکسانیت' اپنی شکل و صورت کی پاکیزگی' اپنی طرز تعمیر کی وجاہت اور چمک دمک اور اپنے بانی کے بلند و بالا جذبے کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک طویل اور چوڑا راستہ' جس کا فرش چوکور پتھروں سے بنایا گیا ہے اور وہ پورے باغ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے اب آپ کے سامنے ہے۔ اس کے دونوں جانب سرو کے دلکش لانبے اور گھنے سایہ دار درختوں کی قطاریں ہیں' یہ سب لطیف ہم آہنگی کے ساتھ اس کے دلکش نظارہ کی عظمت کو دوچند کرتے ہیں۔

باغ کی طرف چند قدم چلنے کے بعد سیاح کافی حد تک گھوم کر اس عمارت کا پچھلا حصہ دیکھ سکے گا' جس کو وہ ستونوں سے لے کر مرغولوں اور منڈیروں تک مکمل تفصیل کے ساتھ اس کے سامنے والے حصہ کی طرح پرشکوہ اور شاندار پائے گا۔ شہ نشین کے دونوں جانب باغ کی دیوار کے ساتھ کشادہ برآمدوں کے سلسلے ہیں' جن کو کم اونچے ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ برنیئر کے مطابق' موسم برسات کے دوران ہفتہ میں تین مرتبہ غریبوں اور ناداروں کو ان برآمدوں میں آنے کی اجازت تھی اور شاہجہان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے ان کی خاطر مقرر کردہ خیرات ان میں بانٹی جاتی۔ سیاح اس خیرات کی تقسیم کا عینی شاہد تھا' ہزاروں محتاجوں کو یہاں سے کھانا کھلایا جاتا اور سرکاری افسران انہیں نقدی اور کپڑے بھی دیا کرتے تھے۔

تاج محل کا باغ:

دروازہ اور تاج محل کے درمیان سنگ مرمر کا ایک کشادہ چبوترہ ہے' جس کے وسط میں اسی پتھر کا ایک چھوٹا سا خوبصورت فوارہ اور چھوٹی فواریوں کی ایک لمبی قطار ہے' جنہیں ایک دوسرے سے چند فٹ کے فاصلہ پر کنارہ در کنارہ نصب کیا گیا ہے۔ فواریوں کی اس قطار کے دونوں اطراف میں خوبصورت روشیں ہیں' ان میں ہر ایک سے پانی کی ایک باریک دھار نکلتی ہے' جو مختلف اطراف میں پھیل جاتی ہے۔ ان کے ساتھ مختلف اقسام کے درخت سایہ فگن

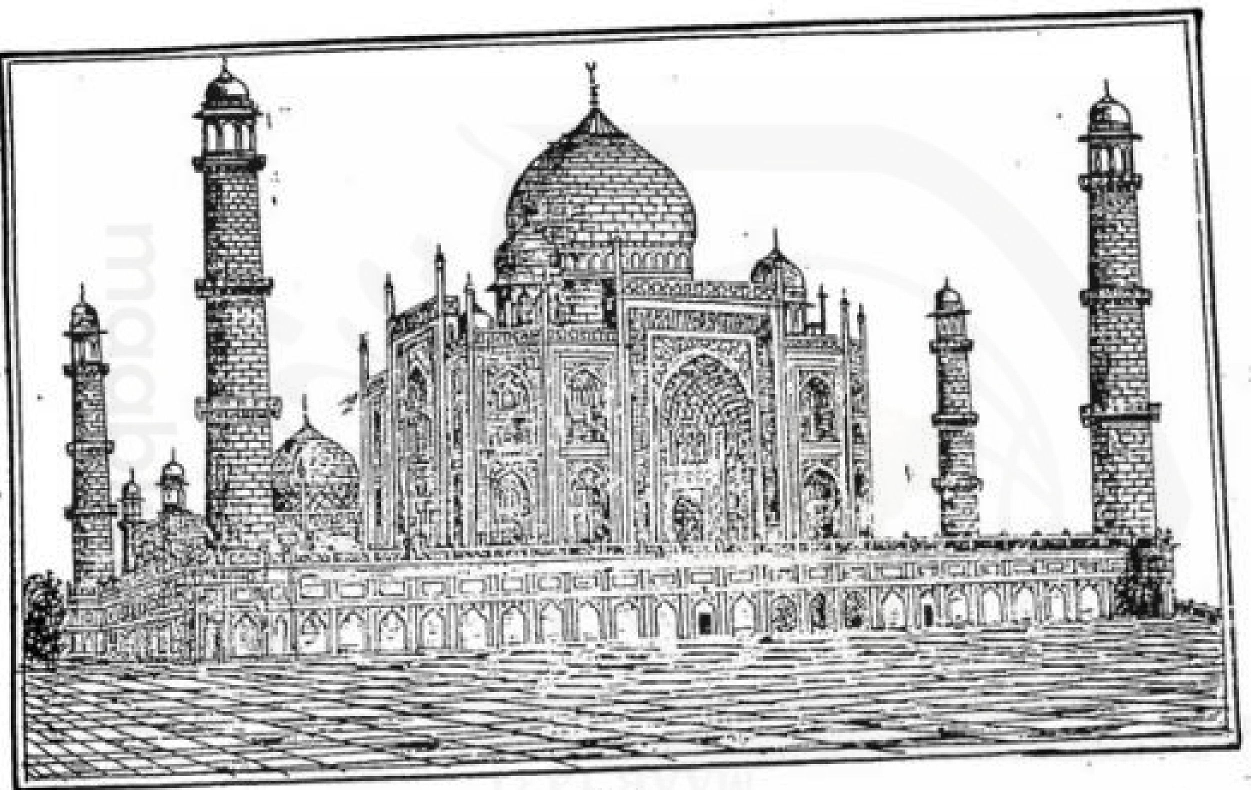
ہیں۔ شاہانہ کھجور' پردار بانس' خوبصورت سرسبز و شاداب نیم اور سنگترے کے سایہ دار درختوں کی ملی جلی مرصع گل کاری کا حسین امتزاج ہے' جبکہ لیموں کے خوش کن پھولوں' گلاب' چنبیلی اور دیگر مسحور کن خوشبودار جھاڑیوں اور پودوں نے فضا کو معطر کیا ہوا ہے۔ باغ کی سرکاری طور پر بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے' آنکھ ٹھنڈی اور تازہ ہو جاتی ہے اور دماغ خوشگوار اور پرسکون ہو جاتا ہے۔ درختوں کے کشادہ خیاباں پر تقریباً" چوتھائی میل کی چہل قدمی کے بعد آپ سفید سنگ مرمر کی آخری دیوار تک پہنچ جاتے ہیں' جس کے دائیں بائیں سنگ مرمر کے انتہائی خوبصورت اور ملائم سیڑھی کے دوہرے زینے ہیں۔ سنگ مرمر کے یہ زینے 18 فٹ بلند اور 313 فٹ مربع کے ایک چبوترے کی طرف جاتے ہیں' جس کے درمیان میں مقبرہ بھرپور شان کے ساتھ کھڑا ہے۔

چبوترہ:

ہر کوئی چبوترے پر پہنچ کر یہاں رک جاتا ہے اور اس عمارت کی خوبصورتی اور شان و شوکت کی تعریف و ستائش میں کھو جاتا ہے۔ ہر قدم پر اس کے اوپر نئی رعنائیوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ جس طرح ایک گوہر آبدار کی جانچ کی جاتی ہے ہر کوئی اس حیرانگی میں غوطہ زن ہو جاتا ہے' کہ اس قدر شاندار عمارت کے کام کی تکمیل کتنی ذہانت اور منصوبہ بندی سے کی گئی ہے۔ سیاہ اور سفید سنگ مرمر کے خانوں والا راستہ انتہائی شفاف اور شاندار پچی کاری کے کام سے مزین ہے' اس کے اردگرد دو فٹ بلند کنگورے ہیں۔ برآمدے کے ہر کونے پر 133 فٹ بلند مینار استادہ ہے' جسے انتہائی نزاکت اور خوبصورتی کے ساتھ سفید سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے' ان آٹھ شاندار میناروں پر ہر ایک کے اوپر ایک چھوٹی خوبصورت سی گنبدی ہے' ان پر ایک لہریے دار سیڑھی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔

مقبرہ:

چبوترے کے وسط میں 186 فٹ مربع شکل کا مقبرہ ہے' جس کے اردگرد خالص سنگ مرمر کے کنگورے ہیں' ہر ایک باقاعدہ فاصلے پر ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہے۔ درمیان میں سے 38 فٹ قطر اور 80 فٹ بلندی میں بڑا گنبد ابھرا ہوا ہے' اس کے اوپر ایک طلائی ہلال ہے' جو سطح زمین سے تقریباً 260 فٹ کی بلندی پر ہے۔ گنبد کے اردگرد بالائی برآمدے کو تقریباً 6 فٹ بلند کنگورہ سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ہر کونے پر سنگ مرمر کے نازک ستونوں پر گنبدیاں موجود ہیں۔ نیچے باغ میں کھڑے ہو کر ان عمارات کو دیکھا جائے' تو یہ سیاح کو بھاری بھرکم گنبد کے مقابلہ میں

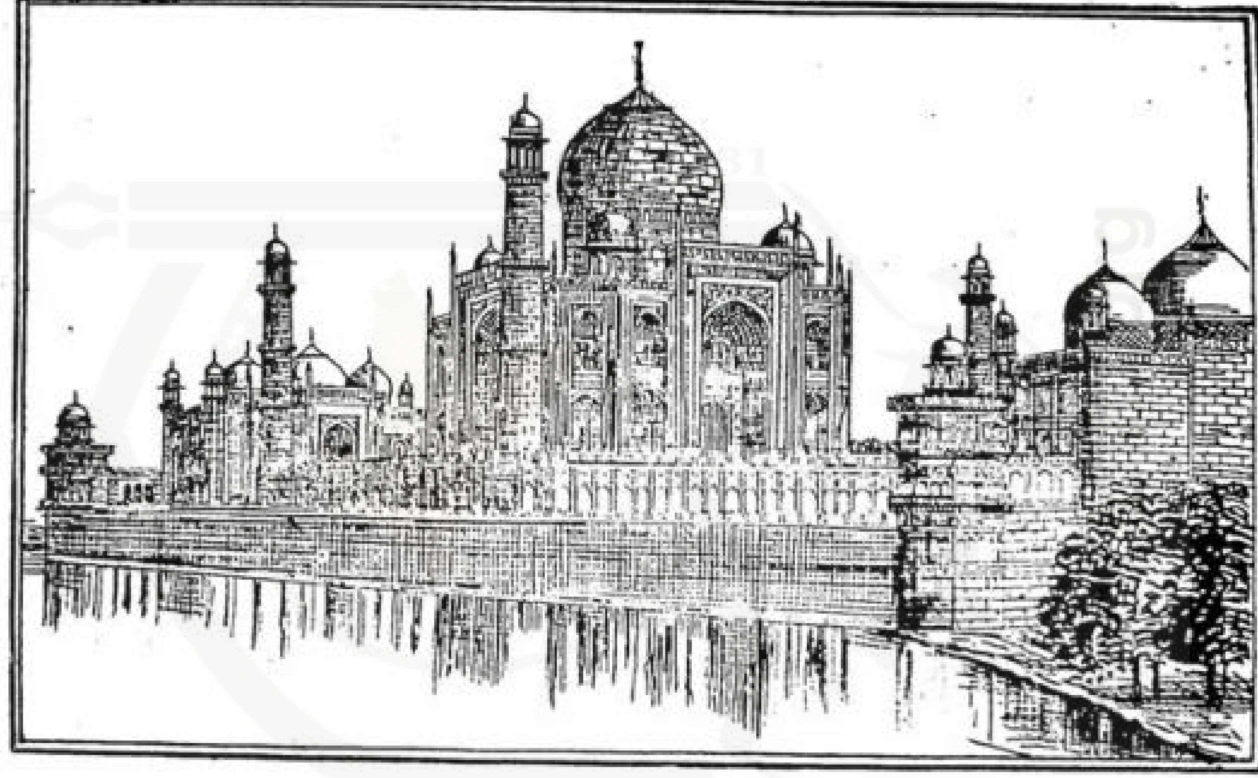


تاج محل

ہلکی پھلکی نظر آتی ہیں' کیونکہ ان کے بغیر گنبد کا وسیع و عریض ابھار بہت بھاری معلوم ہوتا ہے۔
مرکزی مثمن کمرے کے پہلو جو تقریباً 60 فٹ پیمائش کے ہیں' ان کا رخ چاروں سمتوں میں ہے' ان میں سے ہر ایک تقریباً" 130 فٹ طویل دروازے پر مشتمل ہے۔ چاروں طرف مثمن شکل کے کمروں کے جوڑے ہیں' جن کی تعداد آٹھ ہے' ان کا مرکزی کمرہ سے براہ راست رابطہ ہے۔ ان کمروں میں یہاں دفن شاہی جوڑے کی روح کے ایصال ثواب کے لئے ملا مسلسل قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ برنیئر نے اپنے سفرنامہ میں ان ملاؤں کی تلاوت قرآن پاک کا حوالہ دیا ہے۔ ٹیورنیئر اسی موضوع پر غور کرتے ہوئے لکھتا ہے:-
"وہ وقتاً" فوقتاً" قالین' جھاڑ فانوس اور دوسری اقسام کی زیبائشی اشیاء کو بدلتے رہتے ہیں اور وہاں چند ملاؤں کو ہر وقت دعا مانگنا ہوتی ہے۔" دروازوں پر مشتمل بیضوی محرابیں 18 فٹ بلند ہیں اور ہر ایک کے اوپر ایک بیضوی کھڑکی ہے۔ صدر دروازہ ایک نوک دار محراب پر مشتمل ہے' جو منڈیر کے قریب سے ابھری ہوئی ہے۔ دروازوں اور محرابوں کو سر سے پاؤں تک اور گنبد اور میناروں کے بالائی برآمدوں کو پھولدار حاشیوں سے آراستہ کیا گیا ہے' ان کو مختلف پھول پتیوں کی شکل میں سنگ مرمر میں تراش کر بنایا گیا ہے اور ان میں مختلف رنگوں کے سنگ مرمر خاص طور پر ہلکے خاکی (شربتی) اور نیلاہٹ آمیز اودھے رنگوں کے پتھروں کی زیبائشی منبت کاری بھی کی گئی ہے۔ فرش سے لے کر محرابوں کی چوٹی تک اور دیواروں کے ساتھ سفید سنگ مرمر کی زمین پر سیاہ سنگ مرمر کے حروف میں قرآن پاک کی آیات اس قدر صحت کے ساتھ درج کی گئی ہیں کہ اگر آپ سوئی کی نوک پتھر پر سے گذاریں تو وہ کسی جگہ بھی نہیں رکے گی' حالانکہ یہ کام خاصا" منبت کاری کا ہے مگر اس کے باوجود اس کی سطح انتہائی ملائم اور نرم ہے۔ ہر حرف کی لمبائی تقریباً" ایک فٹ ہے۔ ایک مصنف کے مطابق' "انہیں اتنی باقاعدگی' احتیاط اور خوبصورتی سے تراشا گیا ہے کہ بہترین خطاط بھی اگر بہترین طغرہ یا خط کوفی میں اپنی حتی المقدور کوشش کے ساتھ انہیں اپنے قلم سے کاغذ پر لکھنا چاہے تو نہیں لکھ سکتا۔
مرکزی مثمن کمرے میں روشنی کے انتظام اور یہاں قائم کئے گئے سرد درجہ حرارت کے متعلق فرگوسن لکھتا ہے:- "مرکزی کمرہ میں روشنی صرف سفید سنگ مرمر کی جالیوں کے ذریعے آتی ہے' ایک بیرونی جانب اور دوسری دیواروں کی اندرونی جانب نصب ہے۔ ہماری آب و ہوا میں یہ مکمل تاریکی کر دیتیں' مگر ہندوستان میں اور مکمل طور پر سنگ مرمر کی بنی ہوئی عمارت میں یہ روشنی کو کم کرنے کے لئے لگائی گئی ہیں' جو دوسری صورت میں ناقابل برداشت ہوتیں۔ اس کے چاروں طرف ادھ کھلے دروں کے ذریعے دور سے آتی ہوئی ملگجی روشنی کو دیکھ کر مرکزی

کمرے کی دلکش خوبصورتی کے بارے میں کوئی لفظ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ جب اس کو بارہ دری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو گا' تو یہ ضرور چمن و گلستان کی سرد ترین اور خوبصورت ترین آرام گاہ رہی ہو گی اور اب جب کہ یہ مرحومین کے لئے مقدس ہے' اس لئے دنیا بھر میں انتہائی شاندار اور انتہائی متاثر کن مزارات کے طور پر مشہور ہے۔" مذکورہ بالا جالیاں' جو سنگ مرمر اور سنگ یشب سے بنائی گئی ہیں' انہیں خوبصورت تختیوں کے حاشیوں سے آراستہ کیا گیا ہے' یہ مختلف شکلوں کے پھولوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

ممتاز محل اور شاہجہاں کے مزارات: عظیم الشان مثمن ایوان میں بڑے گنبد کے نیچے عین وسط میں ممتاز محل اور اس سے کسی قدر بلند ایک جانب شاہجہان کا مزار ہے۔ قبر کے تعویذ خالص سنگ مرمر کے ہیں اور انہیں انتہائی باریکی اور نفاست سے تراشا گیا ہے' ان پر سفید سنگ مرمر کی زمین میں سنگ یشب' سنگ ستارہ' لاجورد' عقیق اور مختلف رنگوں کے دیگر قیمتی پتھروں اور جواہرات کی خبت کاری انتہائی خوبصورتی اور ترتیب کے ساتھ کی گئی ہے۔ کسی بہترین منصف کے مطابق' قبروں پر چند پھول اتنی صحت اور ترتیب کے ساتھ کندہ کئے گئے ہیں کہ ہر ایک انچ پر مختلف رنگوں کے پتھروں کی پچاس یا ساٹھ اقسام موجود ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے اتنی صفائی اور عمدگی کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ اگر ظاہری آنکھ سے دیکھا جائے تو وہ ہو بہو قدرتی پھولوں کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں صرف خوردبین کی مدد سے ہی جانچا جا سکتا ہے۔ قبروں کے چاروں طرف مثمن شکل کی آٹھ فٹ بلند جالی ہے' جسے سفید سنگ مرمر کے ٹھوس ٹکڑوں سے تراشا گیا ہے اور اس کو بہت زیادہ چمکایا گیا ہے۔ اس چار دیواری میں محرابی شکل کا ایک دروازہ ہے' جو اس سے دو فٹ زیادہ بلند ہے۔ کندہ کاری واضح طور پر مختلف اقسام کے گل بوٹوں' گل لالہ' نرگس اور دیگر پھولوں کی اشکال پر مشتمل ہے' جنہیں انتہائی پیچیدہ زیبائشی نمونہ جات کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اندرونی جانب سے دیواروں کی سطح کو بہت زیادہ چمکایا گیا ہے' لہٰذا یہ اپنی انتہائی پیچیدگی' نزاکت اور خوبصورتی کے معاملہ میں مجسماتی فن کی شہادت پیش کرتی ہے۔ تمام دیواروں اور کونوں کو سفید سنگ مرمر سے آراستہ کیا گیا ہے' جن میں سنگ ستارہ' یشب' زبرجد اور اسی طرح کے دیگر قیمتی پتھروں کی خبت کاری کی گئی ہے' جو سینکڑوں انداز میں نصب پھولوں کی لڑیوں' بیل بوٹوں اور بوقلمونی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بہترین مشاہدوں کے مطابق' "فن تعمیر میں اس جیسا انتہائی خوبصورت اور قیمتی زیبائشی انداز شاید ہی کبھی اختیار کیا گیا ہو۔"



تاج محل — دریا کے سامنے کا منظر

فرگوسن کہتا ہے "مختلف حصوں کے لئے اس کی طرز زیبائش کی جانچ جس انداز میں کی جاتی ہے وہ بھی اسی طرح قابل ذکر ہے' جس طرح یہ خود اپنی مثال آپ ہے اور یہ اس دور کے ہندوستانی ماہرین تعمیرات کے ذوق اور مہارت کا ایک بلند تصور پیش کرتا ہے۔"

قبروں پر درج عبارات: شاہجہان کی قبر پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔۔۔۔

مرقد منور و مضجع مطہر بادشاہ رضوان دستگاہ خلد آرامگاہ اعلیٰ حضرت علیین مکانی فردوس آشیانی صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ غازی طاب ثراہ وجعل الجنتہ مثواہ درشب ہشت و ششم شہر رجب سنہ ہزار و ہفتاد و شش ہجری از جہان فانی بہ بزمگاہ جاودانی انتقال کردند

ترجمہ: اعلیٰ حضرت علیین مکانی (71) فردوس آشیانی صاحب قران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی کی مرقد منور اور آرامگاہ نے رضوان (70) کا رتبہ پا کر اپنا ٹھکانہ جنت میں بنا لیا ہے' انہوں نے ماہ رجب کی 28 تاریخ کی شب' 1076ھ (1665ء) کو اس جہان فانی سے بزمگاہ جاودانی کی طرف سفر کیا۔

ممتاز محل کی قبر پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔۔۔۔

مرقد منور ارجمند بانو بیگم مخاطب ممتاز محل توفیت فیہ سنہ 1040 "مرقد منور ارجمند بانو بیگم المعروف ممتاز محل' ان کا انتقال 1040ھ میں ہوا"

تعویذ کے اوپر اللہ تعالیٰ کے 99 اسمائے مبارکہ درج ہیں:۔

تعویذ کے سر کی طرف درج ہے:۔

القیوم الکافونا

"وہی ہمیشہ رہنے والا اور وہی کافی ہے"

ایک طرف مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

المقربون الذین قالو ربنا اللہ

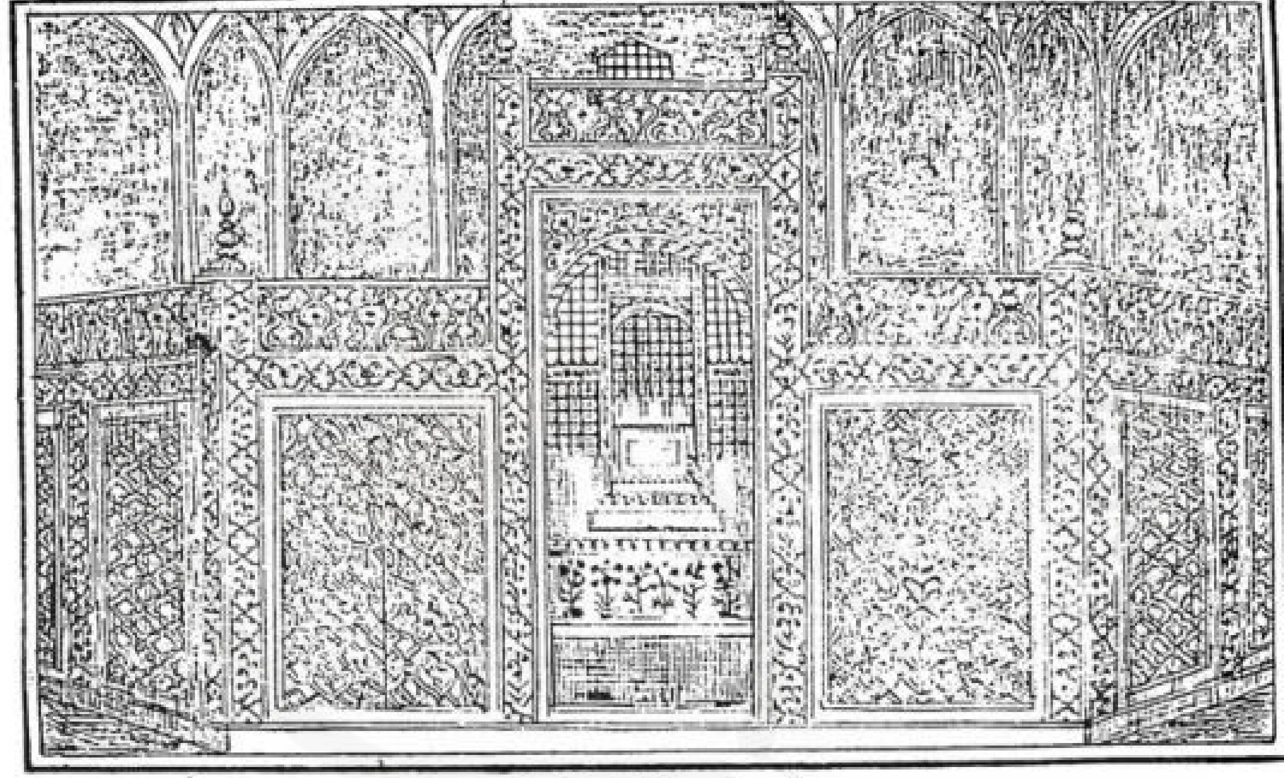
"اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں' اللہ ہمارا رب ہے"

تعویذ کے سرہانے پر قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت درج ہے:۔۔۔۔

ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشہادۃ ھو الرحمن الرحیم

اللہ وہ ہے' جس کے سوا اور کوئی الہ نہیں' غیب اور ظاہر کی باتیں جاننے والا اور بڑا ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

اصل قبریں: اصل قبریں ایک تہہ خانہ میں بالائی ایوان کے بالکل نیچے ہیں۔ بالائی ایوان کی



شہنشاہ شاہجہاں کی آخری آرام گاہ

طرح شاہجہاں کا مزار اپنی ملکہ کے مقابلہ میں قدرے بلند ہے ملکہ کا مزار تہہ خانہ کے مرکز میں جبکہ بادشاہ کا بائیں طرف اس کے پہلو میں ہے۔ وسیع و عریض تہہ خانہ میں ایک ڈھلوانی راستہ کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں' اس کو اس قدر چکنایا گیا ہے کہ اگر قدم رکھتے وقت احتیاط نہ کی جائے تو اس پہ پھسلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ دروازے سے روشنی براہ راست قبروں پر پڑتی ہے' جنہیں انتہائی سادگی سے بنوایا گیا ہے۔ ان کے نیچے خوبصورت ممتاز محل کا جسد خاکی پڑا ہوا ہے' جس کی یاد میں اس کے شوہر شاہجہاں نے یہ مقبرہ تعمیر کروایا' اسے اس کے بیٹے اورنگ زیب نے اس کے پہلو میں دفن کرایا۔

یہ تہہ خانہ ہروقت خوشبویات سے معطر رہتا ہے اور مزارات اور ان کے اردگرد بڑی فیاضی سے پھول نچھاور کئے جاتے ہیں۔

بادشاہ کی اصل قبر کے تعویذ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔۔۔۔۔

مرقد مطہر اعلیٰ حضرت فردوس آشیانی صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ طاب ثراہ سنہ 1076ھ

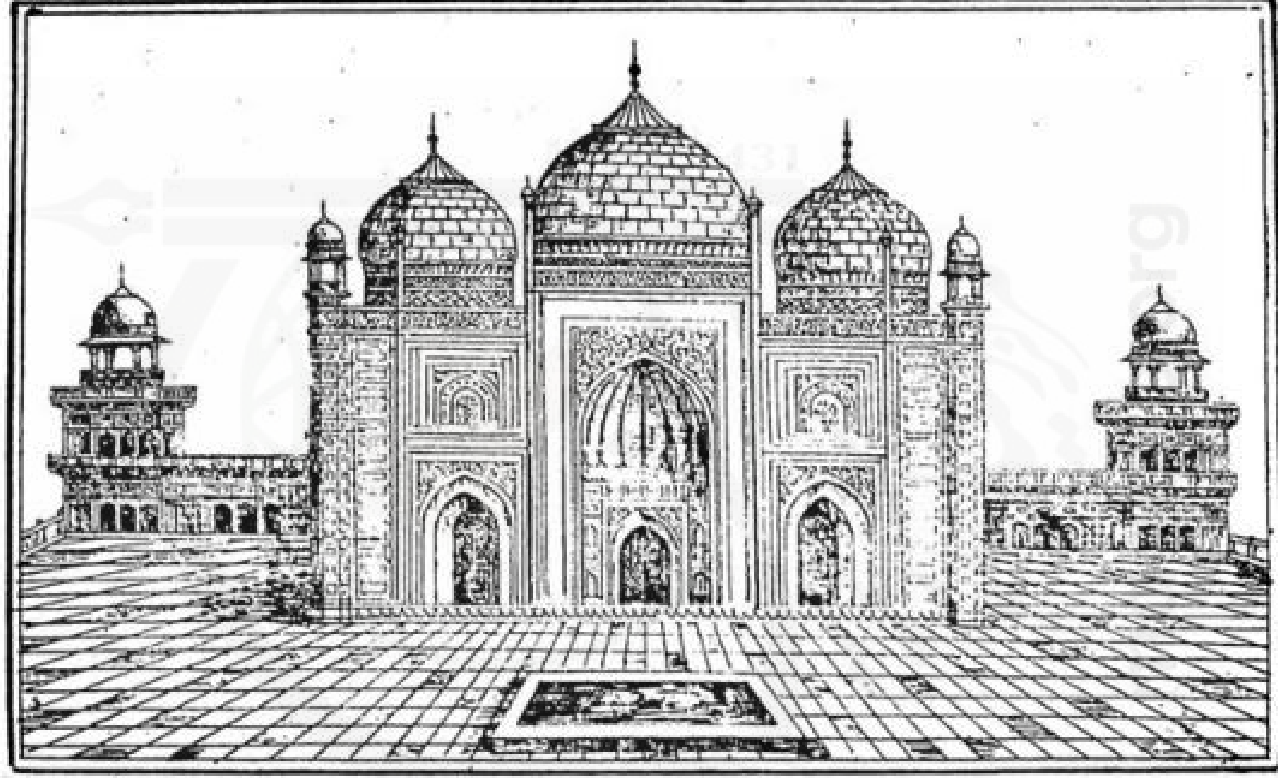
"قبر مبارک اعلیٰ حضرت فردوس آشیانی صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ' ان کا مقبرہ ہمیشہ آباد رہے 1076ھ (1665ء)

ملکہ کی قبر پر بھی مذکورہ بالا تعویذ کی عبارت درج ہے۔

شاہ جہاں کی زندگی میں تہہ خانے کو سال میں صرف ایک مرتبہ یعنی ملکہ ممتاز محل کی برسی کے موقع پر انتہائی دھوم دھام کے ساتھ کھولا جاتا تھا اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو اس میں داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ چنانچہ برنیئر نے اپنے سفرنامہ میں داخلہ کی اس ممانعت کا حوالہ دیا ہے:۔۔۔۔۔

"چونکہ اس کے تقدس کی بے حرمتی کے باعث کسی عیسائی کو اس میں داخلے کی اجازت نہیں تھی اس لئے میں اس کا اندرونی حصہ نہ دیکھ سکا' مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ قیمتی اور شاندار کسی اور چیز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

(گونج) بازگشت: تاج محل کا پرشکوہ گنبد یکساں طور پر بے عیب' شیریں اور طویل گونج یا بازگشت پیدا کرتا ہے۔ بالائی محراب پر ایک ہی آواز انتہائی مسرور کن تھرتھراہٹ میں گردش کرتی ہوئی لہراتی ہے۔ بازگشت میں سنائی دینے والی گونج باہمی آوازوں کے ایک شور کی شکل



تاج محل کی مسجد

اختیار کر لیتی ہے اور بتدریج کم ہوتی ہوئی نیلے آسمان میں گم ہو جاتی ہے' مصنفین اس گونج سے پیدا شدہ اثرات کے بارے میں انتہائی گرم جوشی سے بتاتے ہیں۔ ایک صاحب کہتے ہیں "میں نے تصور کر لیا کہ کوئی عربی یا فارسی مرثیہ خواں حسین ممتاز محل کی قبر پر مرثیہ پڑھ رہا ہے۔ نغمے کے وقفہ کے دوران پیدا ہونے والے اثرات بہشت میں فرشتوں کی ہم آہنگی سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔" ایک دوسرا مصنف تعریف و تحسین کے ایک دھیمے شیریں نغمہ سے پیدا شدہ تھر تھراہٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے' "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چند آسمانوں کا اجتماع ہمارے سروں کے عین اوپر لے کے ساتھ مناجات پڑھ رہا ہو۔" چنانچہ' رے ز کے فنکارانہ قلم نے تہہ خانہ میں شاہانہ' پر رعب اور گہرے سکوت کے بارے میں کچھ اس طرح رنگ آمیزی کی ہے :—

"ایوان اپنے قیمتی پتھروں اور اپنی آرائشوں کی زبردست خوبصورتی کے باوجود انتہائی گمبھیر اور سنجیدہ تاثر پیش کرتا ہے' جو ذہن کو ویسی ہی پر سکون آسودگی بخشتا ہے' جیسی ہم اپنی خوشگوار موت کے متعلق سوچتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ سخت ترین اور بے خیال اشخاص بھی اس میں داخل ہوتے ہی اچانک آنسو بہانے لگتے ہیں۔ اور جو کوئی ایسی سنسنی کے بغیر تاج محل کا نظارہ کرے جو آنکھ میں نمی پیدا کر دیتی ہے' تو اس کی اپنی روح میں خوبصورتی کا احساس ہی موجود نہیں۔

مسجد: تاج محل کے دونوں جانب تقریباً" ایک سو گز کے فاصلہ پر سنگ سرخ کی دو بہت بڑی مساجد ہیں' جن کے تین گنبدوں میں سفید سنگ مرمر کی منبت کاری کی گئی ہے۔ مغربی جانب کی مسجد کو صرف نماز کی ادائیگی کے لئے تعمیر کیا گیا' اس کے (محراب) طاقوں کا رخ کعبہ کی طرف ہے۔ اس کے فرش کو چھوٹے چھوٹے خانوں میں بنایا گیا ہے' ہر خانہ ایک آدمی کے قیام و سجود کے لئے کافی ہے۔ ایک مسجد مشرق کی جانب ہے' جو بالکل اس کی ہو بہو نقل ہے' مگر کعبہ کے رخ اس کی کوئی محراب نہیں' اس کو دوسری مسجد کی نقل کے طور پر اس لئے بنایا گیا تھا تاکہ بیرونی طور پر اس کی یکسانیت اور مطابقت قائم رہ سکے۔

جماعت خانہ: نقلی مسجد جماعت خانہ کے طور پر مشہور ہے' یعنی' بادشاہ شاہجہان یا اس کی بیوی تاج محل کی برسی کے موقع پر یا نماز سے قبل لوگوں کے جمع ہونے کا مقام۔ (72) اصل مسجد کے نیچے ایک احاطہ اس مقام کی نشاندہی کرتا ہے' جہاں مقبرے کی تعمیر کے دوران ملکہ کی نعش کو امانت کے طور پر دفن کیا گیا تھا۔

مسجد اور جماعت خانہ ایک زریں کنگورے کے ذریعے وابستہ ہیں' جبکہ ان کی سیڑھیاں دریا کی طرف جاتی ہیں۔ جماعت خانہ میں تاج محل کی سیاحت کرنے والوں کے قیام کے لئے (جو عارضی طور پر اپنی بحالی صحت یا تفریح کے لئے ٹھہرنا چاہتے ہوں) بالائی کمروں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اس عمارت کی چوٹی اور میناروں سے ارد گرد کے علاقہ کا ایک انتہائی خوبصورت نظارہ حاصل ہوتا ہے۔

شاہ جہاں کا مطلوبہ مزار: تاج محل کے عین سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر پرانی بنیادوں کے آثار ہیں۔ شاہجہان نے ان بنیادوں کو تاج محل سے مماثمت کے مطابق اپنے یادگاری مقبرہ کے لئے بنوایا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ان دونوں مقبروں کو سنگ مرمر کے ایک شاندار پل کے ذریعے یہ باور کرانے کے لئے منسلک کر دیا جائے کہ موت کے بعد بھی اس کے اور اس کی پیاری بیوی کے درمیان الفت کا رشتہ قائم ہے۔ مگر بعد میں اس کی قید نے اسے اس منصوبہ پر عمل درآمد کرنے سے روک دیا' لہٰذا جب اس کا انتقال ہوا' تو اس کے چالاک بیٹے اورنگزیب نے یہ کہتے ہوئے اسے اس کی بیوی کے پہلو میں دفن کر دیا کہ "میرے والد کو میری والدہ سے بہت زیادہ محبت تھی اس لئے اس کی آخری آرام گاہ اس کے قریب بنا دی جائے۔" پس' مسٹر ٹیلر کے الفاظ میں "قسمت نے محبت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جس کو غرور و تکبر نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔"

چاندنی میں تاج محل کا نظارہ: چاند کی روشنی میں تاج محل کا نظارہ انتہائی دلفریب ہوتا ہے' روشنی کی ترچھی کرنوں میں پوری عمارت ہیرے کی طرح جگمگ جگمگ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے: نیز' سنگ مرمر کے کنارہ سے ابھرا ہوا صاف و شفاف سفید گنبد دور سے دیکھنے پر چاندی کی تھالی میں رکھا ہوا ایک منور و تاباں گوہر نایاب دکھائی دیتا ہے۔ سنگ مرمر کی دیوار پر کی گئی آرائشات کسی زیور میں جڑے ہوئے بہت زیادہ جواہرات معلوم ہوتے ہیں' جبکہ اس کے ساتھ بہتے ہوئے پرسکون دریا کے ساتھ اس کے کناروں پر اگے ہوئے درختوں کا ہلکا سا سایہ اس منظر کی دلکشی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ ماسوائے ہوا کے جھونکے کے اس کے سکوت کو اور کوئی چیز نہیں توڑتی۔

تاج محل کا نقشہ: تاج محل کی تخلیق اور اس کے نقشہ کے تصور کے بارے میں موجودہ مصنفین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس کا منصوبہ ایک اطالوی فنکار نے تیار کیا

تھا اور دوسروں کا خیال یہ ہے کہ اس میں سنگ مرمر پر انتہائی لطیف اور نہایت عمدہ منبت کاری ایک فرانسیسی فنکار کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ فرانسیسی سیاحوں' برنیئر اور ٹیورنیئر نے شاہجہاں کے دربار میں حاضری دی تھی' اس لئے انہوں نے اپنے سفرناموں میں اس عمارت کے بارے میں تفصیلی بیان درج کیا ہے۔ ٹیورنیئر نے تاج محل کی تعمیر کے آغاز اور تکمیل کو دیکھا اور برنیئر اس کی تکمیل کے صرف پانچ سال بعد ہندوستان آیا۔ اگر ان کے کسی ہم وطن یا کسی یورپی فنکار نے اس منصوبہ کو تیار کیا ہوتا' تو اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ اپنی تاریخوں میں ان کے ذکر کو حذف کر دیتے اور سب سے پہلے ان کا ذکر نہ کرتے کیونکہ وہ اس کے حقدار تھے۔ مگر انہوں نے اس حیرت انگیز عمارت کے معائنہ کے نتائج کے بارے میں اپنی آئندہ نسل کو پیش کئے جانے والے بیانات میں اس کا اشارہ تک نہیں کیا۔ مزید براں' تاج محل بذات خود اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس نے کسی غیر ملکی نقشہ سے اپنا وجود حاصل نہیں کیا۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے :

——— "اس پر ایک نظر کسی بھی ذہین آدمی کو اس بات کی یقین دہانی کرا دیتی ہے کہ کسی چیز کی اصل نوعیت کے اعتبار سے اس کی نقل قطعی ناممکن ہے۔ تاج محل وضع قطع تناسب اور زیبائشی نقشہ جات میں خالصتاً" مشرقی ہے۔ اگر یہ کافی نہیں ہے' تو ہم اب بھی اس عمارت پر مسلمان ماہر تعمیرات کا نام کندہ کیا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔" ایک اور انگریز مصنف لکھتا ہے :۔ "اس عمارت پر مکمل طور پر اسلامی اور مشرقی تصور کی چھاپ ہے۔" یہ تصور مکمل طور پر اس بات سے مطابقت رکھتا ہے کہ موزونیت سے پیار مسلمان اقوام کی ہی خصوصیت ہے اس لئے تاج محل یقیناً مسلمانوں کے ایک انتہائی حیرت انگیز مشرقی طرز تعمیر کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے۔

تاج محل کی عمارت کو 1630ء یا ممتاز محل کے انتقال کے ایک سال بعد شروع کیا گیا۔ سامنے والے دروازے پر عمارت کی تکمیل کی تاریخ' 1057 (1648ء) درج ہے۔ چنانچہ' اس کی تکمیل اٹھارہ برس (73) میں ہوئی' اس پر تین ملین سٹرلنگ کی لاگت آئی۔

اس مقبرہ کے نقرئی دروازے' جنہیں جاٹوں نے اتار کر پگھلوا دیا تھا۔ صرف ان کی لاگت 1,27,000 روپے تھی۔

بادشاہ نامہ میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ 1042ھ (1632ء) میں ملکہ کی قبر کے ارد گرد جواہرات سے مزین خالص سونے کا ایک جنگلا نصب کیا گیا۔ اسے شاہی طعام خانہ کے نگران (خاصہ شریف) بے بدل خاں کی زیر ہدایات بنایا گیا اور یہ ہندوستانی مرصع زیوراتی فن کا ایک مکمل نمونہ تھا۔ یہ چالیس ہزار تولہ خالص سونے پر مشتمل تھا اور اس کی مالیت چھ لاکھ روپے تھی۔ مقبرہ کے

اندرونی حصہ کو مختلف قسم کے جھاڑ فانوسوں اور شمعوں اور مختلف جسامت اور رنگوں کے زیبائشی چراغوں اور قندیلوں سے آراستہ کیا گیا تھا' جن پر لاکھوں روپے کی لاگت آئی تھی۔ ان کے علاوہ تہران اور قسطنطنیہ کے انتہائی نفیس قالینوں کو فرش پر بچھایا گیا تھا' اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا' جیسے پرستان ہے یا زمین پر بہشت اتر آئی ہے۔

سال 1052ھ (1642ء) میں مذکورہ بالا طلائی جنگلے کو اس خدشہ کے تحت اتار لیا گیا کہ اتنی بڑی مقدار میں سونا چور اچکے قسم کے لوگ چرا کر لے جائیں گے' لہٰذا اس کی بجائے سنگ مرمر کی موجودہ جالی نصب کر دی گئی (74) بادشاہ نامہ کے مطابق' اس جالی کو (جو فن سنگ تراشی کا ایک شاندار اور خوبصورت نمونہ ہے) پچاس ہزار روپے کی لاگت سے دس سال کے عرصہ میں تیار کیا گیا۔ 1720ء میں موتیوں کی اس چادر کو اتار لیا گیا' جسے شاہجہان نے ممتاز محل کے مزار کو ڈھانپنے کی خاطر لاکھوں روپے کی لاگت سے بنوایا تھا۔ (75)

ٹیورنیئر کہتا ہے "میں نے اس عظیم عمارت کی ابتداء اور تکمیل کا مشاہدہ کیا تھا' اسکی تعمیر پر انہوں نے بائیس برس صرف کئے' اس دوران بیس ہزار افراد نے مسلسل کام کیا۔ اس بات سے اندازہ لگانا کافی ہے کہ اس پر بہت زیادہ لاگت آئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مکمل عمارت سے زیادہ خرچ اس کی (بانس بلی) مچان پر آیا' کیونکہ لکڑی کی کمی کے باعث ان سب کو اینٹوں کے علاوہ محرابوں کے سہارا کی مدد سے بنایا گیا: اس پر بہت زیادہ محنت اور بہت بھاری خرچ ہوا۔ شاہجہان نے دریا کے دوسرے کنارہ پر اپنے مزار کی تعمیر شروع کر دی' مگر اپنے بیٹوں کے ساتھ اس کی جنگ نے اس کے منصوبوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا' اورنگ زیب (جو اس وقت حکومت کر رہا ہے) اس کو مکمل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بیگم اور اس کے نزدیک بادشاہ کے مزارات پر 2000 محافظوں کی کمان ایک خواجہ سرا کے پاس ہے"۔

شاہجہان کے ایرانی مورخین نے دور دراز ممالک کے ان کاریگروں کی مکمل فہرستیں دی ہیں' جنہوں نے تاج محل کی تعمیر میں مدد دی' اس کے علاوہ اس میں استعمال ہونے والے پتھر ان کی پیمائش اور قیمت کے بارے میں بتایا ہے۔ ہم نے مقبرہ کے خادمین کے قبضہ میں "تاریخ تاج محل" کے نام سے مشہور فارسی کے ایک قلمی نسخے سے ان کا صرف ایک خلاصہ بیان کیا ہے۔

میر عمارت: عمارت کا سب سے بڑا معمار استاد عیسیٰ تھا' جسے نقشہ نویس کہا جاتا تھا' اس کی تنخواہ 1000 روپیہ ماہانہ تھی۔ اس کے بیٹے محمد شریف کو بطور معمار کے 500 روپے ماہانہ کی ملازمت دی گئی تھی۔ عمارت کے مختلف حصوں پر درج طغرہ رسم الخط میں قرآن پاک کی آیات خطاط امانت خاں شیرازی نے لکھی تھیں' جسے 1000 روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب مزار میں

داخل ہوں تو دائیں ہاتھ ابھرے ہوئے مغفرہ رسم الخط میں درج اس کا نام ملتا ہے۔ یعنی 1048ھ کی تاریخ کے بعد لکھا ہوا ہے "عاجز فقیر امانت خاں شیرازی۔" معماروں کا استاد محمد حنیف بغدادی تھا' اسے بھی 1000 روپیہ ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ گنبد کا معمار اسماعیل خاں تھا' جو روم (ایشیائی ترکی) کا باسی تھا' اس کی تنخواہ 200 روپیہ ماہانہ تھی۔ خطاطی کا استاد محمد خاں بغدادی 200 روپے پر' روم کا پچی کار منوبیگ 780 روپے پر' منوہر سنگھ بھی 200 روپے پر' قندھار کا منولال 200 روپے پر' پشاور کا دین محمد 80 روپے پر' اکبر آباد کا محمد یوسف 100 روپے پر' لاہور کا کلس ساز قاسم خاں 695 روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم تھا: نیز اس کے علاوہ ترکی' ایران' دہلی' کٹک اور پنجاب کے بہت زیادہ کاریگر تھے' جن کی تنخواہیں 100 روپے سے 500 روپے ماہانہ تک تھیں۔

عمارت کے نگران: بادشاہ نامہ کے مطابق' تاج محل کی عمارات کو مکرمت خان اور میر عبدالکریم کی زیر نگرانی 50 لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا۔ اس کے مضافات ایک بہت بڑے شہر میں تبدیل ہو گئے' جسے ممتاز آباد کہا جاتا تھا۔ پرگنہ حویلی میں تیس دیہاتوں کی آمدنی آگرہ کے علاقہ کے چالیس لاکھ دام یا ایک لاکھ سالانہ مالیہ کی رقم مقبرے کی دیکھ بھال کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ اس کے علاوہ مقبرہ کے ساتھ وابستہ تمام دوکانوں' گلیوں اور سرائے کی آمدنی (جن کی مجموعی رقم دو لاکھ روپے سالانہ بنتی تھی) اس کی دیکھ بھال کے لئے مختص کر دی گئی۔ اس خرچ سے بچ جانے والی آمدنی کی رقم کو اس مقبرہ اور اس سے وابستہ دفاتر کے ملازمین کی تنخواہوں اور وظائف پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

سفید سنگ مرمر راجپوتانہ میں جے پور سے آیا' پیلا پتھر نربدا کے کناروں سے' اسکے ایک مربع گز پر 40 روپے لاگت آئی۔ سیاہ سنگ مرمر "چار کوہ" کے مقام سے آیا' اس کے ایک مربع گز پر 90 روپے لاگت آئی۔ بلور چین سے (لاگت 570 روپے فی مربع گز) زبرجد پنجاب سے' عقیق بغداد سے' فیروزہ تبت سے' سنگ یشب یمن سے' لاجورد سری لنکا سے (لاگت فی مربع گز 1'156 روپے) مرجان عرب اور بحیرہ احمر سے' یاقوت بندیل کھنڈ' ہیرا بندیل کھنڈ میں پنا کے مقام سے' کشتی پتھر جیسلمیر سے' سنگلاخ پتھر نربدا سے' سنگ مقناطیس گوالیار سے' سیپ ایران سے' چمقاق ولایت سے' نیلم ایران سے' یاقوت کبود لنکا سے اور سنگ سرخ فتح پور سیکری سے آیا' جس کے 1'14'000 چھکڑے استعمال کئے گئے۔ اس کے علاوہ منبت کاری میں بھی متعدد ایسے پتھر استعمال کئے گئے' انگریزی میں جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ جاٹوں نے ان میں سے متعدد قیمتی پتھر اکھاڑ لئے۔ متعدد پتھر ہندوستان کے باجگزار فرمانروا سرداروں سے خراج کے طور پر

صول ہوئے' جبکہ بہت سے تحفہ کے طور پر وصول ہوئے۔

مہذب دنیا میں تاج محل آگرہ جیسی کوئی ایسی عمارت نہیں ہے' جو مختلف ملکوں اور اقوام کے مصنفین اور سیاحوں کی طرف سے پرجوش تعریف و توصیف کا موضوع بنی ہو۔ انسانی ذوق ر انسانی تصورات میں ہمیشہ اختلاف پایا جاتا ہے' مگر اس کے باوجود مشرق کے مورخین اور مغرب کے شعراء ایک انتہائی شاندار عمارتی یادگار کے طور پر اس کی شان و شوکت کی مدح سرائی میں متحد ہیں۔ انسان کی خودپسندی نے شاید ہی کوئی ایسی یادگار بنائی ہو۔ کرہ ارض کے دور دراز علاقوں کے سیاح اس کی تعریف و توصیف میں مساوی طور پر گرمجوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ جاننا انتہائی دلچسپ ہو سکتا ہے کہ اس عمارت کے بارے میں خود اس کے بانی کی کیا رائے ہے' جسے اس نے دنیا میں اپنی ذہانت کی عظمت اور یادگار کے طور پر چھوڑا ہے' جس نے سطح زمین پر اپنی مرحومہ بیوی کے بارے میں اس کے زبردست عشق اور اس کے فخر اور خودپسندی کی کبھی نہ مٹنے والی چھاپ لگا دی ہے۔

لاہور کے ملا عبدالحمید کی تصنیف "بادشاہ نامہ" کے اوراق سے تاج محل کی مدح سرائی میں ساہ جہان کی اپنی مرتب کردہ پرتصیح نظموں کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا گیا ہے:-

ابیات مصنفہ شاہجہان

زہی مرقد پاک بلقیس عہد	کہ بانوی آفاق راگشت مہد
منور مقامی چو باغ بہشت	معطر چو فردوس عنبر سرشت
بجنتش زخال معطر بخور	بجاروب مژگان درش رفتہ حور
جواہر نگار ست دیوار و در	ہوا تازہ و تر چو آب گہر
عمارت گراین مقدس جناب	زسر چشمہ فیض آوردہ آب
برین بقعہ پاک والا مقام	ترشح کنان ابر رحمت مدام
اگر مجرم آرد . برین در پناہ	شود ہمچو مغفور پاک از گناہ
اگر عاصی آرد برین روضہ روی	کند نامہ خو-ش راشست وشوی
زوقت بنظارہ این مزار	شود چشم خورشید ومہ اشکبار
نمود این عمارت بہ اروزگار	کہ ظاہر شود قدرت کردگار

ترجمہ:- بلقیس کے عہد (76) کی خاتون کا مزار اس قدر شاندار ہے کہ یہ ملکہ جہاں کے جسد خاکی کا مہد بن گیا ہے۔ یہ مقام باغ بہشت کی طرح روشن اور معطر ایسے ہے' جیسے فردوس میں

عنبر و عود کی خوشبو پھیلی ہو۔ اس کے صحن کی ہوا سے حور کے نتھنوں سے خوشبوئیں اٹھتی ہیں۔ حوران بہشت اس کی چوکھٹ کو صاف کرنے کے لئے اپنی پلکیں استعمال کرتی ہیں۔ اس کے در و دیوار جواہرات سے چمکتے ہیں۔ وہاں پر ہوا موتی کی آب و تب کی طرح تر و تازہ ہے۔ اس مقدس عمارت کا معمار اس کے لئے چشمہ فیض سے پانی لایا ہے۔ اس مشہور و معروف مقدس عمارت پر ابر رحمت کی بارش ہمیشہ سے برس رہی ہے۔ اگر مجرم یہاں پناہ لے لے تو جیسے کسی کو معافی مل جاتی ہے وہ گناہ سے پاک ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی گناہ گار اس عمارت کی طرف آئے تو یقیناً اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس عمارت کا نظارہ سرد آہیں پیدا کر دیتا ہے اور چاند و سورج کی آنکھوں سے آنسو رواں کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں اس عمارت کو پروردگار کی شان بیان کرنے کے لئے بنایا گیا ہے"۔

جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی' شاہجہان نے اپنی تخلیق کردہ عمارت کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی سے لکھا ہے اور وقت کے رواج کے مطابق اپنی نظموں کو تمثیلی زبان میں مرتب کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کے قلب کی گرمجوشی کا اظہار کرتی ہیں اور یہ کہ اس نے اس مقبرہ کی عظمت کے تصور کا پوری طرح ادراک کر لیا تھا' جسے اس نے آنے والی نسلوں کے لئے دنیا کے ایک عجوبہ کے طور پر اور اس پر شکوہ سلطنت کے لئے ایک پر تکلف اور شاندار تحفہ کی شکل میں چھوڑا ہے۔

سرولیم ہنٹر تاج محل کے خوبصورت گنبدوں کو "سنگ مرمر کا ایک خواب" بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "تاج محل زیبائش کے اس انتہائی اعلیٰ ترین دقیق مرحلے کو پیش کرتا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں تک پہنچا' یہ ایسا مرحلہ ہے جس میں معمار کا کام ختم ہوتا ہے اور ایک جوہری کا شروع ہو جاتا ہے۔" بیرڈ ٹیلر کہتے ہیں کہ "یہ مکمل طور پر خوبصورت اور انتہائی کمال کی چیز ہے ہر لحاظ سے یہ ایک جن کا کام معلوم ہوتا ہے' جو کمزوری اور بیماری (جو انسانیت کو گھیر لیتی ہے) کے نام تک سے واقف نہیں"۔

ایک مصنف کہتا ہے "یہ انسانی ہاتھوں کا ایک انتہائی خاص اور انتہائی مقدس کام ہے۔ فرشتے ضرور اسے جنت سے لائے ہیں' چنانچہ اس کے اوپر شیشے کا ایک بکس ڈال دینا چاہئے جو اسے ہوا کے ہر جھونکے سے محفوظ رکھ سکے"۔

ایک روسی فنکار اس کے بارے میں اس طرح بیان کرتا ہے "یہ ایک ایسی حسین عورت کی طرح ہے' جسے آپ لاکھ اپنی مرضی کے مطابق برا بھلا کہیں' مگر جس وقت آپ اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں تو اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں"۔ مسٹر کینے اس پر رائے زنی کرتے ہیں

"اس میں داخل ہوں تو اس کے نقشہ میں کچھ ایسی نزاکت اور زنانہ پن دکھائی دیتا ہے جسے آرائش کی خوبصورتی کے ذریعے مٹایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اس کا بدلہ چکایا جا سکتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ درست معلوم ہوتی ہے اور اس سے ذہن میں Rape of the Lock کا مقبول عام شعر آ جاتا ہے۔

ترجمہ:۔ "اگر اس میں کوئی زنانہ نقائص موجود ہوں تو اس کے چہرے کی طرف دیکھو اور تم سب کو فراموش کر دو گے۔"

بشپ ہیبر کے الفاظ میں "اگرچہ دیوان خانہ کی چینی کے لئے زیب و زینت کی طرح اس کی ہر چیز مکمل ہے' مگر اس کا عام تاثر پر تکلف ہونے کی بجائے قدرے سنجیدہ اور متاثر کن ہے"۔

مسٹر جیمز فرگوسن اس کے بارے میں لکھتے ہیں "اپنے پتھر کی خاصیت اور وضع قطع کی شان و شوکت کے معاملہ میں تاج محل دنیا میں اسی قسم کی کسی اور تخلیق کو اپنے ساتھ مقابلہ کی دعوت دے سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی خوبصورتی اعلیٰ ترین طبقہ کی نہ ہو' مگر اپنے حلقہ میں یہ فقید المثال ہے" ایک مصنف نے اس کے بارے میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے "حالانکہ اہرام مصر نے وادی نیل کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور ان کی تعمیر کی مضبوطی اور تصور کی عظمت کے باعث انہیں فن کے عجائب خیال کیا جائے گا' مگر تاج محل آگرہ انسانی فن تعمیر کے انتہائی نازک نمونہ کے معاملہ میں اور شادی شدہ محبت کے انتہائی پر تکلف رومان کے باعث نسل انسانیت کی تعریف و توصیف حاصل کرتا رہے گا۔ سلیمن کہتا ہے میں نے اپنی بیوی سے دریافت کیا' جب وہ اس کو دیکھنے گئی تو اس نے اس عمارت کے بارے میں کیا سوچا؟ اس نے کہا' میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں نے اس کے متعلق کیا سوچا' کیونکہ میں یہ نہیں جانتی کہ اس قسم کی عمارت پر کس طرح تنقید کی جاتی ہے' مگر میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں کیا محسوس کرتی ہوں یعنی میں چاہتی ہوں کہ کل مر جاؤں تاکہ ایک دوسرا تاج محل میرے اوپر تعمیر کر دیا جائے"۔

تاج محل کے بارے میں یہ درست کہا گیا ہے کہ "فن تعمیر میں اس کی وہی حیثیت ہے جو فن مجسمہ سازی میں وینس ڈی میڈیسی یا شاعری میں شیکسپیئر کی ہے"۔

ریورنڈ فریج بیان کرتا ہے "تاہم' کوئی بیان واضح اور جامع نہیں ہے' اگر تصویر کشی یا خاکوں میں بھی اس کا اظہار کیا جائے تو کوئی رنگ درخشاں یا مختلف نہیں ہے۔ ہر کوئی تاج محل کی عظمت کے بارے میں یہ درست تصور پیش کر سکتا ہے کہ مشرقی فن تعمیر کی تاریخ میں یہ ایک بے مثال عمارت ہے"۔

جدائی کا منظر: جب ایک مرتبہ اس طور بجوبہ سے تعلق قائم ہو جاتا ہے' تو بادل نخواستہ اپنے

آپ کو اس مقام سے جدا کرنا پڑتا ہے۔ جسے فن کے ذریعے انتہائی خوبصورت اور بہت زیادہ دلاویز بنا دیا گیا ہے' اس کی یاد ذہن سے علیحدہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ' ایک سیاح اپنے تاثرات کی کچھ اس طرح عکاسی کرتا ہے "ہر شخص لامحدود خوشی کے ساتھ وہاں سے لوٹتا ہے اور گرچہ ہر مرتبہ واپسی پر اس کی توجہ چھوٹے حصوں پر کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے' مگر پوری عمارت کے عظیم تصور سے حاصل ہونے والی خوشی میں اضافہ ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور وہ اس دکھ بھرے احساس کے ساتھ اس سے جدا ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اس کے قابو میں نہیں ہے' اور وہ اس یقین کے ساتھ رخصت ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے اسے کبھی بھی اسکے ذہن سے مٹایا نہیں جاسکتا۔ یعنی یاد اپنا نقش بنالیتی ہے"۔

ہم مشرقی فن تعمیر کے اس گوہر نایاب کے بارے میں اپنے نامکمل بیان اور کمزور سے خاکہ کو اس مقبرے کی تعریف میں خاتون مصنفین کی مندرجہ ذیل شاعرانہ تخلیقات کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

"اے کہ تمہارا شاہانہ ذہن ہی کسی عورت کی تعریف میں اس پر شکوہ یادگار کی تعمیر کر سکتا تھا! اگر محبت اور دکھ نے اس کے کشادہ ڈھانچہ میں روح پھونکی ہے تو کوئی فانی خوشی یا غم تمہاری برابری نہیں کر سکتا! جب ویرانی اس دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی' تب بھی یہ یادگار اسی طرح حفاظت میں خوابیدہ کھڑی رہے گی۔ دنیا کا یہ آخری فاتح بجوبہ وقت اور موت کے ہاتھوں ہی ایک کھنڈر بنے گا (77)

"ممتاز کی بے داغ شہرت کی طرح اس کا بے عیب سنگ مرمر چمکتا ہے: اپنے بادشاہ کے بے مثال عشق کی طرح دلفریب ان کی قبروں کی چادریں ہیں۔ میں نے بہت شاندار گرجے دیکھے اور سینٹ پیٹر کا گنبد بھی دیکھا اور میڈ سین کے مقبرہ کے گرد نہایت قیمتی درخشاں و منور جواہرات کا مشاہدہ بھی کیا؟

مگر محبت کا یہ مندر —— خوبصورتیوں کا ڈھیر' مشرقی فن کا فخر' یہ دل پر قابض موجودہ دیوتا کے تصور کو بلند کرتا ہے۔ اس زبردست خوبصورتی و دلکشی کو حاصل کر کے ہم اپنی تمام طاقت کو تمہارے آگے جھکاتے ہیں۔ یہ سادہ' شاندار اور صاف شفاف عمارت' آہ! یہ صرف اور صرف محبت کی ہے۔ (78)

کسی مشرقی شہزادے کو دولت یا دانشمندی کے معاملہ میں اتنی شہرت حاصل نہ ہوئی۔ فانی ہاتھوں نے اس قدر خوبصورت شکل و صورت کبھی تیار نہیں کی۔ حسین و جمیل ممتاز موت کے سرد بازوؤں میں سو گئی اور جمنا کے پانی پر ہواؤں کے ساتھ آہیں

گردش کرتی گئیں۔ اس کی قبر کے گرد موتی جیسے قطرے ایسے ہیں' جیسے فرشتوں کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہوں اور ان میں خوشبو رچی ہو' وہاں پر جم کر وہ ہمیشہ کے لئے ٹھہر گئے ہیں۔ ہندوستان کے ہاتھ کا فخر' پریوں کا محل۔(79)

ممتاز محل کی پہلی برسی ذیقعد 1041ھ (1631ء) میں منائی گئی۔ بادشاہ نامہ کے مطابق' اس موقع پر تاج محل میں عظیم الشان تیاریاں کی گئیں۔ شاہی گھرانے کے افسران (متصدیان بیوتات) نے بادشاہ کے حکم سے مقبرے کے صحن کو شاندار خیموں اور قیمتی شامیانوں سے آراستہ کر دیا۔ شاہی گھرانے کے تمام شہزادگان اور دارالخلافہ کے امراء اور وزراء اس موقع کو عزت بخشنے کے لئے جمع ہوئے۔ اسی طرح عالم فاضل حضرات' شیخ' علماء اور حفاظ کرام بھی اس موقع پر اکٹھا ہوئے۔ وزراء اور امراء نے شامیانہ کے نیچے اپنے منصب کے مطابق نشستیں سنبھالیں اور بادشاہ نے اپنی موجودگی سے اس اجتماع کی شان میں اضافہ کیا۔ بادشاہ کے حکم سے مرحوم ملکہ کے والد یمین الدولہ آصف خاں نے ایرانی سفیر محمد علی بیگ کے ساتھ نشست سنبھالی۔ اس کے بعد ایک دستر خوان بچھا کر مختلف قسم کے لذیذ کھانوں' مٹھائیوں اور پھلوں پر مشتمل انتہائی شاندار رات کا کھانا اس موقع پر جمع ہونے والے مہمانوں کو پیش کیا گیا اور تلاوت قرآن پاک کے بعد مرحومہ کے ایصال ثواب کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ اس موقع پر جمع ہونے والے غریبوں میں خیرات کے طور پر بانٹنے کے لئے مختص کردہ ایک لاکھ روپوں میں سے پچاس ہزار روپے اسی دن اور باقی پچاس ہزار روپے اگلے روز تقسیم کر دیئے گئے۔ یہ حکم بھی دیا گیا کہ ہر سال برسی کے موقع پر اگر بادشاہ دارالخلافہ میں ہو تو غریبوں میں پچاس ہزار بانٹے جائیں اور جب وہ پڑاؤ میں ہو تو اس مقصد کے لئے بارہ ہزار روپے کی رقم خرچ کی جائے۔

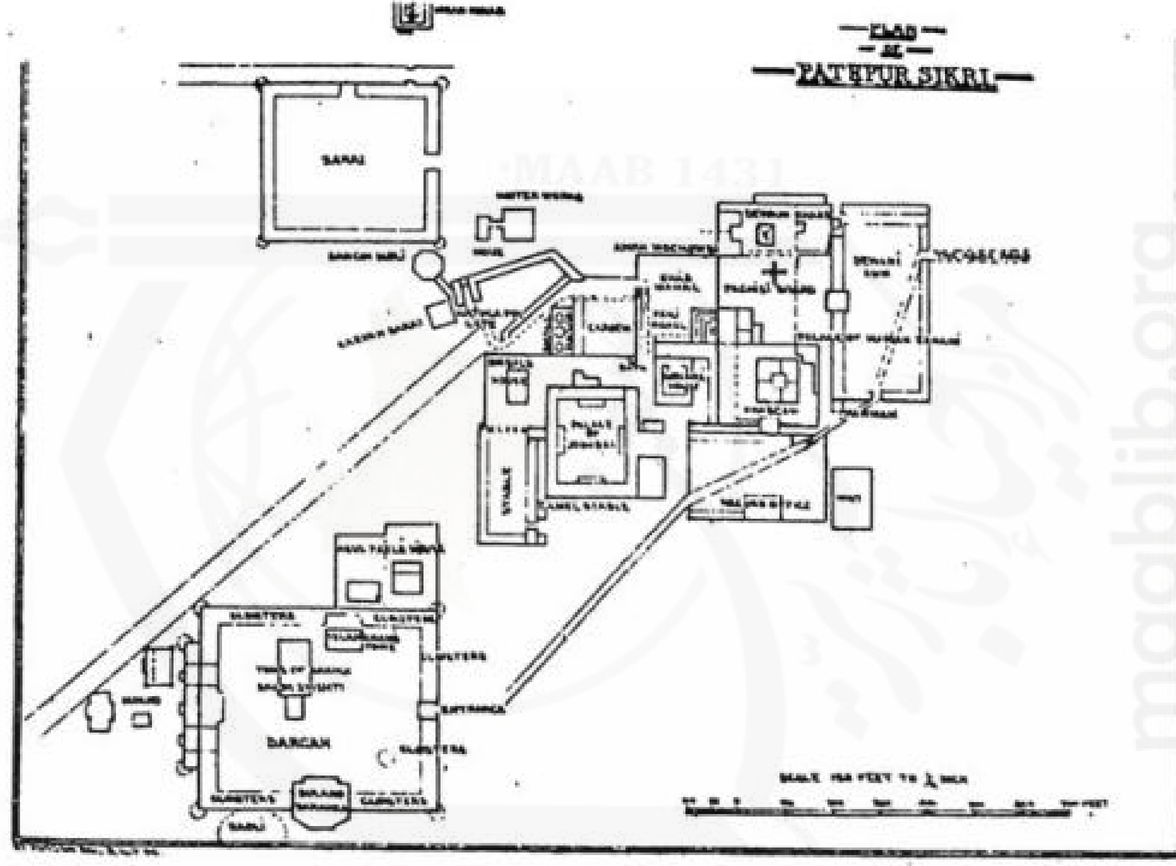
جب کبھی بادشاہ دارالخلافہ میں ہوتا' تو وہ اپنی چہیتی بیٹی بیگم صاحبہ اور حرم کی خواتین کے ساتھ اپنی ملکہ کی برسی میں شرکت کرتا تھا۔ بیگمات مرکزی چبوترے پر تشریف رکھتی تھیں' انھیں قناتوں یا سرخ کپڑے اور مخمل کی چادروں کے ذریعے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جاتا تھا' جبکہ امیر اس مقصد کے لئے نصب کئے گئے شامیانوں کے نیچے جمع ہوتے تھے۔ ہر موقع پر خیرات کے طور پر پچاس ہزار روپے کی مقررہ رقم تقسیم کی جاتی تھی۔ نصف رقم برسی کے روز اور نصف اگلے دن بانٹی جاتی۔ برسی کے موقع پر ہندوستان کے تمام حصوں سے لوگ آ کر جمع ہوتے تھے۔

فتح پور سیکری

فتح پور سیکری کی ابتداء: آگرہ کے جنوب مغرب میں تقریباً" 23 میل اور قلعہ بھرت پور سے 14 میل کے فاصلے پر آگرہ کے ونڈسر' اکبر کی شاہی رہائش گاہ فتح پور سیکری کے عظیم الشان کھنڈرات موجود ہیں۔ یہ بھی پرانی مغلیہ شاہراہ کے راستے پر واقع ہے' جو راستہ میں چند قدیم نسوں اور پلوں کو قطع کرتی ہے' اب استعمال میں نہیں۔ فتح پور سیکری' جو اب کراولی تحصیل کا ایک بلدیاتی شہریا آگرہ کا پرگنہ ہے' اس نے یہ نام ان دو دیہاتوں سے حاصل کیا ہے' جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ سیکری جو کبھی ایک الگ تھلگ گاؤں تھا' اسے کشادہ عمارات سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں اس معمار اعلیٰ کی اولاد کی ملکیت ہیں' جس نے ان محلات کی تعمیر کی نگرانی کی' جن کے باعث فتح پور حقیقت میں مشہور ہوا ہے۔ شہنشاہ اکبر نے وہاں پر اپنے بیٹے سلیم (بعد میں جہانگیر) کی پیدائش کی نسبت سے اسے فتح پور کا نام دیا۔ آئین اکبری میں فتح پور المعروف سیکری کا ذکر صوبہ آگرہ (جسے دار الخلافت کہا جاتا تھا) کے 42 پرگنوں میں سے ایک کے طور پر کیا گیا ہے۔

یہ بیانہ سرکار (33 محلوں پر مشتمل) کے ماتحت تھا۔ چنانچہ ابوالفضل آئین اکبری میں اس کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"بیانہ کا ایک گاؤں "فتح پور سیکری" دار الخلافت سے بارہ کوس کے فاصلے پر واقع ہے' بادشاہ سلامت کے اہتمام سے یہ دنیا کا ایک نہایت شاندار شہر بن گیا ہے۔ یہاں پر سنگ سرخ کے ایک قلعہ کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے ایک دروازے پر ہاتھیوں کے دو مجسمے نصب کئے گئے۔ اسے بلند و بالا عمارات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر شاہی محل اور سلطنت کے وزیروں کے مکانات تعمیر کئے گئے ہیں' جبکہ پہاڑوں کے سامنے میدانوں کو بے شمار بارہ دریوں اور پر تکلف باغات سے مزین کر دیا گیا ہے۔ بادشاہ سلامت کے حکم سے پہاڑوں پر ایک مسجد' مدرسہ اور مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے۔ وہ اس قدر خوبصورت اور شاندار ہیں کہ پوری دنیا کی سیاحت



فتح پور سیکری کا نقشہ

کرنے والے اشخاص کے مطابق' زمین پر چند ہی ایسی عمارات ہوں گی' جو شان و شوکت میں ان کی برابری کر سکیں۔ شہر کے قریب وسیع و عریض شکارگاہیں ہیں۔ بادشاہ سلامت نے ان پر کھیل کا ایک میدان بنوا دیا ہے اور ایک مینار تعمیر کرایا ہے' جس پر سے وہ ہاتھیوں کی لڑائی کا نظارہ کرتے ہیں۔ یہاں پر سنگ سرخ کی ایک کان بھی ہے' جس میں سے اپنی مرضی کے مطابق حسب ضرورت ستونوں اور پہلوؤں کے لئے پتھر کاٹے جا سکتے ہیں۔ عالم پناہ کے زیر اہتمام یہاں پر انتہائی اعلیٰ معیار کا کپڑا اور ریشمی پارچہ جات تیار کئے جا سکتے ہیں اور ہر درجہ کے اہل حرفہ یہاں آباد ہیں"۔

حکومت کے 16 ویں برس کی تاریخ میں ابوالفضل نے فتح پور سیکری کی عمارات کا ایک بیان درج کیا ہے' وہ لکھتا ہے:۔ "بیانہ کا ایک علاقہ سیکری بڑا شہر (مصر جامع) بن گیا۔ شہنشاہ عالم چونکہ اپنی رعایا کی خلوص دل سے بہتری چاہتے ہیں اس لئے انہوں نے اس جگہ کو آراستہ و پیراستہ کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ شہزادوں کی جائے پیدائش اور خدا کے منتخب برگزیدہ بزرگ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی رہائش ہونے کے باعث مبارک مقام ہونے کی وجہ سے بادشاہ سلامت نے سیکری کو اپنی شاہی رہائش گاہ مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا' اس کے علاوہ سلطنت کے وزراء کی آماجگاہ بھی اسی کو بنانے کا ارادہ کیا گیا۔ چنانچہ بادشاہ سلامت کے حکم سے انتہائی خوبصورت اور شاندار شاہی محلات یہاں تعمیر کئے گئے اور تمام عہدوں کے امراء نے اپنی رہائش کے لئے یہاں شاندار عمارات تعمیر کرائیں۔ یہاں پر سنگ سرخ کے ایک قلعہ کی بنیاد رکھنے کا حکم بھی دیا گیا۔ ایک مختصر عرصہ میں سیکری مقبروں' مدرسوں اور عوامی حماموں کے ساتھ ایک عظیم شہر بن گیا: پتھر سے ایک بازار تعمیر کیا گیا اور اس کے مضافات کے میدانوں میں نفیس باغات' نہریں اور نالے بنائے گئے۔ یہ شہر دنیا کے عظیم شہروں میں شمار ہونے لگا۔ بادشاہ سلامت نے اسے فتح آباد کا نام دیا' مگر لوگوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اسے فتح پور کے نام سے پکارنا شروع کر دیا' تو بادشاہ نے اسی نام کی منظوری دے دی۔"

قلعہ آگرہ کی تعمیر اکبر کی حکومت کے دسویں برس یا 1566ء میں شروع کی گئی' لہٰذا دور حکومت کے 14 ویں برس یا تین سال بعد فتح پور سیکری کو شاہی رہائش گاہ کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ مذکورہ بالا مقام پر شروع کئے گئے قلعہ کی بنیادوں کے آثار کو اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بادشاہ کا ارادہ تھا کہ اپنا پورا دارالخلافت وہاں تعمیر کیا جائے' اگلے 17 برسوں یا دور حکومت کے 31 ویں برس تک (1586ء) اس نے اپنا دربار فتح پوری سیکری میں منعقد کیا' جسے سرکاری خط و کتابت میں دارالخلافت لکھا جانے لگا اور آگرہ برائے نام دارالسلطنت بن گیا۔ جب بھی بادشاہ

مہمات پر روانہ ہوتا' تو اپنی بیویوں اور خاندان کو اپنی پسندیدہ رہائش گاہ فتح پوری سیکری میں چھوڑ جاتا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں طویل سفروں کے بعد فتح پور میں بادشاہ کی آمد اور ان مواقعوں پر اس کے اہل خانہ' شہزادگان اور امراء (جس انداز میں اس کا خیر مقدم کرتے تھے) کے بارے میں ایک مفصل بیان درج کیا ہے۔ گجرات میں حسین مرزا کی پیدا کردہ گڑبڑ کو فرو کرنے کے بعد (جب اس نے موسم کی شدت کے باوجود ایک فوج جمع کر کے انتہائی پھرتی سے 450 سے زائد میل کا زبردست سفر طے کیا اور آگرہ سے روانہ ہونے کے بعد نویں روز میدان جنگ میں پہنچ گیا) صرف 43 روز کی غیر حاضری کے بعد آگرہ کی طرف لوٹ آیا۔ شاہی پڑاؤ کی واپسی پر زبردست جشن منایا گیا۔ جب بادشاہ اپنی پسندیدہ رہائش گاہ سیکری پہنچا' تو وہ بھورے رنگ کے ایک جنگی گھوڑے پر سوار تھا' جس کے ایال اور دم پر مہندی (حنا) لگی ہوئی تھی' وہ اپنے ہاتھ میں شاہانہ انداز میں نیزہ تھامے ہوئے تھا۔ اس کے محافظ اور شاہی فوج کے سپاہی سنہری گیندوں سے مزین نیزوں کے ساتھ اس کے آگے آگے چل رہے تھے۔ پورا شاہی گھرانہ اور امراء (جنہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا)' اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے پہاڑوں کی وادی میں آئے۔ اس وقت زبردست خوشی اور جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔ جامع مسجد کے میناروں سے نعروں کی گونج اور موسیقی کے شور سے فضا معمور تھی' اس کی مدد سے دور و نزدیک فتح کی خبر پہنچا دی گئی۔ اس واقعہ کو مصنف کی اپنی دلکش زبان میں بیان کرنا زیادہ دلچسپ ہوگا۔ ابوالفضل کہتا ہے:-

"آنحضرت پاس از روز مذکور ماندہ چون عافیت درجان و روح درتن بدارالاقبال فتح پور آمدند آب تازہ بجوی آمد وعالم گلستان شد حضرات بیگمات و شہزادہائے رفعت پیوند و پردگیان سراپردہ عصمت بدیدار سعادت بخش کامیاب صورت و معنی گشتند و مراسم نیاز بخوبترین وجہ بظہور آمدہ دیدہائے مشتاقان نور افزا گشتند

ترجمہ:- غروب آفتاب سے ایک گھڑی قبل بادشاہ سلامت زندگی میں مانند صحت اور بدن میں مانند جان و روح دارالخلافت فتح پور تشریف لائے' آب تازہ ندی میں آگیا اور دنیا ایک گلستان کی مانند ہوگئی۔ بیگمات عالی' شہزادگان ذی وقار اور باعصمت گھرانے کی پردہ نشین خواتین نے بادشاہ سلامت کا دیدار کر کے عزت اور خوشحالی پائی' نذر نیاز کی رسومات بہترین انداز میں ادا کی گئیں اور جو آنکھیں کافی عرصہ سے ملاقات کے لئے ترس رہی تھیں ان میں زبردست چمک پیدا ہوگئی"۔

چنانچہ' پنجاب میں دس ماہ کی غیر حاضری کے بعد آمد ملا فیضی کی نظموں میں مشہور ہوگئی' جس کا حوالہ اس کے بھائی ابوالفضل نے اسی کتاب میں دیا ہے:-

نسیم خوشدلی از فتحپوری آید | کہ بادشاہ من از راہ دوری آید
چہ دولت قدومش کہ ہردم از دل خلق | ہزار گونہ طرب درظہوری آید
نجستہ باد بعالم قدوم او فیضی | کہ عالمے بمقام حضوری آید

ترجمہ :- فتح پور سے خوشگوار ہوا آئی ہے' کیونکہ میرے بادشاہ سلامت ایک طویل سفر سے آ رہے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی آمد اس قدر مبارک ہے کہ لوگوں کے دل سے ہر لمحہ ہزاروں خوشیاں پھوٹ رہی ہیں۔

اے فیضی خدا کرے ان کی آمد دنیا کے لئے مبارک ہو' کیونکہ سارے لوگ ان کا استقبال کرنے آ رہے ہیں۔

بادشاہ امراء اور ہاتھیوں کی قطاروں کے درمیان سے ہوتا ہوا فتح پور میں داخل ہوا تو سپاہیوں' رقاصوں اور بازی گروں نے اس کا دل بہلایا اور جنگی نقارہ کی آواز سنائی دی۔

اس کے سوتیلے بھائی محمد حکیم مرزا (جسے اکبر نے کابل کی سلطنت دے دی تھی) کی بغاوت اور پنجاب میں اس کے حملوں نے اکبر کو فتح پور سے لاہور روانہ ہونے پر مجبور کر دیا (جسے چودہ برس تک سلطنت کا دارالحکومت رہنے کا اعزاز حاصل رہا) حکومت کے 43 ویں برس یا (1598ء) میں بادشاہ ہندوستان کی طرف لوٹ آیا اور آگرہ اصل دارالحکومت بن گیا۔ بادشاہ نے آخرکار جن وجوہات کی بناء پر آگرہ کو اپنے دارالخلافہ کے لئے منتخب کیا' انہیں کہیں بیان کر دیا گیا ہے۔ (80) 1598ء سے 1605ء تک (جب اکبر کا انتقال ہوا) اس نے اپنا دربار آگرہ میں منعقد کیا' حالانکہ فتح پور ابھی تک اس کی پسندیدہ رہائش گاہ تھا۔ مناسب طور پر بات کی جائے تو فتح پور اکبر کے لئے ونڈسر اور آگرہ لندن تھا۔ دروازے دہلی' لال آگرہ' اجمیر' ظاہرہ' سورج پول اور چندن پول کے نام سے مشہور ہیں۔

علامہ شیخ ابوالفضل اکبر کے دور حکومت کے 14 ویں برس کا حال بیان کرتے ہوئے اکبر نامہ میں ہمیں مطلع کرتا ہے کہ تقریباً اسی دور میں بادشاہ نے شیخ محمد بخاری' حکیم الملک اور دیگر امراء (جنہیں شاہی تخت تک رسائی حاصل تھی) سے سیکری کے شیخ سلیم چشتیؒ کی مذہبی شہرت اور تقویٰ کے بارے میں سنا تو اس امید کے تحت اس گاؤں میں شاہی حرم کی بیگمات کو قابل احترام شیخؒ کی رہائش گاہ کے قریب ٹھہرانے کا فیصلہ کر لیا کہ اس برگزیدہ درویش کی روحانی طاقت اور اس جگہ کے تقدس کے نتیجہ میں اسے ایک بیٹا عنایت کر دیا جائے گا۔ ذہین مورخ لکھتا ہے: "اس سے قبل بادشاہ کے متعدد بچے پیدا ہوئے' مگر خالق کائنات کی پراسرار مرضی سے وہ سب اگلے جہان سدھار گئے۔ جاہل لوگوں نے اس چیز کو محل وقوع کی نحوست سے منسوب کیا: نیز

بادشاہ نے خاموشی کی مہر سے بیہودہ لوگوں کے منہ بند کر دیئے اور اس جگہ کو تبدیل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ فتح پور دار الخلافت کا انتخاب کیا گیا' چنانچہ ایک مبارک گھڑی کو بادشاہ کی ہندو ملکہ مریم زمانی (81) کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ وہ صوبہ اجمیر میں امبر کے راجہ بہاری مل کی بیٹی' راجہ بھگوان داس کی بہن اور کنور مان سنگھ کی پھوپھی تھی۔"

ان دنوں فتح پور کو ایک طویل بازار کے ذریعے آگرہ سے منسلک کیا گیا تھا۔ اکبر نے آگرہ میں اس خوشخبری کو سنا تو فوراً فتح پور روانہ ہوا' جہاں اس واقعہ کی خوشی میں زبردست خوشیاں اور جشن منائے گئے۔ پوری سلطنت میں سزائے موت کے تمام مجرموں اور قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور خوشیاں و جشن روز کا معمول بن گئے۔ برگزیدہ بزرگ کی نسبت سے نومولود شہزادے کا نام سلیم رکھا گیا' غالباً انہیں کی دعاؤں سے یہ خوشخبری سننے کو ملی۔

جہانگیر اپنی "تزک جہانگیری" میں اپنی پیدائش اور فتح پور کی بنیاد سے متعلق واقعات کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"28 برس کی عمر تک میرے والد کا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے درویشوں اور برگزیدہ بندوں کا راستہ اختیار کیا (جو ہمیشہ اللہ کے نزدیک ہوتے ہیں) اور ان سے التجا کی کہ اسے ایسا بچہ عطا کر دیا جائے جو زندہ رہے۔ قابل احترام خواجہ معین الدین چشتیؒ چونکہ ہندوستان کے زیادہ تر بزرگوں کے سربراہ تھے' اس لئے بادشاہ سلامت نے اپنی مراد حاصل کرنے کے لئے ان کے آستانہ عالیہ پر حاضری دینے کا خیال کیا۔ چنانچہ انہوں نے بذات خود منت مانی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں ایک بیٹے سے نواز دے تو وہ انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آگرہ سے ان کے مقبرہ تک کا سفر پیدل کریں گے (یہ فاصلہ 140 کوس کا ہے) اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں بروز بدھ 17 ربیع الاول 977ھ کو پیدا ہوا۔ اس دور میں جب میرے والد کو ایک بچے کی خواہش تھی' آگرہ کے ایک گاؤں سیکری کے نزدیک ایک پہاڑی پر شیخ سلیمؒ نام کے ایک درویش رہا کرتے تھے' وہ مکمل طور پر خدا رسیدہ انتہائی ضعیف شخص تھے۔ اس پہاڑی کے قرب و جوار میں آباد لوگ ان کی کرامات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ میرے والد کو چونکہ درویشوں پر بہت زیادہ بھروسہ تھا' اس لئے انہوں نے شیخ کے ساتھ راہ و رسم بڑھائی۔ ایک روز جب شیخؒ سکر اور جذب کی حالت میں تھے' تو انہوں نے (میرے والد) عرض کی کہ ان کے ہاں کتنے لڑکے ہوں گے۔ فقیر نے جواب دیا:۔ مالک' جو بن مانگے عطا کرتا ہے' وہ تمہیں تین بیٹوں سے نوازے گا:۔ میرے والد نے عرض کی' میں نے منت مانگی تھی کہ اپنے پہلے پیدا ہونے والے بیٹے کو آپکی گود میں ڈال کر آپ کی کفالت میں دے دوں گا' تاکہ آپ اس کے محافظ اور سرپرست بن

جائیں۔ شیخؒ نے اس پر رضا مندی کا اظہار کیا اور فرمایا مبارک ہو! میں نے اپنی طرف سے اسے اپنا نام دیا ہے۔ جب میری والدہ کو درد زہ شروع ہوا تو اسے شیخؒ کے گھر روانہ کر دیا گیا تاکہ میری ولادت وہیں ہو سکے۔ جب میں پیدا ہوا تو میرا نام سلطان سلیم رکھا گیا۔ مگر میں نے کبھی بھی اپنے والد کو ہوش میں یا بے ہوشی کی حالت میں کہتے نہیں سنا کہ انہوں نے مجھے محمد سلیم یا سلطان سلیم کے نام سے پکارا ہو' وہ ہمیشہ مجھے شیخو بابا کہہ کر بلایا کرتے تھے۔

میرے والد محترم نے میری جائے پیدائش موضع سیکری کو اپنے لئے مبارک خیال کرتے ہوئے اسے اپنا دار الخلافہ بنا لیا' لہٰذا چودہ یا پندرہ سال کے عرصہ میں پہاڑیاں اور صحرا جن میں شکاری جانور بکثرت پائے جاتے تھے' بے شمار باغات' شاندار عمارات و بارہ دریوں اور دیگر انتہائی دلفریب اور حسین مقامات پر مشتمل ایک عالی شان شہر میں تبدیل ہو گئے۔ گجرات کی فتح کے بعد اس گاؤں کو فتح پور کا نام دیا گیا"۔

اکبر نے آگرہ سے اجمیر تک (جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ ہے) پیدل سفر کر کے اپنی منت پوری کر دی۔

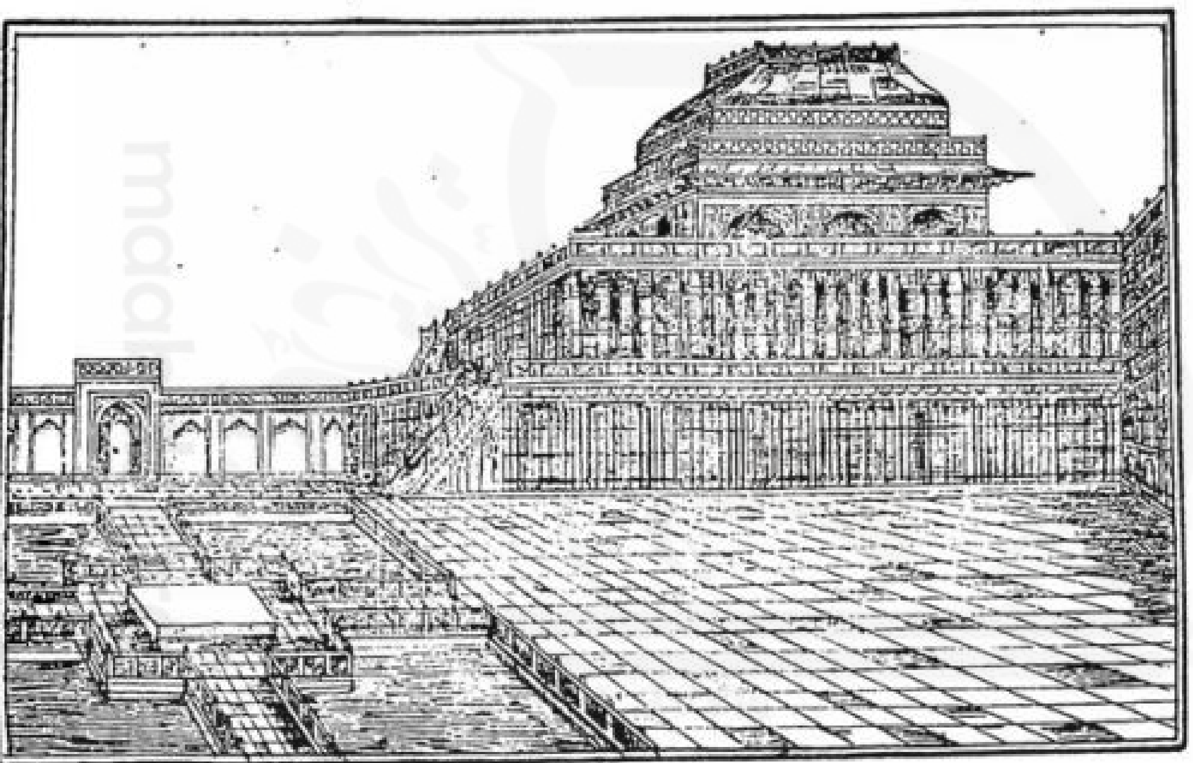
موجودہ ادوار میں فتح پور سیکری اس لئے مشہور ہے کہ اس کا شمار بالائی ہندوستان میں قدیم عمارات کے آثار کے عظیم ترین مجموعات میں ہوتا ہے۔ پورے ہندوستان میں کسی بھی جگہ قدیم عمارات اور مختلف اشکال' جسامت' ان جیسی مضبوطی' عظمت اور شان و شوکت کی حامل یادگاروں کا ایک ہی مقام پر اس جیسا ذخیرہ اس جگہ کے سوا کہیں نہیں دیکھا گیا۔ ان کو استحکام اس لئے حاصل ہے کہ انہیں انتہائی مضبوط مسالے اور دریا چونا گچ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک مصنف کے مطابق' مسالے کے چیپ دار مادہ نے انجینئروں کو حیرت زدہ کر دیا ہے اور جب کیمیا دانوں نے اس کے مختلف اجزاء کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو وہ پریشان ہو گئے۔ ویران محل اور ایوان انتہائی دقیق کندہ کاری کے نمونے ہیں۔ ایک ہوشیار مشاہد کے مطابق:۔ "یہ سنگ تراشی کا ایک صحرا ہے' جہاں اختراع زیبائشی کاموں کے نئے امتزاج تخلیق کرنے کے لئے مقدور بھر کوشش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ سنگ سرخ میں ہر چیز اتنی نفاست سے تراشی گئی ہے کہ (ماسوائے اس جگہ کے جہاں اسے انسان سے نقصان پہنچا ہے) ایسی تیز اور صاف معلوم ہوتی ہے جیسے اسے پہلی مرتبہ چھینی سے تراشا گیا ہو"۔

یہ ایک مردہ شہر ہے' غیر مدفون پومپئی کی طرح۔ حالانکہ یہ عمارات تقریباً تین سو برس سے ویران کھڑی ہیں' مگر ابھی تک مکمل محفوظ حالت میں ہیں اور سیاح کے ذہن پر انتہائی واضح تاثر مرتب کرتی ہیں۔ اس کے نقشہ کی شاندار تخلیق اور عمارت کی شان و شوکت اور خوبصورتی' اس

کے بانی کا بلند ترین تصور پیدا کرتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے مغل اعظم کے جاہ و جلال کا جیتا جاگتا تصور لے آتے ہیں۔ پس مشاہد کی آنکھوں کے سامنے اکبر اور اس کی حرم اور اس کے دربار کے ان خوبصورت ایوانوں اور محلوں کی قدیم عظمت و شان و شوکت کی جیتی جاگتی تصویر آ جاتی ہے۔

فتح پور سیکری کے آثار قدیمہ تقریباً چھ یا سات میل کے دائرہ میں پھیلے ہوئے ہیں' جن کے گرد سنگ سرخ کی ایک بلند و بالا فصیل ہے' یہ پہاڑوں کے زیریں سلسلہ کی سرحد پر واقع ہیں۔ مشرقی جانب یا آگرہ کی طرف سے ایک صاف سڑک کے ذریعے کھنڈرات پر پہنچیں (جس پر ڈاک گھری کے ذریعے باآسانی سفر کیا جا سکتا ہے) تو سیاح کی آنکھوں کے سامنے سب سے پہلے آنے والی چیز ایک کشادہ دروازہ ہے' جس کے دونوں جانب شکستہ حالت میں کمرے بنے ہوئے ہیں اور یہ کافی عرصہ سے ویران پڑے ہیں۔ اس منظر کی افسردہ سنجیدگی پر غور کرتے ہوئے آپ ایک بلند جگہ پر پہنچ جاتے ہیں' جس پر کھنڈرات' محلوں اور مکانات کے آثار کے طویل سلسلے پھیلے ہوئے ہیں: کچھ اچھی حالت میں ہیں اور دوسرے بجری کے بھدے ڈھیروں کی شکل میں ہیں۔ ایک طرف محراب دار کمروں کے سلسلے ہیں' جو ٹکسال کے نام سے مشہور ہیں' دوسری جانب ایک ایوان ہے' جسے ایوان حسابات کہا جاتا ہے۔ ٹکسال کی بائیں جانب 180 X 360 فٹ کا ایک کشادہ احاطہ ہے' جس کی چاروں اطراف میں حجروں کی قطاریں ہیں' انہیں سنگ خارا کے ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ یہ دیوان عام کے ایوان پر مشتمل ہے' ایک چھوٹا سا ایوان ہے جس کے ساتھ صحن کے رخ ایک چوڑا برآمدہ بھی ہے۔ ستونوں کی ان قطاروں میں بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کرنے' اس کے سامنے گذارشات پیش کرنے یا اپنے مسائل بیان کرنے یا اس عظیم بادشاہ کے انصاف کے انتظام کو دیکھنے کے لئے (جس کا شمار اس سلطنت کے عظیم ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے) جمع ہونے والے زبردست ہجوم کو جگہ فراہم کی جاتی تھی۔ اکبر دربار کے ایک طرف ایک چھوٹے سے مستطیل نما برآمدے میں بیٹھتا یا عادت کے مطابق وہاں جمع ہونے والے ہجوم کا سلام اور خراج عقیدت وصول کرنے کے لئے ڈیوڑھی میں کھڑا ہوتا تھا۔ اس طرح اس نے اپنی تمام رعایا کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ یہاں پر مسلح آدمیوں اور جانوروں کی صف آرائی بھی ہوتی تھی۔

ایک تنگ راستے سے گذر کر ہم ایک اور کشادہ ایوان میں آتے ہیں' جس کے بائیں جانب سنگ سرخ کی ایک کشادہ عمارت ہے' جو اب سیاحوں کی آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے' مگر گزشتہ دور میں یہ بادشاہ کا دفتر خانہ تھا۔



شاہی خواب گاہ

ذرا آگے 120 X 210 فٹ کا ایک صحن ہے، جس میں فرش لگا ہوا ہے، اس کے ساتھ ایک ڈیوڑھی یا کمروں کا جوڑا ہے، جس کے چاروں طرف بالائی کمروں کی قطاریں ہیں، ان کے چاروں کونوں پر گنبدیاں ہیں، یہ بادشاہ کا خاص محل ہے۔ عام لوگوں سے شاہی بیگمات کو پوشیدہ رکھنے والی سفید سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی جالیوں کی بیرونی دیواریں اب غائب ہو گئیں ہیں مگر سامنے والے کونے کے مشرق میں ان جالیوں کے آثار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ صحن کے جنوب میں پندرہ فٹ سے کم مربع شکل میں بادشاہ کی خواب گاہ ہے، جہاں بادشاہ اور اس کی بیویاں رات کے کھانے کے بعد ستایا کرتے تھے۔

شاہی خواب گاہ کے اوپر 15 فٹ مربع کا ایک چھوٹا سا مگر انتہائی خوبصورت اور سادہ سا کمرہ ہے۔ اس کے چار دروازے ہیں، ہر جانب ایک دروازہ کے اوپر بزبان فارسی ایک قطعہ درج ہے، اس سارے بند میں بادشاہ کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ حسب ذیل ہے:۔

فرش ایوان ترا آئینہ ساز د رضوان
خاک درگاہ ترا سرمہ کنند نور العین
قصر شاہست بہر رنگ بہ از خلد برین
سخنے نیست درین باب چہ خلدست برین

ترجمہ:۔ "جنت کا داروغہ رضوان، تمہارے ایوان کے فرش میں اپنا منہ دیکھے، تمہارے دربار کی خاک آنکھوں کے لئے سرمہ ہے۔ بادشاہ کا محل ہر لحاظ سے خلد بریں سے بہتر ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے مقابلہ میں جنت کیا ہے؟

خاص محل کے شمال مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جسے شاہی گھرانے کی بیگمات کے لئے عبادت خانہ کے طور پر تعمیر کرایا گیا، اس کے ساتھ کمروں کا ایک جوڑا ہے، جسے ایک شفاخانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ مشرق کی جانب کمرے ہیں، جو بادشاہ کی ترکی بیوی استنبولی بیگم کے کمروں کے طور پر مشہور ہیں۔ یہ مقام انتہائی دقیق کندہ کاری اور نفیس کاریگری کے نمونوں پر مشتمل ہے، جو قدرت اور فن کے تصوراتی مناظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں جنگل کے مناظر، ہمالیہ کے پہاڑ، پہاڑی علاقوں کے خوبصورت پرندے، چین کے لہراتے ہوئے اژدھوں سے نبرد آزما جنگلی درندے، افریقہ کے کھجور کے درخت، انگور کی بیل اور ہندوستان کے دیگر پھلدار درخت، پھولوں کی مالائیں اور لڑیوں کی صورت میں دروازوں کے اوپر لٹکتے ہوئے انگور کے گچھے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بیرونی ستونوں کو منبت کاری کے ذریعے درختوں اور مختلف اقسام کے پھولوں کی عکاسی کے ساتھ آراستہ کیا گیا

سنہری منزل: بادشاہ کے محل یا خاص محل کی دائیں جانب اور اس کے ساتھ ملحقہ سنہری منزل کے نام سے مشہور ایک عمارت ہے' یہ ایک بالائی کمرے پر مشتمل چوکور برآمدہ ہے' اب یہ طلائی زیباشی کام اور چمکدار آرائش سے مزین نہیں ہے' اندرونی دیواروں پہ بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ وہاں پر شاہنامہ میں بیان کردہ سورما رستم کے کارناموں کے مناظر اور سلطان محمود غزنوی کے مشہور شاعر فردوسی کی شاعری میں ایرانی بادشاہوں کی تاریخ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اکبر خاص طور پر اس کتاب کا بہت شوقین تھا۔ طاقچے اور دروازوں و کھڑکیوں کے اوپر محرابیں مختلف اقسام کے مناظر اور گوناگوں تصاویر پر مشتمل ہیں' مگر ان میں زیادہ تر مذہبی اہمیت کی حامل ہیں۔ کسی زمانے میں اس گھر کو مکمل طور پر ملمع سازی اور گل بوٹوں سے مزین کیا گیا تھا۔ برآمدوں کی محرابوں کے اندر اور باہر ابوالفضل کے بھائی فیضی کے فصیح و بلیغ اشعار درج تھے' مگر یہ سب مٹ گئے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کے جوش و خروش نے تراشے ہوئے متعدد بتوں اور مورتیوں کو تباہ کر دیا ہے' مگر ان کے نشانات ابھی تک واضح ہیں۔

اسلام میں اس بناء پر فن مصوری کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی کہ آدمی چاہے اس فن میں کتنا بھی ماہر ہو نامکمل ہے اور انسانی برادری کے مخصوص طبقوں کے مقابلے میں قدرت اور اللہ تعالیٰ کی وسیع و عریض تخلیق کی خوبصورتیوں کے بارے میں اس کا علم چاہے کتنا ہی اعلیٰ پائے کا ہو ناقص ہے۔ اس لئے خدا کے کاموں کی نقل کرنا اور اس جیسی اشیاء بنانے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ اکبر جو وسیع اور کھلے نظریات کا شخص تھا' اس نے ان جیسے پرانے خیالات میں حصہ نہیں لیا۔ بادشاہ نے نوجوانی ہی میں فن مصوری کے لئے زبردست دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی' کیونکہ اس نے اس کو ثقافت اور تفریح دونوں کا ذریعہ خیال کیا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس فن سے متعلق اکبر کے خیالات کے بارے میں دلچسپ بیانات درج کئے ہیں۔ "ایک روز ایک نجی محفل میں اس عنوان کے متعلق مسلمانوں کے خیالات کے موضوع پر بحث کی گئی تو بادشاہ سلامت نے کہا کہ ان کی رائے میں مصوروں کے پاس خدا کی شناخت اور اس کے کمالات کی تعریف کے لئے مخصوص ذرائع ہوتے ہیں' ایک مصور ہر اس چیز کی تصویر بناتے وقت جس میں جان ہوتی ہے اور زندہ چیز کے اعضاء کا نقشہ تیار کرتے وقت لازماً یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ حقیقی تخلیق کرنے کا اہل نہیں ہے' چنانچہ اس کا ذہن زندگی عطا کرنے والے خدا کی طرف جھک جاتا ہے اور اس کے قلبی علم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔" بادشاہ سلامت نے اپنی شبیہ بنوائی تھی' اس لئے سلطنت کے دوسرے تمام امراء کی شبیہیں بھی بنوائی گئیں۔ انہوں نے ایک سو سے زائد مصوروں کو ملازم رکھا ہوا تھا۔

سنہری منزل کی زیبائش اور عمارت میں سب سے اہم نقش ایک یونانی صلیب اور نشان ہے۔ منزل کے ایک دروازے پر حضرت مریمؑ اور ایک فرشتے کی تصویر ہے، جس کے حصے اب بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ روایت اس محل کو اکبر کی عیسائی بیوی بی بی مریم کی رہائش گاہ سے منسوب کرتی ہے، جبکہ گائیڈ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک پرتگیزی خاتون تھی۔ چند مصنفین کو اس بات پر شک ہے کہ آیا اکبر نے بھی کسی عیسائی خاتون سے بھی شادی کی تھی۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس بات کا امکان نہیں ہے کہ اس قدر اہم حقیقت کو اکبر نامہ اور طبقات اکبری جیسی ہمعصر تاریخوں میں حذف کر دیا جاتا۔ تاہم اس بات کو ذہن میں رکھ لینا چاہئے کہ مذکورہ بالا کتب باوجود اس کے کہ اپنے موضوع میں انتہائی دقیق ہیں لیکن ان سے یہ تصور قائم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اکبر کے حالات کے بارے میں مکمل معلومات پر مشتمل ہیں۔ مسلمان مورخین کا اپنی تصانیف میں اپنے اندازہ کے مطابق، اپنے بادشاہوں کے برے افعال اور اس دور کے رجحان کے مطابق بدمزہ کاموں کو اور اسی طرح کے واقعات کے ذکر کو حذف کرنے کے رجحان کی یہاں وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہیلر محترم جان روبسن کی سند پر یہ تسلیم کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے مریم کے نام سے مشہور ایک عیسائی خاتون سے شادی کی تھی۔ مصنف لکھتا ہے "مریم کا محل ابھی تک فتح پور سیکری میں دکھائی دیتا ہے (82) ابو الفضل اکبر نامہ (جلد سوم) میں اکبر کی بیوی مریم مکانی کا باغ دار الخلافت فتح پور سے چار کوس کے فاصلہ پر بتاتا ہے۔ بادشاہ وہاں تفریح کی خاطر جایا کرتا تھا اور شاہی حرم کی بیگمات کے ہمراہ وہاں چند روز ٹھہرا کرتا تھا۔

فتح پور سیکری میں اکبر کو عیسائیت میں بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے مقدس کتابوں کی تعلیم کے لئے گوا میں پرتگیزی آبادی کے عیسائی پادریوں کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ تین پادری ایکوا ویوا، مونسلریٹ اور اینریکس، دسمبر 1568ء میں سورت سے روانہ ہوئے تو انہیں بحفاظت فتح پور پہنچا دیا گیا۔ پادریوں نے اکبر کے بارے میں بیان کیا ہے کہ وہ یورپی رنگ و روپ کا حامل تقریباً پچاس برس کی عمر کا شخص تھا اور اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ بادشاہ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ جب لے چار زبانوں میں انجیل اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی مورتیاں پیش کی گئیں تو اس نے انجیل کو اپنے سر پر رکھا اور مورتیوں کو بوسہ دیا۔ جب پادریوں نے بادشاہ کی حفاظت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب دیا "تمہارے پاس کیا ہے؟ تمہارے گرجوں کے مقابلہ میں میرے محل میں زیادہ صلیبیں ہیں"۔

ہفتے کی شام کو پادریوں اور ملاؤں کے درمیان مناظروں کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔

مناظروں کے بعد (جن میں ہر جماعت فتح حاصل کرنے کا دعویٰ کرتی تھی) ایک عظیم مسلمان ملا اپنے ہاتھ میں قرآن پاک تھام کر آگ کی بھٹی میں کودنے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اس بات کا دعویٰ کرتا کہ وہ ایک ہولناک آزمائش کی ذمہ داری اٹھا رہا ہے اور اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا بشرطیکہ ان عیسائی پادریوں میں سے بھی ایک اپنی انجیل کے ساتھ ایسا کر کے دکھائے اور یہ کہ اس سے اس کے مذہب کی بالادستی ثابت ہو جائے گی۔ پادری' مذہب کے اس جیسے قابل گرفت طریق کار کو اختیار کرنے سے انکار کر دیتے' چنانچہ معاملے کو رفع دفع کر دیا جاتا۔ اکبر عیسائی مذہب کی تعلیمات سے اس قدر متاثر ہو گیا کہ اس نے ابوالفضل کو انجیل کا ترجمہ تیار کرنے کی ہدایت کی اور شہزادہ مراد (83) کو عیسایت کے اسباق لینے کا حکم دیا (84) مسلمانوں کے ابتدائی قاعدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○ کو اے نامی تو جیس و کرستو

(اے کہ تمہارے نام یسوع اور کرانسٹ ہیں) میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس کا مطلب ہے اے وہ کہ جس کا نام شان والا اور مبارک ہے۔ شیخ فیضی نے مذکورہ بالا شعر کو مکمل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کا اضافہ کر دیا۔

سبحانک لاسوا کا یا ہو (ہم تمہاری تعریف کرتے ہیں' اے خدا تمہارے سوا کوئی اور نہیں۔) (85)

پادریوں نے اپنے اور آگرہ میں رہائش پذیر پرتگیزی تاجروں اور باشندوں اور آگرہ کے مضافات میں آباد دیگر عیسائیوں کے استعمال کے لئے ایک چھوٹا سا گرجا تعمیر کرایا۔ خوش قسمتی سے ایک مشنری عیسائی ذوجیری کے مفصل بیان کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہ فتح پور میں اس عظیم بادشاہ کے دربار کی کارروائیوں کا ایک واضح تصور پیش کرتا ہے۔ وہاں ہمیں مطلع کیا گیا کہ اکبر اپنے مصاحبین کے بغیر اکیلا آیا ہے۔ اس نے اپنی پگڑی اتار دی اور نماز ادا کی اس کے بعد وہ پہلے عیسائیوں کے طریقہ کے مطابق جھکا اور پھر اپنے طریقہ یعنی ایرانی مسلمانوں کے انداز کے مطابق (کیونکہ وہ اس مذہب کی ظاہری باتوں سے چمٹا ہوا تھا) اور آخر میں بت پرستوں کے طریقہ کے مطابق جھکا۔ اس نے اپنے امراء کو مجبور کر دیا کہ وہ مشنریوں' ان کی تصاویر' کتابوں اور عبادات کا احترام کریں۔ ایک پرتگیزی عیسائی اس وقت فتح پور میں انتقال کر گیا۔ بادشاہ کی اجازت سے اس کے جنازہ کو عیسائیوں کے رواج کے مطابق فتح پور کی گلیوں میں سے بڑی دھوم دھام سے لے جایا گیا' مسلمان اور ہندو باشندے اس دھوم دھام سے بہت محظوظ ہوئے اور انہوں نے ان رسومات میں شرکت کی۔ پادریوں کو ایک شفاخانہ تعمیر کرنے کی اجازت بھی دے

دی گئی۔

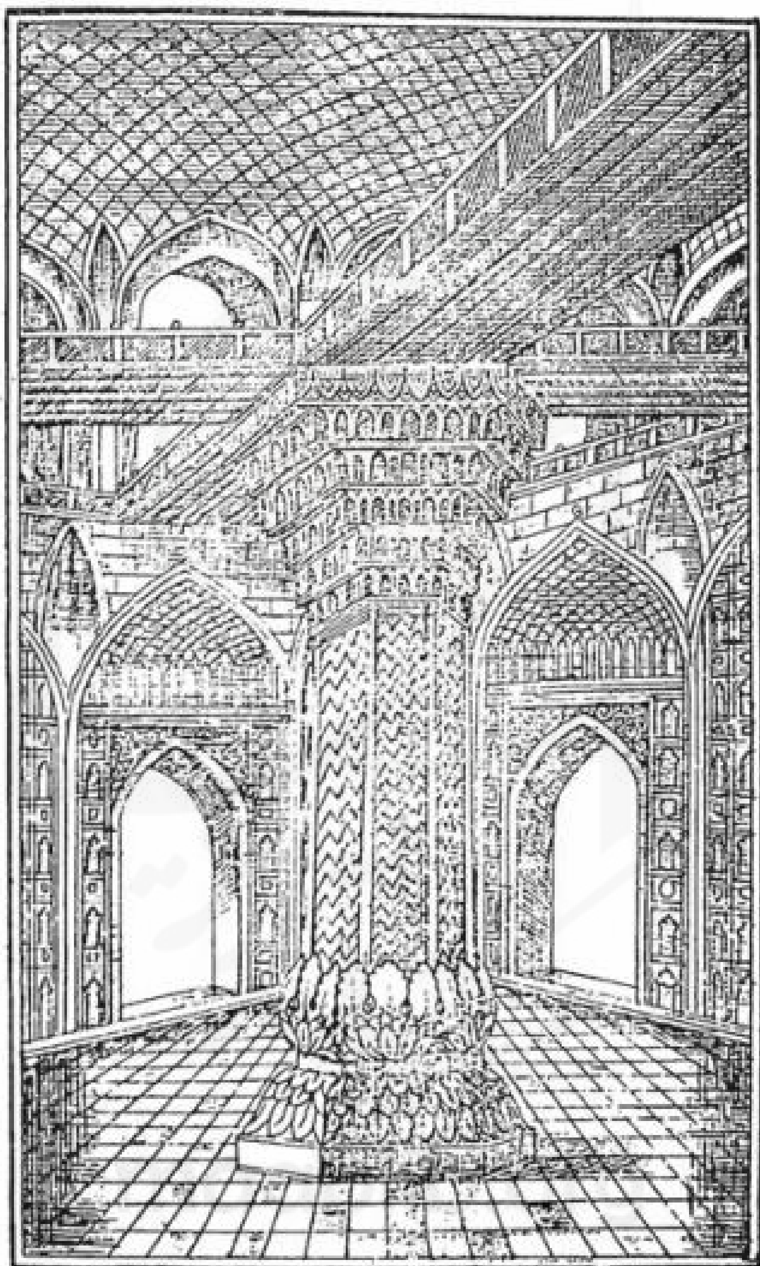
عیسائی پادریوں نے عیسائیت کی طرف بادشاہ کے رجحانات کا اندازہ لگاتے ہوئے اس پر زور دینا شروع کر دیا کہ اس کے لئے یہ بہت بہتر ہے کہ وہ رسمی طور پر عیسائیت اختیار کر کے دین میں ایک نئے سورما کی شان و شوکت حاصل کر لے: مگر اکبر غیر لچک پذیر تھا اس نے پادریوں کو یقین دلایا کہ وہ ان کے مذہب کے بارے میں اپنے دل میں بہت احترام رکھتا ہے اور یہ کہ ان کے گرجا اور اس کی متعدد تعلیمات کی بھی بہت تعظیم کرتا ہے' مگر ابھی تک وہ تثلیث کے اسرار کو نہیں سمجھ سکا اس نے انتہائی دکھ کے ساتھ یہ دریافت کیا ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا کا ایک انسان بیٹا تھا۔

اس نے دلیل پیش کی کہ بت پرست اپنے مذہب کو سچا خیال کرتے ہیں' اسی طرح مسلمان بھی اور عیسائی بھی اپنے مذاہب کو سچا کہتے ہیں' ہم کس مذہب پر یقین کریں اور کس کو رد کر دیں؟" عیسائی پادریوں کی وضاحتیں زود فہم اکبر پر کسی قسم کا تاثر مرتب کرنے میں ناکام ہو گئیں۔ ڈوجرچی نے بادشاہ کے غرور کا ماتم کیا ہے اور شکایت کی ہے کہ وہ کسی ایک آدھ جواب سے مطمئن نہیں ہوتا تھا بلکہ مزید تحقیقات شروع کر دیتا تھا۔

وہ کہتا ہے "دیگر متعدد ملحدوں کی طرح یہ اس بادشاہ کا گناہ صغیرہ ہے: وہ مذہب کی اطاعت میں کبھی بھی عقل کی مزاحمت نہیں کرتے' کیونکہ وہ کسی ایسی چیز کو سچا خیال نہیں کرتے جو ان کی فہم و فراست کے دائرہ کار میں نہیں آتی۔ اپنی سمجھ بوجھ کی پیمائش کے ساتھ وہ اس ذات بے پایاں کو جانچنے کی کوشش کرتے ہیں جو تمام انسانوں کی سمجھ سے بالاتر اور بالوراء ہے"۔ جب ایکواویوا نے ہندوستان کے تمام صوبہ جات میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے اس وقت فتح پور میں موجود تینوں عیسائی مبلغین کو اجازت دینے کی خاطر اکبر سے درخواست کی تو اس نے گول مول جواب میں کہا کہ یہ معاملہ قطعی طور پر خدا کے ہاتھ میں ہے' صرف وہ اکیلا ہی ان کی خواہشات کو پورا کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور یہ کہ وہ اپنی طرف سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا۔ دریں اثناء انوکھے پن کی دلچسپی ختم ہو گئی تو پادریوں پر کم توجہ دی جانے لگی' انہیں کسی درباری نے خفیہ طور پر یہ بتا دیا کہ انہیں تفریح طبع اور انوکھی شے سے زیادہ کسی اور مقصد کے لئے نہیں رکھا گیا تھا اور بادشاہ ان کی تعلیمات کو اختیار کرنے کا ہلکا سا بھی ارادہ نہیں رکھتا' تو وہ 1552ء میں ماسوائے ایکواویوا کے گوا کی طرف لوٹ گئے' بادشاہ اکبر نے ایکوا کو اس کے زبردست کمالات کے باعث روک لیا تھا۔ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اس کا احترام کرتے تھے' لہٰذا اس نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے بحث مباحثہ کو سہل بنانے کے لئے فارسی زبان

سیکھی' اس کا مقصد اکبر کا دل جیتنا تھا۔ مگر اس کو جب اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ بنجر زمین پر بیج بکھیرنے کی مشقت سے کچھ حاصل نہ ہو گا تو وہ بھی کچھ دیر بعد اپنے بھائی بندوں کے پیچھے گوا روانہ ہو گیا۔

طبقات اکبری کے مصنف مرزا نظام الدین احمد نے فتح پور سیکری کے دربار میں ادا کی جانے والی رسومات کے بارے میں ایک بیان درج کیا ہے۔ یہ ابو سعید مرزا کے پوتے مرزا سلیمان والی بدخشاں کی رجب 983 (1575ء) میں آمد کا موقع تھا' جو تیمور کی چھٹی پشت سے تھا۔ مصنف لکھتا ہے "جب وہ فتح پور سے بیس کوس کے فاصلے پر متھرا کے مقام پر پہنچا تو بادشاہ نے اس کا استقبال کرنے کے لئے متعدد امراء کو روانہ کیا۔ جب مرزا فتح پور سے پانچ کوس کے فاصلے پر پہنچا' تو اس کا استقبال کرنے کے لئے تمام امراء اور افسران کو روانہ کیا گیا۔ اور جب اس کے آخری مرحلہ سے روانہ ہونے کی خبر لائی گئی' تو بادشاہ بذات خود گھوڑے پر سوار ہو کر اس کا استقبال کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ فتح پور سے پانچ کوس کے فاصلہ تک سڑک کے دونوں کناروں پر مخمل اور زر بفت کی زین پوش اور طلائی و نقرئی زنجیروں سے مزین پانچ ہزار ہاتھیوں کی قطاریں لگا دی گئیں' ان کی گردنوں اور سونڈوں پر سفید اور سیاہ جھالریں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر دو ہاتھیوں کے درمیان ایک چھکڑا تھا' جس میں چیتے رکھے ہوئے تھے' ان کی گردنوں میں سنہری پٹے اور جسم پر بہترین کپڑے کی زین تھی۔ اس کے علاوہ بیل گاڑیاں بھی تھیں' جنہیں سنہری کشیدہ کاری سے مزین سربند پوش جانور کھینچ رہے تھے۔ جب سارے انتظامات مکمل ہو گئے تو بادشاہ انتہائی دھوم دھام اور شان و شوکت کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس کے پہنچنے پر مرزا فوراً نیچے اترا اور بادشاہ کی طرف دوڑا۔ مگر بادشاہ مرزا کی قابل احترام عمر کو دیکھتے ہوئے خود بھی گھوڑے سے نیچے اترا اور مرزا کو معمول کے مطابق رسومات اور قواعد و ضوابط ادا نہ کرنے دیئے۔ اس نے انتہائی اشتیاق سے اسے گلے لگا لیا اور اس کے بعد دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر مرزا کو اپنے دائیں ہاتھ کی طرف سوار کرایا۔ پانچ کوس کے تمام راستہ میں وہ اس کے حالات پوچھتا رہا اور محل پہنچنے پر اس نے اسے تخت پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ نوجوان شہزادے بھی وہاں موجود تھے۔ انہیں مرزا سے متعارف کرایا گیا' اور ایک بہت بڑی ضیافت کے بعد اس نے مرزا کو شاہی محل کے قریب ایک گھر بطور رہائش گاہ دے دیا۔ دریں اثناء حاکم پنجاب خان جہاں کے لئے احکامات جاری کئے گئے کہ وہ مرزا کی فتح پور سے بدخشاں واپسی پر اس کا ملک بازیاب کرا کے اسے اس پر بحال کرنے کے لئے 5000 سواروں کے ساتھ اس کے ہمراہ جائے اور اس کے بعد لاہور کی طرف لوٹ آئے۔



دیوان خاص (فتح پور سیکری)

دیوان خاص: دیوان خاص کا شمار انتہائی بے مثل عمارات میں ہوتا ہے۔ یہ مریم بی بی کے مکان کے شمال میں اور دیوان عام کے مغرب میں واقع ہے: بیرونی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو منزلہ عمارت ہے' جس کے ہر کونے پر ایک گنبد ہے۔ تاہم اندر داخل ہونے پر ہمارے اوپر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ یہ اصل میں ایک منزلہ عمارت ہے' جو فرش سے گنبد تک کھلی ہے: درمیان میں بالائی کھڑکیوں کی بلندی تک ایک عظیم الشان ستون ہے' جس کو کندہ کاری کے انتہائی نفیس کام سے مزین کیا گیا ہے۔ اس کا مثمن شکل کا چینا کٹہرے سے آراستہ ہے اور یہ بہترین فن سنگ تراشی کا ایک عظیم الشان سرمایہ ہے' یہ اس کے قطر سے تین گنا بڑا ہے۔ اس شہ نشین کے کونوں یا چاروں بغلی دروازوں کی جانب تقریباً دس فٹ لمبے چار سنگین پلوں کے بلند راستے ہیں' وہاں یہ ایک چوتھائی چکر کے ساتھ مل جاتے ہیں جس کا رابطہ پہلی منزل کے ساتھ سولہ زینوں کی سیڑھی کے ذریعے ہے۔ پرانے وقتوں میں درمیان میں رکھے گئے تخت پر ریشمی پارچاجات رکھے جاتے تھے اور اسے اطلس اور مخملی تکیوں سے آرام دہ بنایا گیا تھا اس پر اکبر بادشاہ بیٹھا کرتا تھا اور اس کے چاروں وزراء (خان خانان' بیربل' فیضی اور ابوالفضل) اپنے اپنے محکمہ جات کے لئے احکامات وصول کرنے کے لئے چاروں کونوں پہ کھڑا ہوا کرتے تھے۔

اس جگہ کا تعلق متعدد تاریخی واقعات سے ہے۔ یہیں پر اکبر کے دور میں سلطنت کے امراء' مذہبی' سماجی اور سیاسی موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تصنیف "منتخب التواریخ میں" دیوان خاص کے ایوان میں شیخ ابوالفضل اور اپنے درمیان ہونے والی ایک دلچسپ گفتگو کا ذکر کیا ہے۔ ملا ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا جبکہ ابوالفضل ملحد تھا۔ ملا لکھتا ہے:-

"مجھے یاد ہے' ان بحث مباحثوں کے ابتدائی دنوں میں اتفاق سے فتح پور کے دیوان خاص میں میری ملاقات شیخ ابوالفضل سے ہو گئی۔ اس نے کہا: میں دو وجوہات کی بناء پر تمام مصنفین پر اعتراض کرتا ہوں: پہلی یہ کہ جس طرح انہوں نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مفصل تفسیر لکھی ہے' اسی طرح انہوں نے اگلے پیغمبروں کی تاریخ تفصیل کے ساتھ (86) کیوں نہیں لکھی؟ میں نے جواب دیا کہ قصص الاولیاء میں مفصل بیانات دیئے گئے ہیں۔ اس پر اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا' نہیں وہ کتاب بہت مختصر ہے: انہیں چاہیے تھا کہ تفصیل کے ساتھ لکھتے۔ میں نے جوب میں کہا وقت گذرنے کے ساتھ صرف وہی نقادوں اور مورخین کے مشاہدہ میں آسکیں باقی ماندہ غیر مصدقہ رہیں۔ اس نے کہا یہ کوئی جواب نہیں ہے: اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا دوسرا یہ کہ کاریگروں کی کون سی ایسی قسم ہے جس کا ذکر تذکرۃ

الاولیاء اور نفحت الانس وغیرہ میں نہیں کیا گیا۔ آل رسول ﷺ نے کون سی تقصیر کی ہے، جس کی بناء پر ان میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا: یہ انتہائی حیران کن معاملہ ہے۔ (87) جس قدر بھی وقت درکار ہو اس موضوع پر کہا جاتا مگر سنتا کون؟ اس کے بعد میں نے دریافت کیا معلوم مذاہب میں آپ کس کو تسلیم کرنے میں زیادہ رجحان رکھتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: میری خواہش ہے کہ میں چند روز غیر یقینی اور الحاد کی وادی میں آوارہ گردی کروں۔ میں نے سختی سے جواب دیا اگر آپ مکمل طور پر شادی کے بندھن کی رکاوٹ کو دور کر دیں تو یہ بری چیز نہیں ہو گی، کیونکہ انہوں نے کہا ہے:-

برداشت غل شرع بتائیہ ایزدی   از گردن زمانہ علی ذکرہ السلام

ترجمہ:- "خدا کی مدد سے اس نے دنیا کی گردن سے قانون کی زنجیر اتار پھینکی ہے، اس کے ذکر پہ سلامتی ہو!

وہ مسکرایا اور چلا گیا۔

اس کے بعد بدایونی بیان کرتا ہے کہ ابوالفضل بادشاہ کی حمایت میں علماء کی مخالفت کرنے میں کس قدر دلیر ہو گیا تھا اور وہ اپنی دلیل کے مقابلہ میں نہ تو دلائل اور نہ ہی کوئی وجہ کو سننے کے لئے تیار ہوتا تھا، مصنف کہتا ہے: یہ درست کہا گیا ہے۔

یک عنایت قاضی بہ از ہزار گواہ

"قاضی کی ایک عنایت ہزار گواہوں سے بہتر ہے"

عبادت خانہ: دیوان خاص میں ایک خوبصورت بغلی بر آمدہ ہے، جسے عبادت خانہ کہا جاتا ہے۔ فتح پور سیکری میں بدایونی اور طبقات اکبری نے عبادت خانہ کے متعلق جو بیان لکھا ہے، کوئی دیگر عمارت اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ عبادت خانہ کو 1574ء میں تعمیر کیا گیا، یہاں پر عالم فاضل اور باکمال حضرات کا استقبال کیا جاتا تھا۔

پس ابوالفضل اکبر نامہ جلد سوئم میں دور حکومت کے 19 ویں برس کے واقعات (1574ء) سے متعلق اس کے بارے میں بیان کرتا ہے:-

"یہ چار ایوانوں پر مشتمل ہے، جس کے صحن میں دنیا کے ہر علاقے سے آنے والے ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں اور بادشاہ سلامت کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، جو انتہائی خوش طبعی کے ساتھ ان سے بات چیت کرتے، ان کو تحمل سے سنتے اور ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔ ہر شخص ان تک پہنچ سکتا ہے اور وہ بڑی آزادی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ چیتھڑوں اور خاک میں آلودہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص اور مخمل و ریشم کے بہترین لباس میں ملبوس اعلیٰ سے اعلیٰ انسان بھی

علماء کے اس اجتماع میں اپنے دل کا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ بادشاہ سلامت ایسے فاصلے پر بیٹھا کرتے ہیں' جہاں سے وہ تمام آدمیوں کو دیکھ سکیں اور جس شخص سے بات کرنی مقصود ہو اسے اپنے پاس بلا سکیں۔" یہاں پر چار اجتماعات منعقد ہوتے تھے۔ مشرقی ایوان میں سلطنت کے امراء' مغربی ایوان میں علماء کرام' شمالی ایوان میں صوفیائے کرام اور جنوبی ایوان میں فلسفی جمع ہوا کرتے تھے۔ مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ ہوتا اور مختلف مسائل حل کرلئے جاتے تھے۔ بعض اوقات پوری رات بحث مباحثہ میں صرف ہو جاتی۔ یہاں پر لوگ پوچھ گچھ اور تحقیق کے سوا کچھ نہیں کیا کرتے تھے۔ سائنس کے عمیق نکات' وحی کی باریکیوں' تاریخی نوادرات اور قدرت کے عجائبات پر بحث کی جاتی تھی۔ اکبر اس خیال پر کاربند تھا کہ اگر صحیح علم ہر کہیں سے تلاش کیا جا سکتا ہے تو پھر سچ کو کسی واحد مذہب یا عقیدے تک کیوں محدود کیا جائے; جس کا دیگر مذاہب انکار کریں ایک اس پر کیوں زور دے' ایک مذہب دوسرے پر بالادستی کا دعویٰ کیوں کرے جبکہ اسے یہ حق نہ دیا گیا ہو؟ (88) ان اجتماعات یا اجلاسوں کا انعقاد ابوالفضل کیا کرتا تھا۔ جس طرز پہ یہ منعقد کئے جاتے تھے بدایونی نے اس کے بارے میں بتایا ہے وہ لکھتا ہے: " ابوالفضل انتہائی دلیری کے ساتھ صدر' قاضی' حکیم الملک اور مخدوم الملک جیسے فاتر العقل ضعیف اشخاص کے ساتھ مذہبی معاملات پر جھگڑا کرتا تھا اور ان کو بے عزت کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا' بادشاہ اس پر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ ان اشخاص نے میر بخشی آصف خاں کے ذریعے خفیہ طور پر ابوالفضل کو پیغامات بھیجے کہ وہ ہر وقت ان کے ساتھ اس قسم کا رویہ کیوں اختیار کرتا ہے۔ اس نے جواب بھجوایا ——

مانو کر مردی ایم نوکر بار انجان ز ستیم

ترجمہ:- میں ایک آدمی کا نوکر ہوں کسی بینگن کا نہیں۔

مصنف لکھتا ہے: "اپنی ذہانت' والد کے تعاون' خلیفہ وقت کی حمایت اور اپنی خوش قسمتی کے باعث وہ ایک مختصر سے وقت میں ان سب کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیتا تھا۔ ماسوائے حکیم ابوالفتح اور ملا محمد یزدی کے' بحث و مباحثہ میں کوئی عالم دین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

اسی طرح کے ایک اجلاس میں بادشاہ نے وہاں پر موجود لوگوں سے کہا کہ ان میں سے ہر ایک اپنی سمجھ کے مطابق اس دور کے عقل مند ترین شخص کا نام بتائے اور اس بات کا اشارہ دے کر وہ بادشاہوں کو شمار نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس پر حکیم حمام نے اپنا نام اور ابوالفضل نے اپنے باپ شیخ مبارک کا نام بتایا۔ ان اجلاسوں میں بادشاہ کی آمد انعام و اکرام اور تحفے تحائف کی تقسیم کے لئے مواقع فراہم کر دیتی تھی' لہٰذا مشکل ہی سے کوئی مہمان

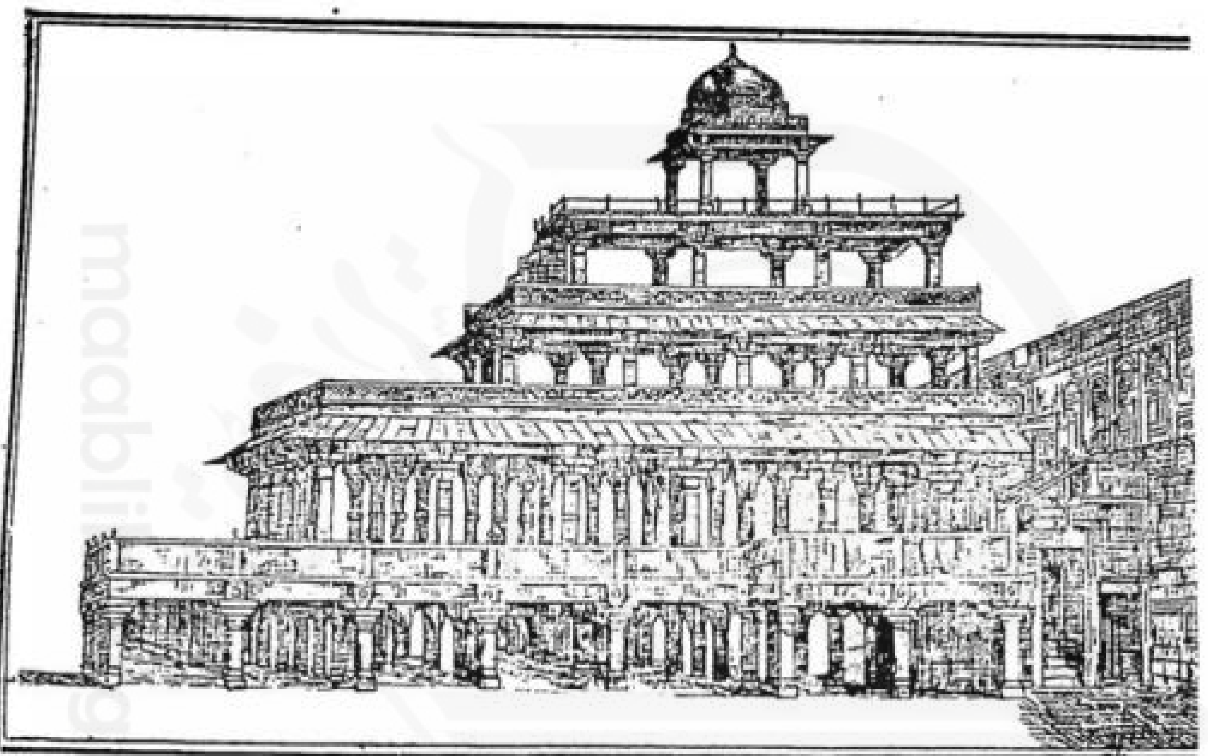
وہاں سے ہاتھ خالی لے کر جاتا۔ یہ اجلاس عموماً" جمعہ کی رات اور مقدس دنوں کی رات کو منعقد کئے جاتے تھے۔" (89)

بدایونی کے مطابق سال 983 (1575ء) کے دوران بادشاہ کے حکم سے متعدد عبادت خانے تعمیر کئے گئے۔ بادشاہ تمام راتیں عبادت و ریاضت میں گزارتا; وہ یاہو اور یاہادی کے ناموں کا ورد کرتا رہتا۔ وہ کئی دفعہ صبح کے وقت ایک الگ تھلگ محل کے قریب رکھے گئے ایک پرانی عمارت کے ہموار پتھر پر بیٹھ کر غور و خوض کیا کرتا تھا' اس نے اپنے سر کو سینے پر جھکایا ہوتا' اس طرح وہ صبح سویرے کی برکت کو اکٹھا کیا کرتا تھا۔

بیراگی کا ڈیرا: اسی صحن میں ایک منفرد عمارت پہ مشتمل قبہ تھا' جہاں بردبار اکبر نے ایک بیراگی فقیر کو ٹھہرایا ہوا تھا۔ یہ نوکدار چھتری کی شکل کا ایک گنبد ہے' جس پر بدھ مت کی طرز کے گل بوٹے اور کندہ کاری کی گئی ہے' اس کو پتھر کے چار ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے' جن کے کونوں پر پیچ دار محرابیں ہیں۔ گرچہ یہ قبہ ہندوانہ طرز کا ہے' مگر اس کے باوجود اس مقام کی عام طرز تعمیر سے جدا نہیں ہے' جو اسلامی طرز تعمیر کا ایک عظیم الشان نمونہ ہے۔ چونکہ اکبر تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتتا تھا اور خاص طور پر اس کا رجحان ہندوؤں کی طرف تھا' اس لئے دربار شاہی میں ایک ہندو پروہت کی موجودگی بے جا نہیں تھی۔

آنکھ مچولی گھر: دیوان خاص کے قریب انتہائی عجیب و غریب نقشہ اور طرز تعمیر کی ایک پر پیچ عمارت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں بادشاہ حرم شاہی کی بیگمات کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا۔ یہ جگہ ایک مرکزی کمرہ پر مشتمل ہے' جس کے جنوب اور شمال میں مزید دو کمرے ہیں۔ ایک ڈھلوان کے اوپر ایک برآمدہ اور اس کے اردگرد پہرے داروں کے لئے حجرے ہیں۔ یہاں پر آہنی قبضوں کے نشانات ہیں' جن سے پتہ چلتا ہے کہ دروازے پتھر کے تھے' جنہیں بھاری بھرکم تالوں سے بند کیا گیا تھا۔ جدید دور کے محققین نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسے حرم سرا کے عقب میں دیوان خاص کے بالکل قریب اس لئے تعمیر کیا گیا تھا کہ حقیقت میں یہ شاہی بیت المال تھا' جہاں غالباً سلطنت کی قیمتی اشیاء اور ساز و سامان کو حفاظت کی خاطر رکھا جاتا تھا۔

پنچ محل: عیسائی ملکہ کے نام سے مشہور محل کے قریب مخروطی شکل کی ایک انتہائی انوکھی عمارت ہے' جو ہر طرف سے کھلی ہے' پانچ منزلہ ستونوں والی عمارت کے چوکور شکل کے یکے بعد دیگرے کھلے برآمدے ہیں' جو ایک دوسرے کے اوپر سے باہر نکلے ہوئے ہیں یہ انتہائی عمدہ کندہ کاری سے مزین ستونوں پر استوار ہیں۔ ہر منزل کی پیمائش یکے بعد دیگرے کم ہوتی جاتی

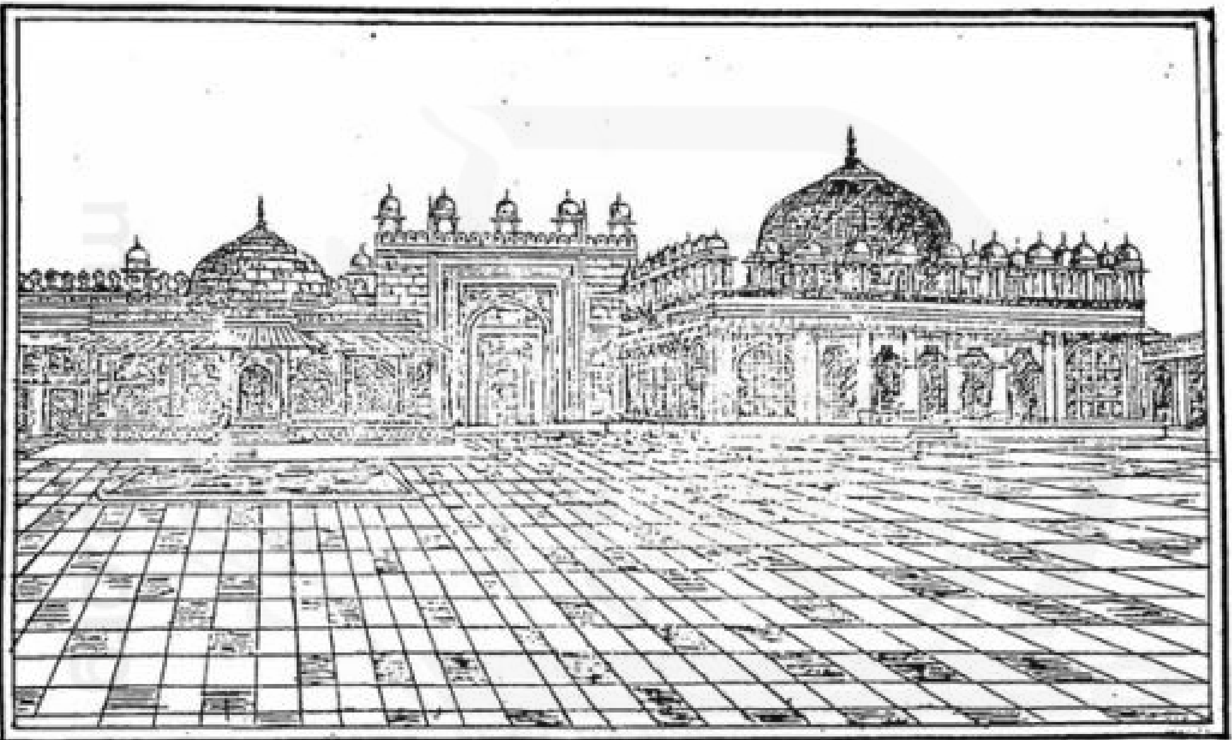


شكل

ہے حتیٰ کہ سب سے اوپر والی پر پہنچ جاتے ہیں' جو بہت بڑے گنبد پر مشتمل ہے اور اسے ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ سب سے نیچے والی منزل کے 56 ستون انتہائی خوبصورت طرز تعمیر کے حامل ہیں۔ یہ ستون فن سنگ تراشی میں انتہائی دلچسپ نمونے کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک پر ہاتھیوں کے ایک جوڑے کی شبیہہ کندہ ہے' جو ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے سونڈیں بھڑائے ہوئے کھڑے ہیں' دوسرے پر ایک آدمی کی شبیہہ ہے' جسے ایک درخت سے پھل توڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پہلی منزل کے ستون 35 اس سے اگلی کے چندرہ اس سے اوپر والی کے آٹھ ہیں' جبکہ سب سے اوپر والی صرف چار ستونوں پر مشتمل ہے۔ ان ستونوں پر کندہ کاری اس قدر عمدگی اور بہترین طریقے سے کی گئی ہے کہ یہ انتہائی اعلیٰ ذوق اور مہارت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ بعد میں اکثر فن سنگ تراشی کے نوادرات کے طور پر ان کی تصویر کشی کی جاتی رہی ہے۔

اس انوکھی عمارت کی ابتداء اور مقصد کے متعلق آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اشخاص کا خیال ہے کہ اسے مقررہ اوقات میں اذان دینے کی خاطر موذن کے لئے بنوایا گیا تھا۔ دوسروں کا یہ خیال ہے کہ اسے شہریوں کے لئے درباری فرائض کے اوقات کا اعلان کرنے کے لئے انتہائی اونچی جگہ پر ایک بہت بڑی گھنٹی لٹکانے کی خاطر بنوایا گیا تھا۔ اور دیگر افراد یہ توجیہہ بیان کرتے ہیں کہ اس جگہ سے اکبر اردگرد کے علاقہ کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے تفریح اور کھیل تماشہ کے لئے بنوایا گیا تھا' جہاں بادشاہ بلند ترین مقام پر بیٹھ کر گرمیوں کی راتوں میں تازہ ہوا اور چاندنی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ اس کے نیچے حرم سرا کی خواتین اپنی نشستوں پر براجمان ہوتیں' غالباً تازہ ہوا کے داخلہ کے لئے اور اردگرد کے علاقہ و زنان خانہ کے مکمل نظارہ کی خاطر محرابوں پر جالی دار پردے لٹکا دیئے جاتے تھے۔ پنج محل نے اپنی لطیف خوبصورتی اور عالیشان وضع قطع کے باعث خاص طور پر حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کی توجہ حاصل کی ہے' چنانچہ لارڈ میو کی صوبیداری کے دوران ایک بہت بڑی لاگت سے اس کی مرمت کرائی گئی اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس کے زیبائشی کام کو بحال کیا گیا۔

پچیسی کا تختہ: پنج محل کے شمال مشرقی جانب پتھر کے ایک وسیع و عریض فرش پر شطرنج کا ایک عظیم الشان تختہ بنا ہوا ہے' جس پر پچیسی کے نام سے مشہور کھیل کھیلا جاتا تھا۔ اس تختہ کو پتھر کے فرش پر کندہ کیا گیا ہے' جو عموعی پیمائش کے اتنے بڑے چوکور خانوں پر مشتمل ہے کہ ایک آدمی کے بیٹھنے کے لئے کافی ہے۔ گائیڈ کہتے ہیں کہ مختلف رنگوں کے خوبصورت ملبوسات میں ملبوس عورتیں کھیل میں اپنی سمتوں کی نشاندہی کرتی تھیں۔ یہ تختہ قلعہ آگرہ کی طرز کا ہے مگر



حضرت شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ (بیرونی منظر)

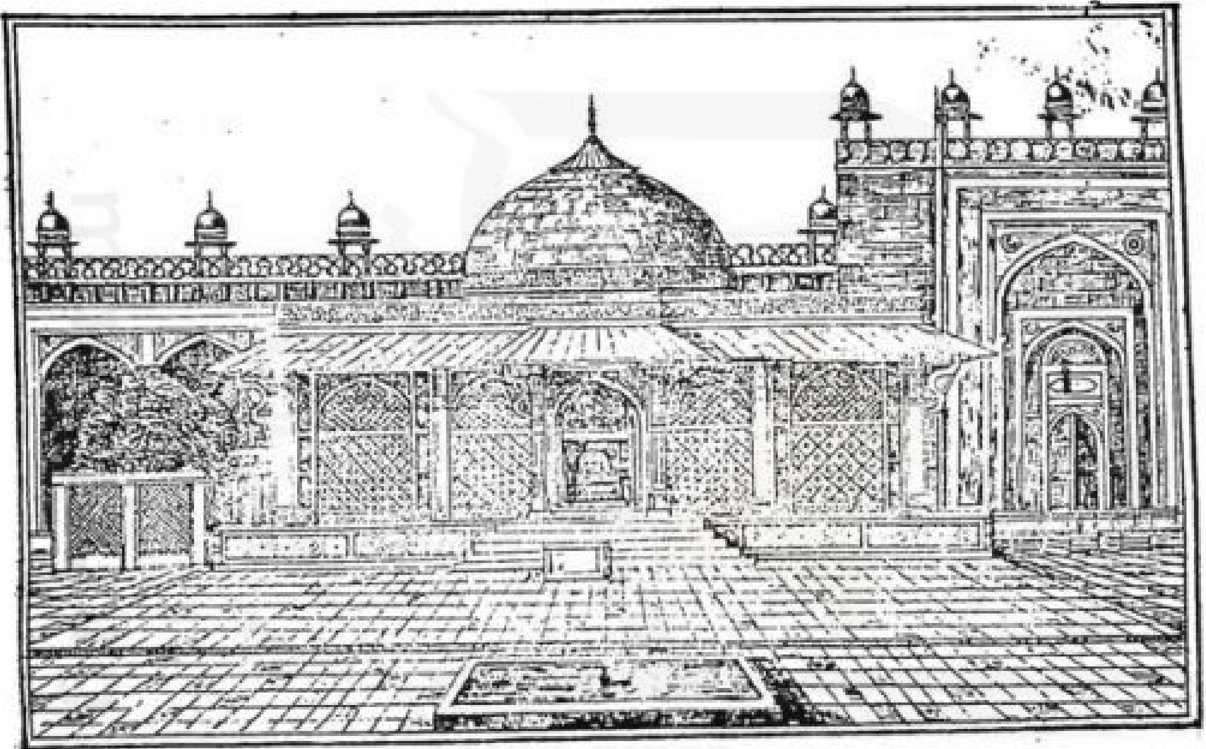
اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ آگرہ میں اسے سنگ مرمر سے اور یہاں پر سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے بچپسی تختہ کے بالکل نزدیک سنگ سرخ کا ایک چھوٹا سا تخت ہے جس پر کھیل کے پانسے پھینکے جاتے تھے۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ: مگران عمارات میں سب سے خوبصورت اور حقیقت میں اس مقام کی سرتاج عمارت صوفی بزرگ شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ ہے' جن کی کرامات پر اعتماد کر کے اکبر نے اس جگہ پر ایک بہت بڑے شہر کی بنیاد رکھی اور اسے شاہی محلوں' باغات اور دیگر سرکاری عمارات سے آراستہ کر دیا۔ یہ شاہی محلات کی جنوب مغربی جانب واقع ہے اور ان دیگر عمارات کے وسط میں ہے جو بادشاہ کے زیر اہتمام بتدریج ابھر کر سامنے آئیں۔

شیخ بہاؤ الدینؒ کے صاحبزادے شیخ سلیمؒ پنجاب کے ضلع منٹگمری میں پاک پتن کے مشہور' صوفی بزرگ حضرت شیخ فرید شکر گنجؒ کی اولاد میں سے تھے۔ وہ ہمیشہ روزے سے ہوتے اور حج کی ادائیگی کے لئے تین مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ ایک فقیر کی شکل میں پورے ہندوستان کا سفر کرنے کے بعد وہ سیکری کے قرب و جوار میں آ گئے' جو اس وقت ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اس لئے انہوں نے پہاڑیوں کے اردگرد پھیلے ہوئے بے آباد اور جنگلی جانوروں سے بھرے ہوئے جنگل میں ڈیرا لگا لیا۔ یہ مقام الگ تھلگ اور دور افتادہ ہونے کے باعث ان کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ انہوں نے یہاں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی: اور جنگلی سرکنڈوں اور حتی المقدور جمع کی گئی ٹہنیوں اور پتوں سے انہوں نے ایک پہاڑی پر ایک سایہ دار درخت کے نیچے جھونپڑی بنائی۔ اس الگ تھلگ کٹیا میں انہوں نے اپنے دن اور رات عبادت و ریاضت میں بسر کئے:

"عبادت ان کا کام' تعریف و توصیف ان کی خوشی تھی"

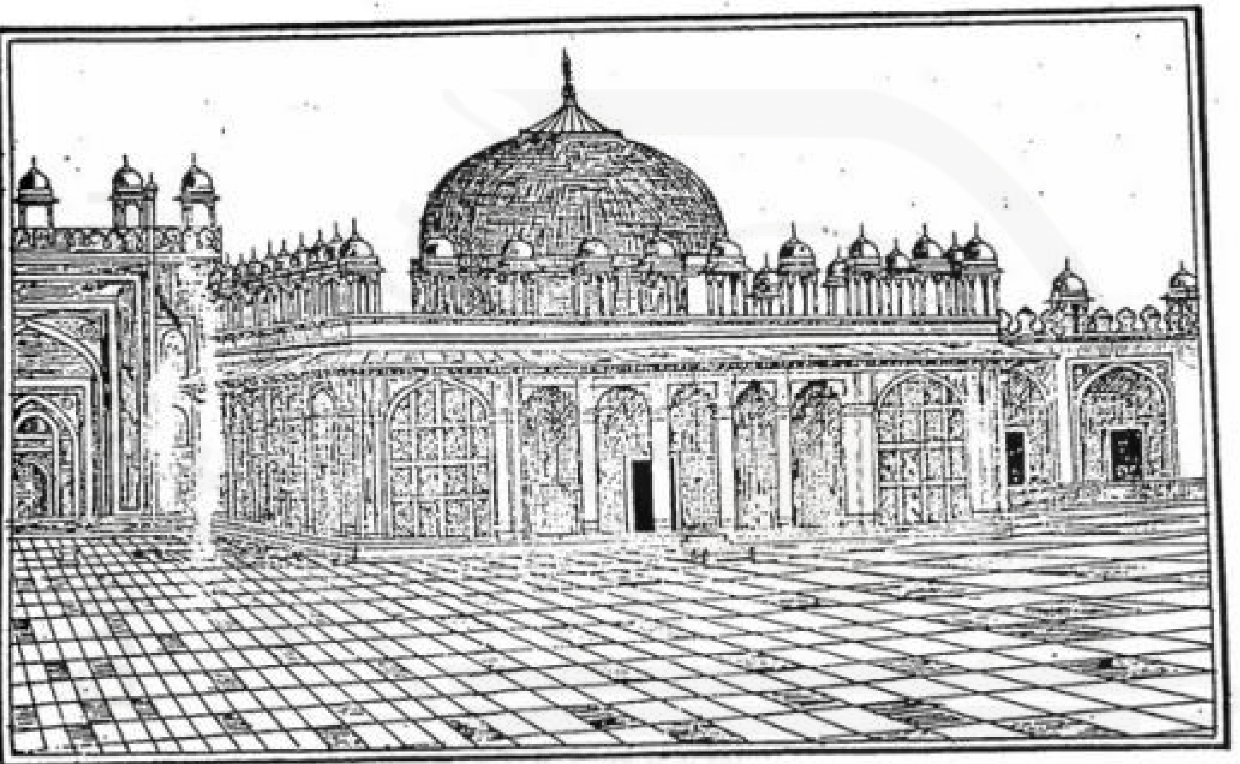
ان کا بچھونا تنکوں اور سرکنڈوں کا اور تکیہ جھاڑیوں اور کنکروں کا تھا۔ اکبر کے پہلے بچے شیر خوارگی کے دوران فوت ہو جاتے تھے اس لئے وہ کافی عرصہ سے ایک بیٹے سے محروم تھا۔ وہ اس بات سے واقف تھا کہ اس کے باپ دادا کی محنت اور فہم و فراست کے ذریعے جس سلطنت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور جسے اس نے بڑی محنت سے مجتمع کیا ہے' اگر اس کے ہاں بیٹا پیدا نہ ہوا تو یہ اجنبیوں کے ہاتھ لگ جائے گی اور اس کا خاندان بھی ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ اسے کسی فقیر اور متقی بزرگ کی دعاؤں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے اس بات پر کامل یقین تھا کہ فقیر خدا کے نزدیک ہوتا ہے اور اس کے توسط سے اسے زندگی کا مقصد یعنی تخت کا وارث مل سکتا ہے۔ اس نے اپنے مشیروں کو اپنی ذہنی پریشانی سے آگاہ کیا تو انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ اسے شیخ



حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ

سلیمؒ کی روحانی مدد حاصل کرنا چاہئے' ان کا خیال تھا کہ انہیں سے اسے گوہر مقصود حاصل ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے ان کے مشورہ پر عمل کیا اس کے نتیجہ میں سلیم کی پیدائش ہوئی: اس کے بعد اکبر ہمیشہ شیخؒ کا احترام کرتا رہا۔ ان کے صاحبزادوں اور دیگر قریبی عزیزوں کو سلطنت کے اعلیٰ اعزازات پر فائز کیا گیا۔ جب شیخؒ کا انتقال ہوا تو اکبر نے ان کی قبر پر ایک مقبرہ تعمیر کرایا' جو شان و شوکت اور خوبصورتی میں ہندوستان بھر میں اسی قسم کی چند عمارات سے سبقت لے گیا ہے۔

مشرق کی جانب ایک شاندار دروازہ 366 X 433 فٹ کے سنگ سرخ کے فرش سے آراستہ ایک وسیع و عریض احاطہ کی طرف کھلتا ہے' اس کے چاروں کونوں میں بلند و بالا اور عالی شان ستونوں کی قطاریں ہیں' جو 50 فٹ بلند محرابی کمروں کے ایک برآمدہ کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ یہ سب بھی سنگ سرخ سے بنائے گئے ہیں۔ شمالی کونے کی طرف بڑھیں تو وہاں صوفی بزرگ کی قبر ہے' جو انتہائی شاندار عمارت ہے اسے مکمل طور پر خالص سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے اس پر انتہائی چمکدار اور عمدہ کندہ کاری کی گئی ہے۔ قبر ایک چوکور بنیاد سے بلند ہوئی ہے اور خربوزے کی شکل کے ایک انتہائی خوبصورت اور شاندار گنبد پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد تراشیدہ پتھر کا ایک برآمدہ ہے' جسے رنگ برنگی شکل اور طرز کی پیچیدہ بغلی محرابوں نے سہارا دے رکھا ہے اور وہ سفید سنگ مرمر کے مضبوط ستونوں سے باہر نکلا ہوا ہے۔ چھجے پر گل لالہ کی شکل کے سوراخوں کا حاشیہ ہے۔ شیخؒ کی قبر کے تعویذ کے چاروں طرف لگی ہوئی سنگ مرمر کی جالی اس قدر خوبصورت ہے اور اسے اس قدر بہترین انداز میں بنایا گیا ہے کہ دور سے دیکھنے پر یہ بہترین ریشمی کپڑے پر گوٹہ کناری کا کام معلوم ہوتا ہے۔ جب ہز رائل ہائینس پرنس آف ویلز نے 1876ء میں اس مقبرے پہ حاضری دی' تو وہ خاص طور پر اس کی پاکیزہ خوبصورتی سے مبہوت ہو گئے۔ برآمدے میں ایک اندرونی کمرہ ہے۔ جس کی دیواریں سنگ مرمر کی ہیں' فرش سے چار فٹ بلندی تک ان پہ عقیق' سیپ اور سنگ یشب کی منبت کاری کی گئی ہے' اس نقطہ سے اوپر دیواروں کو انتہائی چمکدار استرکاری سے مزین کیا گیا ہے اور سنگ سرخ سے تختہ بندی کی گئی ہے' فرش سنگ یشب کا ہے۔ جس پر سنگ مرمر میں سے مختلف رنگوں اور شکلوں کے پھولوں کو خوبصورتی سے تراشا گیا ہے اور اس کے دروازے آبنوس کی مضبوط لکڑی کے ہیں۔ شیخؒ کی قبر خالص سفید سنگ مرمر کی ہے اس کے اردگرد اس پتھر کی ایک جالی ہے' اسے زربفت کی ایک قیمتی چادر سے ڈھانپا گیا ہے' اس کے اوپر مستطیل شکل کی ایک چھتری ہے جس کو چار نازک ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے ہر ایک پر سیپ کا چھلکا چڑھا ہوا ہے جس پر جیومیٹری کی مختلف اشکال کندہ ہیں۔ شمال کی طرف خواتین اور بچوں کی قبریں ہیں: اسی طرف شیخؒ



نواب اسلام خان کا مرقد

کے مزار کے عقب میں شیخ کے پوتے اسلام خاں "کا ایک بہت بڑا مقبرہ ہے' جہانگیر کے دور میں وہ حاکم بنگال تھے۔

اسلام خاں" کا مزار: اس پوری عمارت کا نہایت خوشگوار تاثر ہے اور یہ مقبرہ اپنے نقشہ کی شان و شوکت کے علاوہ اپنے کام کی دلکشی کے باعث اسی قسم کی دیگر عمارات میں بے مثال دکھائی دیتا ہے۔ درحقیقت اس کا شمار ہندوستان کے فن تعمیر کے انتہائی بہترین اور مکمل نمونوں میں ہوتا ہے۔ اس کو اصل میں اکبر نے سنگ سرخ سے تعمیر کرایا تھا اور قبر کے اردگرد سنگ مرمر کی جالی بعد میں شہنشاہ جہانگیر نے تعمیر کرائی تھی' جو اس عمارت کا سب سے بہترین زیبائشی کام ہے۔ حالانکہ یہ مزار تین سو برس سے زائد پرانا ہے مگر اس کے باوجود بہترین محفوظ حالت میں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے منتظمین نے اس پر بہت زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ اس صوفی بزرگ کی قبر کے گرد سنگ مرمر کی جالی پر ہندو اور مسلمان بانجھ عورتیں ڈوریوں یا کپڑے کی کترنوں کی گانٹھیں باندھتی ہیں اور اگر ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو جائے (خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بزرگ خدا کی مرضی سے عطا کرتے ہیں) تو منت کے طور پر روپے پیسہ مٹھائی یا روٹی کی صورت میں نذرانہ پیش کرتی ہیں۔ سکندرا میں اکبر کے مزار پر بھی اسی طرح کے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں۔

درگاہ کے دروازے پر درج مندرجہ ذیل عبارت شیخ کی تاریخ وفات کا قطعہ پیش کرتی ہے:

مغیث ملت و پیر طریق شیخ سلیم
کہ در کرامت و قربت جنید و میفوزست
منورست از شمع خانوادہ چشت
فرید گنج شکر را خلف ترین پورست
دو بین مباش زخود فانی و بحق باقی
کہ سال رحلتش اندر زمانہ مشہورست

"مغیث ملت و پیر طریقت شیخ سلیم" جو جنید اور میفور کی طرح خدا کے نزدیک ہیں' آپ کے دم سے خانوادہ چشت کا چراغ روشن ہے۔ چونکہ آپ حضرت فریدالدین گنج شکر" کے منتخب ترین خلف ہیں۔ شرک سے باز آ خود کو فراموش کردے اور حق واصل ہو جا۔ مذکورہ بالا مشہور زمانہ شعر ہے جس سے ان کی تاریخ وفات کا پتہ چلتا ہے۔

اگر محاورہ "زخود فانی و بحق باقی" کے اعداد میں سے 2 کا ہندسہ نکال دیا جائے تو باقی 979 بچے گا۔ جس سے سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ (1571ء)

بی بی زینب کا مزار: مقبرہ کے مغرب میں ایک خوبصورت محرابی دروازہ چار دیواری کے ایک احاطہ کی طرف کھلتا ہے' جس میں شیخ سلیم چشتیؒ کی پوتی بی بی زینبؒ کا مزار ہے' قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے اور اس پر مندرجہ ذیل مادۂ تاریخ درج ہے:-

چو رحلت کرد این عصمت پناہی
فلک جیب شکیبائی دریدہ
بسال انتقالش گفت ہاتف
بفردوس بریں بیشک رسیدہ

ترجمہ:- "جب باعصمت بی بی نے اس جہاں سے رحلت فرمائی تو آسمان نے غم کے ہاتھوں مجبور ہو کر صبر کا دامن چاک کر ڈالا' ایک غیبی آواز نے ان کے انتقال کے سال کے بارے میں کہا' بے شک وہ فردوس بریں میں داخل ہو گئی ہیں"۔

حاجی حسین کا مزار: مذکورہ بالا مزار کے نزدیک حضرت شیخ سلیمؒ کے خلیفہ اور جانشین حاجی حسین کا مزار ہے۔ مزار کے دروازہ پر مندرجہ ذیل مادۂ تاریخ درج ہے:-

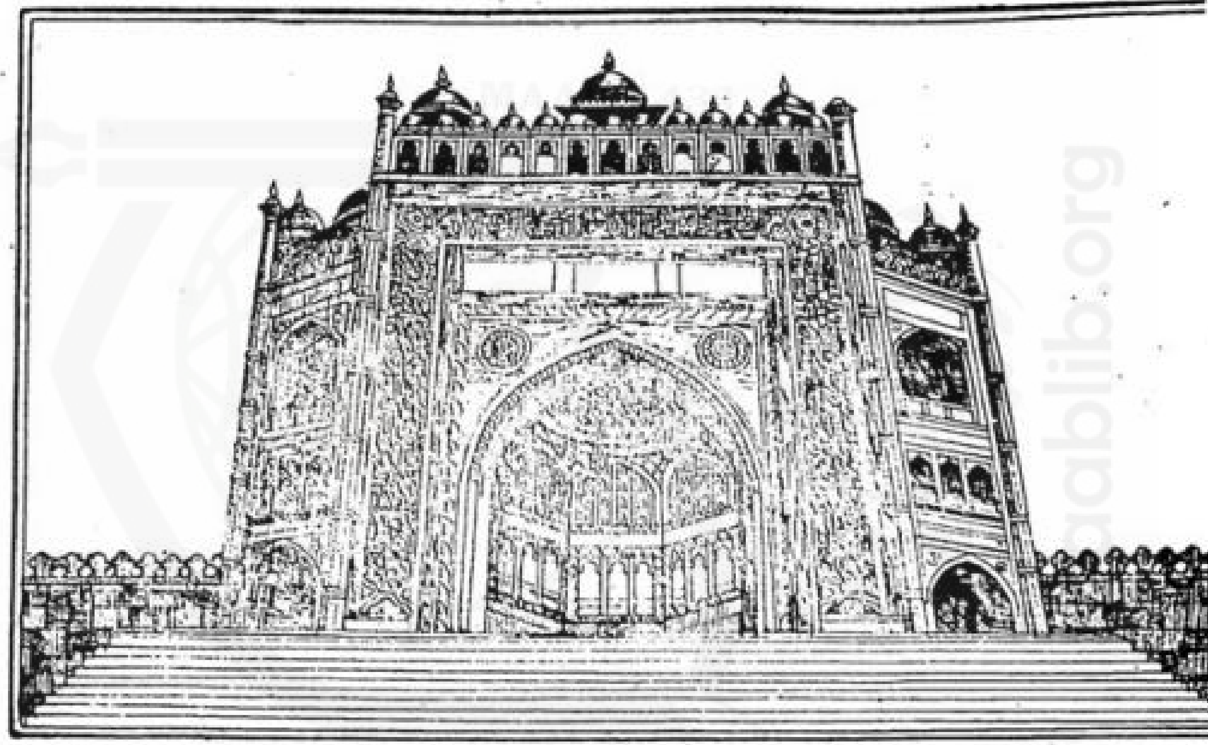
شیخ امیر قافلہ حاجی حسین آنکہ
بودش تمتع نج و عمر جاوداں
چون درصفا و مروہ عمرش نماند سعی
رحمت کشید جانب مقصود راعناں
سال وصال اہل مناسک رقم زوند
بہر طواف کعبہ مقصود شد بجان

سنہ 1000ہجری

ترجمہ:- "شیخ امیر قافلہ حاجی حسین' جنہیں نج (90) ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور عمر جاوداں سے سرفراز ہوئے' جب صفا اور مروہ میں ان کی دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہوا' تو رحمت خداوندی ان کے قلب کی طرف متوجہ ہوئی' اہل مناسک نے ان کے سال وصال کے لئے لکھا: وہ "خدا کے گھر حج ادا کرنے چلے گئے ہیں"۔

مذکورہ بالا سے 1000 ہجری (1594ء) کا مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے' جو کہ ان کی تاریخ وفات ہے۔

بلند دروازہ: مگر ان سب عمارات میں سب سے زیادہ عظیم الشان' دلکش اور انوکھی عمارت "



بلند دروازه

"بلند دروازہ" ہے۔ ایک مصنف کے مطابق اس کا شمار دنیا کے بلند ترین اور انتہائی شاہانہ دروازوں میں ہوتا ہے۔ فرگوسن اسے ہندوستان کی سب سے عمدہ عمارت کہتا ہے۔ یہ بلند و بالا زینوں پر تعمیر کیا گیا ہے اور خانقاہ کے جنوب میں فصیل کے سینہ پر 130 فٹ بلندی پر استادہ ہے۔ یہ ایک انتہائی جاذب نظر اور خوبصورت عمارت ہے' جس کے اوپر مخروطی برجیاں اور مینار ہیں: حالانکہ یہ بھاری بھر کم ہے مگر اس کے تناسب کی یکسانیت اور وضع قطع کی رفعت اس قدر زیادہ ہے کہ یہ مشاہد کو اپنی شان و شوکت اور شاہانہ حسن و جمال سے متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ دروازے کے کناروں پر زرد رنگ کے پتھر میں کندہ کاری کی گئی ہے اور پتھر میں سے تراشے گئے مختلف اشکال کے پھولوں کو انتہائی خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا ہے۔ 120 زینوں پر مشتمل سیڑھی چوٹی تک جاتی ہے' جہاں سے 25 میل دور تاج محل اور قلعہ بھرت پور کی جھلک کے علاوہ اردگرد کے علاقہ کا شاندار نظارہ حاصل ہوتا ہے۔ اس بھاری بھر کم دروازہ کی عظیم الشان شان و شوکت کے سامنے وہ عمارات ننھی منی معلوم ہوتی ہے جن کے ساتھ اب یہ وابستہ ہے: مگر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ عمارت اب اصلی نقشے کا حصہ نہیں رہی۔ بلند دروازے کو خاندیس میں اکبر کی زیر قیادت شاہی افواج کی فتح کی یادگار کے طور پر باب الفتح کی حیثیت سے تعمیر کیا گیا اور اسے خانقاہ اور مسجد کے کئی سال بعد بنوایا گیا۔ جب آپ مقبرہ میں داخل ہوں تو مقدس احاطہ کی دائیں جانب سنگ خارا کی دیوار پر ابھرے ہوئے الفاظ میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

مشرقی دیوار پر درج عبارت

حضرت شہنشاہ فلک بارگاہ ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بعد فتح ملک دکن و دندیس کہ سابقہ مسمی بہ خاندیس بود در سنہ 36 الٰہی مطابق سنہ 1010 ہجری بفتح پور رسیدہ عزیمت آگرہ فرمودند

تا نام زمین و آسمان ست

تا نقش وجود در جہان ست

نامش بہ سپہر ہم نشین باد

ذاتش بجہان ابد قرین باد

وقال عیسیٰ علیہ السلام ——— الدنیا قنطرۃ فاعبروہا ولا تعمروہا من تامل عیش غدا تامل عیش ابدا و تیلت الدنیا ساعۃ فجعلہا طاعۃ بقیۃ العمر لا قیمت لہا

ترجمہ:۔ حضرت شہنشاہ فلک بارگاہ ظل الٰہی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ 46 ویں الٰہی سال بمطابق 1010 میں دکن اور دندیس (پہلے خاندیس کے نام سے مشہور) کے ملک کو فتح کرنے کے بعد فتح

پور پہنچے اور پھر آگرہ روانہ ہو گئے۔

جب تک زمین و آسمان قائم رہیں'
جب تک ہستی کا نام و نشان اس کرہ ارض پر رہے'
تب تک بادشاہ سلامت کا نام آسمان کے نام کے برابر رہے
اور وہ اس وقت تک زندہ رہیں جب تک دنیا قائم رہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا دنیا ایک پل ہے' اس کے اوپر سے گزر جاؤ مگر اس پر گھر نہ بناؤ' جو کوئی روز جزا کی مصیبتوں پر غور کر لیتا ہے اسے دائمی خوشی حاصل ہو جاتی ہے۔

دنیاوی خوشیاں عارضی ہیں: اپنی زندگی کو پھر عبادت و ریاضت میں گزارو اور یاد رکھو کہ اس کے بعد جو کچھ بھی بچتا ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

مغربی دیوار پر درج عبارت کچھ اس طرح ہے

من قام فی الصلوة و لیس معه قلبه فلا یزداد من الله الا بعدا۔ خیر المال ما انفق فی سبیل الله

بعم الدنیا بالآخرة ربح الفقر ملوک۔ لیس فیها محاسبة نامی چه شد اگر تو تخت نگاه کردی و زقصور مثلا بنا کردی خوبی جهان بصورت آئینه مثل خود نگیر ... بر کردی قائله و کاتبه محمد معصوم نامی بن سید صفا الترمذی الحسینی البکری مسکنا النسبت الی سید شیرین بابا حسن ابدال سبزواری مولدا ...

ترجمہ:- جو شخص نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور اس کا دل اس میں نہیں ہوتا تو حقیقت میں اسے خدا کا قرب حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ خود کو اس سے دور کر لیتا ہے۔ تمہارا بہترین سرمایہ وہ ہے جسے تم خدا کے نام پر دیتے ہو۔ تمہارا بہترین کاروبار یہ ہے کہ اس دنیا کو اگلے جہان کے لئے بیچ دو' جو تمہیں فائدہ دے گا۔ تقویٰ ایک ایسی دنیا ہے جس میں کسی چیز کا کوئی حساب نہیں ہے۔

اگر تم نے ایک تخت بنایا ہے اور سونے کے بنے ہوئے محل میں پناہ حاصل کی ہے تو کیا حاصل کیا ہے؟ اس دنیا کی خوبصورتی ایک آئینہ کی مانند ہے اس میں اپنا عکس دیکھنے سے زیادہ اس کو اپنے پاس مت رکھو۔

ساکن بھکر سید صفا ترمذی کے بیٹے محمد معصوم (91) التخلص نامی نے فرمایا اور تحریر کیا جو بابا حسن ابدال سبزواری ساکن قندھار کے بیٹے سید شیریں کی اولاد میں سے تھے۔

اکبر چونکہ مذہبی معاملات میں کج رو تھا اور سچے دین کے بارے میں اس کا اعتقاد مضبوط

نہیں تھا۔ اس لئے مذکورہ بالا عبارات کے پاکیزہ انداز سے ہمعصر تواریخ کے پیش کردہ اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ انتقال سے چند برس پہلے اس نے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی طرف ایک فیصلہ کن جھکاؤ کا اظہار کر دیا اور وہ ایک اچھے مسلمان کی طرح فوت ہوا۔ مذکورہ بالا عبارات لکھے جانے کے صرف چار سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

جامع مسجد: درگاہ کے مغرب میں فرگوسن کے مطابق' اکبر کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اس کے بہترین کندہ کاری سے مزین بلند و بالا چوکور ستون ہیں' اس کے پہلو سنگ سرخ کے جبکہ اندرونی صحن میں سفید سنگ مرمر کا فرش لگایا گیا ہے۔ دیواروں پر اور ان کے اردگرد بہترین اور خوشنما رنگوں میں جیومیٹری کے مختلف نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ مرکز میں ایک بہت بڑا محرابی کمرہ ہے جو اجتماع کے لئے ایک کشادہ جگہ فراہم کرتا ہے۔

بڑی محراب پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے:-

در زمان شہہ جہان اکبر　　کہ از و ملک را نظام آمد

شیخ الاسلام مسجدی آراست　　کز صفا کعبہ احترام آمد

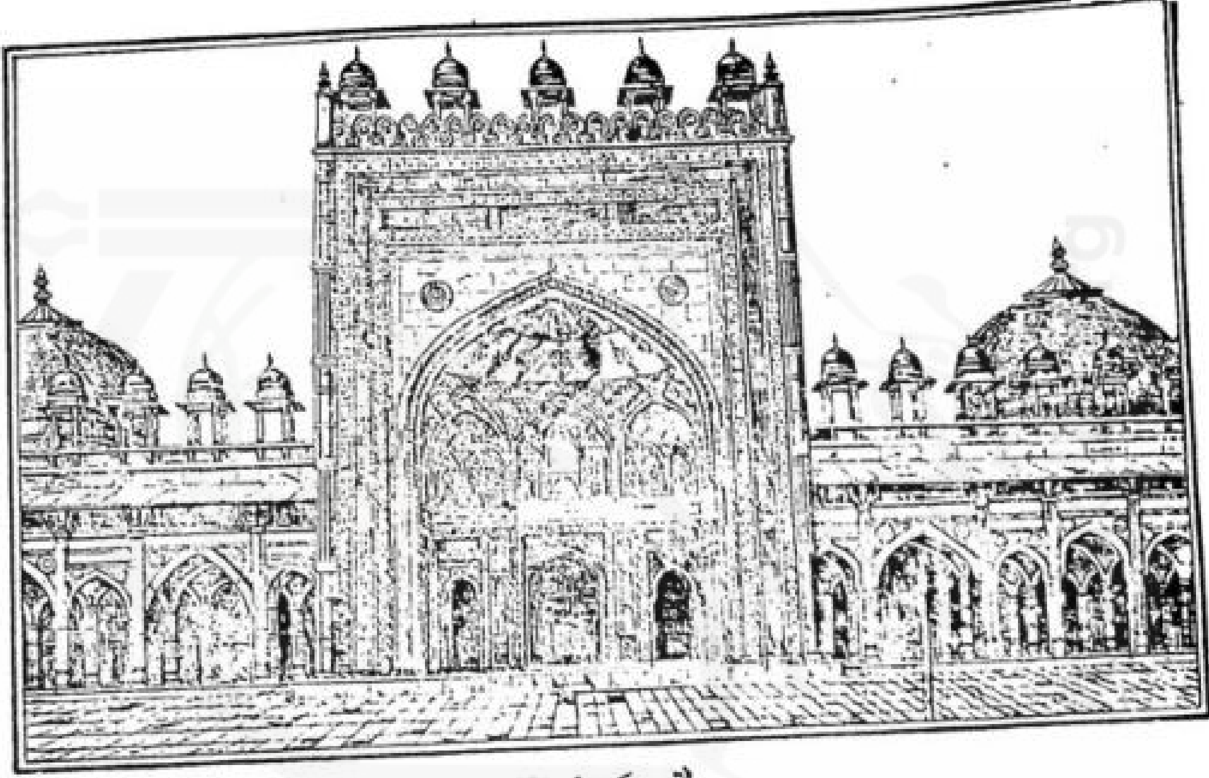
سال اتمام این بنائی　　رفیع ثانی المسجد الحرام آمد

سنہ 989 ہجری

"شہنشاہ عالم اکبر کے دور میں (کہ ملک کا انتظام جن کے ذمہ ہے) شیخ الاسلام نے ایک مسجد آراستہ کی جو اپنی پاکیزگی کی بناء پر کعبہ کی طرح کے احترام کی مستحق ہے' اس عالیشان عمارت کی تکمیل کا سال الفاظ "ثانی مسجد الحرام" میں ملتا ہے"

مندرجہ بالا قطعہ 979ھ یا 1571ء کو تعمیر کا سال بتاتا ہے۔ اس مسجد کو شیخ سلیم نے خود اپنی زندگی میں تعمیر کرایا تھا' انہوں نے صرف چھ ماہ تک اس میں نماز ادا کی' اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

علامی ابوالفضل نے اپنی کتاب "اکبر نامہ" میں فتح پور سیکری کی جامع مسجد میں اکبر کے منعقد کردہ مذہبی اجلاسوں کے بارے میں ایک مکمل بیان درج کیا ہے۔ دور حکومت کے 24 ویں برس یا 987ھ (1579ء) میں سرعام اعلان کر دیا گیا کہ بادشاہ سلامت کی شخصیت میں حکومت اور اجتہاد کی قوتیں جمع ہو گئی ہیں۔ ملاؤں نے اس دستاویز پر دستخط کر دیئے جسکی رو سے مجتہد پر امام عادل کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بادشاہ اسلام امیرالمومنین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی ایک انتہائی عادل' انتہائی دور اندیش اور انتہائی خدا ترس بادشاہ ہیں۔ اور یہ کہ وہ تمام مذہبی معاملات جن کے متعلق مجتہدین کی آراء میں اختلاف پایا جائے' تو اس



فتح پور سیکری کی مشہور مسجد

صورت میں بادشاہ سلامت کے حکم کا اطلاق پوری قوم پر ہو گا۔ اس دستاویز پر مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری شیخ الاسلام شیخ عبدالنبی' صدر الصدور حکیم الملک غازی خان بدخشی' ملتان کے قاضی القضاۃ قاضی جلال الدین' سلطنت کے مفتی صدر جہاں' اپنے دور کے انتہائی زیرک مصنف شیخ مبارک اور دیگر اشخاص نے دستخط کر کے مہر لگا دی۔

مشہور دستاویز: مذہب اسلام کی مکمل اجتہادی تاریخ میں یہ دستاویز انتہائی نرالی نوعیت کی ہے۔ خوش قسمتی سے بدایونی نے اس کی ایک مکمل نقل محفوظ کر لی۔ مندرجہ ذیل نقل اس کی تصنیف سے حرف بہ حرف حاصل کی گئی ہے۔

محضر: مقصود از تشید این مبانی و تمہید این معانی آنکہ چون ہندوستان جنیت عن الحدثان صیا من معدلت سلطانی و تربیت جہان بانی مرکز امن و امان و دایرہ عدل و احسان شدہ طوایف انام از خواص و عوام خصوصا علمای عرفان شعار و فضلای دقائق آثار کہ ہادیان بادیہ نجات و سالکان مسالک اوتوالعلم درجات انداز عرب و عجم رو بدین دیار نہادہ توطن اختیار نمودند جمہور علمائی محول کہ جامع فروع و اصول و حاوی معقول و منقول اند بدین و دیانت و صیانت انصاف وارند بعد از تدبیر وافی و تامل کافی در غوامض معانی آیہ کریمہ اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل -یطع الامیر فقد اطاعنی و من -یعص الامیر فقد عصانی و غیر ذالک من الشواہد العقلیۃ والدلایل النقلیۃ قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عند اللہ زیادہ از مرتبہ مجتہدات و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابدا اعقل و اعلم باللہ اند بنا بران اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہاست بذہن ثاقب و فکر صائب خود یک جانب را از اختلاف بجہت تسہیل بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بان جانب حکم فرمایند متفق علیہ میشود و اتباع آن بر عموم برایا و کافہ رعایا لازم و محکم است و ثانیا اگر بموجب رای صواب نمای خود حکمی را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصی نباشد و سبب ترفیہ عالمیان بودہ باشد عمل بران نمودن برہمہ کس لازم و محکم است و مخالفت آن موجب سخط اخروی و خسران دینی و دنیوی است و این سطور صدق وفور حسبۃ للہ و اظہار الاجراء حقوق الاسلام بمحضر علمائی دین و فقہای متدین تحریر یافت و کان ذالک فی شہر رجب سنہ سبع و ثمانین تسعمائتہ (987ھ)

ترجمہ:۔ اس دستاویز کے لکھنے کا مقصد یہ ہے: چونکہ ہندوستان کو تمام آفات سے محفوظ کر دیا گیا ہے اور یہ بادشاہ سلامت کے عدل کی برکت سے اور ان کے متعارف کردہ اصولوں کے

ذریعے اب سلامتی اور امن کا مرکز اور عدل و فلاح کی سرزمین بن چکا ہے' اس لئے لوگوں کے ہجوم خواص و عوام خصوصاً" پر صاحب عرفان علماء کرام (اور فضلاء دانشمند (جو نجات کے راستے کی راہنمائی کرتے ہیں اور سچائی کے راستے کے ہادی ہیں) عرب اور عجم کے ملک سے ہجرت کر کے اس ملک میں نقل مکانی کر آئے ہیں اور انہوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا ہے۔ چنانچہ قانون کی متعدد شاخوں اور عدل و انصاف کے اصولوں میں ماہر اور عقل و تصدیق کی بنیادوں پر استوار فرمانات میں باکمال چیدہ چیدہ علمائے کرام جو اپنے تقویٰ دیانتداری اور پرہیز گاری کے لئے مشہور ہیں' نے پہلے قرآن پاک کی (سورۃ 62) کے گہرے معانی پر غور کرنے کے بعد کہ "اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحب اختیار ہوں" اور دوسرے ان احادیث پر (1) "یقیناً" امام عادل روز قیامت کو اللہ کا پسندیدہ شخص ہو گا (2) "جو کوئی امیر کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے اور جو کوئی اس کے خلاف بغاوت کرتا ہے وہ میرے خلاف بغاوت کرتا ہے" اور تیسرے یہ کہ دیانت و صیانت پر مبنی متعدد ثبوت اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ کے نزدیک سلطان عادل کا رتبہ مجتہد کے مرتبہ سے زیادہ ہے۔ چنانچہ بادشاہ اسلام' کہف الانام امیر المومنین' ظل اللہ علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی (اللہ ان کی بادشاہت کو قائم رکھے) انتہائی عادل' انتہائی عاقل' انتہائی عالم فاضل اور انتہائی خدا ترس حکمران ہیں اس لئے ان کے بارے میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اگر مستقبل میں کوئی ایسا مذہبی مسئلہ پیدا ہو جائے' جس کے متعلق مجتہدین کی آراء میں اختلاف پایا جائے اور بادشاہ سلامت اپنی فہم و فراست اور عدل و انصاف سے قوم کی بہتری کے لئے اسے اختیار کرنے پر رضامندی کا اظہار کریں اور سیاسی مصلحت کے تحت اس مسئلہ پر کسی بھی اختلافی رائے کے بارے میں کوئی حکم صادر فرمائیں تو بذریعہ ہذا ہم اس پر متفق ہیں کہ یہ ہم سب کے لئے اور پوری قوم کے لئے لازم و ملزوم ہو گا۔

مزید یہ کہ ہم اعلان کرتے ہیں اگر بادشاہ سلامت اپنی فہم و فراست سے کوئی نیا حکم صادر فرمائیں' جو قرآن کے منافی نہ ہو اور عوام الناس کے فائدہ میں ہو تو پوری قوم کے لئے اس کی اطاعت لازم و ملزوم ہو گی اور اس کی مخالفت اس دنیا میں ایمان و دین اور جان و مال کے نقصان اور آنے والے جہاں میں لعنت کا باعث ہو گی۔

اس دستاویز کو انتہائی دیانتداری سے خدا کی بڑائی اور تبلیغ اسلام کی خاطر تحریر کیا گیا ہے اور ہم یعنی علمائے دین اور فقہائے کرام نے رجب 987 ہجری (1579ء) میں اس پر دستخط کئے ہیں۔

مذکورہ بالا دستاویز کا مسودہ شیخ مبارک کی تحریر میں تھا۔ دوسروں نے اپنی مرضی کے خلاف اس پر دستخط کئے۔ مگر شیخ نے اس کے آخر میں مندرجہ ذیل قطعہ شامل کر لیا۔

واین امریست کہ من بجان ودل خواہان او از سالہا باز منتظر آن بودم۔

ترجمہ:۔ یہ وہ معاملہ ہے جس کی میں دل کی گہرائیوں سے خواہش رکھتا تھا اور کئی سالوں سے اس کا بے چینی سے منتظر تھا۔

اس وقت سے بادشاہ کو امام یا امیروقت کی فہم و فراست کی قانونی بالادستی حاصل ہو گئی اور وہ مکمل قانون بن گیا۔ بادشاہ نے یہ سن رکھا تھا کہ وقت کے امام اور خلفائے اسلام جمعہ کی نماز میں بذات خود خطبہ پڑھا کرتے تھے اور بعد کے ادوار میں صاحب قران امیر تیمور اور گورگان کے مرزا الغ بیگ نے اسی طرح ان کی تقلید کی' چنانچہ 'ابوالفضل کے مطابق' اس نے امت مسلمہ کی بہتری کے لئے اس بھاری بھرکم اور مقدس فریضہ کی ذمہ داری اٹھانے کا فیصلہ کر لیا' مگر ملا بدایونی کے مطابق' وہ عوام الناس میں وقت کے مجتہد کی حیثیت سے آیا۔

چنانچہ' یکم جمادی الاول 987ھ بروز جمعۃ المبارک فتح پور سیکری میں جامع مسجد کے منبر پر بیٹھ کر اس نے مندرجہ ذیل خطبہ پڑھا' جو شیخ ابوالفیض فیضی نے اس کی مرضی کے مطابق لکھا تھا:۔

بنام آنکہ مارا خسروی داد
دل دانا و بازوی قوی داد
بعدل و داد مارا رھنمون کرد
بجز عدل از ضمیر مابرون کرد
بود وصفش زحد فہم برتر
تعالیٰ شانہ اللہ اکبر

ترجمہ:۔ "میرے مالک نے مجھے بادشاہت عطا کی اور مجھے دانا' قوی اور بہادر بنایا' اس نے عدل اور ایمان کے راستے میں میری رہنمائی کی اور میرے قلب کو عدل اور سچ سے لبریز کر دیا' کسی انسان کی فہم فراست اس کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی' اللہ اکبر!"

اس نے قرآن پاک کی آیات کا حوالہ دیا اور خدا کی شفقت اور فضل و کرم کا شکر ادا کیا' تب فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ منبر سے نیچے اتر آیا اور مسجد کے امام حافظ محمد امین کے پیچھے باجماعت نماز ادا کی۔

اسی دور میں حاجی ابراہیم سرہندی نے بادشاہ کے سامنے عجیب و غریب طرز تحریر کا ایک انتہائی قدیم کرم خوردہ مسودہ پیش کیا (جس کے بارے میں کہا گیا کہ اسے شیخ شیر علی نے تحریر کیا

تھا) اس میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ صاحب زماں کی متعدد بیویاں ہوں گی اور اس نے داڑھی منڈوائی ہو گی۔ کتاب میں جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا تھا وہ سب اکبر کے روزمرہ معمولات کے مطابق تھیں۔ دیگر شہادتوں کے ذریعے بھی یہ ثابت کیا گیا کہ 990 میں ایک ایسا شخص نمودار ہو گا جو اسلام کے 72 فرقوں کے درمیان تمام اختلافات کو ختم کر دے گا۔ شیراز کے خواجہ مولانا نے ایک قدیم کتابچہ پیش کیا جس میں اس روایت کا ذکر کیا گیا تھا کہ امام مہدی کا ظہور فوراً" ہو جائے گا۔

ابوالفضل نے اکبر نامہ (92) میں فتح پور سیکری کی جامع مسجد میں منعقدہ ایک مذہبی اجلاس کا دلچسپ حال بیان کیا ہے۔ اس وقت وہ خود بادشاہ سے متعارف ہوا تھا (1574ء) وہ لکھتا ہے:۔

"ان دنوں اس کتاب کے مصنف (ابوالفضل) کو بادشاہ سلامت کے ساتھ پہلی مرتبہ ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا' یعنی سال کے آغاز میں دارالخلافہ آگرہ میں شہنشاہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مجھے بہترین موقع میسر آگیا۔ تاہم کچھ غرور و تکبر کے باعث اور کچھ اس لئے کہ میرے والد مجھے رخصت کی اجازت نہیں دینا چاہتے تھے' میں مشرقی علاقوں کا سفر کرنے سے باز رہا۔ معاملات اسی طرح چلتے رہے' حتیٰ کہ اپنے بھائیوں کی طرف سے مجھے ایک خط موصول ہوا' جس میں مجھے مطلع کیا گیا کہ بادشاہ سلامت مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مناسب وسائل نہ ہونے کے باعث مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں بادشاہ کے سامنے خالی ہاتھ کیسے جاؤں گا۔ آخر کار میں نے کوئی ادبی تصنیف پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا' کیونکہ میرے جیسے آدمی کی حالت کے مطابق اس سے بہتر نذرانہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے قرآن پاک کی سورۃ فاتحہ کی تفسیر لکھی' جب شاہی پڑاؤ اجمیر پہنچا تو مجھے اپنے بڑے بھائی کی طرف سے ایک اور خط موصول ہوا' اس میں مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے بادشاہ کی خواہش کو دہرایا گیا تھا۔ اب چونکہ میری ادبی تصنیف مکمل ہو چکی تھی اس لئے میں نے شاہی پڑاؤ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا: نیز جب پڑاؤ فتح پور سیکری پہنچا تو میں اپنے والد کی اجازت حاصل کر کے اس جگہ پہنچ گیا۔ جب میں مصر جامہ (دارالخلافہ) پہنچا تو یہ محسوس کیا کہ وہاں پر کوئی ایسا دوست نہیں ہے' جس کے توسط سے میں بادشاہ سلامت سے متعارف ہو سکوں۔ میری خود پسندی نے ایک بار پھر مجھے اس بات سے روک دیا کہ کسی کو یہ کہوں کہ وہ مجھے بادشاہ سے متعارف کرا دے' حتیٰ کہ میرے بڑے بھائی (جو مجھ سے دانشمندی اور عمر میں بڑا ہے) نے مجھ سے کہا کہ میں اس مذہبی اجلاس میں شرکت کروں' جسے بادشاہ کے حکم سے منعقد کیا جاتا ہے۔

چنانچہ' اگلے روز میں نے جامع مسجد میں شرکت کی' جس کا شمار بادشاہ سلامت کی تعمیر کردہ

عظیم ترین عمارات میں ہوتا ہے۔ اچانک بادشاہ سلامت تشریف لے آئے' انہوں نے کافی فاصلے سے مجھے دیکھ لیا میں نے تعظیم پیش کی۔ بادشاہ سلامت نے مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا' میں فوراً" ظل سبحانی کے پاس حاضر ہوا اور خراج عقیدت پیش کیا۔ بادشاہ سلامت نے مجھ سے شفقت آمیز الفاظ کہے اور وہاں جمع شدہ لوگوں کے سامنے انتہائی خوشدلانہ انداز میں بات کی اور میری ایسی خصوصیات بیان کیں جن سے میں بھی واقف نہیں تھا۔

وحال راچنانچہ من هم نمی دانستم بخاصان بزم اقدس واہی نمودند

انہوں نے اس انداز میں وہاں موجود لوگوں کے سامنے میرے حالات بیان کرنے شروع کر دیئے کہ میں بھی ان سے واقف نہیں تھا۔

بادشاہ سلامت جس شفقت و مہربانی کے ساتھ مجھ سے پیش آئے اس نے میرا دل جیت لیا۔ اس وقت سے بادشاہ کی عنایات و نوازشات میں اضافہ ہو گیا اور روز بروز میں اپنے جلیل القدر آقا اور شہنشاہ کے معیار پر پورا اترتا چلا گیا۔"

غالباً" اسی دور میں علماء کے ایک گروہ نے بادشاہ پر الحاد کا الزام لگایا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں (جلد - 3) اس الزام کی تردید کے لئے پورا ایک باب وقف کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ اکبر نے کبھی بھی خدا یا اس کے نائب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا' حالانکہ اس نے حق تعالیٰ ہی سے اپنا نور حاصل کیا اور اس کے تمام معاملات میں براہ راست اللہ ہی نے اس کی رہنمائی کی۔

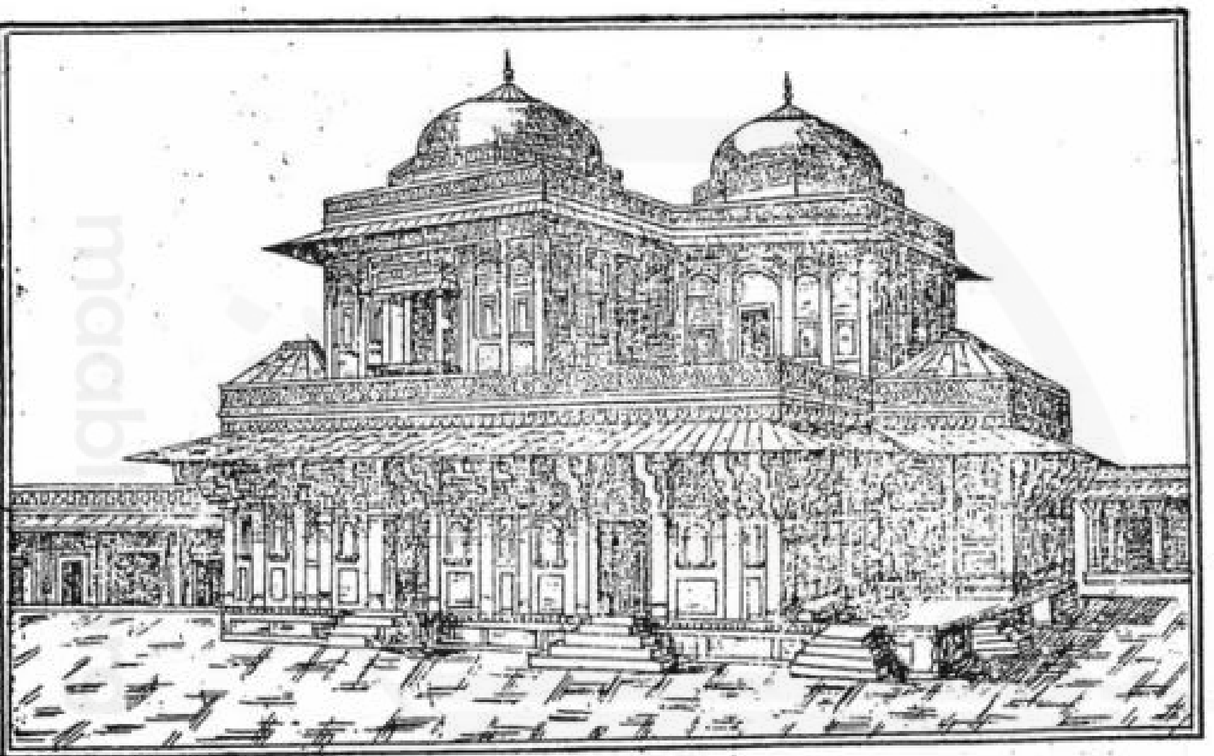
شیر خوار بچے کا مزار: مسجد کی پشت پر ایک چار دیواری ہے جو ایک شیر خوار بچے کے چھوٹے سے مزار پر مشتمل ہے۔ روایت کے مطابق یہ شیخ سلیمؒ کے چھ ماہ کے ایک بیٹے کا مزار ہے' جس نے حیران کن طور پر اپنے قابل احترام والد سے بات کر کے بادشاہ کے بیٹے کے لئے اپنی جان قربان کر دی' کیونکہ اس کے بچے قسمت کے فیصلے کے مطابق شیر خوارگی میں فوت ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ کسی نے ان کی بجائے اپنے بچے کی جان کو پیش کر دیا۔ اس فیاض بچے کے انتقال کے نو ماہ بعد شہزادہ سلیم اس دنیا میں آیا۔ اسی جگہ پر ملبے میں ایک غار کی طرف کھلنے والا ایک دروازہ ملے گا' بادشاہ کی اس جگہ توجہ سے قبل یہی بزرگ کا اصل ٹھکانہ تھی۔ یہ جگہ اس مقام کی نشاندہی بھی کرتی ہے' جہاں وہ اپنے شاگردوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں اس صوفی بزرگ نے شاہی جوڑے کو اپنی کٹیا کے قریب رہائش پذیر ہونے پر راغب کیا تھا اور وہیں پر شہزادہ سلیم کی پیدائش ہوئی تھی۔

ابوالفضل اور فیضی کے محلات: درگاہ کے شمال میں ابوالفضل اور اس کے بھائی فیضی

کے محلات ہیں دونوں تقریباً" یکجا ہیں۔ شاہی درباریوں کے مہمان خانوں اور زنانہ کو انگریزی کمرہ ہائے جماعت کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ عالم فاضل بھائی دیگر عمارات کو دیوان خانوں کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

بیربل کا محل: ابوالفضل کے محل کے شمال میں اکبر کے ایک پسندیدہ ساتھی بیربل (93) کا محل ہے' جس کی بذلہ سنجی اور دانشمندی سے بادشاہ محظوظ ہوا کرتا تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت انتہائی خوبصورت ہے' جس کو وافر طور پر انتہائی باریک اور باکمال کندہ کاری سے مزین کیا گیا ہے اور یہ ابھی تک محفوظ حالت میں ہے۔ زیریں منزل چار کمروں پر مشتمل ہے' ہر کمرہ 15 مربع فٹ کا ہے' جس کی چھت پتھر کی سلوں کی ہے اور اس کی لمبائی 15 فٹ اور چوڑائی بھی اسی قدر ہے۔ چھتیں باہر کو نکلی ہوئی کنگنیوں پر ٹکی ہوئی ہیں' جنہیں بلند و بالا محرابوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ بالائی منزل کے کمرے بھی زیریں منزل کے کمروں کی جسامت کے برابر ہیں اور ان کے اردگرد عالیشان گنبد ہیں۔ مسٹر کینے جو تعریف کے معاملہ میں کبھی بھی فیاض نہیں رہے' اس عمارت کے متعلق لکھتے ہیں "ماسوائے استرکاری کی باریکی کے کوئی چیز مسالا کے ٹھوس پن سے بڑھ نہیں سکتی' ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دیو ہیکل یادگار پر ہاتھی دانت کے کسی چینی کاریگر نے کام کیا ہو۔ پوری عمارت پتھر کی ہے' کسی بھی حصہ میں لکڑی کی کوئی چھڑی تک استعمال نہیں کی گئی' اس کی سب سے زیادہ خوبصورتی اس بات میں مضمر ہے کہ جسامت میں چھوٹی ہونے کے باوجود یہ انتہائی دلفریب اور جاذب نظر ہے۔ درحقیقت اسی طرح کے ساز و سامان کے ساتھ اسی جگہ پر اور اتنی ہی پیمائش میں اس سے بہتر کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا" وکٹر ہیوگو اس محل کے بارے میں لکھتا ہے: "ہر مقام پہ یکساں طور پر نفیس اور حیرت انگیز شان و شوکت ہے' اگر یہ انتہائی ننھا منا محل نہیں تو یہ جواہرات کا ایک دیو ہیکل ڈبہ ضرور ہے"۔

بیربل کے محل کو اکبر کے دور حکومت کے 27 ویں برس میں مکمل کیا گیا۔ جب عمارت مکمل ہو گئی' تو بادشاہ نے بیربل کی درخواست پر اسے اپنی آمد سے عزت بخشی۔ ابوالفضل اکبر نامہ میں اس واقعہ کو بیان کرتا ہے "ان دنوں راجہ بیربل کا مکان بادشاہ کے قدموں کے نور سے روشن ہو گیا' راجہ کو بادشاہ سلامت کا پسندیدہ ساتھی ہونے کا اعزاز حاصل تھا' لہٰذا انہوں نے اس کے لئے نیلگوں سنگ خارا کا ایک کشادہ محل تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جب یہ عمارت مکمل ہو گئی تو اس نے بادشاہ سے دورہ کرنے کی درخواست کی کہ اس سے اس کا رتبہ بڑھ جائے گا۔7 بھمن کو بادشاہ نے اپنی تشریف آوری سے اس محل کو عزت بخشی اور راجہ پر بادشاہ کی نوازشات کی بارش ہو گئی۔"



بیربل کا محل

ہندو ملکہ کا محل: مذکورہ بالا عمارت کے جنوب مشرق جانب ایک محل ہے' جس کو غلطی سے گائیڈ حضرات جودھ بائی سے منسوب کرتے ہیں' جو جہانگیر کی والدہ نہیں بلکہ اس کی بیوی تھی اور اس کے محل کا ذکر قلعہ کے بیان میں کیا گیا ہے۔ درمیان میں واقع ہونے کے باعث کینے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ یہ زن کلاں یا اکبر کی بادشاہ بیگم رقیہ سلطانہ بیگم کا محل تھا' جو بادشاہ کے چچا مرزا ہندال کی بیٹی تھی۔ مگر اس عمارت کی ہندوانہ طرز تعمیر سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ اکبر کی ہندو بیوی کی رہائش گاہ تھی' جو راجہ بہاری مل کی بیٹی اور مریم زمانی کے نام سے مشہور تھی۔ دیواروں پر ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں کندہ ہیں یعنی دیوتاؤں کے پردادا مہادیوا' قسمت اور خوشحالی کی دیوی لکشمی اور ہاتھی کے سر والے گنیش کی تصویر جسے انتظامی معاملات پر اختیار حاصل ہے۔ اس محل سے دریافت ہونے والے چند ٹکڑے ایک ہندو مندر کے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے کمرے نہایت وسیع اور کشادہ ہیں' جو مغرب سے مشرق کی جانب تقریباً" ایک قطار کی شکل میں ہیں' انہیں بادشاہ کی منتخب بیوی یا خود بادشاہ کے خصوصی کمروں کے طور پر بنایا گیا تھا دقیق کندہ کاری سے مزین ایک بلند و بالا دروازہ سے داخل ہونے پر ہم 57 X 177 فٹ کے ایک چبوترہ یا کھلے برآمدہ پہ آجاتے ہیں' جس کا فرش سلوں کا ہے اور اس کے اردگرد شمال اور جنوب میں دو اور تین منزلہ کمروں کے ساتھ ستونوں کی قطار سے مزین برآمدہ ہے' جن کی چھتیں ڈھلوانی سلوں کی ہیں اور ان پر نیلا روغن چڑھایا گیا ہے۔ اس کے قریب ایک اور صحن میں پانی کا ایک شاندار حوض ہے' اس کو چار بلند راستے قطع کرتے ہیں اور درمیان میں مل جاتے ہیں۔ بے شک یہ بادشاہ اور شاہی گھرانے کی خواتین کے لئے ایک تفریح گاہ تھی۔

اس حصہ میں ہندو ملکہ کے محل کے علاوہ استنبولی بیگم کا محل اور سنہری منزل تمام عمارتوں سے زیادہ شاندار ہیں۔ فرگوسن ان کے بارے میں کچھ اس طرح بیان کرتا ہے "یہاں پر اس (اکبر) کی تمام عمارات میں سے زیادہ شاندار' نہایت خوبصورت اور انتہائی مخصوص تین چھوٹے شہ نشین ہیں' کہا جاتا ہے انہیں اس کی تین چہیتی سلطاناؤں کا دل بہلانے اور ان کے قیام کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ شہ نشین چھوٹے ہیں' مگر یہ خیال کرنا ناممکن ہے کہ کوئی اور عمارت بھی نقشہ میں اس قدر دلکش ہو سکتی ہے یا کسی عمارت میں بغیر کسی ذرا سی کوشش اور بدذوقی کے کندہ کاری اور زیبائش کا کام اس حد تک ہو سکتا ہے۔"

شاہی اصطبل: ایک چوگوشہ صحن کے اردگرد ہندو ملکہ کے محل کے شمال مغرب میں گھوڑوں' ہاتھیوں اور اونٹوں کے رکھنے کی خاطر اصطبل بنائے گئے ہیں۔ دیگر عمارات کی طرح انہیں بھی سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے اور یہ ٹھوس طرز تعمیر کے حامل ہیں۔ پتھر کی کھرلیاں اور پتھر

ہی کے بڑے بڑے کڑے ہیں جن کے ساتھ گھوڑوں کو باندھا جاتا تھا' انہیں اس جگہ اب بھی دیکھا جا سکتا ہے اور یہ متجس مشاہد کے لئے دلکشی کا سامان ہیں۔ اصطبلوں سے ذرا ہٹ کر پختہ اینٹوں کا طویلہ ہے' یہ خاص طور پر بادشاہ کے پسندیدہ ہاتھی کے لئے مخصوص کیا گیا تھا جو باقی ماندہ ہاتھیوں میں غیر معمولی جسامت اور سمجھ بوجھ کے لحاظ سے فقید المثال تھا۔

ہرن مینارہ: ان غیر معمولی عمارات کے گروہ میں ایک مینارہ بھی ہے' جو شکل و صورت اور نقش کے لحاظ سے انوکھا ہے' گول شکل کا یہ مینار 90 فٹ بلند ہے (ماسوائے چوٹی کے جس پر ایک گنبد ہے) چوٹی سے بنیاد تک اس پر پوری جسامت کے سنگین نقلی ہاتھی دانت ٹھوس ستون کے پہلوؤں سے کھونٹیوں کی طرح باہر نکلے ہوئے ہیں اور ایک نرالا اور البیلا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ غالباً" اکبر نے اس کو اپنے پسندیدہ ہاتھی کی قبر پر تعمیر کرایا تھا۔ اس کو اس وجہ سے بھی ہرن مینارہ کہا جاتا ہے کہ اکبر اس کی چوٹی پر سے شکار سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا' ملک کے تمام حصوں سے جنگلی جانوروں کو یہاں پر ایک احاطہ میں لایا جاتا اور وہ ان کا شکار کیا کرتا تھا۔ اکبر کے تذکرہ نگاروں ابوالفضل اور نظام الدین احمد کی تصانیف میں شکار سے بادشاہ کے لگاؤ کا مکمل حال بیان کیا گیا ہے۔ وہ ایک ماہر نشانے باز تھا' اس ضمن میں شیر اور ریچھ کے شکار کے بارے میں اس کی پھرتی کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ مسز کینے کے خیال کے مطابق "فتح پوری سیکری میں سرکاری کام کے دباؤ کے تحت ہم بادشاہ کو عمدہ لباس اور جوتوں میں دیکھتے ہیں"۔

مقبول عام نام ہرن مینارہ اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آج تک اس کے مضافات میں ہرن بکثرت پائے جاتے ہیں' ان کے غولوں کو بنجر زمین پر پھرتے یا ندی نالوں میں لیٹے یا سرسبز و شاداب چراگاہوں میں چرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ یقیناً" یہ انہیں ہرنوں کی نسل سے ہیں جن کا اکبر شکار کیا کرتا تھا۔

ہاتھی پول: پہاڑی سے ذرا نیچے مشہور زمانہ ہاتھی پول دروازہ ہے۔ یہ ایک ٹھوس اور عالی شان عمارت ہے' جس کے پہلوؤں میں دو مثمن شکل کے پشتے ہیں۔ محراب زمین سے 20 فٹ بلند ہے' اس کی دونوں جانب ایک بلند و بالا پائے ستون پر پوری جسامت کے دیو پیکر ہاتھی کا مجسمہ ہے: دونوں کی سونڈیں آپس میں لپٹی ہوئی ہیں' جیسے لڑتے ہوئے دروازے پر آ گئے ہوں۔ متعصب اورنگ زیب نے تعصبانہ جذبے کے تحت ان بتوں کے سر مسمار کرا دیئے یا دوسرے لفظوں میں دروازے کی زیب و زینت کو تباہ کر دیا۔ ایک مشرقی شاہی محل کے دروازے کے لئے



ہرن منار

اس سے زیادہ شاندار آرائشی کام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سنگیہ برج: ہاتھی پول دروازہ کے قرب و جوار میں ایک عظیم الشان پشتہ ہے' جسے سنگیہ برج کہا جاتا ہے۔ فصیل کی باقیات کو مرمت کرانے کا کام اکبر نے بہت بڑے پیمانے پر شروع کرایا تھا' مگر بعد میں صوفی بزرگ حضرت سلیم چشتیؒ کی طرف سے فتح پور کو شاہی رہائش گاہ بنانے کے منصوبہ کی منظوری نہ ملنے پر اس نے اس کام کو روک دیا۔

کارواں سرائے: ہاتھی پول اور سنگیہ برج کے درمیان ایک وسیع و عریض کارواں سرائے ہے' جہاں سلطنت کے دور دراز علاقوں اور افغانستان اور ایشیا کے دیگر ممالک سے آنے والے تاجر قیام کرتے اور اپنی اشیاء کو فروخت کیا کرتے تھے۔ یہاں پتھر کی خوبصورت جالیوں سے مزین ایک ملفوف برآمدہ ہے' جسے حرم کی خواتین محلوں کے مختلف کمروں کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لئے ایک راستے کے طور پر استعمال کیا کرتی تھیں۔ یہاں پر حرم سرا کی خواتین کے لئے کشیدہ کاری سے مزین ریشمی ملبوسات' ململ' شالیں اور دیگر پارچہ جات پر مشتمل تجارتی اشیاء کے ذخیرے فروخت کیلئے رکھے جاتے تھے: اسکے علاوہ یہاں پر جوہریوں کی دوکانوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے' جہاں سونے اور چاندی کے زیورات اور جواہرات کی نمائش کی جاتی تھی' جن سے شاہی ملبوسات اور جبوں کو آراستہ کیا جاتا تھا۔ تاہم' یہ سب اپنے ہی ملبے کے نیچے دفن ہو چکے ہیں اور یہاں اب صرف ان کے نشانات ہی کو دیکھا جا سکتا ہے' صرف اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس جگہ استادہ تھے اور انہیں کس مقصد کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔

ان ویران عمارات اور محلات کے سکوت سے زیادہ اور کوئی چیز اداسی کی حامل نہیں ہے جو کبھی زندگی سے بھرپور اور علم و فضل کا گہوارہ ہونے کے علاوہ پر تکلف دربار پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔

آب رسانی: مغرب کی جانب چٹان کے بلند حصوں کے تلے اور جامع مسجد کے دروازہ کے نیچے آب رسانی کا ایک پیچیدہ نظام ہے' جس کے ذریعے رہٹ کی مدد سے پانی کو اوپر اٹھا کر لایا جاتا ہے اور اسے تالابوں کے ایک سلسلہ میں ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد پہاڑیوں پر بنی ہوئی رہائش گاہوں کے مختلف حصوں تک نالیوں کے ذریعے پہنچا دیا جاتا ہے۔

حوض: ان کے درمیان مستطیل شکل کا ایک کشادہ حوض ہے' جسے پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے اس میں سے ٹھنڈا پانی ایک چور دروازے کے ذریعے گرم پانی میں لایا جاتا ہے۔

چوٹی سے دیوار کی بلندی تقریباً 100 فٹ ہے' چند آدمی اور نوجوان لڑکے سیاح کی تفریح کی

خاطر تھوڑی سی بخشش کے لئے ہر وقت اوپر سے چھلانگ لگانے کے لئے تیار رہتے ہیں، یہ تھوڑی سی بخشش ان کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

بدایونی نے فتح پور سیکری میں "انوپ تالاب" کا ذکر کیا ہے، جہاں بادشاہ مذہبی معاملات پر اجلاس منعقد کرنے کے لئے سلطنت کے علمائے کرام اور قانون دانوں کو مدعو کیا کرتا تھا۔ ایک رات اس نے قاضی یعقوب، شیخ ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور چند دیگر حضرات کو مدعو کیا، اس وقت موطاہ یا (عارضی نکاح) پر زبردست بحث مباحثہ ہوا۔ اس بات پر زور دیا گیا کہ امام مالکؒ اور اہل تشیع حضرات کے مسلک کے مطابق، موطاہ کی شادی جائز ہے، مگر امام شافعیؒ اور حنفیہ مسلک کے مطابق یہ ناجائز ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس بارے میں اپنی رائے پیش کی کہ اگر مالکی فرقے کا قاضی موطاہ کو جائز قرار دیتا ہے تو شیعوں اور حنفیوں کے مشترکہ اعتقاد کے مطابق اسے جائز ہونا چاہئے۔ بادشاہ اس رائے سے بہت خوش ہوا۔

باؤلی: محرابی عمارات کے سلسلے کے درمیان حضرت سلیم چشتیؒ کی درگاہ سے کچھ فاصلے پر پختہ اینٹوں سے تعمیر کردہ ایک بہت بڑے تالاب پر مشتمل ایک باؤلی ہے۔ تالاب کا پانی اب متعفن ہو چکا ہے۔ اس کے اردگرد بنے ہوئے برآمدے اسی کی طرف کھلتے ہیں۔ ایک طویل سیڑھی کے زینے تالاب کی طرف جاتے ہیں; نیز اس جگہ کو کچھ اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ مکمل طور پر علیحدگی کے لئے زینوں کی طرف کے دروازے کو مناسب طور پر بند کر دیا گیا ہے۔ یہ حرم شاہی کی خواتین کے لئے غسل کرنے کی جگہ تھی۔

قدیم جھیل: پہاڑیوں کے شمال میں مغل بادشاہوں کے دور میں ایک بہت بڑی جھیل ہوا کرتی تھی، اس کے ایک طرف ایک بہت بڑا پشتہ اور دوسری جانب پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ یہ پانی کی ایک بہت بڑی چادر پر مشتمل تھی، جس کی لمبائی چھ میل اور چوڑائی دو میل تھی۔ اکبر کے دور میں یہ اس جگہ کے باسیوں کو پانی فراہم کرتی اور مضافاتی کھیتوں اور باغات کو سیراب کرتی تھی۔

ابوالفضل (اکبر نامہ، جلد 3) میں ہمیں مطلع کرتا ہے کہ اس جھیل کے کناروں پر شہزادوں اور سلطنت کے امراء کے محل اور بارہ دریاں تھیں۔ موسم گرما میں یہ تفریح گاہ کا کام دیتی تھی، جہاں پر مختلف اقسام کی تفریحات منعقد ہوتی تھیں۔ ان تفریحات اور رنگ رلیوں میں بادشاہ بھی شامل ہو جاتا اور امراء شطرنج اور گنجفا (تاش) کھیلا کرتے تھے۔ دور حکومت کے 27 ویں برس میں (1582ء) اس کا کنارہ ٹوٹ گیا اور جھیل کا پانی اوپر بہنے لگا، کنارے پر بنے ہوئے مکانات بہہ

گئے اور بہت زیادہ مالی نقصان ہوا' مگر جانی نقصان نہیں ہوا تھا' بادشاہ بھی بڑی مشکل سے بچا' اس لئے بادشاہ کی سلامتی کے لئے خدا کا شکر ادا کرنے کی خاطر نذرانے پیش کئے گئے۔ امراء نے بھی اس معاملہ میں بادشاہ کی تقلید کی۔ شمال مغربی صوبہ جات کے لیفٹیننٹ گورنر عزت مآب جیمز تھامسن کے دور حکومت میں پانی کو نکال دیا گیا۔ زمین انتہائی پیداواری ہو گئی ہے' جس کی وجہ سے زرعی اجناس کی کاشت انتہائی کامیابی سے کی جا رہی ہے۔ فتح پور کے مضافات میں سرخ مرچ کو وسیع پیمانے پر بویا جاتا ہے' یہاں کی زمین خاص طور پر اس کی کاشت کے لئے موزوں ہے۔

پتھر کا کاروبار: فتح پور کی کانیں آگرہ اور شمال مغربی صوبہ جات میں عمارات کی چھتوں کے لئے سلیں' سنگین ستونوں اور میناروں کے لئے پتھر مہیا کرتی ہیں' جبکہ غلہ پیسنے کے لئے چکیوں کا بہت وسیع کاروبار کیا جاتا ہے' جو گھریلو استعمال کی اشیاء ہیں اور ان کی زبردست مانگ ہے۔

اکبر کے دور میں دستکاری: اکبر کے دور میں آگرہ اور لاہور کی طرح فتح پور میں بھی اسی پیمانے کا ایک شاہی کارخانہ تھا۔ آئین اکبری کے مطابق' دلفریب نمونوں کے قالین اور دلکش پارچہ جات یہاں تیار کئے جاتے تھے۔ ہر طرح کے قالین باف یہاں آباد ہو گئے اور انہوں نے شاہکار نمونے تیار کئے۔ اس کارخانہ میں لوگوں کو دستکاری کے ایک ترقی یافتہ نظام کی تعلیم دینے کے لئے ماہر معلمین اور کاریگر ملازم رکھے جاتے تھے' یوں نہ صرف کمبل بافی اور ریشم کی کتائی میں بہتری پیدا کی گئی بلکہ بہترین سامان کے لئے ذوق و شوق بھی عام کیا گیا۔

ابوالفضل سنگ سرخ کے کاروبار کے متعلق بات کرتے ہوئے آئین اکبری کے باب 86 میں لکھتا ہے: "اس کو بادشاہ سلامت کی رہائش گاہ فتح پور سیکری کی پہاڑیوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور کسی بھی لمبائی اور چوڑائی والی چٹانوں سے کاٹا جا سکتا ہے۔ ہوشیار کاریگر لکڑی پر کام کرنے والے کسی خرادیے کے مقابلہ میں انتہائی مہارت سے اسے تراش سکتے ہیں; نیز' ان کے شاہکار مانی (ساسانیوں کا عظیم مصور) کی مصور کتاب کی ہمسری کرتے ہیں۔"

شکار: خشک جھیل کے کنارے سے ذرا فاصلے پر اور اتنگم ندی کے کنارے اور اس کے مضافات میں جنگلی سور بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس ندی میں بہترین ذائقے کی بہت بڑی مچھلی پائی جاتی ہے جسے فروخت کے لئے آگرہ کی گلیوں میں لایا جاتا ہے; اس کے علاوہ مرغابی' آبی پرندے اور نیلے کبوتر بھی بافراط ملتے ہیں; جنہیں ہندوستانی آوارہ خانہ بدوشوں کی ایک نسل کے لوگ (جنہیں کنجر کہا جاتا ہے) پھندہ لگا کر پکڑتے ہیں' یہ لومڑی' گیدڑ اور شکاری جانوروں کے گوشت پر گزر بسر کرتے ہیں اور چھپکلیاں اور دیگر رینگنے والے جانور بھی کھا جاتے ہیں۔

خیر پورہ اور دھرم پورہ:

1583ء میں بادشاہ نے شہر کے باہر خیرات خانے تعمیر کرائے' مسلمانوں کے لئے بنائے گئے خیرات خانوں کو خیر پورہ اور ہندوؤں کے خیرات خانوں کو دھرم پورہ کہا جاتا تھا۔ ان جگہوں کا انتظام ابوالفضل کے آدمیوں کے سپرد تھا۔ ایک تیسرا خیرات خانہ بھی تعمیر کیا گیا' اسے جوگی پورہ کا نام دے دیا گیا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے جوگیوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس خیرات خانہ میں آکر جمع ہو جاتی۔ بادشاہ رات کے وقت ان سے علیحدہ ملاقات کرتا اور ان کی کٹھن سچائیوں ان کے مذہبی مسائل' ان کے پیشے' عبادت و ریاضت کے اثر' ان کی متعدد مشقوں اور معمولات' جسم سے غیر حاضر ہونے کی طاقت' کیمیا اور قیافہ شناسی اور روح کے حاضر ہونے کی طاقت کے متعلق سوالات کرتا تھا۔

دم کشی: بادشاہ نے کیمیا گری کا فن حاصل کر لیا اور اپنے تیار کردہ سونے کی ایک مقدار کی نمائش بھی کی۔ تبت کے لاماؤں' منگولیا کے پجاریوں اور دیگر جوگیوں اور درویشوں کی طویل العمری کا سن کر (جو اجتناب کشی اور دم کشی کے عمل کے نتیجہ میں دو سو برس سے زائد عرصہ تک زندہ رہتے تھے) اس نے ان درویشوں کی نقل کرتے ہوئے حرم میں بسر ہونے والے اپنے وقت کو محدود کر دیا' کھانا پینا کم کر دیا اور ایک بیراگی کی حیثیت سے گوشت سے پرہیز کرنے لگا۔ مخصوص دنوں میں جانوروں کو ہلاک کرنے سے منع کر دیا گیا اور دن میں چار مرتبہ صبح اور شام دوپہر اور آدھی رات کے وقت سورج کی پوجا کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔

بادشاہ عابدانہ انداز میں سورج کی طرف منہ کر کے ہر روز سنسکرت زبان میں سورج کے ایک ہزار ایک نام دہراتا اور اپنی پیشانی پر ہندوؤں کا تلک لگاتا تھا۔ اس نے اپنے مذہبی نظام کو "توحید الٰہی" کا نام دے دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے چیلے بنائے۔ وہ ہر صبح سورج کی پرستش کرتا اور 1001 ناموں کا ورد کرنے کے بعد ایک جھروکے میں آجاتا اور جھروکے کے سامنے جمع شدہ ہزاروں لوگوں کو اپنا درشن کراتا' وہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے کہ انہوں نے منت مان رکھی ہے کہ جب تک بادشاہ سلامت کے مبارک چہرے کا درشن نہیں کر لیتے اپنے دانت صاف نہیں کریں گے اور نہ ہی کچھ کھائیں پئیں گے۔ (94)

بادشاہ کی رہائش گاہ اور سلطنت ہند کے پایہ تخت کی حیثیت سے فتح پور سیکری کی شان و

شوکت اپنے بانی اکبر سے شروع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ عظمت عارضی ثابت ہوئی' کیونکہ تعمیر ہونے کے پچاس برس کے اندر ہی کھنڈر بن گیا۔ سب سے پہلے اکبر نے اس پر قبضہ کیا اور وہاں تعمیرات کے معاملہ میں بھی آخری ثابت ہوا' کیونکہ اس کے بعد ایک عمارت بھی تعمیر نہیں کی گئی۔

درحقیقت' جب فنچ نے اکبر کے بیٹے اور جانشین جہانگیر کے دور حکومت کے ابتدائی حصہ میں اس کا دورہ کیا تو اس نے اسے تقریباً ویران پایا۔ چنانچہ' وہ اس جگہ کے بارے میں بیان کرتا ہے :——"سب کھنڈر بن چکا تھا' ایک ویران صحرا کی مانند دکھائی دیتا تھا' رات کے وقت وہاں سے گذرنا انتہائی خطرناک تھا۔" جب فتح پور اپنی شان و شوکت کے عروج پر پہنچ گیا تو صوفی بزرگ سلیم چشتیؒ نے اسے اپنے رہنے کے لئے انتہائی تکلیف دہ پایا۔ انہوں نے دور افتادہ ہونے کے باعث اس مقام کو پسند کیا تھا اور اب یہ بادشاہ کی توجہ حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کا ایک انتہائی گنجان آباد شہر بن گیا تھا۔ مصروف شہر کی ہل چل اور دربار کی رنگ رلیوں اور نمود و نمائش نے اس صوفی بزرگ کی عبادت و ریاضت میں مداخلت شروع کر دی۔ آخر کار بادشاہ نے اپنے روحانی پیشوا کے احساسات سے بے خبری میں پہاڑیوں کا مضبوط فصیل کی تعمیر سے احاطہ کرنا شروع کر دیا۔ درویش اب اور زیادہ دیر تک اپنے آپ کو نہیں روک سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے مرید (بادشاہ) سے کہا کہ انہوں نے بیس مرتبہ مکہ مکرمہ کا حج کیا ہے' مگر ان کا سکون کبھی بھی اس قدر درہم برہم نہیں ہوا۔ یوں انہوں نے بادشاہ سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا کہ بادشاہ کو یا انہیں اس جگہ سے رخصت ہونا ہو گا۔ بادشاہ نے جواب دیا "اگر یہ حضور والا کی مرضی ہے کہ کسی کو یہاں سے چلا جانا چاہئے' تو میں التجا کرتا ہوں کہ اپنے اس غلام کو جانے دیجئے۔" اکبر آگرہ میں منتقل ہو گیا اور اس شہر کو اس نے از سر نو تعمیر کرایا۔ دربار اور شہر کے لوگوں کو آگرہ میں آباد کر دیا گیا وہ اس وقت ایک ویران جگہ تھی؛ نیز' فتح پور سیکری اپنے شاندار اور دلکش محلات' اپنی شاندار مساجد' (جن کو مشرق میں سب سے بہترین کہا جاتا ہے) اپنے بے مثال مقبرہ جات' اپنی پر تکلف رہائش گاہوں اور اپنی ویران گلیوں کے ساتھ آج تک اپنے بانی کے جاہ و جلال اور دولت کی ایک یادگار ہے اور ایک ایسی من موجی طاقت کی شہادت دیتا ہے' جس نے تمام ادوار میں بزرگی کے لئے شہرت پائی ہے!۔ بامعل فرگوسن کے فصیح و بلیغ الفاظ میں: "مجموعی طور پر دیکھا جائے تو فتح پور سیکری کا یہ شہر ایک سنگین افسانہ معلوم ہوتا ہے' کسی بھی جگہ اس نوعیت کے شہر بہت تھوڑے اور نہایت گنے چنے ہی مل سکتے ہیں؛ نیز یہ ایک عظیم انسان کے ذہن کا عکاس ہے' جس نے اس کو نہایت امتیازی طور پر تعمیر کرایا جس کو کسی دوسرے وسیلہ سے

باآسانی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔"

شیخ سلیم چشتیؒ

جن حالات کے تحت شیخ سلیم چشتیؒ فتح پور سیکری میں آباد ہوئے اور وہ واقعات' جن کے باعث یہ مقام ایک غیر اہم دیہات سے ہندوستان کا ایک انتہائی خوشحال شہر اور سلطنت کا دارالخلافہ بن گیا' انہیں پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک ایسے صوفی بزرگ جن کو ہندوستان کی تاریخ کے ایک بہترین دور میں بزرگی کے معاملہ میں ایک بلند مقام حاصل ہے' بے شک انکے خاندان کا ایک مختصر بیان دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ شیخ بہاؤالدین کے بیٹے شیخ سلیمؒ' جنہیں ایران کے ایک گاؤں کی نسبت سے چشتیؒ کہا جاتا ہے (وہیں سے ان کے والد تشریف لائے)' جمال الدین سلمانؒ کے صاحبزادے حضرت شیخ فریدالدین شکر گنجؒ کی اولاد میں سے تھے۔ ابوالفضل کے اکبرنامہ کے مطابق' شیخ فریدؒ نے اپنا نسب کابل کے بادشاہ فرخ شاہ کے ساتھ بتایا ہے۔ عظیم تاتاری فاتح چنگیز خاں کے دور میں ان کے آباؤ اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی شعیب ضلع لاہور میں آئے اور قصبہ قصور میں آباد ہو گئے۔ سلطان بہنحم ان کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا' بعد میں وہ ملتان چلے گئے۔ شیخ فریدؒ ملتان میں کھوتووال کے مقام پر پیدا ہوئے۔ خواجہ معین الدینؒ کے خلیفہ خواجہ قطب الدینؒ کی بزرگی کا سن کر وہ دہلی چلے گئے اور ان کے مرید ہو گئے۔ ان کے انتقال پر وقت کے شیوخ نے متفقہ طور پر انہیں مرحوم صوفی بزرگ کا خرقہ خلافت پہنا دیا' یوں فریدالدینؒ پاک پتن (اس وقت اجودھن کے نام سے مشہور تھا) میں آباد ہو گئے' وہاں' 5 محرم الحرام' 668ھ (1269ء) میں ان کا انتقال ہوا۔

طبقات اکبری کے مطابق "شیخ سلیمؒ سیکریوال کا شمار ہندوستان کے انتہائی قابل احترام شیوخ میں ہوتا تھا اور وہ بزرگی اور عبادت و ریاضت میں تمام بزرگوں سے سبقت لے گئے تھے۔ انہیں کرامات پر مکمل اختیار حاصل تھا (مصنف اسی طرح کہتا ہے) انہوں نے اپنی زندگی میں 24 مرتبہ مکہ مکرمہ کا حج کیا۔ اس کے بعد انہوں نے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ ایک مرتبہ آپؒ پندرہ برس تک مکہ مکرمہ میں رہے۔ بادشاہ سلامت' ظل سبحانی (اکبر) نے آپ کی خاطر فتح پور کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ آپ 979ھ (1571ء) میں انتقال کر گئے۔" ابوالفضل اکبر نامہ میں شیخ سلیمؒ کے دوسرے (میانی) بیٹے شیخ احمدؒ کا ذکر کرتا ہے: "وہ زبردست نیکیوں کے حامل تھے' انہوں نے کبھی بھی کسی سے درشت لہجے میں بات نہیں کی اور انہیں کبھی بھی غصے میں نہیں دیکھا گیا۔ وہ

شرمیلی طبیعت اور باوقار اطوار کے حامل تھے۔ انھیں ایک امیر مقرر کیا گیا اور ولی عہد سلطنت کے لئے عاتکہ (95) بننے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ مالوہ کی مہم میں انھیں سردی لگ گئی اور فتح پور سیکری پہنچنے پر ان پہ فالج کا حملہ ہو گیا۔ جب شاہی پڑاؤ اجمیر روانہ ہونے لگا' تو وہ بادشاہ سلامت کو اپنا آخری خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آئے اور اپنے گھر لوٹنے کے بعد واصل بحق ہو گئے" یہ واقعہ اکبر کے دور حکومت کے 22 ویں برس 985ھ (1577ء) میں رونما ہوا۔ انھوں نے دربار میں شیخ ابراہیم کے ساتھ خدمات انجام دیں۔

شیخ ابراہیم' شیخ سلیمؒ کے بڑے بھائی شیخ موسیٰؒ کے صاحبزادے تھے' جنھوں نے سیکری میں خلوت نشینی میں اپنی زندگی بسر کی۔ ابراہیم زیادہ تر دربار میں شہزادگان کی خدمت پر مامور رہے اور دور حکومت کے 23 ویں برس انھیں فتح پور سیکری کا حاکم مقرر کیا گیا۔ 28 ویں برس میں انھوں نے بہار اور بنگال میں خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کی قیادت میں نمایاں خدمات انجام دیں اور جب 30 ویں برس اکبر کابل گیا تو انھیں آگرہ کا حاکم بنا دیا گیا: یہ عہدہ' 999ھ (1590ء) میں ان کے انتقال تک ان کے پاس رہا۔ وہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے داماد بھی تھے۔

• شیخ بایزید (معظم خاں) شیخ سلیمؒ کے پوتے تھے۔ بایزید کی والدہ نے شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی پیدائش کے دن اسے اپنا دودھ پلایا تھا۔ اکبر کے دور میں انھیں 2000 کی کمان سونپی گئی' مگر جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد انھیں معظم خاں کے خطاب کے ساتھ 3000 ہزاری منصب عطا کیا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد انھیں حاکم دہلی بنا دیا گیا اور جہانگیر کی حکومت کے تیسرے برس انھیں 4000 اور 200 سواروں کی کمان سونپی گئی۔ آپ کا انتقال فتح پور میں ہوا اور وہیں پر دفن ہوئے۔

شیخ اسلام خاں (علاؤ الدین) شیخ سلیم چشتیؒ کے ایک دوسرے پوتے ہیں' ان کی شادی ابوالفضل کی بہن سے ہوئی۔ وہ حاکم بنگال تھے جہاں 1022 (1613ء) میں ان کا انتقال ہو گیا۔

شیخ بایزیدؒ کے بیٹے مکرم خاں کی شادی اسلام خاں کی بیٹی سے ہوئی' وہ بنگال میں ان کے لئے خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ انھیں حاکم اوڑیسہ بنا دیا گیا اور جہانگیر کے دور کے 21 ویں برس انھیں حسن علی ترکمان کی بجائے حاکم بنگال مقرر کیا گیا۔

یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ اکبر کے دور کی سیاسی تاریخ میں مشہور افراد اس جگہ دفن ہیں' جو کبھی فتح پور کا عروس البلاد ہوا کرتا تھا۔

1- **سلطان خواجہ**: خواجہ خاوند دوست کے بیٹے سلطان خواجہ (اعظم خاں) کو طبقات اکبری میں ایک درویش فلسفی کہا گیا ہے۔ انھیں شہنشاہ اکبر کا بہت زیادہ اعتماد اور دوستی حاصل تھی۔

984ھ (1576ء) میں انھیں میرحج بنایا گیا اور اسی برس حج کے لئے مکہ روانہ ہونے والے درباریوں کی ایک بہت بڑی جماعت کا انتظام بھی انھیں کے سپرد کیا گیا۔ اس سے پہلے درباری امراء کی اس قدر بارسوخ جماعت کبھی بھی عرب کے لئے روانہ نہیں ہوئی تھی۔ مکہ مکرمہ کے لوگوں میں تقسیم کرنے کے لئے چھ لاکھ روپے اور 12000 کپڑے کے جوڑوں کا انتظام بھی انھیں سونپ دیا گیا۔

23 ویں برس یا 1577ء میں واپسی پر انھیں ایک ہزاری کماندار بنایا گیا اور سلطنت کا صدر مقرر کر دیا گیا' 992ھ (1583ء) میں انتقال تک یہ عہدہ ان کے پاس رہا۔ انھیں قلعہ فتح پور کے باہر شمال کی طرف دفن کیا گیا۔ مکہ مکرمہ سے واپسی پر وہ دین الٰہی کے رکن بن گئے تھے۔

بدایونی کے مطابق' شریف مکہ نے مکہ مکرمہ میں سلطان خواجہ کا کوئی اچھی طرح استقبال نہ کیا اس لئے وہ بے چینی کی حالت میں ہندوستان لوٹ آئے۔ اپنے وطن لوٹنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انھوں نے خود کو اسلام کی پابندیوں سے آزاد کرا لیا اور داڑھی منڈوا کر قابل احترام آقا ابوالفضل کی رہنمائی میں اکبر کے دین الٰہی میں شمولیت اختیار کر لی۔ سماجی اجلاسوں میں وہ ہمیشہ سب سے آگے ہوتے اور مذہبی بحث مباحثوں میں سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ اکبر نے اپنے نئے چیلے سے خوش ہو کر انھیں غازی پور اور حاجی پور میں جاگیر عطا کر دی۔

جب سلطان خواجہ کا آخری وقت آن پہنچا تو انھوں نے بادشاہ سے کہا: "میں امید کرتا ہوں کہ مجھے ایک دیوانے شخص کی طرح دفن نہیں کیا جائے گا۔" انھیں ایک مخصوص چراغ کے ساتھ قبر میں دفن کیا گیا: ان کی قبر پر ایک جنگلا اس انداز میں لگا دیا گیا تاکہ ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی (جو تمام گناہوں کو صاف کر دیتی ہے) نعش کے چہرے پر پڑ سکے۔

2- **قطب الدین خاں:** فتح پور کے شیخ خوبی (جو اپنے لقب قطب الدین خاں کے نام سے زیادہ مشہور تھے) شیخ سلیمؒ کے نواسے تھے۔ وہ بدایوں کے ایک شیخ زادہ کے بیٹے اور جہانگیر کے دودھ شریک بھائی تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خوبی کی والدہ اس کو اپنی ماں سے زیادہ عزیز ہے۔ جہانگیر نے الہ آباد میں جب اکبر کے خلاف بغاوت کر دی' تو خوبی کو قطب الدین خاں کا خطاب دے کر حاکم بہار بنا دیا گیا۔ تخت نشین ہونے پر اس نے انھیں مان سنگھ کی جگہ بنگال کا صوبیدار مقرر کر دیا۔ ان کا انتقال مشرقی تاریخ میں مشہور چند انتہائی افسانوی واقعات میں سے ایک کے ساتھ وابستہ ہے۔ جہانگیر عالم شہزادگی میں اکبر کے خزانچی مرزا غیاث بیگ تہرانی کی حسین و جمیل بیٹی مہرالنساء پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ پہلے ہی سے علی قلی بیگ استجلو (شیر افگن) کے ساتھ منسوب تھی' ایک ترک امیر تھا۔ وہ ایران کے بادشاہ شاہ اسماعیل ثانی کا سفارچی تھا۔ بادشاہ کے انتقال کے

بعد علی قلی ہندوستان آگیا اور ملتان میں اکبر کے جرنیل اور اتالیق بیرام خاں کے بیٹے مرزا عبدالرحیم خان خاناں سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ ٹھٹھہ میں جنگ کے دوران اس نے خان خاناں کی قیادت میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے' لہٰذا اس کی سفارش پر اسے سلطنت کا امیر بنا دیا گیا۔ مرزا غیاث بیگ (خزانچی) کی بیوی کی رسائی اکبر کی بیوی ملکہ مریم زمانی تک تھی' یوں اس کے محل میں سلیم اور مہرالنساء کی آنکھیں چار ہوئیں' یہ عشق باہمی تھا۔ اکبر نے اس عشق کے متعلق سنا تو باعزت طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس کے بیٹے کے عشق کو اس بندھن کی تکمیل میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ چنانچہ اس کی شادی اس کے منگیتر سے کر کے انہیں اس کی جاگیر بردوان روانہ کر دیا گیا۔

میواڑ کے رانا کے خلاف مہم میں نوجوان امیر شہزادہ سلیم کے ہمراہ تھا' میدان جنگ میں دلیری کا مظاہرہ کرنے پر شہزادے نے اسے شیر افگن کا خطاب دیا۔ جہانگیر نے تخت نشین ہونے پر علی قلی کو اس کی جاگیر میں بھیج دیا۔ نورجہان کے لئے اس کا عشق پھر عود کر آیا' چنانچہ' اس نے اپنے رضاعی بھائی قطب الدین کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ اسے اس کے قابل نفرت حریف سے چھٹکارہ دلا دے۔ قطب الدین نے شیر افگن کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا' مگر اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ تب قطب الدین نے شیر افگن کو اس بات پر راغب کرنے کے لئے کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا' اپنے بھانجے غیاث کو بردوان روانہ کیا۔ وہ خود بھی غیاث کے پیچھے بردوان روانہ ہوا۔ اس کے پہنچنے پر شیر افگن کسی دغابازی کے شبہ کے بغیر دو آدمیوں کے ہمراہ اس کا استقبال کرنے کے لئے گیا۔ قطب نے اس کو دیکھتے ہی شیر افگن کو قتل کرنے کے لئے اپنے ساتھیوں کو اشارہ دینے کی خاطر گھوڑے کی چابک اوپر اٹھا دی۔ "یہ سب کیا ہے؟" شیر افگن نے چلا کر کہا۔ قطب الدین نے شیر افگن کی طرف گھوڑا بڑھا کر اس کی نافرمانی پر اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اب شاہی کارندوں نے شیر افگن پر حملہ کر دیا' اس نے چھ آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کر ڈالا۔ اس کے بعد اپنی تلوار تھامے قطب کی طرف دوڑ کر اس کے پیٹ میں ایک گہرا زخم لگا دیا۔ قطب الدین ایک فربہ اندام شخص تھا اس نے اپنی باہر نکلی ہوئی انتڑیوں کو ہاتھوں سے تھام کر اپنے آدمیوں سے چلا کر کہا کہ اس بدمعاش کو ختم کر دیں۔ شاہی خاندان کی نسل سے ایک کشمیری امیر انباہ خاں نے آگے بڑھ کر شیر افگن کے سر پر تلوار کا وار کیا' مگر شیر افگن نے اسی وقت اپنی تلوار سے اسے کاٹ کے رکھ دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بے شمار حملہ آوروں کا شکار ہو جائے گا' تو اس نے ان کو فرداً" فرداً" مقابلہ کرنے کے لئے للکارا۔ مگر یہ ایک ایسی دعوت تھی' جس کو قبول کرنے کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔

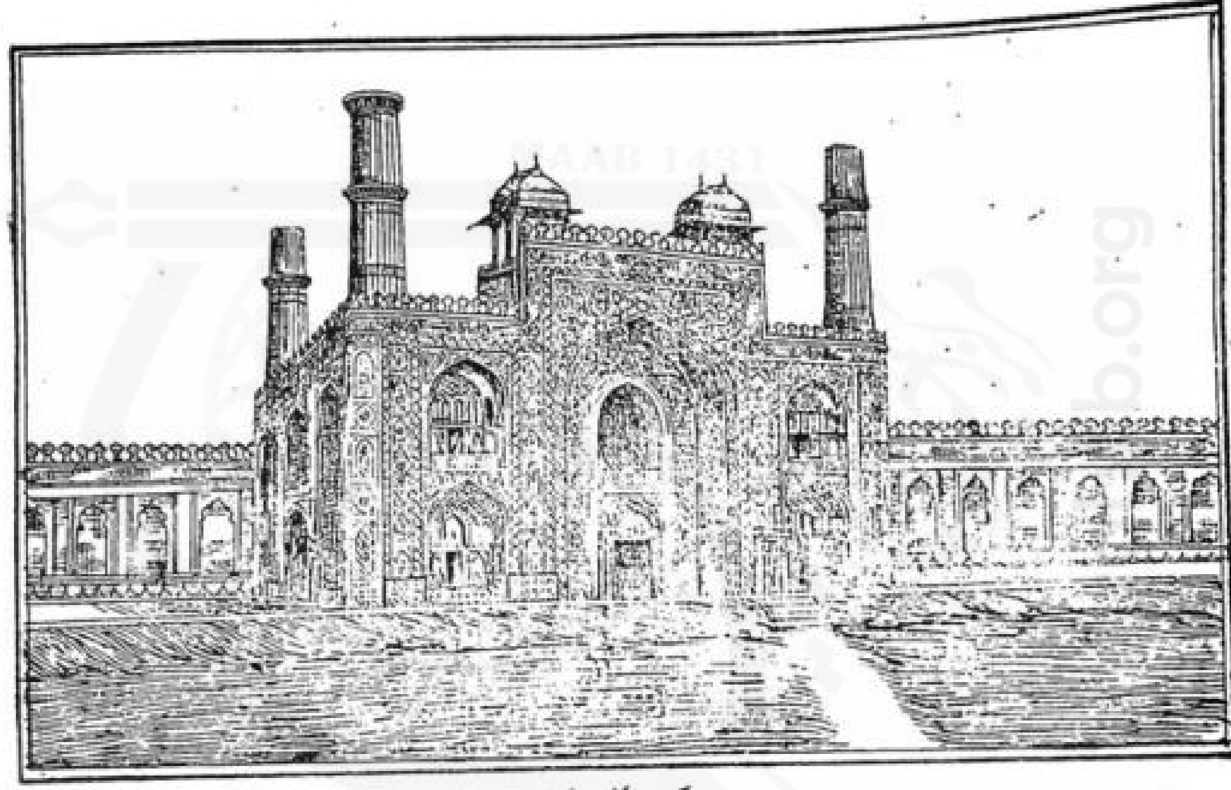
شیر افگن اپنے گھوڑے سے اترا اور اپنا منہ مکہ کیطرف کر کے پانی کی قلت کے باعث وضو کی خاطر مٹی اپنے سر پر ڈالی اور میدان میں ڈٹ گیا۔ اس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے حملہ آوروں کے ہجوم کی گولیوں کی بوچھاڑ سے اس کا جسم چھلنی ہو گیا۔ وہ اپنے نام کی مناسبت سے ایک شیر کی طرح میدان میں گرا۔ اس کے بے شمار حملہ آوروں میں سے کسی فرد واحد کو بھی گرے ہوئے سورما کی لاش کے قریب جانے کی جرات نہیں ہوئی' کیونکہ اس کی بہادری کی زبردست دھاک ان پر بیٹھ چکی تھی۔ آخر کار انہوں نے اسے جان کنی کے عالم میں دیکھا۔ قطب الدین نے جب شیر افگن کی ہلاکت کی خبر سنی تو وہ اس وقت گھوڑے کی پشت پر تھا۔ اس نے شیر افگن کے اثاثوں اور خاندان کو بردوان سے لانے کے لئے غیاثا کو روانہ کیا۔ اس کے بعد اسے ایک پالکی میں ڈال کر روانہ کیا گیا' مگر وہ راستے ہی میں فوت ہو گیا۔ اس کی نعش کو فتح پور سیکری لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

بردوان کے نواح میں ابھی تک ایک خوبصورت گنبد سے مزین مقبرہ استادہ ہے اور سورما شیر افگن کی آخری آرام گاہ کی نشان دہی کر رہا ہے۔

3- **قادری:** قادری شیرازی۔ وہ ایک بہترین شاعر تھا' مکہ مکرمہ سے ہندوستان آیا' جہاں اکبر نے اس کی خوب آؤ بھگت کی بعد میں وہ زیر عتاب آ گیا اور فتح پور سیکری میں انتقال کر گیا۔

سکندرا

دریائے جمنا کے دائیں کنارے سے کچھ فاصلے پر قدیم فوجی سڑک ہے' جسے مغل شمال مغرب میں لاہور اور کشمیر کی طرف سفر کرنے کے لئے استعمال کیا کرتے تھے' اب انگریزی حکومت نے اسے ایک بہترین شاہراہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسے بجا طور پر آگرہ کا خیابان کہا جاتا ہے' کیونکہ اس کے آر پار سرسبز و شاداب کھیت اور میلوں تک پرانی یادگاروں کے کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں جو ذہن میں قدیم ادوار کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ سنگ سرخ کی ٹھوس عمارت پر مشتمل شاہی فصیل کا قدیم دہلی دروازہ (جو ابھی تک محفوظ حالت میں ہے) اور چند قدیم سنگ میل ہیں۔ ایک طرف ضلعی جیل اور دوسری جانب پاگل خانہ ہے' دونوں قدیم عمارات کے محل وقوع پر تعمیر کئے گئے ہیں جن کے متعلق اب کوئی کچھ نہیں جانتا۔ قدیم طاقت اور عظمت کے ان شکستہ کھنڈرات کے درمیان سکندرا کا گاؤں ہے' (96) جس کے قرب و جوار میں بہشت آباد کے باغ میں لاجواب اور ٹھوس عمارت پر مشتمل اکبر کا مقبرہ بے مثال خوبصورتی کی یادگار کے طور پر ایستادہ ہے' چونکہ عظیم شہنشاہ اکبر نے بذات خود اس کا نقشہ تیار کیا اور اس کی تعمیر کا آغاز کیا تھا اس لئے اس میں اکبر کی عمارات کی سبھی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ بظاہر اس کا نمونہ ہندوانہ یا اگر زیادہ درست کہا جائے تو بدھ طرز تعمیر کا ہے' مگر اپنی وضع قطع میں انتہائی لاجواب ہے۔ بہترین نقادوں کے مطابق' مشرقی دنیا میں کسی انسان کی یاد میں تعمیر کردہ کسی بھی دوسری یادگار کے بالکل برعکس ہے۔ عصر حاضر کے ایک جرمن مصنف نے بالکل درست کہا ہے' جس طرح اکبر اپنے معاصرین کے درمیان انوکھا تھا' اسی طرح اس کی جائے مدفون دیگر ہندوستانی مقبروں کے درمیان نرالی ہے۔۔۔۔۔۔ اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ایشیا کے مرقدوں کے درمیان انوکھی ہے۔" اس کے مفید دور حکومت کی بے شمار یادگاروں اور اس کے طویل اور خوشحال دور کے متعدد اچھے کاموں کی طرح اس کے تخلیقی ذہن کی سنگی علامت (جو اس کے جسد خاکی کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے) ہمیشہ پوری دنیا کی تعریف و توصیف حاصل کرتی رہے گی۔ اکبر کی طرح بلند حوصلہ اور اس کی طاقت و شان و شوکت کی طرح عظیم ہے' یعنی اس نے اپنی طرح کی ایک عظیم یادگار اپنے پیچھے چھوڑی ہے' جو تفصیلی تنوع میں پر تکلف حیران کن خوبصورتیوں سے مالا مال اور اپنے مختلف حصوں کے تقابلی لحاظ سے دلکش ہے۔ یہ اس بلند ہمت شخص کے زرخیز تخیل اور وسیع القلبی کا نتیجہ ہے کہ اس کے انتقال کے صدیوں بعد بھی سیاح کرہ ارض کے دور دراز علاقوں سے نہایت جوش و خروش کے ساتھ صرف اس کا مقبرہ



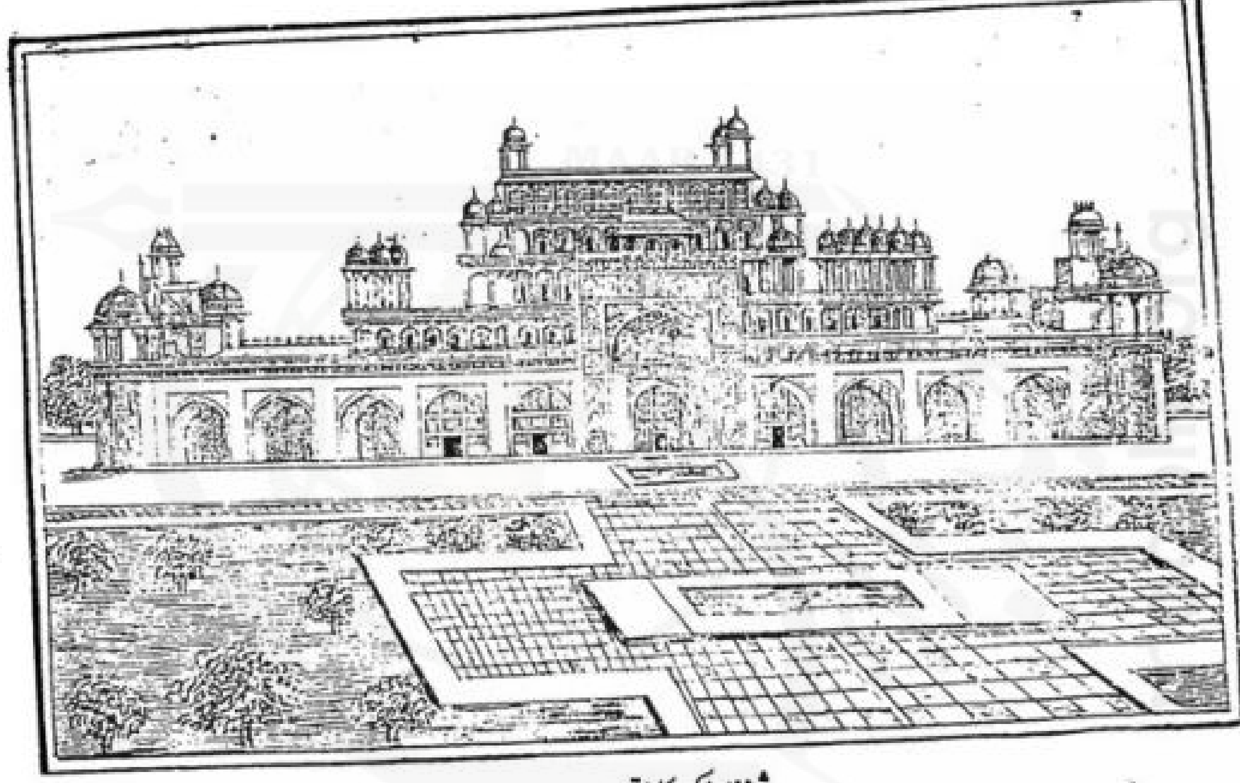
سکندرہ کا دروازہ

دیکھنے آتے ہیں جو اس کی اپنی ذہانت کی یادگار ہے۔ فاتح اشخاص کے ذہنوں کی کون سی ایسی طاقت ہے' جو اس عظیم شخص کی زندگی میں اس کے پاس موجود نہیں تھی؟

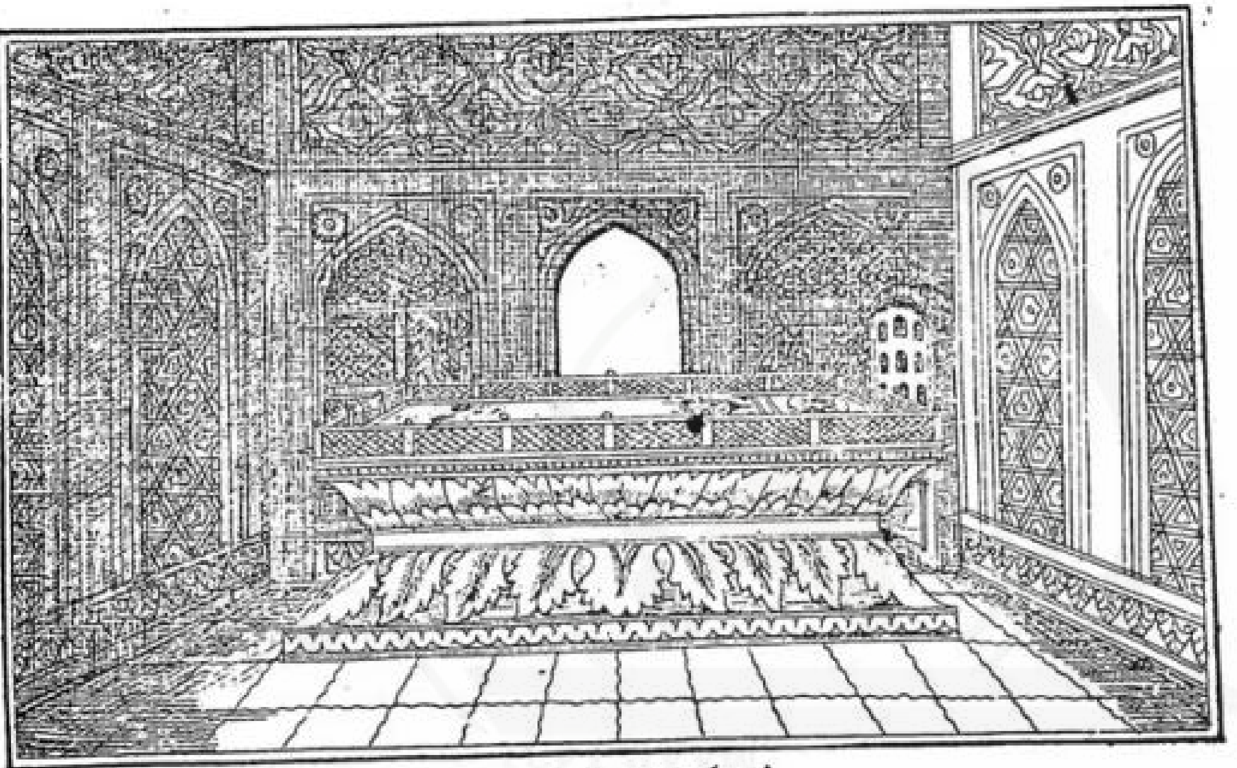
یہ مقبرہ ایک وسیع و عریض چوکور باغ کے درمیان میں موجود ہے (جو تقریباً ایک یا اس سے زائد میل کے دائرہ پر محیط ہے) اس کے گرد ایک فصیل بنائی گئی ہے' جس کی ہر طرف درمیان میں گہرے سرخ رنگ کے پتھر کا ایک بلند و بالا دروازہ ہے۔ ان عمارات کا سرخ رنگ انتہائی دلفریبی سے کونوں پر موجود سفید سنگ مرمر کے خوشنما میناروں کے علاوہ نیلے رنگ کی روغنی ٹائلوں اور دقیق خوبصورتی کے منبت کاری کے خوش نما کام سے علیحدہ کیا گیا ہے۔ دروازوں کی شاہانہ بلندی اور شان و شوکت اس قدر ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر کسی محل کا گمان ہوتا ہے۔

صدر دروازہ: مقبرہ سے بہت پہلے اس کے بلند و بالا و نازک مینار اور سفید گنبد آ جاتے ہیں' جو کافی دور ہی سے سیاح کی آنکھ کو خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچنے پر آپ 70 فٹ سے زائد بلند مغربی یا صدر دروازہ سے گذرتے ہیں' جس کی شکستہ برجیاں اور دوہری محرابیں ہیں' ایک کا رخ دروازے کی جانب اور دوسری کا مرکزی چبوترے (جس پر مزار موجود ہے) کے اوپر پتھر کے چار عظیم الشان پلوں میں سے ایک کی طرف ہے۔

نقار خانہ: صدر دروازہ کے اوپر ایک برآمدہ کے ساتھ ایک محرابدار کشادہ کمرے پر مشتمل نقار خانہ ہے' جہاں سے صبح کے وقت طلوع آفتاب سے ایک گھڑی بعد مرحوم بادشاہ کے اعزاز میں نقارے بمعہ کرنا (97) نفیری (98) سرنا (99) اور دیگر آلات موسیقی بجائے جاتے تھے۔ وہ کمرہ جہاں کبھی شاہی موسیقی بجائی جاتی تھی' اب ایک برطانوی سارجنٹ کے قبضہ میں ہے۔ وہاں مزار کے مجاوروں اور ملاؤں کے حجرے بھی ہیں' جو قبر پر قرآن پاک کی لگاتار تلاوت کیا کرتے تھے۔ چاروں کشادہ حصوں کے اندرونی احاطوں میں باغات لگائے گئے ہیں جو ہر قسم کے پھلدار درختوں سے بھرپور ہیں (ان میں سے املی اور چند دیگر اقسام کے درخت اتنے ہی پرانے ہیں جتنا مقبرہ) مگر باغات اب مکمل طور پر بے توجہی کا شکار ہیں' حتیٰ کہ پل تختوں کے وسط میں بڑے بڑے تالاب اور شاندار فواروں کے حوض اور خوشبودار پھولوں اور مہکتی ہوئی جنگلی بیلوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی نہریں' جو کبھی اس "فردوس بریں" کی خوبصورتی میں اضافہ کیا کرتے تھے' خشک ہو گئے ہیں۔ سفید سنگ مرمر کا چبوترہ جو ان شاندار روشوں کی حد بندی کرتا ہے' اس کی بنیاد 400 فٹ طویل اور اسی قدر چوڑی ہے اور اس کے اوپر مخروطی شکل کے نفیس برآمدوں کی صورت میں سنگ سرخ کی ایک انوکھی عمارت استادہ ہے۔ زیریں منزل کی بلندی



شہنشاہ اکبر کا مقبرہ



شہنشاہ اکبر کی آخری آرامگاہ

30 فٹ ہے' جس کی پیمائش ہر جانب ماسوائے کونوں کے میناروں کے 320 فٹ ہے اور یہ مکمل طور پر کشادہ اور کھلی محرابوں پر مشتمل ہے' ہر جانب ان کی تعداد دس ہے' ان کے ارد گرد گنبدیوں کی قطاریں ہیں' تین مشرق کی طرف ہیں' مغربی اور شمالی جانب والے گنبد بڑے اور بلند ہیں اور جنوب میں قبر کے اوپر والا چوتھا گنبد سب سے بلند ہے۔

مردہ خانہ: صدر دروازے سے مردہ خانے تک ایک ڈھلوان راستہ جاتا ہے' یہ 38 مربع فٹ کے ایک تہ خانے پر مشتمل ہے اور یہاں پتھر کے ایک سادہ سے تعویذ کے نیچے (جو اپنی سادگی میں ممتاز ہے) عظیم شہنشاہ کا جسد خاکی محو استراحت ہے۔ ایوان میں گہرے نیلے رنگ اور سنہرے کام کا پلستر ہے۔ عام اسلامی رسم کے برعکس (جس کے مطابق مردے کا چہرہ مکہ مکرمہ کی طرف کیا جاتا ہے) اکبر کی قبر اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس کا سر مغرب کی طرف ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کا چہرہ مشرق کی طرف ابھرتے ہوئے سورج کی طرف ہو گیا ہے' اس سے بادشاہ کے ہندوانہ رجحان کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ مزار پر ہروقت پھولوں کی چادریں پڑی رہتی ہیں' آنجہانی گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے اپنے خرچ پر اس کے لئے زرق برق چادر مہیا کر کے عالی ہمت بادشاہ کے لئے اپنے ستائشی جذبہ کا ثبوت دیا ہے۔ مرحوم شہنشاہ اکبر کی یاد اس میں موجود صحیح وصف کے سچے عاشقوں کے اسی قسم کے اعتراف کی مستحق ہے۔ جب ایک عظیم جرمن مفکر نے اس بلند خیالات کے حامل بادشاہ کی قبر پر پھول رکھے تو اس میں جوش و ولولہ پیدا ہو گیا۔ پرنس فریڈرک آگسٹائن آف پلیسوگ ہولسٹین' کاؤنٹ وان نوئیر کے قلم سے مندرجہ ذیل اقتباس سے کچھ اس طرح ظاہر ہو گا: "تب وہاں میرے ذہن میں واضح طور پر ہردلعزیز اور وسیع القلب سلیمین کے چند الفاظ آ گئے' وقت اور مقام کے تمام حالات پر غور کرتے ہوئے اور دنیا کے ایک شہری کی طرح محسوس کرتے ہوئے اکبر بادشاہوں کے درمیان مجھے اسی طرح معلوم ہوتا ہے' جس طرح شیکسپیئر شاعروں کے درمیان ہے۔ میں جن دوسرے بادشاہوں کی تاریخ سے واقف ہوں' ان کے مقابلہ میں کسی بھی بادشاہ کے مزار سے زیادہ میں اس کے مزار کی سنگ مرمر کی اس تختی کا احترام کرتا ہوں۔ میں خود بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ اکبر کے مزار کی طرح کسی اور جائے مدفون نے مجھے اس قدر متاثر نہیں کیا۔"

بادشاہ کے نوادرات: قبر کے ساتھ بادشاہ کی کتب' ملبوسات اور زرہ بکتر اس طرح تیار پڑے تھے کہ اگر وہ زندہ ہو جاتا تو اسے دستیاب ہوتے مگر گزشتہ صدی کے دوران انہیں بھرت پور کے جاٹ اپنے ساتھ لے گئے' پس یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اگر اس ریاست میں ان نوادرات کی تلاش کی جائے تو کسی جگہ سے ان کا پتہ چل سکتا ہے۔

پہلے برآمدے پر 14 فٹ 9 انچ بلند دوسرا برآمدہ ہے' جس کی ہر جانب پیائش 186 فٹ ہے۔ تیسرا 15 فٹ 2 انچ اور چوتھا 14 فٹ 6 انچ بلند ہے' یہ سب سنگ سرخ کے کنگوروں' کھمبوں' محرابوں اور ستونوں پر مشتمل ہیں' ہر برآمدہ جسامت میں بتدریج کم ہوتا جاتا ہے مگر کھلے محرابدار برآمدوں میں چوٹی پر ان کا اختتام ایک کشادہ احاطہ میں ہوتا ہے' جو ہر طرف سے 157 فٹ ہے اور یہ سب سے نچلے برآمدے کی جسامت کے مقابلہ میں نصف ہے۔ پورے مقبرہ کی بلندی 100 فٹ ہے۔ مقبرے کے جنوب کی طرف عظیم الشان محراب کے قریب ایک طویل سیڑھی کے زینے بالائی یا دوسرے برآمدے کی طرف جاتے ہیں' ان کے چاروں طرف (دوسروں کی مانند) نازک محرابوں پر ا ستادہ خوبصورت ستونوں کی قطاریں ہیں' یہ بہت کشادہ اور ہوادار ہے اور یہاں سے چاروں طرف کے علاقہ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ بالائی منزلوں پر بھی اسی قسم کے زینوں کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے' جبکہ یہ ذرا چھوٹی جسامت کی ہیں۔ ان طویل زینوں پر چڑھنے کا عمل تھکا دینے والا ہے۔ مگر جب ہر مرحلہ پر کشادہ اور دلفریب کمروں کا نظارہ اور ہوا کا جھونکا حاصل ہوتا ہے اور سرسبز و شاداب کھیتوں اور اس بہشت بریں کے چاروں طرف بکھری ہوئی قدیم عمارات کے کھنڈرات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو اس ساری مشقت کا معاوضہ مل جاتا ہے۔

بلند ترین منزل: سب سے اوپر والی منزل بالکل کھلی ہے اور اس کے اردگرد انتہائی خوبصورت نقش و نگار سے مزین سنگ مرمر کی جالیوں پر مشتمل بیرونی دیوار ہے' جسے اسی پتھر کی ٹھوس سلوں میں انتہائی نزاکت اور باریکی سے کندہ کیا گیا ہے اور یہ انتہائی پاکیزہ اور پیچیدہ کاری گری کے مختلف نمونوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ حاشیے اور سنگ مرمر کی جالیوں کا کام حیران کن عمدگی اور بوقلمونی کا حامل ہے اور خاص طور پر اسی مقصد کے تحت ان میں مساوی وقفوں پر چھوڑی ہوئی درزوں سے شمال مشرق میں دریائے جمنا کے بل کھاتے ہوئے راستہ اور مشرقی افق پر ابھرتے ہوئے چاند کی طرح تاج محل کے سفید گنبدوں کے علاوہ پورے علاقہ کا وسیع نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ منزل اندرونی جانب خالص سنگ مرمر کے ستونوں کی قطاروں سے آویزاں ہے۔ مسٹر ٹیلر یہاں کے خوبصورت منظر کے بیان میں قطعی طور پر پرجوش ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

"میرا خیال تھا کہ سیویلے (ہسپانیہ) کا القصر اور گریناڈا کا الحمرا خالص ترین اسلامی طرز میں میرے سامنے آئے تھے' مگر میں غلطی پر تھا' میں نے جو کچھ شان و شوکت مغلوں کی دیکھی اور جو کچھ ان کے بعد دیکھا' اس نے ایک شاندار خواب کی طرح مجھ پر غلبہ پا لیا ہے۔"

بالائی منزل پر دوسرا مزار: سفید سنگ مرمر کے احاطہ کے وسط میں ایک بلند چبوترے پر

سب سے نچلے برآمدے کے اصل مزار کی طرح بالکل اسی مقام پر دوسرا مزار ہے۔ سنگ مرمر کی انتہائی خوبصورت جالیوں کے ذریعے چبوترے کا احاطہ کیا گیا ہے' تعویذ کو خالص ترین سفید سنگ مرمر کے ایک ہی ٹھوس ٹکڑے سے تراشا گیا ہے اور اس پر اس قدر دلفریب اور جاندار نقش و نگار میں خوشنما کندہ کاری کی گئی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے' جیسے برف کی طرح سفید چادر پر شگوفے اور پھول بکھرے ہوئے ہوں۔ تعویذ کے سرہانے پر فارسی رسم الخط کے ابھرے ہوئے الفاظ درج ہیں:-

اللہ اکبر: (100) یہ دو الفاظ اتنا کہنے کے لئے کافی ہیں کہ اس کے نیچے کون دفن ہے۔ قبر کے پاؤں کی طرف یہ الفاظ نمایاں ہیں۔

جل جلالہ'

تعویذ کے پہلوؤں میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے 99 اسمائے مبارکہ ابھرواں نقش و نگار میں عربی رسم الخط کے ابھرے ہوئے الفاظ میں درج ہیں۔ چاروں کونوں پر سفید سنگ مرمر کے کنگورے ہیں' جن کے گنبدوں پر سنہری ملمع سازی کے ساتھ روغنی چینی ٹائلیں لگائی گئی ہیں' یہ تعویذ اپنی بنیاد پر سفید اور سیاہ سنگ مرمر کے پچی کاری سے مزین فرش سے گھرا ہوا ہے۔ جبکہ اس کے سر کی طرف نصف ستون کی چوٹی پر چند انچ کے قطر کا ایک گول گڑھا ہے جہاں گزشتہ زمانے میں ایک سنہری عود دان رکھا جاتا تھا۔

مینار: بہشت آباد کے باغ کی طرف صدر دروازہ کے اطراف میں دونوں میناروں کی چوٹیوں کو 1764ء میں آگرہ کی لوٹ مار کے وقت جاٹوں نے اڑا دیا' چنانچہ وہ ان شاندار عمارات پر اپنی وحشت و بربریت کے نشانات چھوڑ گئے۔ میناروں کو پہلے گنبدوں اور کھلے برآمدوں سے مزین کیا گیا تھا' انہیں کافی عرصہ پہلے مسمار کر دیا گیا۔ فرگوسن کا خیال ہے کہ بالائی منزلوں کو کبھی بھی مکمل نہیں کیا گیا تھا' ——— اس برآمدے پر بنیادوں کے آثار سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ سنگ مرمر کے موجودہ احاطے پر ایک شاندار چھت اور بہت بڑی جسامت کا گنبد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ تاہم' ہو سکتا ہے اس کی ماہیت کی باطنی قدروقیمت کو الگ کرنے کے لئے کوئی چیز موجود نہ ہو۔ طرز تعمیر میں مخصوص' منصوبہ اور انصرام میں انوکھی' یہ فن کا ایک مکمل اور نادر نمونہ ہے۔

جرمن شہزادے کے بیان کے مطابق' یہ عمارت کے اس قدر قرب میں واقع ہے کہ کوئی شخص اس کی عالی شان بلندی اور اس کی حیران کن عمدگی اور خوبصورت بوقلمونی سے مجموعی تاثر لے لیتا ہے۔ اس میں اس قدر حقیقت ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو کسی قدیم داستان کے پریوں

کے قلعہ کے روبرو کھلتا ہے۔ ممتاز شہزادہ اس یادگار کے بارے میں اپنے فصیح و بلیغ بیان کا اختتام اس طرح کرتا ہے: "میرے لئے یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح تھا مگر آگرہ واپسی پر میں نے اکبر اور اس کے دور کی یاد کو ذہن میں محفوظ رکھنے کا تہیہ کر لیا۔"

اگرچہ اس مقبرے کا نقشہ خود اکبر نے بنایا تھا اور اس نے اپنی زندگی ہی میں اس کا بہت بڑا حصہ تعمیر کروا لیا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تکمیل اس کے بیٹے اور جانشین جہانگیر کے دور میں ہوئی' جس نے عمارات میں ترمیم کر دی۔ اس بادشاہ نے دور حکومت کے تیسرے برس کے واقعات کے متعلق اپنی تزک جہانگیری میں اس مقبرے کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان درج کیا ہے:

"17 جمادی الثانی' بروز سوموار کو میں نے اپنے والد عرش آشیانی (101) کی منور آرام گاہ کو اپنا خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آگرہ سے پیدل سفر شروع کر دیا' اگر میرے لئے یہ ممکن ہوتا تو میں اپنی پلکوں کے ذریعے اور سر کے بل یہ دور دراز کا سفر طے کرتا۔ میرے قابل احترام والد نے میری پیدائش کے لئے اپنی منت پوری کرنے کی خاطر حضرت خواجہ معین الدین سنجری چشتیؒ کے مقبرہ پر حاضری دینے کے لئے فتح پور سے اجمیر تک 120 کوس کا سفر پیدل طے کیا۔ اگر میں اپنی پلکوں اور سر کے بل یہ فاصلہ طے کرتا تو اس میں کون سا حیران کن عمل تھا؟ اس منور مقبرے کی حاضری کی سعادت حاصل کرنے پر میں نے اس پر تعمیر کردہ عمارات کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر صدمہ پہنچا کہ یہ میری خواہش کے مطابق نہیں تھیں' کیونکہ میری خواہش تھی کہ عمارت ایسی ہونی چاہئے کہ دنیا کے دور دراز کونوں سے آنے والے سیاح اس بات کا اعتراف کر سکیں کہ انہوں نے کرہ ارض پر اس جیسی عمارت کہیں نہیں دیکھی۔ جس وقت عمارت زیر تعمیر تھی بدقسمت خسرو نے بغاوت کر دی اس لئے میں وقت کی ضرورت کے تحت لاہور روانہ ہو گیا۔ ماہرین تعمیرات نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اسی طرز پر کام جاری رکھا جس کو وہ بہتر خیال کرتے تھے' انہوں نے چند اختراعات کیں' حتیٰ کہ عمارت کے لئے منظور کردہ تمام روپیہ تین یا چار سال کے عرصہ میں خرچ ہو گیا۔ میرے حکم سے فن تعمیر میں ماہر دیگر کاریگروں نے ماہر مہندسوں کے مشورہ سے' منظور کردہ نمونوں کے مطابق چند حصوں کو از سر نو تعمیر کیا۔ کافی حد تک ایک شاندار عمارت تعمیر کر دی گئی۔ مقبرہ منور کے ارد گرد وسیع و عریض باغات لگائے گئے اور سفید سنگ مرمر کے میناروں پر مشتمل ایک بلند و بالا اور شاندار دروازہ تعمیر کیا گیا۔

عمارت کی لاگت: مجھے اطلاع دی گئی کہ ایران کے پچاس ہزار تمن اور (توران کا موجودہ سکہ) 45 لاکھ خانی کے مساوی پندرہ لاکھ روپے عمارت پر خرچ کر دیئے گئے۔"

تھامس ہربرٹ (جس نے جہانگیر کے دور میں آگرہ کا دورہ کیا) نے اپنے سفرنامہ میں سکندرا کے مقبرہ کا مندرجہ ذیل بیان درج کیا ہے:۔

"جب ہم لاہور جاتے ہیں تو آگرہ سے پانچ میل کے فاصلے پر سکندرا کے مقام پر مغل اعظم کا مقبرہ ہے' اس کی بنیاد اکبر نے شروع کی' بالائی عمارت کی تعمیر اس کے بیٹے جہانگیر نے جاری رکھی اور ابھی بمشکل مکمل ہوئی تھی کہ وہ ہندوستان کے اس عجوبے پر چودہ ملین روپے خرچ کر چکے تھے۔

اس ممتاز عمارت کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسی یادگار سے زیادہ عظیم عمارت سورج نے پوری دنیا میں نہیں دیکھی۔" (102)

مقبرہ کی طرف کھلنے والے عظیم الشان جنوبی دروازہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

مرحبا خورم فضائی خوشتر از باغ بہشت

مرحبا عالی بنائے برتر از عرش برین

بختے او راہزاران روضہ رضوان غلام

روضہ او راہزاران جنت الماوے زمین

کلک معمار قضا بنوشت بر درگہ او

ھذہ جنات عدن فادخلوھا خالدین

کتبہ عبدالحق شیرازی فی 1022

ترجمہ: اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان (اور) نہایت رحم کرنے والا ہے۔ آفرین اے خوش فضا کہ تو باغ بہشت سے زیادہ خوشگوار ہے! آفرین اے عالی شان عمارت کہ تو عرش بریں سے زیادہ بلند ہے! ایک ایسی جنت' جہاں رضوان جیسے ہزاروں غلام ہیں' ایک ایسا باغ' جہاں ہزاروں جنت الماوی اس کی تفریح گاہیں ہیں۔ معمار قضا کے قلم نے دروازے کے اوپر درج کیا ہے: "یہ باغ عدن ہے' تم اس میں جنت میں داخل ہونے والوں کی طرح داخل ہو جاؤ۔ (1613ء) 1022 ہجری میں تحریر کردہ عبدالحق شیرازی۔ (103)

دروازے کے اندرونی جانب مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

بفرمان شاہنشہ ذوالجلال	کہ باشد شہنشاہیش بے زوال
شد آراستہ آنچنان روزگار	کہ حیران شد اندیشہ ہوشیار
بگیتیے زفیض از بادشاہ	بود سا یہ نور ذات الہ
چو از دھر آن سایہ گردد نہاں	نہد سایہ دیگر اندر جہاں
بدنیا بود تاسر انجام کار	بنزد خرد گردش روزگار
زمانہ دگرگوں شو دھر نفس	نگر در بیک گونہ باہیچکس
فلک رتبہ شاہ اکبر عرش گاہ	کہ از ہیبتش کوہ گشتی چوکاہ
نشستی چو بر تخت شاہنشہی	گرفتے جہاں فر ظل الٰہی
فرو زندہ افسرو تخت بود	کریم و رحیم و جوان بخت بود
دل روشن و جان آگاہ داشت	جہان خورد و داد و گرفت و گذاشت
بباغ جہان تخم نیکی بکشت	برآن گرفت و ریاض بہشت
روانش چو انوار خورشید و ماہ	فرو زندہ باد از نور الہ

ترجمہ: اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان (اور) نہایت رحم کرنے والا ہے۔

شہنشاہ ذوالجلال کے حکم سے کہ جس کی کائنات پر حکومت لازوال ہے' دنیا کو اتنی کثرت سے نوازا گیا ہے کہ اس کا ادراک کرنے کی کوشش میں دانشمند کی عقل ششدر رہ گئی۔

اللہ کے فضل و کرم سے اس جہاں میں ایک بادشاہ خدا کے جاہ و جلال کا سایہ ہوتا ہے۔ جب یہ سایہ دنیا سے پوشیدہ ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ اس دنیا پر ایک دوسرا سایہ بھیج دیا جاتا ہے۔ اسی انداز میں دنیا کے معاملات نپٹائے جاتے ہیں' دانشمند جانتا ہے کہ وقت کا چکر گھومتا ہے' ہمارے ہر سانس کے ساتھ وقت بدلتا ہے۔ کوئی بھی ایک ہی حالت میں نہیں رہتا۔ بادشاہ اکبر کی شان آسمان جیسی کی گئی ہے اور اس کا رتبہ عرش کی طرح بلند کر دیا گیا ہے۔ اس کے حکم سے پہاڑ گھاس کے ایک تنکا میں بدل سکتا ہے۔ جب وہ تخت شاہی پر رونق افروز ہوئے تو اللہ کے فضل سے دنیا کی شان و شوکت بڑھ گئی ہے۔ تخت و تاج کو زینت بخشنے والے' فیاض' رحمدل اور خوش قسمت' وہ پاکیزہ روح اور روشن دل کے حامل تھے۔ انہوں نے اس دنیا پر حکومت کی' اسے جیتا' اسے بخشا اور آخر کار اسے چھوڑ دیا۔ دنیا کے باغ میں انہوں نے نیکی کا بیج بویا' اس کے پھل کو چکھا اور پھر جنت کی طرف رخصت ہو گئے' خدا کرے ان کی روح سورج اور چاند کی کرنوں کی طرح ہمیشہ خدا کے نور سے تابانی حاصل کرتی رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

شاہ اکبر زروئے دانائی گر بظاہر زدھر فانی رفت
دوحش بیزوال بود ازان دل بدنیائے بازوال نہ بست
مرغ روحش چوبود طایر عرش رفت و برآشیان خویش نشست
دوام ملک بقائے قدیم کس رانیست
خدائیر است بقائے قدیم و ملک دوام

ترجمہ: اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

گرچہ بادشاہ اکبر نے ازروئے دانائی بظاہر اس فانی دنیا کو چھوڑ دیا' مگر وہ اپنے ملک کی طرح لازوال ہیں۔ انہوں نے اس فانی دنیا میں اپنا دل نہیں لگایا —— چونکہ ان کی روح عرش کا پرندہ تھی' چنانچہ وہ یہاں سے پرواز کر کے اپنے گھونسلے میں جا بیٹھی ہے۔ کوئی آدمی دوام ملک اور بقائے حیات سے واقف نہیں تھا۔ بقائے قدیم و ملک دوام صرف اکیلے خدا ہی کو سزاوار ہے۔

دروازے کی محراب پر مندرجہ ذیل قطعہ اور بادشاہ کی تاریخ وفات درج ہے:-

طاقیکہ از رواق نہم چرخ برتر است
روشن زلمعہ اش رخ تابندہ اختر است
این طاق زیب نہ فلک و ہفت کشور است
از روضہ منور شاہ اکبر است
تاریخ دواز دھم جمادی الآخر سنہ ہزار و چہار دہ ہجری

ترجمہ: یہ طاق نویں آسمان سے بھی بلند تر ہے۔ اس کے سایہ نے روشن ستاروں کو بھی منور کیا ہے۔ اس طاق نے نو آسمانوں اور ہفت کشور کو زیب و زینت بخشی ہے۔ کیونکہ یہ بادشاہ اکبر کا روضہ منور ہے۔

(12 جمادی الآخر' 1014ھ (1605ء)

بالائی منزل پر مزار کے تعویذ کے گرد محرابوں پر مندرجہ ذیل نظمیں درج ہیں۔ 36 محرابی دروازے ہیں' ہر جانب نو عدد ہیں' ہر محراب پر ایک شعر درج ہے:-

بنام شهنشاه ملک قدم … که ذاتش مبرا بود از عدم

همه پادشاهان روے زمین … ازو صاحب تاج و تخت و نگین

کند از عام آشکارا وجود … بود ذات او مظهر عدل وجود

ز لطفش که و مه طلبگار کام … بود درگهش قبله خاص و عام

نگارنده جوهر آب و خاک … طرازنده گوهر جان پاک

دو عالم زفیض ازل آفرید … یکی کرد پنهان و دیگر پدید

بجمشید انگه سرائے سپنج … به شاهان با افسر و تاج و گنج

که از عدل ایشاں شود روزگار … شگفته تر از باغ در نو بهار

ره داوری را چو گیرند پیش … شناسند بیگانه را همچو خویش

شہے کو چنیں زیست در روزگار … بود سایه ذات پروردگار

ز شمد فزوں بود شصت و دو سال … که شاه اکبر آن سایه ذوالجلال

بپالائے زرینه مسند نشست … بر تخت او گشت افلاک پست

جهاں رابیا راست از عدل و داد … دل اهل عالم ازو گشت شاد

بر پایه تختش از هر گروه … شده جمع مردان صاحب شکوه

بهرار گمند نظر سوے خاک … بگوهر شدے عتراز جان پاک

گرفتے بیک حمله ملکی برزم … بایماے ابرو بدادے ببزم

چو لطف خدا لطف او عام بود … بهر کار چشمش بانجام بود

بدرگاه او هر که بردے پناه … چو اندیشه رفتے زماهی بماه

چناں پرشد آوازه اش در جهاں … که در دل نگنجید راز نهاں

پرداخت آنگونه روے زمین … که کرد آفرینش جهان آفرین

بگنجیے دو افزوں زه پنجاه سال … چنین کرد شاهی زروے جلال

چو از عدل آباد کرد ایں جهان … سوے آن جهاں رفت روشن رواں

شاه هفت کشور ازین پیش بود … کنون هفت جنت مسخر نمود

بنزد خرد مند هشیار دل … سرا ایست این عالم آب و گل

بجو مہر از جوہرنہ سپہر — کہ باکس بپایان نبرد است مہر
سپہر ست برکینہ مہرش مدار — کہ باکینہ ور مہر ناید بکار
جہان است مانند موج برآب — ازان شتہ دل کے شود کامیاب
نہ بست است پیمان بہ کس روزگار — کہ شکست آزا بہنگام کار
نماند بگیتی کے جاوداں — زدست اجل کس نبردست جان
چہ خوش گفت آن کامل نکتہ سنج — کہ از گوہر دانش اندوخت گنج
جہاں اے برادر نماند بکس — دل اندر جہان آفرین بندو بس
شداز عدل شاہ اکبر کا مگار — بسان بہشت برین روزگار
جہان گشت خورم بدروران او — زمین وزمان شد بفرمان او
ولی دھر بے مہر پیمان گسل — زکین مہر ازکرد بیرون زدل
زتاثیر جہری این جہاں — روان شد سوے عالم جاوداں
روانش ہمیشہ زحق شادباد — از و عالم قدس آباد باد

ترجمہ:- "شہنشاہ ملک قدم کے نام سے کہ جس کی بادشاہت بے زوال ہے۔ کہ ارض کے تمام بادشاہان اسی سے تخت و تاج اور تمکین حاصل کرتے ہیں۔ وہ عدم سے وجود کو پیدا کرتا ہے' اسکی ذات والا صفات عدل اور شان و شوکت کی مظہر ہے۔ بڑے اور چھوٹے اسی کے لطف و کرم کے محتاج رہتے ہیں' خاص و عام اسی کے آستانے پر دعا کرتے ہیں۔ جوہر آب و خاک کو پیدا کرنے والا' گوہر جان پاک کو زندہ کرنے والا' اس نے اپنے فیض ازل سے دو عالم تخلیق کئے' ایک کو پنہاں اور دوسرے کو آشکار کر دیا۔ تب اس نے اس عارضی سرائے میں بادشاہوں کو تخت و تاج اور خزانہ عطا کر دیا: تاکہ ان کے دل سے دنیا باغ نو بہار کی طرح شگفتہ تر ہو جائے۔ جب وہ عدل کرنے بیٹھتے ہیں تو اجنبی سے بھی اپنے آدمی کی طرح کا سلوک کرتے ہیں۔ ایک بادشاہ جو اس جہاں میں زندگی گذارتا ہے وہ اصل میں سایہ پروردگار ہے۔ سال 962 میں سایہ ذوالجلال۔ اکبر بادشاہ سونے سے آراستہ نشست (104) پر بیٹھا' آسمان اسکے تخت کے سامنے جھکتے ہیں۔ اس نے دنیا کو عدل و مساوات سے مزین کر دیا اور لوگوں کے دل خوش کر دیئے۔ اس کے تخت کے آگے ہر قبیلہ اور قوم کے مردان صاحب شکوہ جھکتے تھے' اگر وہ مہربانی سے مٹی کو دیکھتا تو وہ جان پاک کے گوہر سے زیادہ قیمتی ہو جاتی۔ میدان جنگ میں ایک ہی حملہ سے وہ ملک کو فتح کر لیتا مگر بزم میں وہ ابرو کے اشارے سے لوگوں کو نوازتا تھا۔ خدا کے لطف و کرم کی طرح اس کا لطف و کرم عام تھا' ہر کام کے انجام پر نظر رکھتا۔ جو کوئی اس کے دربار میں پناہ کا خواستگار ہوتا اس کا

رتبہ زمین سے چاند تک بڑھ جاتا۔ یہ جہاں اس کی شہرت سے اس قدر لبریز ہو گیا کہ دل میں کسی راز کو پوشیدہ رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہ رہی۔ اس نے روئے زمین کو اس قدر آراستہ کر دیا کہ جہان کو پیدا کرنے والے نے اسے آفرین کہا۔ اس نے 52 سال تک اس دنیا پر بڑی شان کے ساتھ حکومت کی اور اپنی عادلانہ حکومت سے دنیا کو خوشحال کر دیا۔ وہ ایک درخشاں روح کے ساتھ دوسرے جہاں کی طرف رخصت ہوا۔ اس سے پہلے وہ ہفت کشور کا بادشاہ تھا' اب اس نے سات آسمانوں کو مسخر کر لیا ہے۔ دانشمند اور ہوشیار ذہن کے نزدیک آب و گل کا یہ جہاں ایک سرائے ہے۔ اس دنیا سے دوستی نہ کر کیونکہ دوستی کبھی کسی کے ساتھ نہیں رہتی۔ دنیا انتقام پر مائل رہتی ہے' اپنا ذہن اس کے ساتھ مت لگا کیونکہ پر انتقام جذبے کی حامل دوستی کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا پانی میں ایک لہر کی طرح ہے' جس سے پیاسا اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا۔ دنیا کسی کے ساتھ عہد و پیمان نہیں کرتی کیونکہ جب اس کو پورا کرنے کا وقت آیا تو اس نے اسے نہیں توڑا۔ کوئی بھی ہمیشہ کے لئے اس جہان میں نہیں رہا۔ کوئی خود کو موت کے ہاتھوں سے نہیں بچا سکا۔ اس کامل نکتہ سنج (105) نے کیا خوب کہا ہے کہ اس نے علم و فضل کے خزانے سے زبردست دولت جمع کی ہے۔

میرے بھائی! دنیا کبھی بھی کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہی' اپنے دل
کو خالق جہان ہی کے ساتھ وابستہ کر!
بادشاہ اکبر کامگار کے عدل سے دنیا بہشت بریں کی طرح ہو گئی۔
اس کے دور میں سب لوگ خوش ہو گئے۔ زمین و آسمان اس کے
زیر نگیں تھے۔
افسوس ! بے رحم وقت جس نے کسی کے ساتھ وفا نہیں کی
اس نے اپنے دل سے اس کے لئے مہر و محبت کو ختم کر دیا۔

اس دنیا کی بے وفائی کے باعث وہ عالم جاوداں کی طرف رخصت ہو گیا۔ خدا اس کی روح کو ہمیشہ خوش رکھے اور عالم قدس اس سے آباد رہے!

مزار' آرام بانو: اکبر کے مزار کی مشرقی جانب ایک کمرے میں اس کی بیٹی آرام بانو بیگم کی قبر ہے۔ سنگ مرمر کا تعویذ نادر خوبصورتی کا حامل ہے اور اسے نہایت پاکیزہ اور عمدہ کندہ کاری کے زیبائشی کام سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تعویذ کے سرہانے پر یہ درج ہے:

اللھم اغفرلی ذنوبی

"اے خدا میرے گناہ معاف کر دے"۔

اور اس کے پاؤں کی طرف عبارت درج ہے:

هذا القبر آرام بانو

"یہ آرام بانو کی قبر ہے"

تعویذ کے دونوں جانب فارسی رسم الخط میں قرآن پاک کی آیت الکرسی درج ہے۔

شکر النسا بیگم کا مزار: اکبر کے مزار کی غربی جانب ایک دوسرے کمرے میں اس کی ایک اور بیٹی شکر النساء بیگم (106) کا مزار ہے۔ طرز تعمیر کی شان و شوکت اور عمارت کی عمدگی اور نفاست کے معاملہ میں یہ بالکل آرام بانو کے مزار سے مماثلت رکھتا ہے۔ قبر کے سر کی جانب یہ دعا درج ہے:

اللهم اغفر ذنوبی

"اے خدا میرے گناہ معاف کر دے"

هذا القبر شکر النسا بیگم

"یہ شکر النسا بیگم کی قبر ہے"

مرزا سلیمان شکوہ کا مزار: مذکورہ بالا مزارات کے قریب بادشاہ شاہ عالم کے بیٹے اور اکبر شاہ ثانی کے سگے بھائی مرزا سلیمان شکوہ کا مزار ہے' جس کا (1837ء) 1253ھ میں آگرہ میں انتقال ہوا اور اسے یہاں دفن کیا گیا۔

سنگ مرمر کے تعویذ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

اللہ و محمد صلی اللہ علیہ وسلم و علی علیہ السلام فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حسن علیہ السلام و حسین علیہ السلام

چو فرمود رحلت سلیمان شکوہ ز دار الفنا سوے ملک بقا
بسال دو صد الف و پنجاہ و سہ بہ ذیقعد بست و نہم زین سرا
در آن دم ز ہاتف ندا این رسید بگو کرد بر شاہ رحمت خدا

لوح منور مرشد زادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ ابن محمد شاہ عالم بادشاہ غازی

ترجمہ :- اللہ' محمد صلی اللہ علیہ وسلم' علی علیہ السلام' فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام

جب مرزا سلیمان شکوہ نے دار الفنا سے ملک بقا کی طرف رحلت فرمائی' تو وہ 1253ھ کا سال اور ذیقعد کی 29 تاریخ تھی۔ اس وقت غیبی آواز کو یہ کہتے سنا گیا' کہو خدا نے بادشاہ پر اپنی

رحمت کی ہے۔

"لوح منور شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ ابن محمد شاہ عالم بادشاہ غازی"

ایک اور مزار: اس مزار کے مغرب میں ایک اور مزار ہے' جو اپنے نقشہ کی پاکیزگی اور اپنے زیبائشی کام کی نفاست کے لحاظ سے بہت زیادہ دلچسپی کا حامل ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس کا مزار ہے۔ مسٹر نٹل نے اپنی تصنیف "مفتاح التواریخ" میں اندازہ لگایا ہے کہ یہ مرزا ہندال کی بیٹی اور اکبر کی پہلی بیوی رقیہ سلطان بیگم کا مزار ہے۔ جو 1030ھ میں آگرہ میں انتقال کر گئی تھی۔ تعویذ پر عربی عبارت کچھ اس طرح ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

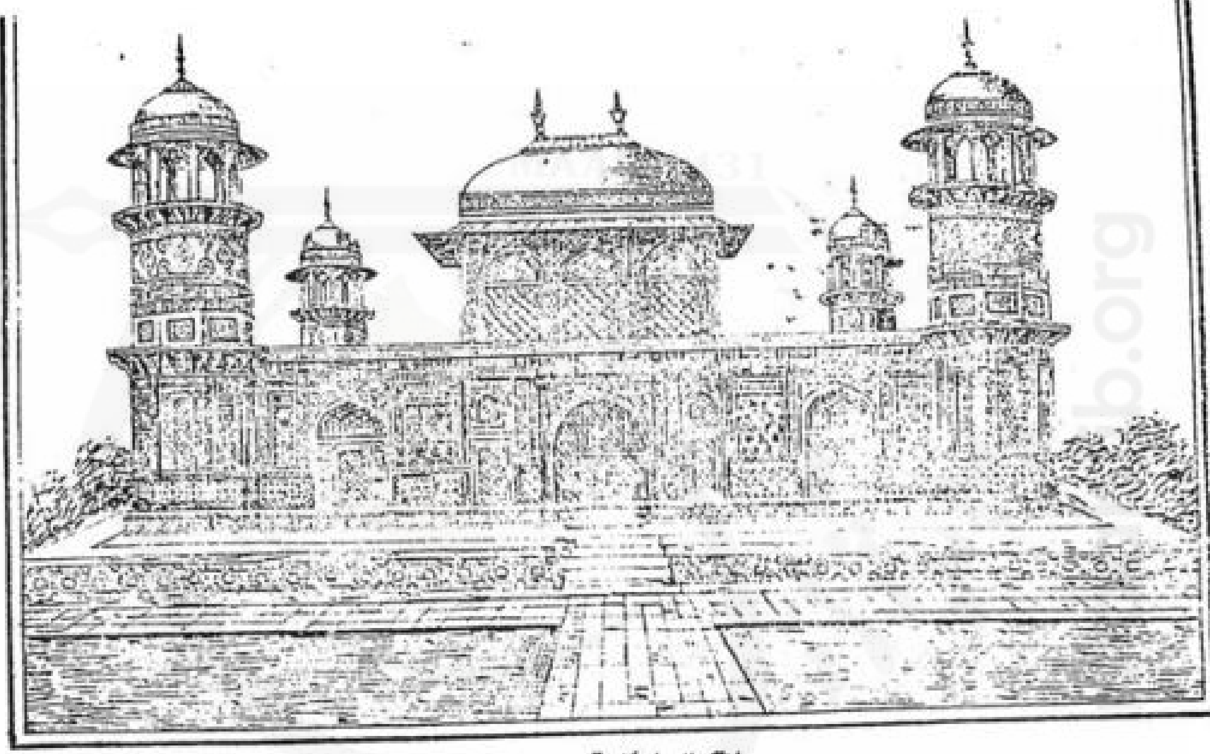
لا الہ الا للہ الملک الحق المبین۔ لا الہ الا اللہ الخالق العلیم۔ لا الہ الا للہ رب الجلال المبین۔ اشہدان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ و اشہدان محمد اعبدہ و رسولہ۔ اشہدان وحدہ حق الموت فی المیت حق۔ و النار حق والتوریتہ والانجیل حق والزبور حق۔ والفرقان حق۔ والمیزان حق والصراط حق و ان الساعت آتیتہ لاریب فیہا۔ وان اللہ معبث من القبور برحمتک یا ارحم الراحمین۔

ترجمہ:۔ اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان (اور) نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور وہی اصلی مالک اور حق المبین ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور وہی علم کا خالق اور مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور وہی رب جلیل اور مبین ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول اور بندے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کی وحدت حقیقی ہے۔ اور مردے کی موت حقیقی ہے: جہنم کی آگ سچ ہے۔ توریت' انجیل' زبور اور قرآن پاک سچی کتابیں ہیں۔ روز جزا کا میزان سچ ہے: پل صراط سچ ہے۔ بے شک روز جزا نے آنا ہے: اس کے بارے میں کوئی شک نہیں اور یقیناً خدا نے مردوں کو اس روز زندہ کرنا ہے۔ اے ارحم الراحمین! میں تیری ہی رحمت پر بھروسہ کرتا ہوں۔

اعتماد الدولہ کا مقبرہ

سنری پل کے پار دریا کے بائیں کنارے پر ایک باغ میں اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے۔ یہ باغ



اعتماد الدولہ کا مقبرہ

کے وسط میں 149 فٹ مربع اور زمین سے 3 - 4 فٹ بلند ایک چبوترے پر ایک چوکور احاطہ میں واقع ہے۔ باغ کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے اور اس میں پھول' پودے' جھاڑیاں اور سرو کے طویل درخت کثرت سے لگائے گئے ہیں۔ اس چبوترے پر زیریں یا مرکزی ایوان متوازی الاضلاع ہے اور ہر جانب اس کی پیمائش 22 فٹ 3 انچ ہے۔ فرش سنگ مرمر پر مشتمل ہے' جس کو زیادہ تر منبت کاری سے مزین کیا گیا ہے۔ وزیر اور اسکی بیوی کے اصلی مزارات اسی ایوان میں ہیں۔ یہ انتہائی چمکدار زرد رنگ کے سنگ سماق سے بنائے گئے ہیں اور بے مثال خوبصورتی اور عمدگی کے حامل ہیں۔ دیواروں پر معنرہ رسم الخط میں قرآن پاک کی سورة الفتح' الزمل اور سورة الملک خوبصورت پتھر کے ابھرے ہوئے حروف میں لکھی ہوئی ہیں۔ ایوان کے اردگرد چھوٹے کمرے ہیں' جن میں اسی خاندان کے دوسرے افراد کے مزارات ہیں۔ پہلی منزل میں عمارت کے وسط میں ایک شاندار برآمدہ ہے' جس تک نیلگوں سنگ خارا کی سیڑھی کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے اور اس پر ایک مستطیل گنبد ہے' جس پر دو سنہری کلس ہیں۔ اس بالائی کمرے میں موجود قبریں سادہ سنگ مرمر کی ہیں۔ مگر ان پر کوئی عبارت درج نہیں۔ دوسری منزل کے چاروں کونوں پر تقریباً 40 فٹ بلند چار گول مینار ہیں' جن پر سنگ مرمر کی گنبدیاں ہیں' پوری عمارت سفید سنگ مرمر کی ہے' جس میں رنگین پتھروں کے امتزاج سے منبت کاری کی گئی ہے' جو خوبصورت نقش و نگار میں' پھولوں' سرو کے درختوں' گلدانوں اور تاج محل کی طرح جواہرات سے مزین دیگر آرائشی گل بوٹوں کی نمائندگی کرتے ہیں' مگر اس کے مقابلہ میں کم نزاکت کے حامل ہیں' لیکن پھر بھی یہ انتہائی خوشگوار تاثر پیش کرتے ہیں۔ یہ زیبائشی نقش و نگار دیواروں پر سنگ مرمر کی انتہائی نفیس دلکشی اور عمدگی کی حامل جالیوں سے آنے والی روشنی سے نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان جالیوں سے ہوا اور روشنی آزادی سے اندر آتی ہے اور ان کے نقشہ کی نزاکت اور فنکارانہ خوبیوں کا امتزاج حقیقی طور پر عمارت کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔

غربی جانب دریائے جمنا اعتماد الدولہ کے مقبرہ کی دیوار کے ساتھ بہتا ہے' چاروں میناروں کی چوٹی سے دریا کے سامنے آگرہ شہر کا ایک بہترین نظارہ کیا جاتا ہے۔

اعتماد الدولہ کی سرگزشت: اعتماد الدولہ (جس کے نام سے باغ کا یہ مقبرہ مشہور ہے) تہران سے آنے والے ایک ایرانی مہم جو کا خطاب ہے۔ وہ مشہور زمانہ نور جہاں اور اس کے بھائی آصف خاں (جس کی بیٹی ممتاز محل (خاتون تاج محل) بادشاہ شاہجہان کی ملکہ تھی) کا باپ تھا۔ سلطنت کے خزانچی کے عہدہ سے ترقی دے کر اسے وزیر کے مرتبہ پر فائز کیا گیا' جو اسکے انتقال تک اس کے پاس رہا۔ وہ کشمیر جاتے ہوئے راستے میں 22 - 1621 میں کانگڑا کے مقام پر

فوت ہوا۔ اس کی نعش کو تابوت میں بند کر کے اس کی بیٹی نور جہاں آگرہ لے آئی اور اس نے اس کی قبر پر موجودہ مقبرہ تعمیر کروایا۔ اس کے انتقال پر اس کے بیٹے کو آصف خاں کے خطاب کے ساتھ خالی عہدے پر فائز کیا گیا۔ جہانگیر نے اپنی تزک جہانگیری میں اپنے سسر کے متعلق ایک دلچسپ بیان درج کیا ہے:۔ "وہ ایک شاعر تھا اور قدیم شعراء کی نقل میں اشعار کہتا تھا۔ ہنس مکھ اور زندہ دل اور پر مذاق طبیعت کا مالک تھا۔ اپنی عادات میں مستعد اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ ہر کوئی اسے پسند کرتا تھا اور کوئی شخص اس کا دشمن نہیں تھا۔ وہ سستی اور کاہلی سے کام نہیں لیتا تھا اس لئے اس کے سرکاری حسابات ہمیشہ زبردست ترتیب میں ہوتے تھے۔ فرض شناس داماد نے اس خاصیت کو بھی اس محترم بوڑھے شخص کی خصوصیات میں شامل کیا ہے کہ وہ "رشوت کو پسند کرتا تھا اور بغیر کسی روک ٹوک اور جھجک کے طلب کرتا تھا"۔

جب بوڑھے وزیر کا آخری وقت آن پہنچا تو بادشاہ اور اس کی بیوی نور محل اتفاق سے اس کے بستر کے قریب تھے۔ بیٹی نے باپ سے دریافت کیا کہ کیا وہ بادشاہ کو پہچانتے ہیں ‘ تو جاں بلب وزیر نے فوراً ایک ایرانی شاعر کا مندرجہ ذیل شعر پڑھا:۔

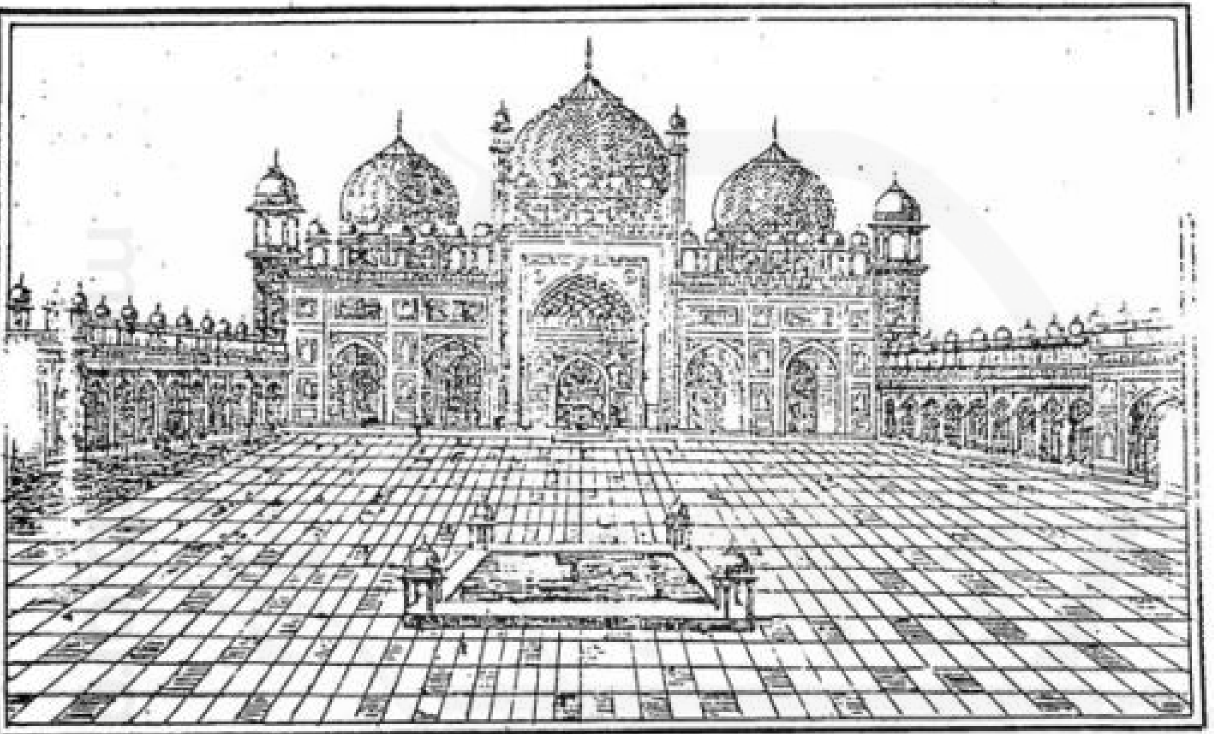
آنکہ نابینای مادر زاد اگر حاضر شود
در جبیں عالم آرا بہ بیند مہترے

"اگر ایک مادر زاد نابینا بھی یہاں موجود ہو تو وہ بادشاہ کی پیشانی کے جاہ و جلال سے اس کو فوراً پہچان لے گا"۔

اس کے تھوڑی دیر بعد بوڑھا شخص انتقال کر گیا۔ وزیر کی بیٹی (نور جہاں) نے اس مقبرے کو 1628ء میں مکمل کروایا۔ پہلے پہل ملکہ نے اس کی قبر پر ٹھوس چاندی کا مقبرہ تعمیر کرانے کا ارادہ کیا مگر اس کے معمار نے اسے اس بناء پر اس کے ارادے سے باز رکھا کہ اس بات کا امکان ہے کہ چاندی سے چوروں اور ڈاکوؤں کی حرص و طمع کو ہوا ملے گی اور یہ کہ سنگ مرمر زیادہ خوبصورت اور دیرپا ثابت ہو گا' اس کے علاوہ کم نقل پذیر اور سستا ہے۔

شہر اور اس کے مضافات میں قدیم یادگاریں

جامع مسجد: قلعہ کے صدر دروازہ کے سامنے شمال مغربی جانب جامع مسجد استادہ ہے۔ اسے بیگم صاحب کے نام سے مشہور شاہجہان کی بڑی صاحبزادی جہاں آراء بیگم نے تعمیر کروایا تھا۔



جامع مسجد

سیاحوں نے دہلی میں اس کے سیدھے سادے لوح مزار (کتبہ) کا اکثر ذکر کیا ہے۔ اپنے باپ پر اس کے اثر و رسوخ (بعد میں اس نے اس کی قید میں بھی اس کا ساتھ دیا) کو سلطنت کی آخری حدوں تک دیکھا اور محسوس کیا گیا۔ وہ شاہی خزانے سے بہت بڑے بڑے وظائف حاصل کرتی تھی اور سلطنت کے امراء اسے قیمتی تحائف پیش کرتے تھے۔ مسجد کو سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے اور یہ ایک بلند چبوترے پر واقع ہے' جس کے اردگرد اسی پتھر کے ستونوں کی قطاریں ہیں۔ وہاں پر گیارہ فٹ بلند ایک کشادہ سیڑھی کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ 130 فٹ طویل اور 100 فٹ چوڑی بڑی عمارت مغرب کی طرف ہے۔ اس کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے' جن کے چوکھٹے سفید سنگ مرمر کے اور حاشیہ سنگ سرخ کا ہے اور محرابوں کی قطاروں نے انہیں سہارا دے رکھا ہے۔ سامنے والے حصہ میں پانچ محرابی دروازے ہیں' ہر جانب ایک بڑا اور دو چھوٹے ہیں یہ سب ایک کشادہ صحن کی طرف کھلتے ہیں۔ مرکزی محرابی دروازہ چوڑائی میں 40 فٹ سے زیادہ ہے۔ چھت کے ہر کونے پر ایک مثمن گنبد ہے اور سامنے والے حصہ کو انتہائی خوبصورت چھوٹے چوکور گنبدوں کی ایک قطار سے مزین کیا گیا ہے۔ مرکزی کمرہ کی چھت کے چاروں کونوں سے چار نازک مینار اٹھائے گئے ہیں' ان کے پیچھے تین بڑے گنبدوں پر یکے بعد دیگرے سنگ خارا اور سفید سنگ مرمر کی چوڑی پٹیوں کے ساتھ ثبت کاری کی گئی ہے۔

یہ مسجد نمایاں نقش' شاندار استرکاری اور عالی شان تناسب کی حامل ایک نفیس عمارت ہے۔

شرقی جانب کے علاوہ مشرقی دروازہ کے حجروں کو (جو بہت زیادہ جاذب نظر تھے) بغاوت کے دوران عسکری وجوہات کی بناء پر مسمار کر دیا گیا۔

عمارت کی لاگت عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسجد کو پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے 1058ھ (1648ء) میں تعمیر کیا گیا اور اس کی تکمیل پانچ برس میں ہوئی۔

مرکزی محراب کے اوپر قرآن پاک کی مندرجہ ذیل سورۃ درج ہے:۔ (107)

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

والشمس وضحیہا ○ و القمر اذا تلیہا ○ والنہار اذا جلیہا ○ والیل اذا یغشیہا ○ والسماء و ما بنیہا ○ والارض و ما طحیہا ○ ونفس وما سویہا ○ فالہمہا فجورھا وتقواھا ○ قد افلح من زکیہا ○ و قد خاب من دسیہا ۔ ○ کذبت ثمود بطغوھا ○ اذا نبث اشقیہا ○ فقال لہم رسول اللہ ناقتہ اللہ - وسقیہا ○ فکذ بوہ فعقروھا۔ فدمدم علیہم ربہم بذنبہم فسوھا۔ ولا یخاف عقبیہا۔

ترجمہ:- شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان (اور) نہایت رحم کرنے والا ہے۔
قسم ہے سورج اور اس کی روشنی کی اور چاند کی جب سورج (کے غروب) سے پیچھے آئے' اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو خوب روشن کردے اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو چھپالے اور قسم ہے آسمان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بنایا۔ اور قسم ہے زمین کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بچھایا اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا۔ پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو القاء کیا۔ یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کرلیا۔ اور نامراد ہوا جس نے اس کو فجور میں دبا دیا۔ قوم ثمود نے اپنی شرارت کے سبب (صالحؑ) کی تکذیب کی (اور یہ سب اس زمانہ کا قصہ ہے) جبکہ اس قوم میں جو سب سے زیادہ بدبخت تھا وہ اونٹنی کے قتل کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ تو ان لوگوں سے اللہ کے پیغمبر (صالحؑ) نے فرمایا کہ اللہ کی اس اونٹنی اور اس کے پانی پینے سے خبردار رہنا' سو انہوں نے پیغمبروں علیہم الصلوات والتسلیمات کو جھٹلایا پھر اس اونٹنی کو مار ڈالا تو ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کے سبب ان پر ہلاکت نازل فرمائی' پھر اس ہلاکت کو تمام قوم کے لئے عام فرمایا اور اللہ تعالیٰ کو اس ہلاکت کے آخر میں کسی خرابی کے انجام کا کسی سے اندیشہ نہ ہوا"۔

محراب کے درمیان میں قرآن پاک کی آیت الکرسی درج ہے:-

اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم ط لا تاخذہ سنتہ و لا نوم ط لہ ما فی السموت و ما فی الارض ط من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ ط یعلم مابین ایدیہم و ما خلفھم ولا یحیطون بشی من علمہ الا بماشاء وسع کرسیہ السموت والارض و لایو دہ حفظہما و ھو العلی العظیم ط

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' زندہ ہے سنبھالنے والا ہے تمام عالم کا' نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند' جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہیں' سبھی اسی کی ملکیت ہیں۔ ایسا کونسا شخص ہے جو اس کے پاس کسی کی سفارش کرسکے بدون اس کی اجازت کے۔ وہ ان کے تمام حاضر و غائب حالات کو جانتا ہے اور وہ موجودات اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لاسکتے' مگر جس قدر علم دینا وہی چاہے۔ اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اللہ کو ان دونوں کی حفاظت کچھ گراں نہیں گزرتی' اور وہ عالیشان' عظیم الشان ہے۔"

محراب کے اردگرد فارسی کا مندرجہ ذیل قطعہ درج ہے:-

این مسجدیست شریف خدائی منان روئی زمین را و معبدیست منیف لله ذوالغفران عبادت گزین را و منظریست نور افزای دیدہ وران عبرت آئین را و سکینیست دلکشا عارفان حقیقت بین را۔ کہ بامر رفیع القدر نواب فلک جناب خورشید احتجاب ہمت قباب عفت نقاب سدہ نساء زمان صاحب نسواں دوران ملکہ جہاں مالکہ گیہان ناموس العظمین اعز اولاد امیر المومنین جہاں آراء بیگم در عہد سعادت مہد صاحب عصر والی دھر ظل ظلیل حضرت سبحان خلیفہ نجیل ایزد منان باعث امن و امان بادشاہ هفت اقلیم فرازندہ تخت و دیہیم حارس ملک و ملت قامع جور و بدعت بادشاہ دین پناہ شہنشاہ حق آگاہ مظہر کرم وجود برگزیدہ حضرت معبود فرمان فرمائی۔ بحرو بر داو دہ عدل گستر رافع لوائے بر واحسان جہاں آباد ملک ستان مقنن قوانین رعیت پروری و پروردہ نوازی۔ ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی مبلغ پنج لک روپیہ کہ قریب هفدہ هزار تومان رائج ایران وبست وپنج لک خانی مائق توران باشد در عرض پنج سال صورت انجام پذیرفت ایزدبی نیاز بے انباز این بنائی رفیع راچون بیت المعمور پایدار واین اساس منیع راچون کاخ فلک برقرار دارد پروردگار این بنائی انیت آثار باسیہ مبانی خیرات عام را مراسم مبرات عاید گرداناد تم فی سنہ 1058 ہجری۔

ترجمہ:- "یہ مسجد مالک روئے زمیں کے لئے وقف ہے اور اس خالق کائنات کی عبادت گاہ ہے' جو پوری کائنات پر حکومت کرتا ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے: یہ وہ مقام ہے جو ان لوگوں کی بصارت کی چمک کو زیادہ کرتا ہے' جو دنیا کو عبرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں: یہ عارفان حقیقت کے لئے ایک دلکشا مقام ہے۔

اس کو رفیع القدر' نواب فلک' صاحب خورشید حجاب' ہمت قباب' عفت نقاب' سدہ نساء صاحب نسواں دوران' ملکہ جہاں' منتخب جہاں' اعز اولاد امیر المومنین' جہاں آراء بیگم کے حکم سے مالک دوران' صاحب عصر' ظل سبحان' خلیفہ نجیل ایزد' باعث امن و امان بادشاہ هفت اقلیم' ناموس تخت و تاج' حارس ملک و ملت' قامع جور و بدعت' بادشاہ دین پناہ' شہنشاہ حق آگاہ' مظہر لطف و کرم' برگزیدہ معبود' فرمانروائے۔ بحروبر' داوہ عدل گستر' رافع لوائے نیکی و احسان' جہاں آباد ملکستان' مقنن قوانین رعیت پروری' پروردہ نوازی' ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی کے عہد سعادت میں مبلغ پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا' جو ایران کے سکہ رائج الوقت 17000 تمن اور توران کے سکہ رائج الوقت 25000 خانی کے مساوی

ہیں اور اسے پانچ سال کے عرصہ میں مکمل کیا گیا۔

پروردگار عالم اس عالی شان عمارت کو اور اس بلند مرتبہ مسجد کو بیت المعمور (108) اور کاخ فلک کی طرح آباد رکھے اور خدا تعالیٰ اس مقدس جگہ پر (جس کی بنیاد لوگوں کی عبادت کے لئے رکھی گئی) اپنی رحمت نازل فرمائے' اسے 1058ھ (1648ء) میں مکمل کیا گیا"۔

1857ء کی بغاوت کے بعد اس بناء پر یہ مسجد مسلمانوں کے لئے بند کر دی گئی کہ یہ قلعہ کے قریب تھی اور اسے کسی عام بغاوت کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

لارڈ جان لارنس نے بطور گورنر جنرل اسی قابل احترام جذبہ رواداری (جو ان کی پوری زندگی کا ایک خاص وصف تھا) سے کام لیتے ہوئے 1858ء میں جب یہ دیکھا کہ یہ مسجد ابھی تک بند پڑی ہے' تو انہوں نے حکم دیا کہ اسے فی الفور کھول دیا جائے اور اسے اس کے جائز مالکان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس مفید اور منصفانہ تدبیر کا عظیم سہرا مسٹر جان بٹین کے سر بھی جاتا ہے' جو آگرہ کے کمشنر کی حیثیت سے ان حقائق کو وائسرائے کی توجہ اور دھیان میں لائے۔ جان لارنس کا تذکرہ نگار بوسورتھ سمتھ لکھتا ہے "اس کے کئی سال بعد تک جان بٹین اور جان لارنس کے ناموں کو مسجد میں مسلمانوں کی دعاؤں میں سنا جا سکتا تھا' یہ مزید اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ہم نے عدم رواداری سے نہیں بلکہ رواداری سے کام لیتے ہوئے اس ملک پر اپنی گرفت مضبوط کی"۔

رام باغ: ریلوے اسٹیشن سے پکی سڑک کے ساتھ ساتھ شہر کے شمال مشرقی جانب چند منٹ کی ڈرائیونگ سیاح کو ایک اور تفریح گاہ رام باغ کی طرف لے جائے گی' جسے کچھ لوگ آرام باغ بھی کہتے ہیں' مگر یہ رام باغ کے طور پر زیادہ مشہور ہے۔ اس کا شمار آگرہ کے قدیم ترین دیواری باغات میں ہوتا ہے' جن میں نور افشاں کا چمن گل بھی تھا' جس کا ذکر بابر نے اپنی تزک بابری میں کیا ہے۔ اس مقام پر بابر اور اس کے جانشینوں کے دور میں بہت سی شاہی ضیافتیں دی گئیں اور یہ (جیسی اب ہے) جگہ' پھلوں کے ایک باغ اور تفریح گاہ کا کام دیتی تھی۔ ہنس مکھ بادشاہ اپنے خوش مزاج درباریوں اور دونوں اصناف کے زندہ دل ساتھیوں کے ہمراہ فرصت کے لمحات چاندنی اور کھلی ہوا میں انگور کی شراب سے لبریز ایک فوارے کے کنارے پہ بیٹھ کر رنگ رلیوں میں بسر کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے مرتب کردہ فارسی کے ایک مشہور شعر میں بیان کئے گئے ہنسی مذاق کی ایک ذاتی مثال پیش کی ہے:-

ابر ست و نوبہار و می و دلبر ناخوش ست
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ترجمہ :- "بادل ' نوبہار ' شراب اور صحبت دلبر کس قدر خوشگوار ہے! اے بابر عیش کرو کیونکہ دوبارہ اس دنیا میں کبھی نہیں آتا(109)

شہنشاہ بابر کے جسد خاکی کو کابل لے جانے سے پیشتر عارضی طور پر اسی جگہ دفن کیا گیا تھا۔ مرہٹوں نے اسے رام باغ کا نام دیا۔

باغات وسیع و عریض اور مختلف برآمدوں پر مشتمل ہیں' جو اوپر تلے بنے ہوئے ہیں اور انہیں پتھر اور سنگ مرمر کے برآمدوں کے ساتھ چوکور تختوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ باغ میں پھلدار درخت بکثرت لگائے گئے ہیں اور اس کے کناروں پر پھولدار جھاڑیاں اور پودے بھی لگائے گئے ہیں۔ اس کی خوب اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے اور گرمیوں کی جھلسا دینے والی تپش میں یہ یورپی باشندوں کے لئے گوشہ تنہائی کی ایک خوشگوار جگہ کا کام دیتا ہے۔

دریا کی جانب پرانی عمارات کے چند محرابی تہ خانے ابھی تک موجود ہیں۔ جب باغ میں داخل ہو کر بائیں طرف جائیں تو روغنی دروازوں و کشادہ فرنیچر اور بہترین حالت کے دو منزلہ کمروں کے جوڑے باغ کے ایک کونے میں دکھائی دیتے ہیں۔ چھٹی منانے والوں اور عارضی طور پر اس مقام کی سیر کرنے والوں کے لئے یہ ایک پسندیدہ گوشہ تنہائی ہے۔

حالانکہ ان عمارات میں دلکشی زیادہ نہیں' مگر اس کے باوجود یہ مقام انوکھی دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ اب وہاں متعدد نوبیاہتا جوڑے ہنی مون مناتے ہیں اور بہت سے تھکے ہارے افراد تازہ سانس اور توانائی حاصل کرنے کے لئے ڈیرا لگا لیتے ہیں۔ تین صدیاں پیشتر اسی مقام پر ایشیا کا خدائی فوجدار مہم جو بابر دبلے پتلے اور طویل القامت جسم کے ساتھ خوبصورت تاتاری دوشیزاؤں اور زندہ دل ساتھیوں کے ہمراہ چہل قدمی کیا کرتا تھا اور وقتی طور پر سلطنت کے تمام معاملات کو فراموش کرتے ہوئے اپنے پسندیدہ جام میں ایک وسیع و عریض اور پر آشوب سلطنت کے تمام اندیشوں کو ڈبو دیتا تھا۔

چینی کا روضہ یا افضل خاں کا مقبرہ: دریا کے بائیں کنارے پر سنگری پل کے شمال مشرقی کونے سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر چینی کا روضہ ہے۔ عمارت کے بیرونی حصہ کو چینی یا روغنی خوبصورت ٹائلوں سے آراستہ کیا گیا ہے' اسی وجہ سے اس کو یہ نام دیا گیا۔ اس مقبرہ کو افضل خاں کی یاد میں مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام شکر اللہ تھا اور وہ شیراز کے رہنے والے تھے' 17 ویں صدی میں ہندوستان تشریف لائے۔ ایک ادبی مہم جو کی حیثیت سے سورت کے راستہ سے آئے اور تقریباً 1617ء میں جہانگیر کی ملازمت اختیار کر لی۔ انہوں نے دربار شاہی

میں زبردست حمایت حاصل کر لی اور شاہجہان کے تحت دیوان کی تقرری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1639ء میں ان کا انتقال لاہور میں ہوا اور آگرہ میں اپنی زندگی کے دوران اپنے تعمیر کردہ مقبرہ میں انہیں دفن کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا' جب بادشاہ شاہجہان نئی دہلی کی بنیاد رکھنے اور وہاں محل تعمیر کرنے میں مصروف تھا۔ یہ تقریباً اسی مربع فٹ کی چوکور عمارت ہے اس کے اوپر ایک بصلہ نما گنبد ہے' جس کے ساتھ ایک کشادہ مرکزی مثمن شکل کا گنبدی کمرہ ہے' اس کے وسط میں اینٹوں کے دو مزارات ہیں' جسے کی ہر جانب مربع شکل کا کمرہ ہے۔ گنبد قدیم پٹھانی طرز کا ہے۔ اندرونی کمروں کے اوپر قرآن پاک کی آیات درج ہیں' مگر اب یہ تیزی سے اکھڑ رہی ہیں

جمنا کے پار قدیم عمارات میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:۔

1- **بلند خاں کا باغ:** جہانگیر کے دربار کے ایک خوجہ سرا بلند خاں کا باغ۔ اس کا ایک کشادہ مینار ہے' جس کو 32 ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے اور سات بڑے بڑے کنویں باغ سے ملحقہ ہیں۔

2- **زہرہ باغ:** رام باغ اور چینی کا روضہ کے درمیان ماتحت کنوؤں اور بارہ دریوں کے ساتھ واقع زہرہ باغ کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ بابر کی صاحبزادی کا باغ رہا ہو گا۔ یہ عمارت پٹھان اور ابتدائی مغلیہ دور کے درمیانی عرصے کی منفرد طرز کی حامل ہے۔

3- **موتی باغ:** اعتماد الدولہ کے مقبرہ کے سامنے واقع موتی باغ کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد شاہجہان نے رکھی تھی۔ اب اسے مکمل طور پر جدید بنا لیا گیا ہے۔

4- **نواب گنج:** نواب گنج بلند فصیل اور میناروں پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے شاہ جہاں کے خزانچی نواب صلابت خان نے تعمیر کرایا تھا۔ اب اسے رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

5- **مسجد ہمایوں:** کچ پورہ کے چھوٹے سے دیہات میں تقریباً بابر کے چمن محل کے سامنے جمنا کی جنوب مشرقی جانب ایک شکستہ مسجد ہے' جسے شہنشاہ ہمایوں نے تعمیر کرایا تھا۔ عمارت کی لمبائی 93 فٹ اور چوڑائی 35 فٹ ہے۔ گنبد چھوٹے ہیں اس لئے بیرونی جانب سے انہیں دیکھا نہیں جا سکتا۔ محراب ایک بہت بڑے مرکزی طاقچے یا حصے کی طرف کھلتی ہے۔ جس کے پہلوؤں میں چار چھوٹے کمرے ہیں۔ قبلہ رخ محراب کے روبرو مغربی دیوار پہ مندرجہ ذیل

عبارت درج ہے:-

محمد ہمایوں شہ عرصہ دین — کہ بنیاد قدرش بود فوق گردون
بفرمان عالی و حکم رفیعش — مرتب شد این فرش و این سقف میمون
بتاریخ اتمام این بیت مشعر — شہ عرصہ دین محمد ہمیون
قایلہ و راقمہ شتاب المعالی غفرذنبہ

ترجمہ:- "محمد ہمایوں بادشاہ ملک دین کہ جس کی شان و شوکت آسمان سے بھی بلند ہے۔ اس کے فرمان عالی و رفیع حکم سے یہ ممتاز فرش اور چھت تعمیر کئے گئے۔

اس مسجد کی تکمیل کی تاریخ ان الفاظ میں دریافت کی گئی:

"شہ عرصہ دین محمد ہمایوں"

اس کا مرتب کنندہ و راقم شتاب المعالی ہے (اس کے گناہ معاف ہوں۔)

بائیں ہاتھ یہ عبارت درج ہے:-

این بقعہ بود چون دل صوفی صافی
انکار صفائی وی است بی انصافی
چون یافت بسعی زین خوافی
اتمام تاریخ شدش سعی زین الخوافی

مرید باید انکہ بانی راخیری یاد کند ناظمہ و راقمہ شتاب۔

"یہ مقام صوفی کے دل کی طرح صاف ہے۔ اس کی صفائی سے انکار انصاف سے جدا ہوتا ہے۔ اس کو زین خوافی کی کوشش سے مکمل کیا گیا۔ اس کی تاریخ بنیاد ان الفاظ میں پائی گئی" "زین خوافی کی سعی سے"

مرید سے اس کے بانی کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کی استدعا کی جاتی ہے۔

ناظمہ و راقمہ شتاب۔

اس عمارت کی بنیاد 937ھ بمطابق 1520ء میں رکھی گئی۔

6- **چار باغ:** چار باغ یا بابر کا چمن محل موضع کچ پورہ کے مشرق میں واقع ہے، یہ اب مکمل طور پر کھنڈر بن چکا ہے۔

7- **مہتاب باغ:** مہتاب باغ تاج محل کی مخالف سمت میں واقع ہے۔ یہ اس باغ کا محل وقوع ہے، جس پر شاہجہان نے دوسرے کنارے پر تاج محل کے ہم پلہ اپنی یادگار تعمیر کرنے اور

ان دونوں یادگاروں کو سنگ مرمر کے پل کے ذریعے وابستہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مغربی مینار کی بنیادوں کو اب بھی تلاش کیا جا سکتا ہے' جبکہ مشرقی مینار اپنی آرائشات کے ساتھ تقریباً درست حالت میں موجود ہے۔

8- **اچانک باغ:** کچ پورہ سے ایک میل کے فاصلہ پر مشرق کی طرف واقع اچانک باغ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے بابر کے دور میں اسی نام کی ایک شہزادی نے بنوایا تھا۔ دریا کی طرف کھلنے والے چند کمروں کے سوا اب اس باغ کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

9- **چھتری' راجہ جسونت سنگھ:** چھتری' راجہ جسونت سنگھ کی دیواروں پر خوبصورتی سے کندہ کاری کی گئی ہے اور اسے گلدانوں اور پھولوں کی اشکال سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جمنا کے دوسرے کنارے پر رام باغ سے اس شاندار عمارت کا ایک بہترین نظارہ کیا جاتا ہے۔

دیگر پرانی عمارات: تاج محل کے قریب پرانے دلچسپ مقامات میں نواب خان دوراں خاں کی حویلی' شاہ احمد بخاری کا مقبرہ' لاٹ دیوار کے نام سے مشہور دیواری مینار' تاج محل کی چار دیواری کے جنوب مشرقی کونے کے قریب چھوٹی مسجد اور تملیار کا باغیچہ کے نام سے مشہور علاقہ میں چند قدیم محلات کے آثار کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

باغ مہابت خاں: تاج محل اور چھاؤنی کے درمیان ایک بہت بڑی حویلی کے اندر مہابت خاں کا باغ ہے۔ اس کے قریب موضع بسائی میں روضہ دیوان جی کے نام سے مشہور مقبرہ ہے۔

عید گاہ: خیر گڑھ کی سڑک پر شاہجہان کے دور کی عید گاہ ہے' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے چالیس روز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اسے سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس کی لمبائی 159 فٹ اور چوڑائی 40 فٹ ہے۔ یہ چھ بلند محرابوں پر مشتمل ہے' جن میں سے مرکزی محراب سب سے زیادہ بلند ہے۔ اس کے گرد ایک بلند و بالا دیوار ہے' جس کے چاروں کونوں پر ایک ایک گنبد ہے' یہ احاطہ 570 X 530 فٹ کی پیمائش کا ہے۔

مقبرہ جودھ بائی: یہ مقبرہ ل پورہ اور فتح پور سیکری کی سڑک کے درمیان آگرہ میں چاند ماری کے میدان کے نزدیک خواجہ کی سرائے کے نام سے مشہور ایک گاؤں کے قریب واقع ہے۔ پہلے یہ ہر طرف سے 78 فٹ کی ایک چوکور عمارت تھی۔ مگر تقریباً 1832ء میں حکومت نے چھاؤنی میں بیرکیں تعمیر کرنے کی غرض سے اس کے ایک بہت بڑے حصے کو دھماکے سے اڑا دیا۔ دیواروں کے دروازے اور بیرونی چار دیواری کے بھی میناروں کو مسمار کر دیا گیا۔ مسٹر بیگلر کہتے

ہیں "اس مقصد کے لئے یہ مقبرہ مسمار کرنے میں بہت مشکل پیش آئی کیونکہ انتہائی مضبوط تھا' چنانچہ "دھماکہ سے اڑانے کے بعد اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ اینٹوں کے ٹکڑوں کی شکل میں ایک بہت بڑے ڈھیر پر مشتمل ہے' جس کو نہ تو انسان کا ہتھوڑا اور نہ ہی وقت ختم یا مسمار کر سکتا ہے!"

جودھ بائی یا جودھ پور کی رانی اکبر کی راجپوت ملکہ جہانگیر کی والدہ اور جودھ پور کے راجہ مالدیو راؤ کی بیٹی تھی۔ جس طرح اکبر کی والدہ کا لقب مریم مکانی تھا اسی طرح جودھ بائی کو مریم الزمانی کہا جاتا تھا۔ جودھ بائی کی سنگ مرمر کی اصل قبر عمارت کے فرش کے نیچے ایک بہت بڑے تہہ خانے میں ہے' وہاں مصری اہرام کی راہداریوں کی طرز پر بنی ہوئی چار راہداریوں کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے ان میں سے تین راہداریاں ملبے کے ڈھیر کی وجہ سے بند ہو چکی ہیں۔ چوتھی راہداری میں رینگتے ہوئے اندر داخل ہوا جا سکتا ہے۔

لاڈلی بیگم' شیخ فیضی اور شیخ مبارک کے مزارات: سکندرا کی سڑک اور عالم گنج سے شمال کی طرف تقریباً" ایک میل کے فاصلے پر قندھاری باغ کے عقب میں فتح پور کے سنگ سرخ کی ایک بہت بڑی چار دیواری ہے: ہر طرف سے اس کی پیمائش 335 فٹ ہے اور اس کا ایک بہت عظیم الشان اور بلند و بالا دروازہ ہے۔ دیواریں کنگورے دار فصیل پر مشتمل ہیں اور چاروں کونوں پر مینار ہیں۔ پرانی عمارت کو 1004 (1595ء) میں مکمل کیا گیا۔ یہ احاطہ ایک باغ پر مشتمل ہے۔ جس کے وسط میں ایک بلند چبوترہ ہے۔ یہ اکبر کے مشہور زمانہ دوست اور مشیر ابوالفضل کی بہن لاڈلی بیگم کا مزار ہے۔ وہ فتح پور کے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے پوتے اسلام خاں کی بیوی تھی' جو جہانگیر کے دور میں بنگال کے صوبیدار تھے۔ اس کا انتقال 1017ھ (1608ء) یا اپنے خاوند کی وفات سے پانچ برس قبل ہوا۔ اب جس جگہ درمیان میں چبوترہ ہے پہلے یہاں ایک عظیم الشان مقبرہ ہوا کرتا تھا' جسے مکمل طور پر سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا تھا: مگر اس کو متھرا کے لکھی چند سیٹھ نے مسمار کرا دیا۔ اس نے حکومت سے یہ زمین خرید کر سنگ مرمر کے ٹکڑوں کو اکھاڑ کر فروخت کر دیا۔ نئے مالک نے اس کی جگہ یہاں پر نازک محرابوں کی ایک زیبائشی بارہ دری تعمیر کرا دی ہے۔

اس احاطہ میں شیخ مبارک اور ان کے سب سے بڑے بیٹے اور ابوالفضل کے بھائی فیضی کے مزارات بھی تھے' مگر متھرا کے سیٹھوں نے ان سب کو مسمار کرا دیا۔

عظیم الشان صدر دروازے کے باہر ایک بہت بڑا کنواں ہے' آگرہ اور اس کے مضافات میں یہ سب سے بڑا ہے۔ کنوئیں کی عمودی سرنگ کے گرد ایک شاندار باؤلی یا تہہ خانہ ہے'

وہاں تک عمیق اور کشادہ غلام گردشوں کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں' موسم گرما میں یہ ایک خوشگوار پناہ گاہ مہیا کرتا ہے۔

بلند دیوار کے احاطہ کے دروازے پر طغرہ خط میں درج مندرجہ ذیل عبارت کو اب بھی دیکھا جا سکتا ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

و به ثقلیتی هذه الروضته للعالم الربانی والعارف الصمدانی جامع العلوم شیخ مبارک الله قرس سره قد وقف بینائیه بحر العلوم شیخ ابوالفضل سلمه الله تعالی فی ظل د و لت الملک العادل یطلبه المجد والا قبال والکرم جلال الدنیا والدین اکبر بادشاه غازی خلد الله تعالی ظلال سلطنته باهتمام حضرت ابی البرکات فی سنه اربع والف

ترجمہ:۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان (اور) نہایت رحم کرنے والا ہے۔

میں صرف اسی پر بھروسہ کرتا ہوں! اس مقبرے کو عالم ربانی و عارف صمدانی جامع العلوم شیخ مبارک اللہ قدس سرہ کے لئے تعمیر کیا گیا۔ اس کو بحرالعلوم شیخ ابوالفضل سلمہ اللہ تعالیٰ نے زیر سایہ دولت الملک العادل' صاحب اقبال و کرم' جلال الدنیا والدین اکبر بادشاہ غازی (خدا تعالیٰ ان کی حکومت کو ہمیشہ قائم رکھے) زیر نگرانی ابوالبرکات 1004ھ (1595ء) میں تعمیر کرایا۔

اس روضہ کو اسی سال مکمل کیا گیا جس میں فیضی نے انتقال کیا۔

آئین اکبری میں ابوالفضل کے مندرجہ بیان کے مطابق اصل میں اس کے والد اور بڑے بھائی کو دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر آگرہ کے سامنے بابر کے چار باغ میں شیخ علاؤالدین مجذوبؒ کے مقبرہ کے قریب دفن کیا گیا تھا۔ ابوالفضل (جس نے روضہ تعمیر کرایا) نے بذات خود ان کی نعشوں کو دریا کی اس طرف منتقل کیا۔ مگر یہ واقعہ کب رونما ہوا' اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا۔

مقبرہ مریم زمانی: اکبر کے مقبرہ کی جنوب مغربی جانب لاہور کی طرف جانے کے لئے مغلوں کے زیر استعمال رہنے والی قدیم شاہراہ اور دریا کے درمیان اور شاہی قلعہ کی فصیل کے قدیم دہلی دروازہ سے گزرنے کے بعد مریم زمانی کا مقبرہ ہے' جو ایک پرتگیزی خاتون تھی اور اس کا شمار اکبر کی ہر دلعزیز ملکاؤں میں ہوتا تھا۔ بے شک اس نے بادشاہ کو عیسائیوں سے رواداری برتنے پر آمادہ کرنے کے لئے زبردست اثر و رسوخ استعمال کیا کیونکہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس نے ایسا

ہی کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ بادشاہ سکندر لودھی کی بارہ دری تھی' جسے اس نے 1495ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ سنگ سرخ کی ایک وسیع و عریض دو منزلہ عمارت ہے اس کے ہر کونے پر ایک ترشا ہوا مثمن مینار ہے اور زیریں منزل تقریباً" چالیس کمروں پر مشتمل ہے۔ اس کا شمار مضافات کی انتہائی قدیم عمارات میں ہوتا ہے۔ چرچ مشن اس مقبرے کو چھاپہ خانے کے لئے استعمال کیا کرتا تھا' اس نے یہاں ایک قابل دید یتیم خانہ اور دستکاری سکول قائم کیا۔

مقبرہ قندھاری بیگم: شاہجہان کی ملکہ اور شاہ ایران شاہ اسماعیل صفوی کے پوتے مظفر حسین کی بیٹی قندھاری بیگم کا مقبرہ قندھاری باغ میں واقع ہے' جو اب بھرت پور کے مہاراجہ کی شہری رہائش گاہ ہے۔

راجہ بھوج کا محل: مہادیو ولکیشور کے قریب چند پرانے محلات کے کھنڈرات ہیں' جن کو قدیم شہرت کے حامل راجہ بھوج کے محل سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مقبرہ بخشی صلابت خاں: سکندرا اور آگرہ کے درمیان تقریباً" نصف راستہ میں سڑک کی بائیں جانب کھیتوں میں ایک مقبرہ واقع ہے' جس کے ساتھ 64 ستونوں پر مشتمل ایک ملحقہ ایوان ہے۔ اس یادگار کو شاہجہان کے ایک خزانچی بخشی صلابت خاں کی یاد میں تعمیر کرایا گیا۔ جسے امر سنگھ روہتاس نے ہلاک کر دیا' قلعہ آگرہ کے موجودہ امر سنگھ دروازہ کو اسی کا نام دیا گیا۔

مقبرہ صادق خاں: مذکورہ بالا عمارت سے ملحقہ ایک غار کے ساتھ ایک گنبددار عمارت ہے' مگر کسی یادگاری نشان یا عبارت کے بغیر ہے۔ یہ اکبر کے ایک پیر صادق خاں کی آخری آرام گاہ کا پتہ دیتی ہے۔ جو چار ہزاری منصبدار اور اکبر کا ایک بہترین افسر تھا۔ وہ ہمارے پرانے دوست' نور جہاں کے والد اعتماد الدولہ کا بھتیجا تھا' جس کا انتقال 1579ء میں ہوا۔ (110)

گمبز پہلوان: آگرہ سے تین میل کے فاصلے پر گوالیار کی سڑک کی بائیں جانب پہلوان کا مقبرہ ہے۔ شاہجہان کے دور کے ایک مشہور و معروف پہلوان کی آخری آرام گاہ ہونے کے باعث اس کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس مشہور آدمی کے مقبرہ کے گرد ایک بہت بڑا گاؤں معرض وجود میں آ چکا ہے۔ یہ مقبرہ ایک بہت بڑے چوکور چبوترہ کے درمیان ایستادہ ہے۔ اس کے اوپر ایک بہت بڑا گنبد ہے اور ہر کونے پر ایک برجی ہے۔ چوکور چبوترے کے چاروں کونوں میں ہر کونے پر چار ستونوں سے مزین سنگ سرخ کا ایک خوبصورت قبہ ہے۔

مقبرہ فیروز خاں: گوالیار کی سڑک کے دائیں ہاتھ روضہ پہلوان کے مساوی فاصلے تک

اولین طرز تعمیر کا حامل ایک اور مقبرہ ہے جو مضافات کی عمارات میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ دربار اکبری کے میر خوجہ سرا فیروز خاں کا مقبرہ ہے۔ یہ سنگ سرخ کی ایک ہشت پہلو عمارت اسی شکل کے ایک بلند چبوترے پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس شاندار مقبرے کی چار دیواری میں مشرقی جانب ایک بہترین دروازہ کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے۔ گنبد کو مختلف رنگوں کی روغنی ٹائلوں کے ساتھ بڑی فیاضی سے آراستہ کیا گیا ہے اور عمارت کے متعلق حصوں کو بھی اسی طرح سجایا گیا ہے۔ دیواروں کو نہایت عمدہ اور انتہائی نفیس طرز کی کندہ کاری سے مزین حاشیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ امیر فیروز خاں' جو اس گنبد کے نیچے محو استراحت ہے' نے فیروز آباد کی بنیاد رکھی اور مقبرہ کے نواح میں واقع اینٹوں کا ایک وسیع و عریض تالاب تل فیروز خاں بھی اسی کے نام سے مشہور ہوا۔

آگرہ سے چار میل کے فاصلہ پر سکندرا کی سڑک پہ سرائے اعتبار خاں خواجہ واقع ہے۔ یہ کبھی ایک کھلی بارہ داری ہوا کرتی تھی' مگر اب دروازوں کو اینٹوں کی چنائی سے بند کر دیا گیا ہے۔

گھوڑے کا مجسمہ: سکندرا کے راستے میں باغ سورج بھان کے قریب آگرہ سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر سڑک کے بائیں ہاتھ' سنگ سرخ سے بنا ہوا گھوڑے کا ایک بھرپور جسامت مجسمہ ہے۔ اس کے سامنے پختہ اینٹوں کا ایک مقبرہ ہے۔ اس مجسمہ کے بارے میں مستند بیان کو محفوظ نہیں کیا گیا۔ لوگوں کی بیان کردہ کہانی کچھ یوں ہے: کہ کوئی گھڑ سوار دہلی سے آگرہ آیا' جب وہ اس مقام پر پہنچا تو اس نے ایک بوڑھی عورت سے دریافت کیا کہ آگرہ شہر کتنی دور ہے۔ اس نے جواب دیا:- "اتنا ہی ہے' جتنا تم دہلی سے سفر کر کے آئے ہو۔" گھڑ سوار پر مایوسی چھا گئی اور وہ فوراً" ہلاک ہو گیا۔ ایک ہمدرد امیر آدمی نے اس واقعہ کی یادگار کے طور پر گھوڑے کا مجسمہ تعمیر کرا دیا' بالکل مخالف سمت میں واقع مقبرہ مایوس آدمی کی آخری آرام گاہ بتائی گئی ہے۔

شہر کی مندرجہ ذیل یادگاریں قابل ذکر ہیں:-

1- **اکبری مسجد:** نناری بازار کے قریب واقع اکبری مسجد کو اصل میں اکبر نے تعمیر کروایا تھا۔ حال ہی میں اس کے نقشہ کو مکمل طور پر تبدیل کر کے بنایا گیا ہے' عمارت کی لمبائی 84 فٹ 6 انچ اور چوڑائی 25 فٹ ہے۔

2- **مسجد معتمد خاں:** جہانگیر کے نوابی معتمد خاں کی مسجد کشمیری بازار میں واقع ہے۔ اس کو سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس پر چند جگہوں پہ انتہائی باریک کندہ کاری کی گئی

ہے۔ اس کی پیمائش 53 X 20 فٹ ہے۔

3- **کالی یا کلاں مسجد:** کالی مسجد دوسرے لفظوں میں کلاں مسجد کے نام سے مشہور یہ مسجد گورنمنٹ ڈسپنسری کے قریب واقع ہے۔ اس کے گنبد امتداد زمانہ سے سیاہ پڑ چکے ہیں' اسی وجہ سے اسے کالی مسجد کا نام دیا گیا ہے۔ خیال ظاہر کیا جاتا ہے: کہ یہ آگرہ میں سب سے قدیم مسجد ہے۔ اسے بڑی جسامت کی ہموار اینٹوں اور چونا سے تعمیر کیا گیا ہے: مگر پہلے پہل اس کی پیشانی پر سنگ خارا آویزاں تھا۔ سامنے والے حصہ میں یکساں چوڑائی کے بہترین محرابی دروازے ہیں جن کے اوپر پانچ گنبد سایہ فگن ہیں: مرکزی گنبد سب سے بڑا ہے' اس کی لمبائی 128 فٹ اور گہرائی 33 فٹ 9 انچ ہے۔ یہ مسجد پٹھان دور کے قریب ابتدائی ہندوستانی طرز اور فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس مسجد کی بنیاد ایران کے بادشاہ شاہ اسماعیل صفوی کے پوتے مظفر حسین نے رکھی تھی' (جس کا ذکر ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اکثر کیا ہے) وہ شاہجہان کا سسر تھا' جو مہاراجہ بھرت پور کی شہری رہائش گاہ قندھاری باغ میں دفن ہے۔ مظفر حسین پنج ہزاری منصب پر فائز تھا اور 1600ء میں یا اکبر سے تقریباً" پانچ برس پہلے انتقال کر گیا۔ اسے ایک پر فریب اور دھوکہ باز شخص بتایا گیا ہے۔

4- **مسجد مخنشاں،** مسجد مخنشاں شہر کے مغربی حصہ میں "لوہا کی منڈی" میں واقع ہے۔ اس انتہائی خوبصورت عمارت کو زردی مائل سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے تین گنبد ہیں' درمیان والا سب سے بڑا ہے اور سامنے والی دیوار کے ہر کونے پر ایک مثمن مینار ہے۔ دیوار کے اوپر مغرب کی طرف سنگین جالیوں پر مشتمل انتہائی خوبصورت اور شاندار کھڑکیاں ہیں۔ کہا جاتا ہے اس مسجد کو اکبر نے ایک پسندیدہ خوجہ سرا ہیتم کی یاد میں تعمیر کرایا۔ جب ایک غیر معمولی قحط سالی کے دوران مصیبت رفع کرنے کے لئے دیگر تمام ذرائع ناکام ہو گئے تو ان کی دعا نے آسمان سے بارش برسا دی۔ وہ دنیاوی دولت سے اس قدر لاتعلق تھے کہ جب کوئی شخص انہیں انعام کی پیشکش کرتا وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

5- **درگاہ شاہ علاؤ الدینؒ:** سید سلیمان مدنی کے صاحبزادے شاہ علاؤ الدینؒ مجذوب المعروف علاول بلاول یا شاہ ولایت کی درگاہ اور مسجد محلہ نائی کی منڈی میں واقع ہے۔ اس کی پیمائش 46 فٹ X 19 فٹ ہے۔ شہر میں پٹھان دور کی یہ قدیم ترین عمارات ہیں۔ یہ صوفی بزرگ شیر شاہ سوری افغان کے دور میں گزرے ہیں اور یہ براستہ خراسان ہندوستان میں تشریف لائے۔ انہوں نے آگرہ میں اسلامی قانون کا ایک مدرسہ قائم کیا اور مسجد تعمیر کرائی اور

ایک خانقاہ کی بنیاد بھی رکھی' جس کا انتظام ایک وظیفہ سے کیا جاتا تھا وہ ابھی تک قائم ہے۔ مسجد نصف دیواروں تک زمین میں دھنس چکی ہے' اس کے بارے میں ایک انوکھی کہانی بیان کی جاتی ہے۔ شاہی ملازمت میں ایک شتربان نے اسے اصطبل کے طور پر استعمال کرنا چاہا' حتیٰ کہ اس مقدس عمارت میں اپنے جانوروں کو بھی باندھ دیا: درویش نے شکوہ کیا جس کی بناء پر عمارت زمین میں دھنسنا شروع ہو گئی' چنانچہ بدقسمت جانور کچل کر ہلاک ہو گئے اور یہ اس وقت تک دھنسنا بند نہیں ہوئی جب تک بزرگ نے اسے رکنے کا حکم نہیں دے دیا۔ اس صوفی بزرگ کا انتقال 1546ء میں شاہ سلیم کے دور میں ہوا۔ مسجد کے تین سادہ گنبد ہیں اور یہ بعد کے پٹھان دور کے فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

حمام' اللہ وردی خاں: اللہ وردی خاں کا حمام چھیپی تولا گلی کے بائیں ہاتھ واقع ہے۔ سنگ سرخ کا ایک خوبصورت محرابی دروازہ (جس پر نہایت دقیق کندہ کاری کی گئی ہے) حمام کے ایک بہت بڑے احاطہ کی طرف کھلتا ہے' جس پر ایک گنبد سایہ فگن ہے' بنیاد سے اس کا قطر 30 فٹ ہے۔ دروازے پر فارسی اشعار کی صورت میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:-

درایام شہنشاہ جہاں گیر — کہ می زیبد باو عالم پناہی
بشہر آگرہ دارالخلافہ — کہ باشد پای تخت پادشاہی
بحکم اللہ وردی خاں بنا کرد — چنین پاکیزہ حمامی کہ خواہی
صفائش روبرو باروے خورشید — فضا لیش تا فلک دربار کاہی
زموج آب و عکس قرص کلبام — ہمیشہ حوض او پر ماہ و ماہی
پئی تاریخ بنیادش دلم را — بخسل فکر شستم از تباہی
گرفتم دامن پاکان و گفتم — بنائی خیر حمام صباحی

ترجمہ:- شہنشاہ جہانگیر کے دور میں عالم پناہی صرف اسی کو زیبا ہے شہر آگرہ دارالخلافہ میں (جو پایہ تخت ہے) وردی خاں کے حکم سے خیر اللہ نے اس قدر پاکیزہ حمام کی بنیاد رکھی کہ جس کی خواہش کی جا سکتی تھی۔ اس کی صفائی چاند کے روشن چہرے کے برابر ہے۔ اس کی وضع قطع دربار فلک کی طرح وسیع و عریض ہے۔ اس کی جلترنگ اور اس میں چاند کے عکس کے باعث اس کا فوارہ ہمیشہ مچھلیوں اور چاند سے لبریز رہتا ہے۔ اس کی تاریخ بنیاد تلاش کرنے کی غرض سے میں نے شہد کے عکس سے اپنے ذہن سے پریشانی کو دھو ڈالا۔ تب پاکیزہ افراد کے دامن کو تھام کر میں نے کہا:-

"اس عظیم حمام کی بنیاد نیکی پر ہے!"- 1030ھ (1620ء)

مشرق سے مغرب کی طرف اس کی لمبائی 122 فٹ اور شمال سے جنوب کی طرف چوڑائی 72 فٹ ہے۔

کمروں کے دو جوڑے ہیں' جن کو گذشتہ دور میں کارواں سرائے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ حماموں کو اس قدر مہارت سے تعمیر کیا گیا اور اتنا بہترین انتظام کیا گیا ہے کہ حسب خواہش درجہ حرارت قائم رکھا جا سکتا ہے۔

اجمیری دروازہ کی مسجد: اس مقام سے جنوب کی طرف جہاں پہلے آگرہ کا اجمیری دروازہ موجود تھا ایک چھوٹی سی مسجد واقع ہے۔ مسجد کے سامنے والے حصہ میں دیوار پر ایک پتھر نصب ہے جس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔ پہلی تین سطریں قرآن پاک کی آیات کی صورت میں عربی زبان میں ہیں اور چوتھی یا آخری سطر فارسی میں ہے:-

الله لا اله الا هو الحیی القیوم لا تاخذه سنته و لا نوم له ما فی اسموت و ما فی الارض ط من ذا الذی یشفع عنده الا باذنه ط یعلم ما بین ایدیهم و ما خلفهم و لا یحیطون بشی ء من علمه الا بماشاء وسع کرسیه السموات و الارض ولا یوده حفظهما و هو العلی العظیم ط

بنا کرد در عصر نور الدین محمد جہانگیر پادشاہ این مسجد و گنبد
بندہ احقر حاجی سلطان در سنہ 1031 یک ہزار سی و یک

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' زندہ ہے سنبھالنے والا ہے تمام عالم کا' نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند' جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے' سب اسی کی ملکیت ہیں۔ ایسا کونسا شخص ہے جو اس کے پاس کسی کی سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے۔ وہ ان کے تمام حاضر و غائب حالات کو جانتا ہے اور وہ موجودات اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لا سکتے' مگر جس قدر علم دینا وہی چاہے۔ اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اللہ کو ان دونوں کی حفاظت کچھ گراں نہیں گزرتی' اور وہ عالیشان عظیم الشان ہے۔

بادشاہ نور الدین محمد جہانگیر کے دور میں اس احقر حاجی سلیمان نے سال 1031 (22-1621ء) میں یہ مسجد اور گنبد تعمیر کیا۔

تاہم' اس مقام پر کوئی گنبد نہیں ہے۔ اصل میں اس پتھر کا تعلق اجمیری دروازہ کے جنوب مغربی جانب مسلمانوں کے قبرستان کی ایک پرانی مسجد سے تھا' جب وہ کھنڈر بن گئی تو اس پتھر کو

اتار کر اس دروازہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کی دیوار میں نصب کر دیا گیا۔

مسجد عالمگیر: شہر کے محلہ عالم گنج میں اورنگزیب الملقب عالمگیر کی مسجد ہے۔ مگر اب اس کو مکمل طور پر تبدیل کر کے کلکٹر آفس کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ سابقہ کلکٹر مسٹر بلنٹ نے اس کے ارد گرد کئی دوکانیں تعمیر کرا دیں' جنہیں تاجروں کے ہاتھ کرایہ پر اٹھا دیا گیا ہے۔

اس مسجد پر مندرجہ ذیل قطعہ درج ہے:-

للہ الحمد این چہ مکانست۔ کہ پاک تراز جان ست۔ تعالی شانہ از سویدا و اغدار۔ خیض گلز مینش سینہ ھا از شوق تجلی بھار۔ اجابت معتکف محرابش۔ طھارت وقف خاک و آبش۔ وسعت صحنش زیر مد نظر نگنجد۔ و برفعت کنگ اش سدرہ مبالغہ نرسد۔ فضائش عالی است کہ دریائے جون نہرے ازو در گزشتہ۔ بلکہ مجو رشتہ در گوھرش جا کردہ۔ از بنجا صفا را دریاب۔ کہ گوھر را دریا آبست۔ وا۔ بنجا دریا از رشک صفائش چون رشتہ در پیچ و تاب۔ از انجاکہ خانہ حق جل و علے است۔ اگر فرش را عرش گویند رواست ھیشطا تحش از کو ھی نا سقف فلک خمیدہ۔ یا مجور اعیان پشت بتواضع خم کردہ۔ ھر کہ رابدین مکان گزر افتد۔ چون سایہ سر بسجدہ نھد۔ اگر زمینش درین سرزمین امری شنید۔ ھرگز از سجدہ سر نمی پیچید۔ حضور باآنکہ توام نجات در صلوٰۃ۔ برغم باین قرار کہ گلبانگ شہرتش اقطار امطار گرفتہ مسجد عالمگیر گفتنش بجاست۔ وباین اعتبار کہ از خاک برداشتہ بجلوہ تپ رسائد رواست۔ بادشاہ زمان ملک الملوک دوران۔ المتخلص باخلاق اللہ۔ البالغ کل بالغ۔ الحی سنت رسول اللہ۔ چنان برتبہ فنافی اللہ پرداخت کہ خانہ خود سرخانہ خدا ساخت۔ ھمایوں دلی کہ ارخصایل سلطانی۔ صفات سبحان گر آید۔ مبارک منزلی کہ از دارالخلافہ بہ بیت المی ھنجویت زان آید۔ ذات اشرفش زیب افروز اورنگ۔ کمترین چاکرش با بگیر چین و فرنگ تعمیرش مسجد کن کلیسائے اہل شرک و نفاق۔ تحرمش آتش زن آتش کدہ وسوائے فارس و عراق۔ امام باستحقاق بہترین امر گزیدہ عرب و عجم۔ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر است اگر بنائے عالم گیر گویند بسیار خوشناست۔ بنائش بنائے اثبات دین کامل۔ لا لیس لای تقی۔ آئین باطل۔ بنای اسلام تاریخ بنائش یعنی۔

کلمہ۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ وان محمد اعبدہ و رسولہ ——

بجز از سال ایجادش ——

ترجمہ:- الحمد للہ کیسی مسجد ہے' جو زندگی سے بھی زیادہ مقدس ہے۔ اس کی تعمیر کے نقشہ میں خالق کائنات کی زبردست طاقت دکھائی دیتی ہے۔ اس کی زمین کے فیض سے مومن کا سینہ تقویٰ

کے نور سے منور ہو جاتا ہے۔ قبولیت دعا نے اس کی محراب تلے ٹھکانہ بنا لیا ہے: طہارت اس کے آب و خاک کے لئے وقف ہے: اس کے صحن کی وسعت نظر کے ادراک سے ماورا ہے۔ اس کے کنگروں کی بلندی ذہن میں نہیں آ سکتی۔ اس کی چار دیواری دنیا کی طرح وسیع ہے' جس میں دریائے جون (جمنا) ایک نہر کی طرح بہتا ہے۔ نہیں دریا اس کی موتیوں کی تسبیح کے لئے ایک دھاگے کی طرح ہے۔ یہاں اس کی پاکیزگی کا تصور کیجئے: ایک موتی اپنی آب و تاب سمندر سے حاصل کرتا ہے' مگر اس جگہ سمندر اس کی پاکیزگی اور شان و شوکت کے رشک میں دھاگے کی طرح بل کھاتے ہوئے راستے کی شکل میں اس سے لپٹا ہوا ہے۔ جب تک یہ اللہ عزوجل کا گھر ہے' تو اس کی پہلی منزل کو عرش کا نام دینا درست ہے۔ اس کی سامنے والی محراب فلک کی سطح پر خمیدہ ہے یا شکرانے کے طور پر اس طرح جھکی ہوئی ہے' جس طرح نمازی نمازوں میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جو کوئی اس مسجد میں ٹھکانہ بناتا ہے اور زمین پہ اپنی پیشانی ٹکاتا ہے' تو وہ خدا کی عبادت میں ایک سائے کی طرح ہو جاتا ہے۔ اگر یہ جگہ حکم سن لیتی تو کبھی بھی خالق کائنات کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار نہ کرتی۔ (111)

جب تک یہ مسجد پوری دنیا میں اپنی شہرت کے باعث مسجد عالمگیر کے طور پر مشہور ہے۔ تب تک بادشاہ کا نام دعاؤں سے جدا نہیں ہو سکتا اور اس کو یہ نام دینا درست ہے کیونکہ دنیاوی حیثیت سے اس کی شہرت عرش تک پہنچ گئی ہے۔

بادشاہ زمان ملک الملوک دوران کی فطرت میں خدائی نیکیاں جمع ہیں۔ البالغ کل بالغ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سنت کو زندہ کرنے والا' وہ اس قدر فنافی اللہ ہو چکا ہے کہ اس نے خانہ خدا کو اپنا گھر بنا لیا ہے۔ دل خوش ہے کہ سلطان کے خصائل میں صفات سبحانی آ گئی ہیں۔ بادشاہ خوش قسمت ہے جو اپنے دارالخلافہ سے پانچ مرتبہ خدا کے گھر جاتا ہے۔ ذات والا صفات نے تخت و تاج کی زینت کو بڑھا دیا ہے۔ ان کا ادنیٰ سا نوکر بھی چین اور فرنگ سے خراج وصول کرتا ہے۔ اس کی مسجد نے کلیسائے اہل شرک و نفاق کو توڑ دیا ہے۔ اس کی جائے نماز نے ایران اور عراق کے آتش کدوں کے شعلوں کو بجھا دیا ہے۔ امر گزیدہ عرب و عجم کے باعث (112) وہ مسلمانوں کا امام ہے۔ اگر ہم اس عمارت کو عالمگیر کا نام دیں تو نہایت مناسب ہے۔ اس کی بنیادیں دین مکمل کی بنیادیں ہیں۔ مزید براں' جو اس کو دیکھتا ہے کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔ اس کی تاریخ کو اسلام کے سرمایہ میں یعنی ان الفاظ میں تلاش کیا جائے' میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ لاشریک ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ یہ اس کی تاریخ بنیاد ہے۔

تاریخ بنیاد 1082 ہجری (1671ء) ہے' جب اورنگزیب مرہٹہ سردار سیواجی سے جنگ میں مصروف تھا۔

شاعر نظیر کا مقبرہ: نظیر جدید دور کے ایک عظیم اردو شاعر تھے۔ وہ دہلی کے اردو زبان کے مشہور شعراء' ظفر' ذوق' مومن خاں اور غالب کے ہمعصر تھے۔ ان کا انداز بیان' شاندار اور سادہ تھا اور اس میں فطرت اور اس کی خوبصورتیوں کو بیان کرنے کے سلسلہ میں ایک خصوصی وصف پایا جاتا تھا۔ جوانی اور بڑھاپا' زندگی اور موت' موسموں' میلوں ٹھیلوں' دولت اور غربت' فقیروں اور قلندروں کے بارے میں انکے بیانات نہایت موثر ہیں; اور ان کی نظمیں ملک میں بوڑھے اور جوان' امیر اور غریب کی زبان پر ہیں۔ آگرہ میں ان کا مقبرہ مرجع خاص و عام ہے اور یہاں پر ایک میلہ بھی منعقد ہوتا ہے۔

مقبرہ سمرو: سمرو کا مقبرہ آگرہ کے محلہ پادری تولہ میں واقع ہے۔ اس کا اصل نام والٹر رین ہارٹ تھا اور نجف خاں (113) کے دور میں اس کے پاس فوجی کمان تھی۔ وہ سردھانہ کی راجدھانی (جو اب کالعدم ہو چکی ہے) کا بانی تھا۔ 4 مئی 1778ء کو وہ آگرہ میں انتقال کر گیا اور اس کی وسیع و عریض جاگیروں پر بیگم سمرو کے نام سے مشہور اس کی بیوہ اس کی جانشین بنی۔ وہ اس کی افواج کی کمان کے سلسلہ میں بھی اس کی جانشین مقرر ہوئی۔ ضابطہ خاں کے بیٹے غلام قادر روہیلہ کی تخت نشینی کے دوران بیگم کا شمار نمایاں شخصیات میں ہوتا تھا اور جب یہ سردار 1787ء میں دہلی میں داخل ہوا تو وہ اپنی افواج کے ساتھ پانی پت سے روانہ ہوئی اور محل کے سامنے آ پہنچی' اس وفادار خاتون اور اس کے یورپی افسران سے مرعوب ہو کر روہیلہ سردار دریا کے پار چلا گیا۔ شاہی حکومت کے لئے اسکی خدمات کے سلسلہ میں شاہ عالم نے سرعام اس کا شکریہ ادا کیا اور زیب النساء کے لقب کے تحت اسے بادشاہ کی بیٹی قرار دیا۔

پادری تولہ کے نام سے مشہور محلہ عدالت ہائے انصاف کے عقب میں واقع ہے اور لشکر پور کے نواحی قصبہ سے منسلک اصل علاقے کے ایک حصہ پر مشتمل ہے۔ اس کا شمار ایشیا میں عیسائیوں کے انتہائی قدیم قبرستانوں میں ہوتا ہے۔ شہنشاہ اکبر نے اس جاگیر میں رومن کیتھولک مشن کو مالکانہ حقوق عطا کر دیئے تھے۔ یہاں پر آرمینین اور پرتگیزی عبارات کے حامل دو سو سال سے زائد پرانے عیسائیوں کے چند مزارات ہیں۔

سمرو کا مقبرہ مثمن شکل کی ایک عالیشان عمارت ہے' جس کے اوپر گہرے رنگ کے مٹیالے پتھر سے مزین ایک گنبد سایہ فگن ہے' اس کی مماثلت قسطنطنیہ کے ایک فوارے سے بہت ملتی

جلتی ہے۔ عبارت پرتگیری زبان میں ہے۔ جو اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ اس کی تعمیر کے وقت آگرہ میں کوئی انگریز یا فرانسیسی نہیں تھا۔ عبارت حسب ذیل ہے:۔

Aqvi 1020 Walter Roinhardt Morreo Aos 4 Demayo, no Anno de 1778

ترجمہ:۔ "یہاں پر والٹر رین ہارٹ محو استراحت ہے' المتوفی 4 مئی 1778"

جان ہیسنگ کا مقبرہ: سمرو کے مقبرہ کے قریب مرہٹوں کی ملازمت میں ولندیزی جرنیل جان ہیسنگ کا مقبرہ واقع ہے' جس نے لارڈ لیک کی طرف سے قلعہ آگرہ کے محاصرہ سے تھوڑی دیر قبل اپنی موت تک قلعہ کی کمان کی۔ (114) سمرو کی یاد کے لئے وقف کردہ عمارت کے مقابلہ میں یہ کہیں زیادہ جاذب نظر اور شاندار عمارت ہے' اگرچہ یہ چھوٹے پیمانے کی عمارت ہے مگر اپنی طرز تعمیر اور نقشہ کے لحاظ سے فقید المثال تاج محل کے ہم پلہ ہے۔

حوالہ جات

(49) حملہ آور فوج پہلی مرتبہ چتوڑ پر قبضہ کرنے میں ناکام ہو گئی اور دوسری مرتبہ کوشش کی جا رہی تھی کہ بادشاہ نے اتفاق سے قلعہ کے حاکم جے مل کو مشعل کی روشنی میں ایک سوراخ مرمت کرنے کے لئے ہدایات دیتے ہوئے دیکھ لیا۔ بادشاہ نے قریب کھڑے ہوئے سپاہی سے بندوق پکڑ کر جے مل کو پیشانی پر گولی مار دی۔ راجپوتوں نے اپنے سردار کو مردہ دیکھا تو وہ مایوس ہو گئے' لہٰذا انہوں نے سورماؤں کی موت مرنے کا تہیہ کرنے کے بعد جوہر کی رسم ادا کی' اپنے بیوی بچوں کو موت کے گھاٹ اتار کر انہیں اپنے سردار کے ساتھ نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مندروں کی طرف لوٹ گئے اور مسلمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ بادشاہ نے فصیل کو ویران دیکھا تو دن کی روشنی میں اس جگہ داخل ہو گیا۔ جے مل اور پتہ کے مجسمے فن کا بہترین نمونہ تھے' مگر اورنگ زیب نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کروا دیا۔ بعد میں ان میں سے ایک کے ٹکڑے اکٹھا کئے گئے' ہاتھی کے مجسمہ کی مرمت کر دی گئی۔ دھلی کے ایمپرس گارڈن میں ابھی تک اس مجسمہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

(50) آئین اکبری۔

(51) "جب بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں' تو وہاں پر موجود سبھی افراد کورنش بجالاتے ہیں اور اپنے اپنے عہدوں کے مطابق اپنی جگہوں پر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں" آئین اکبری۔

(52) اجودھن (پاکپتن) کے شیخ زکریا کے بیٹے شیخ تاج الدین دھلوی اور اکبر کے دربار کے دیگر علماء (جو صوفیہ فرقے کے پیروکار تھے) نے اسے قائل کر لیا تھا کہ قرآن پاک اور پیغمبر اسلام کی احادیث کے مطابق انسان کامل کی اصطلاح میں وقت کے حکمران کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کی ہستی مقدس ہوتی ہے۔ یہ دلیل پیش کی گئی کہ سجدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان کامل ہونے کے باعث اس کے آگے زمین بوس ہوا جائے۔ تب سے بادشاہ کے احترام کو ایک مذہبی حکم سمجھا جانے لگا۔ بادشاہ کا چہرہ کعبہ مرادات اور قبلہ حاجات تھا۔ ملاحظہ کیجئے' بدایونی۔

(53) جنگل اور پانی کے رہنما' علم غیب میں ماہر ایک بزرگ' کہا جاتا ہے انہوں نے آب حیات کو دریافت کر لیا تھا۔ مسلمان دریا میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر چراغ اور پھول وغیرہ رکھ کر انہیں نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ کشتی کے ذریعے سفر کرنے والے ہمیشہ ان سے التجا کر کے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔

(54) مکہ مکرمہ میں موجود مقدس کنواں' جسے ہیگر (حضرت حاجرہ) کا کنواں بھی کہا جاتا ہے۔

(55) الفاظ حوض جہانگیری کے حروف کی تعداد 1113 ہے۔ جب اس سے زمزم کے الفاظ (94) کو علیحدہ کر دیا جائے تو اس کی تاریخ بنیاد (1019 ہجری) حاصل ہوتی ہے۔

(ایک ہندو کا سفرنامہ) کے مصنف نے اپنی کتاب میں جہانگیر کے پسندیدہ جام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جسے تین انچ سے زیادہ لمبے اور اسی قدر چوڑے ایک غیر معمولی جسامت کے لعل میں سے ایک جام کی طرز پر تراشا گیا تھا' اس کے اوپر سنہری حروف میں جہانگیر کا نام درج تھا۔ اسی طرح کے قدرے چھوٹے پیالے کو اس کے ساتھ رکھا ہوا تھا' جس کی ٹانگ اور سٹینڈ بھی تھا۔ اس کا تعلق عظیم تیمور لنگ سے تھا' دونوں اودھ کے سابق بادشاہ کی ملکیت تھے اور انہیں 1860ء سے چند سال پیشتر کلکتہ میں جواہرات کی ایک انگریزی دوکان پر فروخت کے لئے رکھا گیا تھا۔ بعد میں ان کی قسمت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

(56) فرشتہ نے اس محاصرہ کے بارے میں ایک تفصیلی اور سیر حاصل بیان تحریر کیا ہے۔ چتوڑ کا سردار رانا اودھے سنگھ راجپوت قبائل کا سربراہ تھا' اس لئے یہ مقام ہندوؤں کی خود مختاری کا گڑھ تھا۔ راجپوتوں نے زبردست مزاحمت کی اور بہادر حفاظتی فوج نے پناہ کے لئے بادشاہ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا حتیٰ کہ آخری آدمی تک لڑ کر ختم ہو گیا۔ چتوڑ کی فتح نے راجپوتانہ کی بغاوت کو دبانے کے لئے بہت اہم کردار ادا کیا۔

(57) کینے آگرہ کے بارے میں اپنی دستی کتاب میں غلطی سے اس کی تاریخ 1666 بتاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ٹیورنیئر نے نومبر 1665ء میں آگرہ کا دورہ کیا' مگر شاہجہان اس وقت زندہ تھا اور محل میں قید سخت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا انتقال 1666ء میں ہوا۔ اگر بوڑھا بادشاہ وہاں سخت قید میں پڑا ہوتا تو (جیسا کہ کتاب اول کے باب 11 میں بتایا گیا ہے) ٹیورنیئر کو کسی طرح بھی محل کی تمام عمارات کو دیکھنے نہ دیا جاتا۔ ٹیورنیئر ایک دلچسپ بیان کے ساتھ اس باب کا آغاز کرتا ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ اس نے محل کا مکمل نظارہ کس طرح کیا۔ وہ کہتا ہے: "بادشاہ جہان آباد میں جانے کے لئے آگرہ میں اپنی رہائش کو چھوڑنے سے قبل جب بھی کسی دورہ پر اس علاقہ میں جاتا' تو محل کا قبضہ (جہاں اس کا خزانہ موجود ہوتا تھا) اپنے کسی سرکردہ اور بااعتماد امیر کے سپرد کر جاتا' جو بادشاہ کی واپسی تک دن رات اس دروازہ کے آگے سے نہیں ہٹتا تھا جہاں اس کا خزانہ پڑا ہوتا تھا۔ اسی طرح کی غیر موجودگی کے دوران مجھے آگرہ کا محل دیکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ بادشاہ جہان آباد کے لئے روانہ ہو چکا تھا' اس کے بعد پورا دربار اور حتیٰ کہ خواتین بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گئیں' تو محل کی حکومت ایک ایسے امیر کے سپرد کی گئی جو ولندیزیوں اور عام طور پر فرنگیوں کا ایک عظیم دوست تھا۔ جیسے ہی بادشاہ روانہ ہوا' آگرہ میں ولندیزی کارخانہ کے سربراہ مسٹر ویلنٹ رسم کے مطابق اس امیر کو سلام کرنے اور اسے تحفہ پیش کرنے کے لئے گئے۔ ☆☆☆ جب دونوں جانب سے شکریہ ادا کر لیا گیا تو حاکم نے مسٹر ویلنٹ سے دریافت کیا کہ وہ اس سے کس قسم کی خدمت چاہتے ہیں' تو انہوں نے اس سے کہا چونکہ دربار موجود نہیں ہے'

اس لئے کیا ہی اچھا ہو اگر ہمیں محل کا اندرونی حصہ دیکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ ہمیں اس کی اجازت دے دی گئی اور چھ آدمی ہمارے ہمراہ کر دیئے گئے' سفر نامہ ہند' از ٹیورنیئر' جلد اول' صفحہ 106- یہ بیان سیاح کے اس دوسرے بحری سفر کی طرف اشارہ کرتا ہے' جب انہوں نے 1645 میں سورت کی طرف سفر میں آگرہ کا دورہ کیا' اس وقت شاہجہان پر امن حکومت کر رہا تھا' ملاحظہ کیجئے' تعارف' صفحہ 83 وغیرہ

(58) (عرش) نواں آسمان' جہاں خدا تعالیٰ کا تخت ہے۔

(59) یہ کہ اس محل کے کنگورے فارسی لفظ س کے تیز کناروں کی طرح صاف دکھائی دیتے ہیں جو دانتوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

(60) استعمال کیا گیا لفظ سجود سجدہ سے حاصل کیا گیا ہے' اتنا جھکنا کہ زمین کے ساتھ سر چھونے لگے' خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے۔

(61) اس ایوان میں مشہور زمانہ زنجیر عدل ایک کونے سے جمنا کے سامنے میدان میں دوسرے کونے تک باندھی ہوئی تھی۔ مصیبت زدہ کوئی شخص بھی اسے کھینچتا تو اس کے ساتھ بندھی ہوئی گھنٹیاں بادشاہ کو درخواست گذار یا فریادی کی موجودگی کی اطلاع دے دیتی تھیں' یوں فریادی کی فریاد سنی جاتی اور بادشاہ کی طرف سے براہ راست اس کی شکایت کا ازالہ کیا جاتا تھا۔

(62) یعنی تیمور جسے صاحب قران کہا جاتا ہے۔

(63) آخری جملہ میں ابجد کے قاعدہ کے مطابق حروف کے اعداد 1046 ہیں' جو 1636ء کے مطابق ہجری سال کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ وہی سال تھا' جب شاہجہاں نے بیجاپور کے بادشاہ عادل شاہ کے ساتھ صلح کی تھی۔ ہر شعر کے بعد خالی جگہ میں لفظ' اللہ' محمدؐ' ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ لکھے ہوئے ہیں۔

(64) بادشاہ نامہ' صفحہ' 933-

(65) ستمبر' 1892ء

(66) بادل گڑھ کے نام سے مشہور قدیم قلعہ 911ھ (1505ء) کے زلزلہ کے باعث بری طرح متاثر ہوا اور 962ھ (1556ء) کے دھماکہ کے باعث تقریباً مسمار ہو گیا۔ ملاحظہ کیجئے صفحہ 12 سے آگے۔

(67) حکومت کے 23 ویں برس قاسم خاں کو آگرہ کا حاکم بنایا گیا۔ اس نے اکبر کے لئے کشمیر فتح کیا اور اسے 34 ویں برس کابل کا حاکم مقرر کیا گیا۔ 1593ء میں اسے کابل میں قتل کر دیا گیا۔

(68) برنیئر کا سفر نامہ سلطنت مغلیہ' صفحہ' 293-

(69) اس کا نام علم الدین تھا اور وہ پنجاب میں چنیوٹ کا رہنے والا تھا۔ اس نے لاہور میں اپنے نام

سے مشہور ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔

(70) مسلمانوں نے جنت کے داروغہ کو رضوان کا نام دیا ہے۔

(71) لفظ علیین ہے' جس کا مطلب آسمانوں سے اوپر کوئی مقام ہے۔ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق وہاں موت کے بعد تمام متقی لوگوں کی ارواح جمع ہوتی ہیں' یہ وہ علاقے ہیں جہاں صرف فرشتوں کی رسائی ہے۔

(72) مسٹر نیلر اس عمارت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دوسری جانب بالکل اسی قسم کی عمارت ہے' جس کا اس کے سوائے کوئی مقصد اور استعمال نہیں ہے کہ اسے یکسانیت اور توازن (جو پورے نقشہ میں ملتا ہے) قائم کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔" مگر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے' اسے نماز کی ادائگی اور بادشاہ اور اس کی بیوی کی برسی کے موقع پر تقریبات منعقد کرنے سے قبل لوگوں کے اجتماع کے لئے بنایا گیا۔

(73) ٹیورنیئر کے مطابق 22 برس' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں تاج محل سے منسلک عمارات' کارواں سرائے وغیرہ کی تعمیر کا عرصہ بھی شامل ہے۔

(74) دیکھئے صفحہ 102 سے قبل۔

(75) ملاحظہ کیجئے صفحہ 105 سے پیشتر۔

(76) بلقیس. حضرت سلیمان علیہ السلام نبی اللہ کے دور میں یمن کے سبا شہر کی ملکہ تھی۔ وہ اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور تھی اور آتش پرست تھی۔ مسلمان مصنفین کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب ترک کر کے اپنا دین اختیار کرنے کی دعوت دینے کے لئے ایک خط روانہ کیا۔ انہوں نے یہ خط پرندہ ہدہد کے ذریعہ روانہ کیا' جس نے ایک ایلچی کا کام کیا۔ ملکہ پیغمبر خدا کے سامنے پیش ہوئی اور ان کا دین اختیار کر لیا۔ وہ پیغمبر خدا کی کنیز بن گئی۔ مشہور شاعر حافظ شیرازی نے شہر سبا کی طرف ہدہد کے پیغام کے حوالے سے کہا ہے:

مژدہ اے دل کہ دگر باد صبا می آید
ھد ھد خوش خبر از شہر سبا می آید

ترجمہ: اے دل خوش ہو جاؤ کہ باد صبا چلنے لگی ہے' ہدہد شہر سبا سے خوش خبری لے کر آیا ہے۔"

(77) سابق کمانڈر انچیف سر جارج نوجینٹ کی بیوی لیڈی نوجینٹ کی طرف سے۔

(78) لارڈ کومبر میئر کے تحت ایڈجوٹینٹ جنرل کرنل سی' فیگن کی بیوی مسز سی۔ فیگن کی طرف سے۔

(79) گمنام۔

(80) ملاحظہ کیجئے ان بیانات کا اختتامی حصہ۔

(81) اکبر نے اس سے سانبھر کے مقام پر شادی کی۔ وہ رجب' 1032ھ (1622) میں انتقال کر گئی۔ اس کا نام جودھ پور کے راجہ موتھ کی بیٹی' جہانگیر کی ہندو بیوی' جودھ بائی کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔

(82) وھیلر کی' تاریخ ہند' جلد اول' صفحہ 163' 1875ء کا ایڈیشن۔

(83) وہ جہانگیر (سلیم) کے تین ماہ بعد پیدا ہوا' فتح پور سیکری کے پہاڑوں میں پیدا ہونے کے باعث اس کو "پہاڑی" کے عرف سے پکارا جانے لگا۔ وہ اس وقت صرف آٹھ برس کا تھا۔

(84) بدایونی' دوئم' 256۔

(85) اکبر نے پادریوں کو سلطنت کے کسی بھی حصہ میں عیسائیت کی تبلیغ کی اجازت دے دی تھی' مگر اس نے یہ کہتے ہوئے بذات خود عیسائی مذہب اختیار نہ کیا کہ وہ خدائی حکم کا انتظار کر رہا ہے۔ اکبر کے علاوہ اس نے دوسرے آدمیوں میں دلچسپی کو بڑھا دیا' معلوم ہوتا ہے ابوالفضل اور اس کے بڑے بھائی ابوالفیضی نے اس سے بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ دونوں صوفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔

(86) یاد رہے کہ خطوط وحدانی کے اندر کی عبارت' مصنف بدایوانی کی تحریر کردہ ہے۔

(87) جس کتاب کا تذکرہ ابوالفضل نے کیا ہے وہ بزرگان دین کے حالات زندگی پر مشتمل ہے' ان میں سے زیادہ تر بزرگ دستکار تھے۔ ابوالفضل کا اعتراض یہ تھا کہ' جبکہ دستکاروں کا تذکرہ ان کتابوں میں کیا جا سکتا ہے تو اہل بیت کا ذکر کس لئے حذف کر دیا گیا ہے۔ بدایونی یہ نہیں کہتا کہ ابوالفضل کے اعتراض پر اس کا جواب کیا تھا: مگر جواب صاف ہے: مسلمان اہل بیت کو ولیوں سے بہت برتر خیال کرتے ہیں اور وہ اس درجہ میں شمار نہیں ہوتے' مومنوں کے نزدیک رسول پاکؐ کے بعد ان کا مقام ہے۔

(88) بدایونی۔

(89) بادشاہ کی زیر صدارت مذہبی اجتماعات فتح پور سیکری کی جامع مسجد میں بھی منعقد کئے جاتے تھے۔

(90) یعنی مکہ مکرمہ کے حج کی سعادت۔

(91) بھکر کے میر محمد معصوم کا تعلق بخارا میں ترمذ کے سید خاندان سے تھا۔ ان کے آباؤاجداد ان سے دو یا تین نسل پیشتر قندھار آ گئے اور ان کے والد میر صفا بھکر میں آباد ہو گئے۔ طبقات کے مصنف مرزا نظام الدین احمد کے توسط سے انہیں اکبر سے متعارف کرا دیا گیا۔ اس نے انہیں اڑھائی ہزاری کمانڈار بنا دیا۔ اکبر ان کی قابلیت کے اعتراف میں ان کا سرپرست بن گیا اور 1012 میں (1603ء) انہیں بطور سفیر تہران روانہ کیا' جہاں شاہ عباس نے ان کا خوب خیر مقدم کیا۔

محمد معصوم کو بطور شاعر اور مورخ بہت زیادہ شہرت حاصل تھی۔ انہوں نے نامی کے تخلص سے شاعری کی اور وہ تاریخ سندھ اور متعدد دوسری کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ وہ عبارات میں نقش و نگار بنانے اور مرتب کرنے میں بڑے ماہر تھے اور اپنے سفر میں ہمیشہ سنگ تراشوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ ان کی بیاضی عبارات نے ہندوستان سے اصفہان اور تبریز تک بے شمار مساجد اور سرکاری عمارات کو آراستہ کیا۔ فتح پور میں جامع مسجد کے علاوہ ان کی عبارات قلعہ آگرہ کے دروازہ' قلعہ منڈو اور دیگر مختلف مقامات پر ملتی ہیں۔ انہوں نے سکھر کو متعدد عمارات سے مزین کیا اور دریائے سندھ کی ایک شاخ (جو بھکر کے گرد بہتی ہے) کے درمیان ایک گنبد تعمیر کیا (جس کی تاریخ' الفاظ "گنبد دریائی" میں ملتی ہے' جس سے 1007ھ (1598ء) مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ وہ ایک متقی اور انتہائی فیاض تھے انہوں نے 30 یا 40 لاکھ روپے ترکہ میں چھوڑے' جو ان کے بیٹے میر بزرگ کو وراثت میں ملے۔

(92) اکبر نامہ' صفحہ 52' جلد -3-

(93) کینیڈی غلطی سے اس کو بیربل کی بیٹی کا محل کہتا ہے۔ اکبر نامہ کے مطابق بادشاہ نے اسے خود بیربل کے لئے بنوایا تھا' لہٰذا اس میں اور آئین اکبری میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ یہ بیربل کی بیٹی کا محل تھا!

(94) اکبر کی مذہبی اختراعات کے متعلق ملاحظہ کیجئے' باب -3

(95) ایک ترکی لفظ' جس کا مطلب دایہ کا شوہر ہوتا ہے۔

(96) عام بیانات کے مطابق' اس کو خاندان لودھی کے دوسرے بادشاہ سکندر لودھی کی نسبت سے یہ نام دیا گیا۔

(97) بجورا کی ایک قسم۔

(98) الغوزہ۔

(99) بانسری کی ایک قسم۔

(100) یہ الفاظ دوہرے مقصد کے لئے استعمال کئے گئے ہیں یعنی ایک تو عظیم ہونے کے ناطے خدا کی تعریف کے لئے اور دوسرے اس شخص کے لئے جو اس مقبرہ میں دفن ہے۔ (اکبر کا مطلب بڑا ہوتا ہے) دوسرے معنوں میں اضافے کو حذف کرنے سے ان کا مطلب بنتا ہے اللہ' اکبر ہے' یعنی "اکبر خدا ہے۔" جو اکبر کے تخلیق کردہ نئے دین الٰہی کی خاصیت تھی۔ تاہم' اکبر کے اختیار کردہ صوفی مسلک کے مطابق یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ خدا کا نور یا روح ہر جاندار اور بے جان چیز میں ہے' اس لئے اکبر کے پیروکاروں نے دلیل پیش کی' وہ خدا کی روح تھا یا خود خدا تھا' کیونکہ بطور بادشاہ وہ خدا کا سایہ تھا اور اسے نور بھی اسی سے حاصل ہوا۔ اس کے باوجود اس توجیہہ کا ابہام بالکل واضح ہے'

اگرچہ مزار کے پاؤں کی جانب درج الفاظ کے ذریعے احمقانہ طور پر ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے' لیکن صرف اللہ کی شان و شوکت کی تعریف کے لئے ہیں' جو صرف اللہ ہی سے منسوب ہے۔ بادشاہ نے اللہ اکبر کے یہی الفاظ اپنی مہر پر کندہ کروائے تھے اور انہیں تمام سرکاری خط و کتابت کے اوپر لکھا جاتا تھا' ایک مرتبہ اس نے انہیں السلام علیکم کا متبادل بنانے کا حکم دے دیا۔ جس کے جواب میں جل جلالہ کہا جاتا تھا۔

(101) یہ خطاب اکبر کو انتقال کے بعد دیا گیا۔

(102) ہربرٹ کا سفرنامہ ہندوستان' افریقہ وغیرہ صفحہ 64'1677ء کا ایڈیشن - لندن۔

(103) عمارت پر درج تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دروازے کو جہانگیر نے 1613ء یا نورجہاں سے اپنی شادی کے تین برس بعد بنوایا' جب وہ میواڑ میں جنگ لڑ رہا تھا۔

(104) یعنی تخت۔

(105) یعنی سعدی۔

(106) اس کی شادی شاہ رخ مرزا ابن مرزا ابراہیم ابن مرزا سلیمان المعروف والی بدخشاں سے ہوئی۔ ملاحظہ کیجئے' باب 3۔

(107) یہ قرآن پاک کی 91 ویں سورۃ الشمس ہے' اس کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا۔ زمخشری کے مطابق جو مسلمان اس سورۃ کو خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھے گا اس کو اس طرح انعامات سے نوازا جائے گا' جیسے اسے خیرات میں اپنے مداروں میں منور و درخشاں سورج اور چاند عطا کر دیئے گئے ہوں۔

(108) مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق بیت المعمور (فرشتوں کا معبد) ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے۔

(109) فارسی کا یہ شعر بابر نے کابل میں اپنے چمن محل میں سنگ مرمر کے فوارے کے کناروں پر درج کروایا' جس کو وہ رنگ رلیوں اور جشن کے موقع پر شراب سے بھرنے کا عادی تھا۔

(110) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دھول پور میں دفن ہے' ملاحظہ کیجئے' کینے کی تصنیف آگرہ' صفحہ 39۔

(111) یہ قطعہ خدا کی طرف سے عزازیل کو دیئے جانے والے حکم کی طرف اشارہ کرتا ہے' جس نے خدا کے تخلیق کردہ انسان کے پتلے کے سامنے سجدہ کرنے کے حکم سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق' شیطان بن گیا۔

(112) سوا'' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(113) سرو کے بیان کے لئے ملاحظہ کیجئے' صفحہ ۱۵۹ سے قبل۔

(114) ملاحظہ کیجئے' باب' اول' صفحہ 113 سے قبل۔

باب سوئم

اکبر اور اس کا دربار

شہنشاہ اکبر: 1541ء میں قنوج کے قریب شیر شاہ سے اپنی شکست کے بعد ہمایوں سندھ میں تسلط قائم کرنے کی غرض سے روانہ ہوا اور تقریباً" اڑھائی برس تک اس علاقے میں رہا۔ دریائے سندھ سے تقریباً" بیس میل مغرب کی جانب پاتر کے مقام پر اس کا بھائی ہندال بمعہ اپنے امراء اور حرم سرا کے اس سے آن ملا۔ ہمایوں نے اپنے بھائی کا زبردست استقبال کیا۔ تقریبات کے دوران ہندال کی والدہ (یاد رہے وہ ہمایوں کی ماں نہیں تھی) نے بادشاہ اور دربار شاہی کی خواتین کو ایک عظیم الشان ضیافت دی۔ اس دعوت میں ہمایوں نے اتفاق سے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کو دیکھ لیا' جس کا نام حمیدہ بانو تھا۔ وہ اس پر کچھ اس قدر فریفتہ ہو گیا کہ اس نے اس موقع پر انتہائی گرمجوشی سے پرشوق انداز میں دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ اور جب اسے بتایا گیا کہ وہ ایک امیر کی بیٹی ہے' جو ہندال کا اتالیق رہ چکا ہے' تو اس نے پوچھا آیا اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ اسے جواب میں بتایا گیا کہ اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے مگر ابھی تک باقاعدہ طور پر منگنی کی رسومات ادا نہیں کی گئیں۔ ہمایوں نے اپنے لئے اس کا رشتہ مانگا۔ ہندال نے اس خیال کو پسند نہیں کیا یوں دونوں بھائیوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا حتیٰ کہ ان میں علیحدگی ہو گئی۔ مگر ہندال کی ماں اس رشتے کے حق میں تھی' چنانچہ ہمایوں کی شادی حمیدہ بانو سے ہو گئی' جس نے حال ہی میں اپنا چودھواں سال مکمل کیا تھا' اس کے تھوڑی دیر بعد یہ نوبیاہتا جوڑا بھکر میں پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہندال نے اس شادی پر مشتعل ہو کر ہمایوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔

اکبر کی ولادت: اس شادی کے نتیجہ میں 15 اکتوبر 1542ء کو عمرکوٹ کے مقام پر مارواڑ کے صحراؤں کے کنارے پر اکبر کی ولادت ہوئی' جودھ پور کے راجہ مل دیو کی بے لیفنی نے ہمایوں کو اس طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عمرکوٹ کے حکمران راجہ رانا پرشاد نے اس کی خوب خاطرمدارت کی اور اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ اکبر کی پیدائش سے چار روز قبل ہمایوں ضلع جون پر حملہ کرنے کے سلسلہ میں امرکوٹ سے روانہ ہوا۔ بادشاہ نے یہ خوشخبری سنی تو وہ اپنے بیٹے اور وارث کی پیدائش کے لئے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ ریز ہو گیا۔ امراء اور کمانڈر اس کے گرد جمع ہو کر مبارک باد دینے لگے۔ رسمی انعام و اکرام کی عدم ادائیگی کے باعث بادشاہ نے اپنے جھاری بردار اور معتمد جوہر (مورخ، مصنف تذکرۃ الواقعات) کو مشک عنبریں کا گولا لانے کا

حکم دیا اسے اس نے چینی کی ایک رکابی میں توڑا اور یہ کہتے ہوئے اپنے امراء میں تقسیم کر دیا۔ " اپنے بیٹے کی پیدائش کے موقع پر صرف یہی ایک تحفہ ہے جو میں اس وقت آپ کو پیش کر سکتا ہوں' مجھے یقین ہے جس طرح مشک کی خوشبو نے اس کمرے کو بھر دیا ہے اسی طرح اس کی شہرت ایک دن چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی۔ " اس کے بعد اس مبارک موقع کا جشن منانے کے لئے نقارے بجائے گئے اور بگل گونج اٹھے۔ بادشاہ نے بچے کو جلال الدین محمد اکبر کا نام دیا۔

جب شہنشاہ ہمایوں ایران کے شاہ طہماسپ کی امدادی فوج کے ساتھ قندھار پر حملہ کرنے والا تھا' تو ہمایوں کے بھائی عسکری نے (جو اس وقت شہر پر قابض تھا) کامران کی درخواست پر ننھے اکبر اور اس کی سوتیلی بہن بخشی بانو بیگم کو قندھار سے کابل روانہ کر دیا۔ مارچ 1545ء میں قندھار پر قبضہ کے بعد ہمایوں نے کابل کی طرف پیش قدمی کی' جس پر اس نے نومبر1546ء میں اسکے باشندوں کے جشن منانے کے دوران قبضہ کر لیا۔ ہمایوں کو یہاں میدان جنگ میں اپنی کامیابی کے علاوہ تین سال کی جدائی کے بعد اپنے پیارے بیٹے اکبر سے دوبارہ ملنے کی خوشی بھی ملی۔ جب اس وقت ملکہ بھی کابل سے وہاں پہنچی' تو اکبر کی رسم ختنہ (جس کو حالات کے تحت ملتوی کر دیا گیا تھا) شرع کے مطابق زبردست جشن کے درمیان اور انتہائی شان و شوکت کے ساتھ ادا کی گئی۔ (115)

ابوالفضل کے مطابق رسم ختنہ کے بعد جب اکبر کی عمر پانچ برس ہوئی تو اس کو سب سے پہلے بشری علم کے مدرسہ میں لایا گیا اور مولانا عزم الدین کو اس کا اتالیق منتخب کیا گیا۔ اکبر نے اپنے پہلے استاد سے کچھ بھی نہیں سیکھا' اس لئے کچھ عرصہ بعد اس کی جگہ پر مولانا بایزید کو مقرر کیا گیا۔ بعد میں معین خان کو مقرر کیا گیا کہ وہ شہزادے کو بادشاہ کے منصب کے لئے تیار کر دے چنانچہ اسے ہتھیاروں کے استعمال "گھڑ سواری' تیر کمان' نیزا' تلوار اور بندوق چلانے میں ماہر بنا دیا گیا' مگر اس نے لکھنا اور پڑھنا نہیں سیکھا۔ جب بیرم خاں اکبر کا قائم مقام بنا تو نوجوان بادشاہ کو میر عبداللطیف قندوائی کی اتالیقی میں دے دیا گیا۔ اکبر نے اپنے عالم فاضل استاد سے عارفانہ غزلیں پڑھیں اور حافظ کے اشعار کو زبانی یاد کر لیا۔ میر کا نصب العین تھا "امن سب کے ساتھ" اس میں کوئی شک نہیں کہ اکبر نے بصیرت اور رواداری (جو اس کی پوری زندگی کا خاص وصف تھی) اپنے مہربان دل استاد کی ابتدائی تعلیمات سے حاصل کی۔

اکبر کی یہ زبردست خواہش تھی کہ ہندوستان کے دو مخالف فرقوں کے ساتھ مکمل مساوات کی شرائط پر برتاؤ کیا جائے اور ہندو و مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا جائے۔ اس کی

خواہش تھی کہ ہندوستان کو ایک ایسے باغ میں تبدیل کر دیا جائے کہ اس میں ہندو کا بلیان (انجیر کا پیڑ) جو قوت حیوانی کا درخت ہے ' ہمیشہ تروتازہ اور لہلہاتا رہے اور وہ مسلمان کے کھجور کے نازک اور عالی ہمت درخت کے شانہ بشانہ کھڑا اور آباد رہے ' جس نے اس کے ساتھ صحرائے عرب سے نیل کے وسائل اور ایران کے پہاڑوں سے لے کر چین کے ساحلوں اور بحرالکاہل تک کا سفر کیا ہے۔ وہ ایک ہندو کے زیر سایہ پیدا ہوا تھا' چنانچہ جب تخت نشین ہوا تھا' تو اس نے ہندوؤں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لئے فیصلہ کن رجحان کا اظہار کر دیا تھا۔

در حقیقت' یہ چیز اس کو وراثت میں ملی تھی۔ جب اس کے دادا بابر نے ہندوستان کو فتح کرنے کے منصوبے بنائے تو اس نے سلطان ابراہیم لودھی کو معزول کرنے کے لئے ایک راجپوت سردار رانا سانگا سے بات چیت کی۔ اس کے باپ ہمایوں نے چتوڑ کے رانا (جس کو اس نے بہادر شاہ کے خلاف مدد بہم پہنچائی تھی) اودھے سنگھ کی عظیم ماں کرناوتی کا راکھی بند بھائی بننے کو ترجیح دی۔ اکبر نے راجپوتوں کے ساتھ الحاق کر لیا اور اس نے اس جنگجو قوم سے نہ صرف اپنے جگری دوست بلکہ اپنے چند انتہائی بااعتماد مشیر اور بہادر جرنیل بھی حاصل کئے۔ اس کے علاوہ وہ پہلا چغتائی تھا' جس نے ایک ہندو راجپوت شہزادی سے رشتہ ازدواج قائم کیا۔ واقعہ کچھ یوں ہے:۔ امبر کے سردار اور کچھواہا گھرانے کے انتہائی محترم شہزادے راجہ بہاری مل نے ہمایوں کو اس وقت اہم عسکری خدمات بہم پہنچائیں' جب یہ بادشاہ ایران کو ہجرت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے ہمایوں کے حاکم زنول مجنون خاں قاقشال کو بغیر تنگ کئے مراجعت کی اجازت دینے کی خاطر شیر شاہ سوری کے ایک جرنیل حاجی خاں سے مصالحت کر لی۔ اکبر کی تخت نشینی پر بہاری مل نے دھلی کے قریب ہیمو کی شکست کے دو روز بعد شاہی پڑاؤ میں اپنی پہلی حاضری دی۔ یہاں اس نے معمول کے پرسکون ماحول اور شاہی دربار کی ترتیب کی بجائے ایک ہنگامہ خیز منظر دیکھا۔ سپاہی' نوکر چاکر اور منصب دار ہر طرف اڑتی ہوئی خیموں کی میخوں اور رسوں سے بچنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے دھکم پیل کر رہے تھے' جبکہ ایک نوجوان نہایت اطمینان سے ایک مست ہاتھی پر بیٹھا اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی آہنی آنکس کی ضربوں سے اسے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا' پرسکون مشاہدے کے مقابلہ میں اس کام کے لئے زیادہ دلیری کی ضرورت تھی۔ آخر کار اس نوجوان نے مست ہاتھی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی نشست سے باہر کودا اور بوڑھے ہندو سردار کو خوش آمدید کہا' جو اپنے بیٹے بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کے ہمراہ آیا تھا' اس نے نوجوان کے حوصلہ اور پھرتی کی بہت زیادہ تعریف کی۔ ان کی تعریف و توصیف کو نظر انداز کرتے ہوئے' اس نوجوان نے بوڑھے سردار کو اپنے پیچھے قرمزی رنگ کے

شاہی خیمہ میں آنے کا اشارہ کیا' ——— یہاں بہاری مل پر انکشاف ہوا کہ وہ ان کے اپنے بادشاہ کے سوا کوئی اور نہیں تھا: یہاں پر راجپوت سردار پہلی مرتبہ چغتائی بادشاہ کی بے مثال بہادری اور زبردست مہارت سے متاثر ہوا۔ پانچ برس بعد بہاری مل اور اس کے پورے خاندان نے سنگانیر میں بادشاہ کے پاس حاضری دی: ان کا خوب خیر مقدم کیا گیا۔ راجہ نے شاہی ملازمت میں شمولیت کرنے اور دوستی کے بندھن کو اکبر کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کے ذریعے مضبوط کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بغیر کسی حیل و حجت کے دونوں درخواستوں کو منظور کر لیا گیا' چنانچہ مجوزہ شادی معرض وجود میں آگئی: اس بندھن کے نتیجہ میں سلیم (بعد میں شہنشاہ جہانگیر) کی پیدائش ہوئی۔ مغلیہ شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ راجپوت شہزادیوں کی شادی اس وقت سے باقاعدہ شکل اختیار کر گئی اور ہندوستان کی آبادی کے دو بڑے دھڑوں میں درستی پیدا کرنے کے لئے اس کی مدد سے بہتر نتائج بر آمد ہوئے۔ دار الخلافہ پہنچنے پر راجہ بہاری مل کو پانچ ہزاری کماندار بنا دیا گیا اور اس کے بیٹے اور پوتے کو اعلیٰ عسکری کمانیں سونپی گئیں۔

اکبر کی اختراعات و ایجادات: اکبر ایک اختراعی طبیعت اور میکانکی ذہن کا حامل تھا۔ وہ مختلف میکانکی فنون میں ماہر تھا: نیز توپ کو ڈھالنے اور جنگ کا بھاری اسلحہ اور ہتھیار بنانے کے علم سے بخوبی واقف تھا۔

محل کے قرب و جوار میں اس کے کارخانے تھے اور وہ اپنے اسلحہ خانہ کے کام کو انتہائی جستجو سے دیکھتا تھا۔ اس نے نئے طریقے متعارف کرائے اور انہیں عملی شکل دے دی۔

اس نے توپوں اور بندوقوں کی تیاری پر خصوصی توجہ دی اور اس شاخ کی کارکردگی کو بادشاہ کا ایک اولین مقصد قرار دیا۔ اس نے ایک ایسی توپ ایجاد کی' جسے راستے میں آسانی سے علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا اور حسب ضرورت ترتیب دے کر جوڑا جا سکتا تھا۔ ایک دوسری ایجاد کے ذریعے ایک ہی بندوق سے بیک وقت سترہ توپوں پر نشانہ لگایا جا سکتا تھا۔ ایک نرالی قسم کی توپ تھی' جسے ایک ہاتھی آسانی سے لے جا سکتا تھا اور دوسری اس قدر بڑی جسامت کی تھی کہ اس کے گولے کا وزن بارہ من تھا اور اسے لیجانے کے لئے کئی ہاتھی اور ایک ہزار بیل درکار ہوتے تھے۔

بادشاہ نے ایک بندوق ایجاد کی تھی' جس کے گھوڑے کی ہلکی سی حرکت سے نشانہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس نے ایک پہیہ بھی ایجاد کیا تھا' جو ایک انتہائی مختصر وقت میں توپ کی سولہ نالیوں کو صاف کر سکتا تھا۔ (116)

اس نے بے شمار ایسے ایجاد کئے اور اس وقت مروجہ طور طریقوں میں بہت زیادہ بہتری پیدا

کی۔ سرخ کپڑے سے مزین اور فیتے سے بندھا ہوا خیمہ گلاب دار بھی اس کی ایجاد تھا۔ یہ کسی طرح بھی ایک سو مربع گز سے کم نہیں تھا' اس کے مضبوط دروازے تھے' جن کو تالوں اور چابیوں سے محفوظ بنایا گیا تھا۔ اس کا پڑاؤ ایک گشتی شہر تھا اور اس کے پاس بہت بڑی جسامت کے شہ نشیں تھے' جو سفر کے دوران دیوان عام و دیوان خاص' جھروکہ' عبادت گاہوں اور مختلف دیگر مقاصد کے لئے استعمال ہوتے تھے۔

روشنی کے شعبہ میں اس نے نفیس شکلوں کی بے شمار شمعیں ایجاد کیں۔ وہ دیوتا کی علامت کے طور پر آگ کی پرستش کرتا تھا' غروب آفتاب کے وقت اس کے سامنے بارہ طلائی و نقرئی شمعیں لائی جاتیں' تب ایک گویا اپنے ہاتھ میں ایک شمع پکڑے ہوئے شیریں اور مترنم آواز میں خدا کی حمد میں مختلف گانے گاتا' اپنی دھنوں کا آغاز اور اختتام بادشاہ کے لئے ایک دعا سے کرتا تھا۔

اس نے مست ہاتھیوں کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے کئی ایجادیں کیں۔ اس نے ایک چرخی (یا کھوکھلے بانس کا ایک ٹکڑا' پٹوں سے لپٹا ہوا اور بارود سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ مٹی کی تہہ کے ذریعے بارود کو دو نصف حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے) ایجاد کی۔ دونوں سروں پر آگ لگانے سے یہ گھومتی ہوئی انتہائی خوفناک آواز پیدا کرتی تھی اور کسی مست ہاتھی کو خوفزدہ کرکے اسے خاموش کر دیتی تھی۔ گزشتہ دور میں دو لڑتے ہوئے ہاتھیوں کو جدا کرنے کے لئے آگ جلائی جاتی تھی' مگر اس سے بہت مشکل پیدا ہو جاتی اور شاذ و نادر ہی مطلوبہ فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ جانور کو رام کرنے کے لئے اکبر کا وضع کردہ طریقہ انتہائی مفید تھا۔

بادشاہ نے غیر معمولی گاڑیاں ایجاد کیں' ان میں سے ایک ایسی گاڑی بھی تھی' جسے ایک ہاتھی کھینچتا تھا اور اس قدر بڑی تھی کہ بے شمار حماموں پر مشتمل تھی۔ یہ ایک سفری حمام تھا اور اسے بیل بھی باآسانی کھینچ سکتا تھا۔ مختلف انداز کے رہٹ اور چھکڑے بنائے گئے اور ایک ایسی مشین ایجاد کی گئی جو کنوئیں سے پانی نکالتی اور اسی دوران چکی کے پتھر کو بھی چلاتی تھی۔

اکبر نے چندل منڈل کا کھیل ایجاد کیا' وہ اسے مختلف انداز میں کھیل سکتا تھا۔ آئین اکبری میں ان سب کی تفصیل درج ہے۔ اس نے تاش کے کھیل میں متعدد تبدیلیاں کیں اس کے علاوہ شطرنج کا ایک بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ اس کے مورخ کے مطابق "اس کا اہم مقصد ان کھیلوں سے محظوظ ہونا اور اس کے علاوہ آدمیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور دربار میں یگانگت اور اچھے بھائی چارے کی فضا پیدا کرنا تھا۔"

اکبر کا تجسس: اکبر اگرچہ ایک مسلمان پیدا ہوا تھا' مگر اس کے باوجود اسے ایک متجسس ذہن

عطا ہوا تھا۔ وہ متلاشی حق تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ اپنی تمام رعایا کو (چاہے ان کی نسل اور عقیدہ کچھ بھی ہو) ایک مشترکہ قومیت کی صورت میں متحد کر دیا جائے۔ وہ مسلمانوں کی حمایت نہیں کرتا تھا' کیونکہ ان کا تعلق حکمران قوم سے تھا۔ وہ مختلف مذاہب اور فرقوں کے علماء کی آراء جمع کرتا' نہایت غور سے ان کو پرکھتا' جس کو چاہتا منظور کر کے اس پر برقرار رہتا اور جسے ناقابل قبول سمجھتا رد کر دیتا۔ بدایونی لکھتا ہے: "بچپن سے بلوغت تک اور بلوغت سے بڑھاپے تک بادشاہ' انتہائی مختلف پہلوؤں اور ہر قسم کے مذہبی رواجوں اور فرقہ وارانہ عقائد سے گذرا" ——— وہ ہر چیز کو تجسس کے جذبہ کے تحت جمع کیا کرتا تھا۔ ان تجسسات نے اس کے ذہن میں اس خیال کو مضبوط کر دیا تھا کہ تمام مذاہب میں ذہنی اور اخلاقی کمالات کے افراد اور زبردست مفکرین ہوتے ہیں' اور اس کا یہ عقیدہ تھا کہ تمام اقوام میں ایسے افراد موجود ہوتے ہیں' جو کرامات کے حامل ہوتے ہیں۔ اس نے کافروں پر عائد جزیہ معاف کر دیا۔

اس نے روز محشر کے عقیدہ کو رد کر دیا اور آواگون یا تناسخ کے عقیدہ پر یقین قائم کر لیا۔ تہ دل سے اس مقولے پر کاربند ہو گیا: "کوئی ایسا مذہب نہیں ہے' جس میں تناسخ (یا روح کے حلول کر جانے کا عمل) کے عقیدہ کی جڑ مضبوط نہ ہو۔" برہمنوں نے اس عقیدہ کے لئے شہادت تلاش کرنے کی خاطر صحیفے ترتیب دیئے۔ وہ جوگی پورہ' عبادت خانہ اور اسی قسم کے اجتماعات کے لئے دیگر مقامات پہ منعقد ہونے والے مذہبی اجتماعات میں اپنے ہندوانہ خیالات پر قائم رہتا۔ مذاہب کے بارے میں علم جمع کرنے کے لئے اس کی خواہش صرف اجتماعات عام تک محدود نہیں رہتی تھی: بلکہ اپنی خواب گاہ میں جب وہ تمام سرکاری فرائض سے ہٹ کر آرام کرنے کے لئے جاتا تب بھی علماء کی صحبت کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ اس نے وسو ہوتم نام کے ایک برہمن کو تمام موجود اشیاء کی سنسکرت زبان میں ایک لغات مرتب کرنے کا حکم دیا۔ دیبی نام کا ایک اور برہمن ایک انتہائی انوکھے انداز میں بادشاہ کے پاس اس کی خواب گاہ میں جایا کرتا تھا۔ بدایونی کے مطابق چونکہ حرم میں آدمیوں کا داخلہ سخت ممنوع تھا اس لئے وہ ایک چارپائی کے ذریعے محل کی دیوار پھلانگ کر اس برآمدے میں پہنچتا جہاں بادشاہ سویا ہوتا تھا۔ پس آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہو کر بادشاہ کو بتوں' آگ' سورج اور ستاروں اور ہندوؤں کے بڑے دیوتاؤں' برہما' مہادیو' بیشن' کشن' رام اور مہاما کی پرستش کی صورت میں ہندومت کے اسرار و رموز اور کماوتوں کی تعلیم دیتا تھا۔ بادشاہ سورج کی اس لئے پوجا کرتا تھا کہ وہ سب سے بڑی روشنی ہے' تمام روشنیاں اس کے ماتحت ہیں۔ اس نے مختلف سات رنگوں کی پوشاکیں اختیار کر لیں' جن کو وہ سات اجرام فلکی کے رنگوں کے مطابق ہفتے کے خاص دنوں میں زیب

تن کرتا تھا۔ اس نے گائے کے گوشت کا استعمال ترک کر دیا' اس کا خیال تھا کہ گائے کو مارنا غلط ہے' اس لئے گائے کے گوبر کو پاکیزہ سمجھتا تھا۔ حکیموں نے اپنی کتابوں میں قطعات تحریر کر دیئے کہ گائے کے گوشت کا استعمال صحت کے لئے مضر ہے اور مختلف بیماریاں پیدا کرتا ہے۔

اکبر زرتشت کی تعلیمات پر یقین رکھتا تھا اور آگ کو خدا کی ایک تجلی اور اس کی کرنوں میں سے ایک کرن خیال کرتا تھا۔ اپنے بچپن ہی سے وہ ہوم کو ایک عبادت کے طور پر مناتا تھا۔ قدیم بادشاہوں کی رسم کی پیروی میں اس نے حکم دیا کہ دربار میں مقدس آگ کو دن رات روشن رکھا جائے؛ نیز اس نے شیخ ابوالفضل کو آگ مندر کا نگران مقرر کیا۔ وہ پوجا میں سورج اور آگ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا۔ جب محل میں شمعیں اور چراغ روشن کئے جاتے تو وہ درباریوں کو اٹھنے کا حکم دیتا۔ وگرو کے آٹھویں روز وہ کسی ہندو کی طرح اپنے ماتھے پر زعفران کا نشان لگا کر دیوان عام میں آتا' تب برہمن نیک شگون کے طور پر موتیوں اور جواہرات سے مزین ایک راکھی اس کے ہاتھ پر باندھتے تھے۔

اکبر کی والدہ حمیدہ بانو 20 اگست 1604ء کو آگرہ میں انتقال کر گئی' تو اکبر ماتمی لباس میں ملبوس تھا اور اس نے اپنا سر' ڈاڑھی اور مونچھ منڈوا دیئے۔ مرحوم ملکہ کی نعش کو دہلی لایا گیا۔ بادشاہ نے کئی قدموں تک جنازے کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور اس کی سلطنت کے سرکردہ امراء نے بھی اس کی تقلید کی۔ دربار کے تمام امراء نے اپنی ڈاڑھی مونچھ منڈوا دی اور ماتمی لباس پہن لیا۔

اکبر نے روز محشر' قیامت اور رسول اکرمؐ کی احادیث پر مبنی احکامات سے متعلق اسلامی المللات کو پس پشت ڈال دیا۔ ماسوائے عقل اور تصدیق پر مبنی ثبوتوں اور اظہر من الشمس سچ کے جاہل عقائد کے اس کے متجسسانہ ذہن کو کوئی چیز مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ تمام فرقوں کے علماء سے کئی نجی ملاقاتوں اور مذاہب' اخلاق و طبعی علوم پر مختلف صحائف کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے انسانی فطرت کے کمالات اور کمزوریوں کی پوری طرح آزمائش کی۔ جہاں تک مستقبل کی جزاؤں اور سزاؤں کا تناسخ سے اختلاف تھا' وہ ان سے انکار کرتا تھا۔ جسم سے پرواز کرنے کے بعد روح کی موجودگی سے انکاری تھا؛ نبیوں کے معجزات اور بزرگوں کی کرامات کا منکر تھا' جنوں' فرشتوں اور غائب دنیا کی دوسری تمام مخلوقات کے وجود سے انکار کرتا تھا۔

ایک نئے مذہب کی بنیاد: اس نے اپنے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی' جس کو وہ "دین الٰہی" کہتا تھا۔ اس میں خدائے واحد کو الہ اور زمین پر اکبر کو اس کا خلیفہ تسلیم کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے کلمہ طیبہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس

کے رسول ہیں۔)" کی جگہ پر یہ کلمہ اپنایا گیا:

لا الہ اللہ۔ اکبر خلیفتہ اللہ

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اکبر اس کا خلیفہ ہے۔

اس خوف کے تحت کے کہیں نیا کلمہ آبادی کے مسلمان طبقوں میں بے چینی نہ پیدا کر دے' اس کے استعمال کو محل تک محدود کر دیا گیا۔

اس وقت (990ھ' 1582ء) ملا شیری نے دس اشعار کی ایک نظم لکھی' ان میں سے چند یہ ہیں:

شورش معرفت اگر در خاطر آرد جاہلے
کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ ے آید مرازین بیت بس کز طرفگی
نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن
بادشاہ امسال بدعوئی نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

ترجمہ: اگر کوئی جاہل اپنے ذہن میں یہ خیال کرے کہ خلق خدا میں پیغمبر کی محبت کبھی جدا بھی ہو سکتی ہے تو یہ اس کے دماغ کا فتور ہے۔ میں اس انوکھے شعر پر اپنے قہقہہ کو کبھی دبا نہیں سکتا' جو پڑھا تو امیر کی دعوت میں جائے گا اور بھوکے شخص کا پلول بن جائے گا۔ اس سال بادشاہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اگر خدا نے چاہا تو سال گذرنے پر وہ خدا بھی بن بیٹھے گا ـــــــــ

اکبر کے قائم کردہ دین الٰہی کی ایک اہم سیاسی اہمیت تھی۔ یہ ایک مذہبی برادری تھی' جو مختلف افراد کی جماعت پر مشتمل ایک متحدہ سیاسی گروہ تھا' اس کے اراکین اس کی رو سے اچھی اور بری قسمت' خوشی اور غمی کی حالت میں بادشاہ کا ساتھ دینے کا حلف اٹھا کر خود کو پابند کر لیتے تھے۔ سال 988 (1580ء) کے دوران بادشاہ میں موجود دین کے چار درجوں کی تشریح کی گئی' ان میں سے (1) بادشاہ کی ملکیت کے لئے قربانی دینے کی خاطر تیار رہنا (2) زندگی (3) وقار اور (4) مذہب۔ جو کوئی ان چاروں چیزوں کی قربانی دیتا اسے چاروں درجے حاصل ہو جاتے اور جو ایک کی قربانی دیتا اسے ایک درجہ حاصل ہوتا۔ تمام درباریوں نے اپنے ناموں کا اندراج مخلص چیلوں کی حیثیت سے کرایا تھا۔

تمام سرکاری خط و کتابت اور دوسری تحریریں' الفاظ' اللہ اکبر سے شروع ہوتی تھیں' جن میں اکبر کے نام کو اللہ کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے اور بسم اللہ جیسے متبرک کلمے کے استعمال کو

ترک کر دیا گیا۔ اسلامی نمازوں کو بے فیض اور نادرست کہہ کر رد کر دیا گیا اور روزوں کو تقلیدی یا مذہبی اندھا پن قرار دے کر چھوڑ دیا گیا۔ ایران کے آتش پرستوں اور برہما کے پیروکاروں جیسی عبادات کو زیادہ جامع اور موثر بنا کر متعارف کرایا گیا۔

تمام مذاہب کی بنیاد کے لئے صرف انسان کی دلیل ہی کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ تمام سرکاری مندرجات میں نئے دین کے مطابق' ایک نئے سنہ کو متعارف کرایا گیا اور سلام کے مروجہ طریقہ میں تبدیلی پیدا کر دی گئی۔ جب دین الٰہی کا کوئی رکن کسی دوسرے کو دیکھتا تو کہتا:۔ اللہ اکبر' اس پر دوسرا جواب میں کہتا جل جلالہ۔ ابوالفضل لکھتا ہے' اس طریقہ سلام کو رائج کرنے سے بادشاہ سلامت کا مقصد لوگوں کو ان کے وجود کی اصل کے بارے میں یاد دلانا اور خدا کی تازہ' حیات بخش اور شکر گذار یاد قائم رکھنا ہے۔" اس کے اراکین گوشت کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی پیدائش کے مہینے کے دوران بھی اس کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ موت کے بعد آدمی کی یاد میں اس کی روح کے ایصال ثواب کی خاطر دیئے جانے والے کھانے کی بجائے ہر رکن کو اپنی زندگی میں ایک کھانا دینا ہوتا تھا۔ اسے اپنی سالگرہ کے موقع پر بھی ایک پر تکلف ضیافت کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ کسی مردے کی روح کو کھانا (جو مادی شے ہے) پیش کرنا حماقت ہے کیونکہ وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا——— کسی کی سالگرہ کے دن ایک عظیم الشان ضیافت میں شرکت کرنے کو انتہائی معقول سمجھا جاتا تھا۔ اپنی پیدائش کے مہینے میں ہر رکن کو روزہ رکھنا ہوتا تھا۔

اکبر کے لئے عیسائیوں کی سفارت: یکم اپریل' 1896ء کو منعقد ہونے والے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ایک ماہانہ اجلاس میں "اکبر بادشاہ کے لئے عیسائیوں کی سفارت" اور سابقہ جنرل آر میکلگین کے درج کردہ بیانات پر مبنی' مسٹر ای' ڈی' میکلگین' آئی۔ سی۔ ایس کا ایک دلچسپ مضمون پڑھا گیا۔ یہ عیسائیوں کی پیش کردہ ان سفارتوں کی کارروائیوں کے بارے میں مکمل طور پر بیان پیش کرتا ہے:۔

فادر ایکوادیوا کی طرف سے 27 ستمبر' 1582ء کو تحریر کردہ خط پہلی سفارت کے آخری مرحلہ کے بارے میں ایک دلچسپ بیان پیش کرتا ہے۔ یہ کہتا ہے:۔ "بادشاہ ہر روز دربار میں نئی اختراعات متعارف کر کے غلط فہمی پیدا کرتا ہے' دوسری اشیاء میں مخلوقات یعنی سورج اور چاند کی پوجا اور ہفتے کی رات سے اتوار کے پورے دن تک گوشت سے اجتناب شامل ہے۔ مجھے یقینی معلومات ملیں کہ بہت سے بت پرست توہم پرستی کے باعث سورج اور چاند کے روز بالکل کچھ نہیں کھاتے۔ عام طور پر بازار میں گوشت کے لئے کسی جانور کو ذبح کرنے پر ممانعت ہے اور ہم

عموماً اتوار کے روز کھانے سے قاصر ہیں۔ ان کے چلہ کے دو یا تین روز بعد ایک نیا ایسٹر شروع ہو گیا ہے' جسے مرجان کے نام سے متعارف کرایا گیا ہے' اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمام سردار شاہانہ لباس پہن کر باہر آئیں اور موسیقی اور ناچ گا سکیں۔ میں نے بادشاہ کے نجومیوں سے دریافت کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ ایک ایسی ضیافت ہے' جسے ایران کے قدیم آتش پرست بادشاہ منعقد کیا کرتے تھے۔ مسلمان بہت زیادہ ناراض تھے اس لئے وہ ضیافت کے ناظرین کی نقل نہیں کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھ نہیں سکتے کہ آیا وہ ان چیزوں کو اس لئے اپنائے ہوئے ہیں کیونکہ وہ انہیں پسند کرتے ہیں یا انہیں صرف تجربہ کے طور پر کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس معاملہ کو میں بھی نہیں سمجھ سکتا' کیونکہ بادشاہ موسم برسات جیسی ملاقات کی طرح مجھ سے اپنائیت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے' ہر وقت دین کے بارے میں پوچھتا ہے اور ابھی تک معلوم ہوتا ہے وہ دیگر چیزوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے' چنانچہ ایک روز اس نے مجھ سے یہ اعتراف کیا کہ اگر کوئی حقیقت میں سچ کی تمیز کر سکے تو اسے بہت زیادہ حیرانگی ہوگی۔ 24 ستمبر بروز منگل بادشاہ سہ پہر کے وقت ڈومینگو پائرز کی شادی دیکھنے کے لئے ہمارے گرجا میں آیا۔ ہم نے گرجے کو بہت اچھی طرح سے آراستہ کر دیا اور اس کے اعزاز میں دو ٹرالیوں کو رنگ بھی کیا نیز: ڈومینگو پائرز نے حکم دیا کہ ہمارے مکانوں میں اس کے لئے ایک پرتگیزی ضیافت تیار کی جائے۔ بادشاہ نے ہر چیز سے حظ اٹھایا اور اپنی طاقت سے بڑھ کر اس کی آؤ بھگت کرنے پر اس نے مجھ سے بہت شفقت کا اظہار کیا۔ شادی کے موقع پر میں نے جوڑے سے ایک درس کی تبلیغ کی۔ عورت کو میری سمجھ نہ آئی تو بادشاہ نے میری فارسی کی گفتگو کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اسے بتایا۔ بادشاہ رات کے آٹھ بجے تک ہمارے گھر میں ٹھہرا۔ وہ انتہائی مسرت کے ساتھ مسلمانوں اور بت پرستوں کے تمام سرکردہ سرداروں کو اس مکان میں لایا۔ ان ملحدوں میں سے ایک جو ان علاقوں کا حکمران تھا بہت زیادہ حیران ہوا اور اس گرجے پر اس نے پھبتی کسی۔ دیگر افراد اور بادشاہ کے بچے بھی موجود تھے اور ان کے علاوہ ان دو سرکردہ مسلمان سرداروں نے بھی اس مکان میں کھانا کھایا' جن کو بادشاہ نے بلوا بھیجا تھا۔"

اکبر بطور روحانی پیشوا: اکبر نے قوم کے ایک روحانی پیشوا کی حیثیت سے لوگوں کو چیلے بنایا۔ بادشاہ کے سامنے منت مانگنے کو اپنی مشکلات کے حل کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ بیمار اور بے کس عورتوں' (جن کے سینوں سے ان کے شیر خوار بچے چمٹے ہوتے تھے) بھک منگوں اور محتاجوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ بادشاہ کی ایک نظر کرم حاصل کرنے کے لئے فتح پور سیکری میں دیکھے جا سکتے تھے۔ یا وہ بادشاہ کی چھوئی ہوئی چیز کو چھیننے کی خاطر وہاں جمع ہوتے تھے۔ ان جیسی اشیاء کے

حصول کو انتہائی متبرک سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایک مخصوص فاصلہ سے اپنے ناموں کو رازداری میں پیش کرتے تھے۔ جب بادشاہ سیر کے لئے اپنے دربار سے رخصت ہوتا' تو دیہاتوں اور شہروں سے مردوں اور عورتوں کے ہجوم اپنے ہاتھوں میں نذرانے لئے اس سے ملاقات کرتے اور اپنی پیشانیاں زمین سے چھو کر اس سے لطف و کرم' راستبازی' بیٹے کی پیدائش' دوستوں کی ملاقات' طویل العمری' دولت کی زیادتی' منصب کی ترقی اور بہت سی دوسری چیزوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ بادشاہ ہر ایک کو جواب دیتا اور ان کی مذہبی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ معمول کے مطابق شجرہ جبلیت کی بجائے بادشاہ اپنے چیلوں کو اپنی تصویر دے دیتا تھا' وہ اسے ایمان کی علامت' راست بازی اور خوشی کی پناہ گاہ سمجھتے تھے اور اسے اپنی پگڑیوں میں جواہرات سے مزین ایک ڈبیہ میں رکھتے تھے۔

اکبر سورج کی پوجا کرتا تھا اور دن میں چار مرتبہ اس کے سامنے طویل دعائیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ اس نے ایک دیوتا کی طرح اپنی پوجا کی اجازت بھی دے دی تھی۔ ہر صبح جب وہ محل کے جھروکے میں نمودار ہوتا' تو لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا تھا۔ عورتیں دعائے خیر حاصل کرنے کے لئے اپنے بیمار بچوں کو لایا کرتی تھیں اور ان کی صحت یابی پر اسے نذر پیش کرتی تھیں۔ لوگ دم جھاڑا کرانے کے لئے پانی کے پیالے لایا کرتے تھے۔ بادشاہ پانی اٹھاتا اور اسے سورج کی کرنوں کی طرف کرتا اور چند مقدس الفاظ منہ میں پڑھتے یا (ابوالفضل کے پر فصیح الفاظ میں) قسمت کی کتاب میں الہامی احکامات پڑھنے کے بعد اس پہ پھونک مار دیتا۔

ہندووانہ رسم و رواج: ہر وہ چیز جسے مسلمان نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور گھن کھاتے تھے' اور ہر وہ چیز جو دین اسلام کے منافی تھی اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور اسے متعارف کرایا جاتا تھا۔ چنانچہ' یہ قانون بنا دیا گیا کہ سجدہ بادشاہوں کے لئے واجب ہے' مگر سجدہ کی بجائے لفظ زمیں بوس استعمال کیا جاتا تھا۔ سکوں پر ہجری سنہ کی بجائے سنہ ہزار سالہ درج تھا۔ طاقت بڑھانے یا حکیم کے نسخہ کے مطابق شراب پینے کی اجازت تھی۔ حرم سرا کی بے شمار ہندو رانیوں کے زیر اثر بادشاہ نے نہ صرف گائے کے گوشت کو ترک کر دیا بلکہ لہسن اور پیاز کھانا اور داڑھی رکھنا بھی چھوڑ دیا۔ دیوالی کے تہوار کے دن (جب ہندو گائے کی پوجا کرتے ہیں) متعدد آراستہ و پیراستہ گائیں بادشاہ کے سامنے لائی جاتیں۔ (117)

ہندوؤں کے مابین مقدمات کا فیصلہ مسلمان قاضی اور مفتی نہیں بلکہ عالم فاضل برہمن کیا کرتے تھے۔ معمول کے مطابق حلف اٹھانے کی بجائے ملزمان کے قصور یا بے گناہی کا اندازہ کرنے کے لئے آزمائش کی تجویز رکھی گئی تھی۔ دھکتا ہوا لوہا ان کے ہاتھ میں دے دیا جاتا تھا یا

ان کے ہاتھوں کو مائع گرم مکھن میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اگر انھیں کوئی گزند نہ پہنچتا تو بے گناہ قرار دے دیا جاتا اگر زخمی ہو جاتے تو قصور وار سمجھا جاتا تھا۔ آزمائش کی ایک دوسری شکل میں انھیں رواں گہرے پانی میں کودنے کو کہا جاتا۔ اگر وہ تیر کے واپس زمین پر آنے سے پہلے سطح پر آ جاتا (جسے اس وقت چھوڑا جاتا تھا جب آدمی پانی میں چھلانگ لگاتا تھا) تو اسے قصور وار سمجھا جاتا تھا۔

ڈاڑھی منڈوانے کو بادشاہ کے لئے دوستی اور محبت کی اعلیٰ ترین علامت سمجھا جاتا تھا؛ نیز یہ رسم عام ہو گئی۔ ہندوؤں کے ذوق کے منافی ہر چیز کو چھوڑ دیا گیا۔ گھنٹیوں کے بجانے کو متعارف کرایا گیا۔

اسلام کی تعلیمات کے خلاف سوروں اور کتوں کو اب ناپاک نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ حرم سرا اور قلعہ کے تہہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ چند دانشوروں کے اس مقولے کو (کہ کتے میں دس خصوصیات ہوتی ہیں اور یہ کہ اگر ان میں سے ایک بھی آدمی کے پاس ہوتی تو وہ ایک درویش ہوتا) کتے کو پاک سمجھنے کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔

جنگلی سور اور شیر کے گوشت کی اس بناء پر اجازت تھی کہ جو آدمی ان جانوروں کا گوشت کھاتا ہے اس میں ان جانوروں کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ممنوعہ جانوروں اور حشرات الارض کے استعمال کی اجازت کے حق میں شاہنامہ فردوسی کے دو اشعار کا حوالہ مسلسل دربار میں دیا جاتا تھا۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار | عرب را بجائے رسیدست کار
که ملک عجم راکنند آرزو | تفو باد بر چرخ گردان تفو

ترجمہ: اونٹنی کا دودھ پینے اور چھپکلیوں کو کھانے کے باعث عربوں نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب وہ ملک ایران کی آرزو کرنے لگے ہیں' تف ہے قسم پر! تف ہے قسمت پر!

نماز کے وقت طلائی اور نقرئی ملبوسات پہننا لازمی قرار دے دیا گیا' اسلامی نمازوں' روزوں اور حج کو ممنوعہ قرار دے دیا گیا۔ بارہ برس کی عمر سے قبل ختنے کو غیر قانونی سمجھا جاتا تھا اور اس کے بعد ان اشخاص کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تھا' جنھوں نے اس پر عمل درآمد کرنا ہوتا تھا۔ سنہ ہجری کو ختم کر دیا گیا' لہٰذا سال کا آغاز' بادشاہ کی تخت نشینی کے سال کی تاریخ سے ہوتا تھا' جسے تاریخ الٰہی کہا جاتا تھا۔ عام آدمی کے لئے عربی پڑھنے اور سیکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی' کیونکہ ایسے لوگ بہت زیادہ خرابی پیدا کرنے کا باعث بنتے تھے۔ شرع اسلامی کے مطالعہ کی اجازت نہیں تھی۔ نجوم' فلسفہ' طب' ریاضی' شاعری' تاریخ اور داستانوں کا مطالعہ کیا جاتا تھا اور انھیں

ضروری سمجھا جاتا تھا۔

جشن نوروز: بادشاہ کو جب جمشید کے جشنوں اور پارسیوں کے تہواروں کے بارے میں بتایا گیا' تو اس نے انھیں اپنا لیا اور انھیں لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے مواقع بنا دیا۔ لوگ ان مواقعوں کو خوشیوں کے ساتھ مناتے اور ان کی تعریف کرتے تھے; نیز دربار میں جاہ و جلال کا مظاہرہ کیا جاتا' جو رنگ رلیوں اور خوشیوں کا گہوارہ بن جاتا تھا۔ سب سے اہم تہوار نئے سال کے روز ہوتا تھا' جو آغاز سے فروردین کے مہینہ کی 19 تاریخ تک رہتا تھا۔ اس تہوار کے پہلے ایام میں محل میں تین راتوں تک رنگین قندیلیں روشن کی جاتی تھیں' دوسرے دن ایک رات تک روشن کی جاتی تھیں اور خوشی عام ہوتی تھی۔ جشن نوروز کے آخری دن جب سورج برج حمل کے 19 ویں درجے میں داخل ہو جاتا تھا' بادشاہ اس کو خصوصاً" مقدس خیال کرتا تھا۔ اس دن امراء کی ترقی ہوتی یا اپنے منصب کے مطابق جاگیریں یا گھوڑے اور خلعت حاصل کرتے تھے۔

بادشاہ دوبارہ قدیم پارسیوں کی رسم کی پیروی میں ان دنوں میں شاندار ضیافتیں منعقد کرتا تھا' جن کے نام کسی مہینے کے نام کے مطابق ہوتے تھے۔ چنانچہ' ضیافتیں 19 فروردین' تین ارد بہشت' 6 خرود' 13 تیر' 7 امرود 4 شہریور' 16 میر' 10 بان' 9 آذر' 8'15'23' دائی' 2 بہمن' 5 اسفندرمز کو منعقد ہوتی تھیں۔ ان میں سے ہر روز دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ پانسہ کے ساتھ کھیلنے اور قرض کی رقم پر سود وصول کرنے کو جائز قرار دے دیا گیا تھا۔ بادشاہ نے دربار میں ایک جواء خانہ تعمیر کر کے سود کی حوصلہ افزائی کی; نیز خزانہ سے جواریوں کو ادھار دے کر ان پر سود وصول کیا جاتا تھا۔

جشن نوروز کے موقع پر مذکورہ عرصہ کے لئے حرم شاہی کی بیگمات و خواتین اور دیگر شادی شدہ خواتین کی تفریح کے لئے بادشاہ کے حکم سے مینا بازار لگائے جاتے تھے۔ بادشاہ ان موقعوں پر دل کھول کر رقم خرچ کرتا تھا۔ ان مواقعوں پر حرم کے افراد کے اہم معاملات کا فیصلہ کیا جاتا' نکاح کئے جاتے اور لڑکے لڑکیوں کی نسبتیں طے ہوتی تھیں۔

مختلف طبقوں کے لوگوں میں یگانگت قائم کرنے کے خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے اکبر سماجی اجتماعات کا اہتمام کرتا' جنھیں دوستی اور اتحاد کی دعوتیں کہا جاتا تھا' ان میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ سب بادشاہ کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاتے کیونکہ وہ اپنی خوش مزاجی سے ان کا دل بہلاتا تھا۔ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے' بادشاہ سلامت کے منظم اور محتاط انتظامات کے باعث دربار عالی حوصلہ جنگ و جدل کے میدان کی بجائے ایک اعلیٰ و ارفع دنیا کے مندر میں تبدیل ہو گیا تھا اور آدمیوں کے زعم اور خود پسندی کا رخ خدا کی عبادت کی طرف موڑ

دیا گیا تھا' حتیٰ کہ ادنیٰ اور دنیاوی لوگوں نے اپنی نجی زندگی میں جوش و ولولہ اور حکومت کے لئے الفت اور وفاداری سیکھ لی۔ (118)

خوش روز: ابوالفضل کے مطابق ہر ماہ کے پہلے خوش روز کو بادشاہ اس دنیا کی متعدد عجیب و غریب اشیاء کے بارے میں جاننے کی غرض سے ایک بہت بڑے میلے کا اہتمام کرتا تھا۔ سوداگر اپنی اشیاء کو فروخت کرنے کے لئے پیش کرتے تھے۔ حرم شاہی کی بیگمات اپنی تشریف آوری سے میلے کو عزت بخشتی تھیں۔ اس کے علاوہ امراء کی بیگمات کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ خرید و فروخت اس میلے کا معمول ہوتی تھی۔ بادشاہ مقررہ نرخوں پر خریدنے کے لئے اشیاء کا انتخاب کرتا تھا' وہ زیادہ تر اپنے علم میں اضافہ کی خاطر ایسا کرتا تھا۔ سلطنت کے اسرار و رموز' لوگوں کے کردار' افسران کے رویہ اور ہر دفتر اور کارخانے کی حالت کا پورا علم رکھا جاتا تھا۔ خواتین کے مینا بازار کے بعد مردوں کے لئے بازار بھی لگائے جاتے تھے' ان میں تمام ممالک کے سوداگران اپنی اشیاء فروخت کے لئے پیش کرتے تھے۔ ان میلوں میں ہر قسم کے لوگوں کو آنے کی اجازت ہوتی تھی اور کسی بھی افسر کے خلاف اگر کسی شخص کو شکایت ہوتی' تو اپنی شکایت بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کی اسے پوری آزادی ہوتی تھی' حتیٰ کہ نیزہ بردار بھی اسے روک نہیں سکتا تھا۔

کم سن ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چونکہ وہ ان کی کارروائی کی نوعیت کو سمجھنے کے سلسلہ میں ابھی بہت کم عمر ہوتے تھے اس لئے سن بلوغت کو پہنچنے پر انہیں اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی طرف لوٹنے کی پوری آزادی دے دی جاتی تھی۔ کسی بھی شخص کے مذہب کی بناء پر اسے تنگ نہیں کیا جاتا تھا یا کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ ہر کسی کو اپنا مذہب چھوڑ کر اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق دوسرا دین اختیار کرنے کی اجازت تھی۔ اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان پر عاشق ہو جاتی اور اپنا مذہب تبدیل کر لیتی' تو اسے جبراً اس کے قبضہ سے نکال کر اس کے خاندان کے حوالے کر دیا جاتا۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان عورت کسی ہندو کے عشق میں گرفتار ہو جاتی تو اسے دوبارہ ہندوؤں میں شامل ہونے سے روک دیا جاتا۔ کسی شخص کو بھی کسی دوسرے کے مذہبی اعتقاد اور آزادی میں دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی۔ ہر کسی کو گرجے' عبادت خانے' بتوں کے مندر یا آگ کی پوجا کے مندر اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کرنے کی اجازت تھی۔ مکمل طور پر مذہبی آزادی دی گئی تھی اور کسی بھی خاص فرقے کے لئے حوصلہ افزائی کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا' یا کسی بھی فرقے کو کسی دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاتی تھی۔

باغبانی کا ذوق: اکبر باغبانی کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ ایران اور توران سے ماہر باغبان (مالی)

آگرہ اور فتح پور سیکری لائے گئے اور وہ ان کا خصوصی سرپرست بن گیا۔ مختلف اقسام کے نئے درختوں اور پھولوں کی شجرکاری کے کام کو انتہائی زوروشور سے کیا جاتا تھا۔ پکے ہوئے پھل کابل اور کشمیر سے اور خربوزے' ناشپاتیاں اور سیب سمرقند سے درآمد کئے جاتے تھے۔

اکبر کی رحمدلی: اکبر جانوروں پر ظلم سے نفرت کرتا تھا' اس لئے اپنی زندگی کے خاتمہ کے قریب اس نے شکار اور جانوروں کی لڑائی کو ترک کر دیا تھا۔ اسے اکثر یہ کہتے سنا گیا' کاش میرا جسم تمام اجسام سے بڑا ہو جائے' تاکہ دنیا کے لوگ دوسرے زندہ جانوروں کو مارے بغیر اسے کھا سکیں۔' انسان دوستی کے تحت وہ کسی کو بندہ (غلام) کہنا پسند نہیں کرتا تھا' کیونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ ملکیت صرف اسی ایک غائب خدا کے لئے سزاوار ہے؛ چنانچہ' وہ لوگوں کے اس طبقے کو چیلے کہا کرتا تھا' ہندی میں اس کا مطلب وفادار مرید ہوتا ہے۔ بادشاہ کے تمام مریدوں کو چیلے کہا جاتا تھا۔ وہ ان لوگوں کو ان کی قابلیت کے مطابق اعلیٰ عہدوں پر متمکن کرتا اور ایک عام سپاہی کی حیثیت سے ترقی دے کر سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیتا تھا۔

اکبر کی رحمدلی کے سلسلہ میں مثال کے طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب 1526ء میں پانی پت کی جنگ میں شکست کے بعد (مہابھارت کے دور سے اس صحرانے اقوام کے لئے میدان جنگ کا کام دیا ہے) ہیمو کو اکبر (اس وقت محض ایک لڑکا تھا) کے سامنے لایا گیا تو اس کی آنکھ میں تیر لگا ہوا تھا' —— بیرام خاں نے اکبر سے کہا کہ قیدی کا سر کاٹ دیں اور اس طرح ایک کافر کو قتل کر کے دین اسلام کی خاطر اپنے لئے غازی کا لقب حاصل کر لیں۔ فیاض لڑکا ایک شکست خوردہ اور بے یارومددگار دشمن کو ہلاک کرنے کے خیال سے باز رہا۔ اس پر بیرام نے تاخیر سے بچنے اور نوجوان بادشاہ کو خون کے منظر کا عادی بنانے کے لئے خود ہیمو کا سر کاٹ دیا۔

بدایونی نے بادشاہ کی رحمدلی کی ایک مثال پیش کی ہے۔ جب بادشاہ سلامت جون 1573ء میں احمد آباد سے فتح پور سیکری پہنچے تو حاکم پنجاب حسین قلی خاں' باغی ابراہیم مرزا (جسے ملتان کے قریب شکست دی گئی تھی) کی فوج کے تین ہزار قیدی ان کے پاس لایا۔ ان قیدیوں میں ابراہیم کا ایک جرنیل مسعود حسین مرزا بھی تھا۔ مسعود کی آنکھوں کو سی دیا گیا تھا۔ مگر اکبر نے انہیں کھولنے کا حکم دیا' دیگر تمام قیدیوں کو خنزیروں' گدھوں اور کتوں کی کھالیں اوڑھائی گئی تھیں مگر بادشاہ نے ان سب کو بشمول مسعود کے عام معافی دے کر آزاد کر دیا۔

عیسائی پادری (جس نے 1582ء میں فتح پور سیکری میں اکبر سے ملاقات کی) نے بادشاہ کی نرم مزاجی کے متعلق ایک کہانی درج کی ہے۔ "ایک مرتبہ جب بادشاہ دریائے جہلم پر تھا' تو بارہ مفروروں کو سزا کے لئے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس معاملہ کو ذاتی طور پر سننے اور اس پر غور

کرنے کے بعد اس نے حکم دیا کہ ان میں سے چند کے سر اڑا دیئے جائیں اور دوسروں کو قید کر دیا جائے۔ پہلے لوگوں میں سے ایک مجرم نے بادشاہ سے استدعا کی کہ اسے بات کرنے کی اجازت دی جائے۔ اجازت ملنے پر اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اسے قتل نہ کیا جائے' کیونکہ اس کے پاس ایک ایسا فن ہے' جس میں اس دنیا کا کوئی شخص اس سے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ جب بادشاہ نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کون سا فن ہے' تو اس نے جواب دیا "شہنشاہ عالم میں ہر ایک سے بہتر گا سکتا ہوں" بادشاہ نے کہا "گاؤ" اس بیچارے شیطان نے اس بے کسی کے ساتھ گانا شروع کیا کہ بادشاہ اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ اس پر قیدی نے کہا: جہاں پناہ مجھے معاف کر دیجئے' آج میرا گلا رندھا ہوا ہے اس لئے میں گا نہیں سکتا۔ اس جواب سے بادشاہ اس قدر خوش ہوا کہ اس نے نہ صرف اس شخص کو معاف کر دیا بلکہ مفروروں کو سزائے موت دینے کے حکم میں تبدیلی کر دی' چنانچہ جب تک اس نے ان کے جرم کے سلسلہ میں مزید تفتیش کا حکم نہیں دے دیا' انہیں قید میں رکھا گیا" (119)

شادی بیاہ: اکبر ہندوستان کی اس رسم کو پسند نہیں کرتا تھا' جس کی رو سے کسی مرد کی شادی کسی ایسی عورت سے کر دی جاتی تھی' جس کو اس نے دیکھا نہیں ہوتا تھا اور وہ اس سے وابستہ بھی نہیں رہا ہوتا تھا۔ وہ اس بات کی تائید کرتا تھا کہ اگر شادی کے بندھن میں بندھنے والا جوڑا کمسن ہو' تو اس نکاح کو قانونی بنانے کے لئے دلہا اور دلہن کی رضامندی اور والدین کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔ وہ سن بلوغت کو پہنچنے سے قبل مرد اور عورت کی شادی کو ناپسند کرتا تھا' اس سلسلہ میں یہ دلیل پیش کرتا تھا کہ جب جوڑا سن بلوغت کو پہنچتا ہے' تو اس قسم کی شادی محبت کی کمی کا باعث بنتی ہے اور ان کے گھر کو یا تو ویران کر دیتی ہے یا بعد کی زندگی میں ناراضگی پیدا کر دیتی ہے۔ شادی نسل انسانی کی بقاء' دنیا کی پائیداری اور ترقی کے لئے ضروری ہے۔ یہ شیطانی شہوات کے طوفان کے خلاف سدراہ ہے اور انسان کے عیارانہ اور برے رجحانات کی روک تھام کرتی ہے۔ یہ گھروں کے قیام اور خوشی و آرام میں بہتری پیدا کرنے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مگر شادی شدہ لوگوں کو محض شہوانی لذت اٹھانے کی بجائے بلند محرکات پر عمل پیرا ہونا چاہئے: انہیں اپنے دل میں روحانی بندھن کے خیالات کو ہر حالت میں سمونا چاہئے اور یہ سب کچھ شادیوں میں صرف مساوی محبت و الفت ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے —— اس نے چچا زاد' ماموں زاد بہن بھائیوں اور قریبی عزیزوں کے درمیان شادی کی ممانعت کے لئے ایک فرمان جاری کیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ جنسی بھوک کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی تھی —— لڑکوں کی 16 برس سے قبل اور لڑکیوں کی 14 برس سے پیشتر شادی کی اجازت نہیں تھی' کیونکہ کم

عمری کی شادی کے نتیجہ میں اولاد کمزور پیدا ہوتی تھی۔ اس نے شادیوں کو باقاعدہ بنانے اور ان کا انتظام کرنے کے لئے افسران مقرر کئے' جنہیں توبی بیگی کہا جاتا تھا' وہ دلہا اور دلہن کے حالات کی چھان بین کرتے تھے اور انہیں فریقین سے حاصل شدہ محصول سے ادائیگی کی جاتی تھی۔ ابوالفضل کے مطابق' اس محصول کی ادائیگی کو مبارک خیال کیا جاتا تھا اور یہ لوگوں کو ان کی شکر گزاری کا اظہار کرنے کے قابل بنانے کی خاطر وصول کیا جاتا تھا۔ پانچ ہزار سے ایک ہزار کی کمان کرنے والے منصب دار چار مہریں ادا کرتے: ایک سو کے کماندار دو مہریں: چالیس کے کماندار ایک مہر اور دس کے کماندار چار روپے ادا کرتے تھے۔ یہ محصول متمول افراد بھی ادا کیا کرتے تھے۔ درمیانے درجہ کے لوگ ایک روپیہ اور عام آدمی ایک دام ادا کرتے تھے۔ عام لوگوں کو کوتوال کے دفتر میں اپنی شادیوں کا اندراج بھی کرانا ہوتا تھا۔

جہیز: بادشاہ اس بے جا جہیز کو پسند نہیں کرتا تھا' جسے فریقین کے وسائل کا دھیان رکھے بغیر بلا اندازہ مقرر کر دیا جاتا تھا' یہ معاملہ محض ایک دکھلاوا ہوتا تھا۔ مگر وہ اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ زیادہ جہیز بے سوچی سمجھی طلاقوں کی روک تھام کرتے ہیں۔

کثیر الازدواجی: وہ اس بات کی حمایت میں نہیں تھا کہ کسی آدمی کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی جائے: اس کے خیال کے مطابق کثیر الازدواجیت آدمی کی صحت تباہ کرتی ہے اور اس کے گھر کے امن و سکون کو خراب کرتی ہے۔ کسی بوڑھی اور بانجھ یا حاملہ عورت یا نابالغ لڑکیوں کے ساتھ ملاپ کی ممانعت تھی۔ وہ نوجوان خاوند رکھنے والی بوڑھی عورتوں کو سخت سزا دیتا' کیونکہ یہ عمل ہر قسم کی شرم و حیا کے خلاف تھا۔ اسی طرح جن عورتوں کی زرخیزی کا زمانہ گذر جاتا' انہیں بھی شادی کی اجازت نہیں تھی۔ مگر بیوائیں اگر پسند کرتیں تو مذکورہ شرط سے ہٹ کر شادی کر سکتی تھیں۔ کسی کو بھی ماسوائے بانجھ پن کے باعث ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ دیگر تمام معاملات میں ایک خدا اور ایک بیوی کے قاعدہ پر عمل درآمد کیا جاتا تھا۔

جس ہندو لڑکی کا خاوند شادی کی تکمیل سے پہلے فوت ہو جاتا تھا اسے جلانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن جو ہندو عورت اپنی مرضی سے اپنے خاوند کی چتا پر جلنا چاہتی تو اسے ایسا کرنے کی آزادی حاصل تھی' مگر اسے زبردستی اس کام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

عدل و انصاف: اکبر عدل و انصاف کے معاملہ میں بہت سخت تھا۔ وہ تمام مقدمات کی سماعت خود کرتا اور ہر اس چیز کی ذاتی طور پر تحقیقات کرتا' جس کے لئے اس کے احکامات درکار ہوتے۔

گوا سے آنے والا عیسائی پادری' جس نے 1582ء میں فتح پوری سیکری کے دربار میں حاضری دی' کہتا ہے "وہ نہ تو لکھ سکتا اور نہ ہی پڑھ سکتا ہے' مگر علم کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے اور ہر وقت اپنے اردگرد عالم فاضل افراد کو جمع رکھتا ہے' جنہیں وہ ایک نہ سے دوسری چیز کے متعلق بحث کرنے یا اس کے متعلق بیان کرنے کے لئے مدعو کرتا ہے۔ جب وہ کسی جگہ ٹھہرتا ہے' تو کسی شخص کو اس کی اجازت کے بغیر موت کے گھاٹ نہیں اتارا جاتا۔ اس کے پاس آنے والے تمام دیوانی مقدمات کے تمام حقائق بھی ہوتے ہیں۔" وہ انتہائی تحمل کے ساتھ ہر قسم کے معاملات کو سنتا اور اس کے لئے وقت نکال لیتا۔ انسانوں کے مابین انصاف کرنے کے سلسلہ میں اسے خوشی حاصل ہوتی تھی۔

اکبر کی غذا: اکبر اپنی غذا کے معاملہ میں پرہیزی اور کفایت شعار تھا۔ گوشت سے اجتناب برتتا تھا اور پورے مہینے اس کو چھوئے بغیر گذار رہتا تھا۔ وہ زیادہ تر چاول' دودھ اور مٹھائیوں پر گذارہ کرتا تھا۔۔۔۔۔ اس نے چوبیس گھنٹوں کے دوران کبھی بھی ایک سے زیادہ کھانا نہیں بنوایا۔ میر بھکاول (باورچی خانے کا نگران) سب سے پہلے طلائی و نقرئی تھالوں اور پتھر اور مٹی کے برتنوں میں رکھے گئے کھانے کو چکھتا اور سرخ یا سفید کپڑوں میں باندھ کر انہیں سربمہر کرکے نیزہ برداروں کے پہرہ میں بادشاہ کے کمروں تک لے جاتا۔ سربمہر تھیلے جو مختلف اقسام کی روٹی' دہی کی چٹنیوں' اچار کی رکابیوں اور مختلف سبزیوں پر مشتمل ہوتے تھے' انہیں بھی اسی انداز میں روانہ کیا جاتا تھا۔ محل کے نوکر دوبارہ کھانے کو چکھتے اور تھالوں کو جب زمین پر دسترخوان کے اوپر ترتیب سے رکھ دیا جاتا تو بادشاہ ان میں سے تناول کرتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ دعائیہ انداز میں سجدہ ریز ہو جاتا۔ 1580ء میں ایک مرتبہ جب اکبر اپنی میز پر کھانا کھانے کے لئے بیٹھا ہوا تھا' تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اس وقت وہ اپنے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے' ہو سکتا ہے کہ بھوکے افراد نے اس کے کھانوں کی خواہش کی ہو۔ مورخ مرزا نظام الدین احمد کہتا ہے' جب بھوکوں کو اس سے محروم کیا گیا تو وہ کس طرح کھا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے حکم دے دیا کہ اس کے لئے تیار کئے جانے والے کھانے میں سے ایک حصہ سب سے پہلے بھوکے اشخاص کو دیا جائے اور اس کے بعد اسے پیش کیا جائے۔ اس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ اس کی رحمدلی کسی قوم یا فرقہ کے امتیاز کے بغیر سب کے لئے یکساں ہے۔

بادشاہ نے جس طرح اپنے کھانے کو باقاعدہ بنایا تھا' اسی طرح وہ اپنے پینے کے معاملہ میں بھی سخت تھا۔ وہ کنوئیں کا پانی نہیں پیتا تھا اور اس کی خوشگواری اور پاکیزگی کے سلسلہ میں بہت محتاط تھا۔ آئین اکبری میں اس کے آبدار خانہ کے بارے میں ایک علیحدہ باب موجود ہے۔

بادشاہ پانی کو سرچشمہ حیات (آب حیات) کہا کرتا تھا۔ چاہے وہ گھر میں ہوتا یا سفر میں گنگا کا پانی استعمال کیا کرتا تھا' جب دربار آگرہ یا فتح پور میں ہوتا' تو پانی سربمہر برتنوں میں دریائے گنگا سے آگرہ کے قریب ترین مقام سرون سے لایا جاتا تھا اور دریا کے کنارے سے پانی روانہ کرنے کے لئے بااعتماد افراد کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ کے لئے کھانا بارش کے پانی یا جمنا یا چناب سے لائے گئے پانی کے ساتھ تیار کیا جاتا تھا (جب بادشاہ پنجاب میں ہوتا) مگر اس کے ساتھ گنگا کا تھوڑا سا پانی مسلسل شامل کیا جاتا تھا۔ اس نے لذائذ دنیا کو ترک کر دیا تھا۔ بستان کا مصنف لکھتا ہے " ملتان میں میں نے شاہ سلیم اللہ کو دیکھا' جنہوں نے دنیا سے کنارہ کشی کر لی ہے اور وہ توحید پرست ہیں۔ نظم و ضبط میں بہت سخت ہیں اور انسان کی صحبت سے اجتناب کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اکثر جلال الدین اکبر کے ساتھ رہے ہیں اور بعض اوقات اسے یہ کہتے ہوئے سنا ہے: اگر ماضی میں میرے پاس وہ علم ہوتا جو اس وقت ہے' تو میں اپنے لئے کبھی کسی بیوی کا انتخاب نہ کرتا' کیونکہ بوڑھی عورتوں کو میں ماں اپنی ہم عمر عورتوں کو بہن اور لڑکیوں کو بیٹیاں سمجھتا ہوں۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ اس نے نواب شکر خاں مشہدی کی زبانی اکبر کا یہی مقولہ سنا تھا"۔

اکبر کی مصروفیات: اکبر اپنی راتیں دیوان خاص میں فلسفیوں کی صحبت اور علماء و فضلا کے ساتھ بحث مباحثہ میں گذارتا تھا۔ ان اجلاسوں میں پرانے قوانین کو بیان کیا جاتا اور نئے خیالات پر خوش ہو کر شاباش دی جاتی۔ وہ شام کے وقت اور دوبارہ صبح کے وقت تھوڑا سا سو لیتا تھا۔ شبانہ اجلاسوں میں بادشاہ بحث مباحثہ کے لئے مناسب موضوعات شروع کر دیتا' جبکہ دوسرے مواقعوں پر سلطنت کے امور سامنے لائے جاتے اور احکامات جاری کئے جاتے تھے۔ طلوع آفتاب سے چار گھڑی پیشتر وہ عبادت و ریاضت کے لئے اپنے نجی کمروں کی طرف چلا جاتا اور فجر سے تقریباً" ایک گھڑی قبل گویے نغمات اور مذہبی راگ گا کر اس کا دل بہلاتے تھے۔ صبح صادق سے تھوڑی ہی دیر بعد وہ جھروکے میں نمودار ہو کر نیچے کھڑے ہوئے ہجوم کا نذرانہ عقیدت وصول کرتا۔ ملک کی زبان میں اسے درشن کہا جاتا تھا۔ تب وہ حرم کے ارکان کا استقبال کرتا اور کچھ کام سرانجام دیتا۔ اس کے بعد ایک مختصر سا قیلولہ کرنے کے لئے اپنی خواب گاہ میں چلا جاتا۔ شام کے قریب وہ ایک کھڑکی میں نمودار ہوتا' جو ایوان شاہی کی طرف کھلتی تھی اور یہاں کاروبار سلطنت سرانجام دیتا اور انصاف برتتا تھا۔

صوفیوں کے انداز کی پیروی میں اکبر اونی کپڑے خاص طور پر دوشالہ پہنا کرتا تھا۔ اس نے بہت سے ملبوسات کے نام تبدیل کر دیئے تھے اور ان کے لئے اپنی اصطلاحات اور نام ایجاد کئے۔

نڈر حوصلہ اور زبردست دلیری کے علاوہ اکبر حیرت انگیز جسمانی طاقت کا بھی مالک تھا' جس نے اس کی زبردست حاضر دماغی اور غیر معمولی چستی و جسمانی پھرتی کے ساتھ اسے سخت ترین آزمائشوں میں ناکام نہیں ہونے دیا۔ وہ کھیل تماشے اور جانوروں کی لڑائیاں دیکھنے کا بہت شوقین تھا اور خصوصاً ہاتھیوں کی لڑائیوں میں بہت زیادہ خوشی محسوس کرتا تھا: اس وقت وہ مہاوت کی جگہ بذات خود اس کارروائی میں حصہ لیتا اور متحارب جانوروں کو لڑاتا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں' آگرہ میں دور حکومت کے چھٹے سال میں رونما ہونے والے ایک واقعہ کو بیان کیا ہے' یہ حیرت انگیز طور پر اس قابل ذکر شخص کی دلیری اور شجاعت کی عکاسی کرتا ہے۔ قلعہ آگرہ کے باہر بادشاہ کی تفریح کے لئے بنائے گئے چوگان (120) کے میدان میں انتہائی غضب ناک قسم کے دو شاہی ہاتھیوں کو (جن کے نام ہوائی اور رن باغ تھے اور جو انتہائی ماہر سدھانے والوں کے قابو میں بھی نہیں رہ سکتے تھے) ایک دوسرے سے لڑا دیا گیا۔ پورا دربار اس منظر کو دیکھنے کے لئے جمع تھا۔ جس وقت ہوائی نام کا ہاتھی انتہائی خونخواری اور جوش کی حالت میں تھا' اکبر اس پہ سوار ہوا اور اس کے مخالف ہاتھی پر حملہ کر دیا' جو اسی قدر غضبناک اور پر جوش تھا۔ وہاں جمع شہزادگان اور امراء نے جب یہ سوچا کہ ان کے بادشاہ کی زندگی خطرے میں ہے' تو انہیں بہت تشویش ہوئی اور زبردست دہشت پھیل گئی' وہاں موجود کسی شخص کو حتیٰ کہ عظیم ترین امیر میں بھی یہ حوصلہ نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کو ان خدشات سے آگاہ کر سکیں' جو وہ اس کے متعلق رکھتے تھے۔ آخر کار انہوں نے شمس الدین محمد اتکہ خاں (121) کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا' جو بادشاہ کا بہت زیادہ منظور نظر تھا۔ اس امیر نے بادشاہ کے ہاتھی کے قریب پہنچ کر اس سے دست بستہ عرض کرتے ہوئے امراء کی تشویش اور مایوسی سے آگاہ کیا جو وہ اس منظر سے محسوس کر رہے تھے' چنانچہ اس ہاتھی سے نیچے اترنے کی استدعا کی۔ اکبر نے اتکہ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنی درخواست پر زور دیا تو وہ خود کو ہاتھی سے نیچے گرا دے گا' اس نے اسے واپس جانے کا حکم دیا۔ تب اس نے آنکس کو گھمانے اور مروڑنے کے علاوہ انتہائی مہارت کے ساتھ (جس نے تمام تماشائیوں کو حیرت زدہ کر دیا) ہوائی کو اپنے سر کے ذریعے متحارب ہاتھی پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا۔ یہ حملے ہجوم کے شور و غوغا کے درمیان جاری رہے' رن باغ پیچھے ہٹا اور دریا کی طرف بھاگ اٹھا۔ بادشاہ نے اپنے ہاتھی کے ساتھ اس کا تعاقب کیا۔ شکست خوردہ ہاتھی نے کشتیوں کے پل کا راستہ اختیار کیا' ہوائی نے اسے جا لیا۔ بھاری بھرکم جانوروں کے زبردست وزن نے کشتیوں کے پل کو بری طرح ہلا دیا' اس سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ پل ٹوٹ جائے گا۔ راہ گیروں نے پل کے دونوں جانب دریا میں چھلانگیں لگا دیں اور دریا میں تیرتے ہوئے' دوڑتے ہوئے ہاتھیوں کا

تعاقب کرنے لگے تاکہ بادشاہ کی مدد کی جا سکے جو ابھی تک ہوائی کی پشت پر سوار تھا۔ دونوں ہاتھیوں نے بحفاظت پل کو پار کر لیا جب رن باگھ کی شکست مکمل ہو گئی' تو ہر قسم کی تشویش بھی ختم ہو گئی۔ بادشاہ نیچے آیا' تو اس کے امراء نے انتہائی خوشی محسوس کرتے ہوئے نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے اسکا استقبال کیا اور اس کی کامیابی پر اسے مبارک باد دی۔ یہاں شیخ ابوالفضل لکھتا ہے: "بادشاہ سلامت نے دیوان خاص میں اسے کئی بار بتایا کہ "جب میں کسی ایسے غضبناک ہاتھی پر سوار ہوتا ہوں جو اپنے مہاوت کو اتار پھینکتا ہے' تو میں خدا پر اپنے غیر متزلزل ایمان اور بھروسے کے باعث ایسا کرتا ہوں' جس نے مجھے زندگی عطا کی ہے اور مجھے خوشحال اور طاقتور بنایا ہے' کیونکہ اس کے فضل و کرم کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" شیخ نے بادشاہ کی خوشامد کے سلسلہ میں اپنے جوش و خروش میں ان جیسے مواقعوں پر بادشاہ کی شجاعت کے کارہائے نمایاں کو اس کے روشن اور اہل بصیرت ذہن سے منسوب کیا ہے: جس نے اسے مستقبل کے واقعات کو گہری بصیرت سے دیکھنے اور ان کے متعلق اپنی غیر معمولی دانشمندی کے ساتھ مشاہدہ کرنے کے قابل بنا دیا۔

اکبر ہر قسم کے ہاتھی پر سواری کر لیتا اور اسے اپنے حکم کے تابع بنا لیتا تھا۔ تمام تماشائیوں کو اس وقت انتہائی حیرانگی ہوتی جب وہ مست ہاتھی کی سونڈ پر بھی پاؤں رکھ کر انتہائی تیزی سے اس پر سوار ہو جاتا تھا۔ ایک تیز رفتار ہاتھی بمعہ آرام وہ ہودہ کے بادشاہ کے استعمال کے لئے ہر وقت محل میں تیار ہوتا تھا۔ اسی طرح محل میں قاصد گھوڑے بھی تیار رکھے جاتے تھے۔

اکبر مختلف اقسام کے کھیلوں اور ہاتھی سے لیکر ہرن اور مینڈھوں اور مرغ سے لیکر بلبل تک کے جانوروں کے درمیان لڑائیوں سے بہت زیادہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ پہلوانوں کے کرتب دیکھنے کا بھی بہت شوقین تھا' اس نے اپنے دربار میں ایران اور توران کے مشہور پہلوان اور مکے باز رکھے ہوئے تھے۔ ہر روز برابر کی جوڑ کے دو پہلوان ایک دوسرے سے لڑائی کرتے۔ پہلوانوں میں ہم جیلان کے مرزا خاں' تبریز کے محمد قلی (جس کو بادشاہ نے شیر حملہ کا خطاب دیا تھا) بخارہ کے صادق' ترکستان کے مراد' توران کے محمد علی' کردستان کے شاہ قلی' حبشہ کے بلال اور ہندوستان کے سری رام' منگل' کنہیا' گنیش انبہ' نانک' بلا بہادر وغیرہ کے نام دیکھتے ہیں۔

تجسس کی خاطر اکبر مکڑیوں کی لڑائی دیکھنا بھی پسند کرتا تھا۔ وہ ایک تحقیقی ذہن کا مالک تھا' اس سے اس کا مقصد فطرت کا علم حاصل کرنا اور تخلیق کے عجائبات کو دیکھنا ہوتا تھا۔

وہ شکار کا شوقین تھا۔ اس نے شکاری کتے (122) رکھے ہوئے تھے اور ہرنوں و چیتوں کو دوسرے جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے لئے سدھایا ہوا تھا۔ جنگلی جانوروں کو پھانسنے کے لئے

پالتو ہرنوں کے سینگوں کے ساتھ جال باندھ دیئے جاتے تھے۔ اسے اپنے تمام ہاتھیوں کے نام بھی یاد تھے' اس نے اپنے گھوڑوں' جنگلی درندوں' ہرنوں اور کبوتروں کے نام رکھے ہوئے تھے اور ہر ایک کو اس کے نام سے جانتا تھا۔ آئین اکبری میں پالتو جانوروں اور پرندوں کے بے شمار شعبہ جات اور ان سے وابستہ عملے کے انتظام کے لئے قواعد و ضوابط درج کئے گئے ہیں۔ اکبر ہر شعبے کی بغور نگرانی کرتا تھا اور اس میں گہری دلچسپی لیا کرتا تھا۔ ان کھیل تماشوں کے دوران وہ انتہائی اہم کاروبار سلطنت کی انجام دہی کرتا اور فوری نوعیت کے سنجیدہ سرکاری معاملات کے سلسلہ میں احکامات بھی جاری کرتا' جو اس کے سامنے لائے جاتے تھے۔ ابوالفضل نے اکبر کی جسمانی مستعدی' حوصلہ اور ذہانت کے متعلق کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ ضلع باری میں ایک آدم خور شیر نمودار ہوا ہے۔ بادشاہ ناہر خاں نامی ہاتھی پر سوار ہو کر جنگل کی طرف روانہ ہوا' شیر نے غضبناک ہو کر اپنے پنجے ہاتھی کے ماتھے میں گاڑ دیئے اور اس کے سر کو گھسیٹ کر زمین تک لے گیا مگر مصاحبین نے اسے ہلاک کر دیا۔ ایک دوسرے موقع پر قمرغہ کے دوران (یا تعاقب جس کے لئے ہانکنے والے ملازم رکھے جاتے ہیں) ایک شیر (جسے ہانک کر لایا گیا تھا) نے بادشاہ پر حملہ کر دیا' اس نے اسے سر میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک مرتبہ ایک شکاری مہم کے دوران ایک شیر نے حملہ کر کے ایک آدمی کو نیچے گرا لیا۔ بادشاہ نے درندے کا نشانہ لے کر اسے ہلاک کر دیا اور آدمی کی جان بچائی۔ متھرا کے جنگل میں پیچھے آنے والا ایک شخص اچانک شیر کو سامنے پا کر خوفزدہ ہو گیا مگر اکبر میدان میں ڈٹا رہا اور انتہائی غیض و غضب سے درندے کی طرف دیکھا' جو دبک کر بیٹھ گیا تھا' اسے ہلاک کر دیا گیا۔ 1561ء میں اکبر 19 برس کا نوجوان تھا' مالوہ سے آگرہ کی طرف واپسی کے دوران جب وہ نروار کے مضافات میں گھوڑے پر سواری کرتے ہوئے اکیلا آگے آگے جا رہا تھا' کہ اچانک ایک شیر بمعہ پانچ بچوں کے اس کے سامنے آگیا' جو جنگل میں سے نمودار ہو کر اس کے راستے پر آگیا تھا۔ اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے اپنی تلوار کھینچی اور ایک ہی وار سے اس درندے کا سر اڑا دیا۔ جب پیچھے رہ جانے والے خدم و حشم کا لشکر قریب آیا' تو نوجوان بادشاہ کو انتہائی اطمینان کے ساتھ اپنے مردہ دشمن کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا گیا۔ اس کے سرداروں نے اس میں ایک زبردست دلیری کے حامل اور مستقل مزاجی اور مصمم ارادے کے مالک نوجوان کو پہچان لیا تھا۔

میدان جنگ میں اکبر کی شجاعت: میدان جنگ میں اکبر کی دلیری کی بہت سی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ چتوڑ کے محاصرہ (68 - 1567ء) میں اس نے جس جانثاری' ہوشیاری اور دلیری کا مظاہرہ کیا وہ قابل ذکر ہے۔ برسر اقتدار رانا (بابر کے مدمقابل رانا سانگا کا بیٹا اودے سنگھ تھا)

اور میواڑ کے راجپوت اس مقام کو اپنی طاقت کا منبع اور ہندوؤں کی آزادی کا گڑھ سمجھتے تھے۔ اکبر نے انتہائی احتیاط اور باقاعدگی کے ساتھ محاصرہ کیا اور انگریزوں کے جدید طریقہ جنگ کی طرز پر خندقیں بچھائیں۔ (123) اس نے اپنے مورچوں کی تفصیلات کا جائزہ لیا۔ وہ اس مہم کی نگرانی میں انتھک تھا' جس نے اس کی شان و شوکت کے راستہ میں ایک سنگ میل کا کام دینا تھا۔ وہ اس جنگ کے متعلق اس قدر فکر مند تھا کہ اس نے منت مانی کہ جیسے ہی اس جگہ پر قبضہ ہو گا وہ خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے انتہائی قابل احترام صوفی بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری کے مزار پر حاضری دینے کی خاطر پیدل سفر کرے گا۔ اس نے ڈیلوں اور خندقوں پر مشتمل دو صابت یا ٹیڑھے میڑھے مورچے بنائے' تاکہ قلعہ کی دیواروں تک پہنچ کر بارودی سرنگوں کے ذریعے ان میں شگاف پیدا کئے جائیں۔ اکبر نے شجاعت کے کارناموں کے لئے سپاہیوں کی ہمت بندھائی' لہٰذا اس کی موجودگی نے ان پر جادو کی طرح اثر کیا۔ اکبر کی جواں مردی اور خطرے سے نفرت نے اس کے ساتھیوں کے لئے زندہ مثال قائم کر کے انہیں شجاعت کے کارناموں پر اکسایا۔ ایک موقع پر جب وہ اس مقام پر کھڑا محاصرے کی کارروائیوں کے لئے ہدایات دے رہا تھا' جہاں دشمن کی بندوقوں اور توپوں کی شدید گولہ باری ہو رہی تھی کہ قلعہ سے توپ کا ایک گولہ آکر اس کے قریب گرا' مگر اسے کوئی گزند نہ پہنچا' حالانکہ اس نے اس کے بیس ساتھیوں کو چت کر دیا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر اس کا جرنیل خان عالم اس کے قریب کھڑا تھا کہ اس وقت اسے ایک گولی لگی اور اس کی زرہ بکتر اور چار آئینہ میں سے گذر گئی' مگر یہ اندرونی لباس میں رک گئی اس لئے کوئی زخم نہ لگا' یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اس نے بادشاہ کے حضور خوش قسمتی کے باعث زندگی حاصل کی ہے۔ اکبر اپنے جوش و خروش اور پھرتی کے معاملہ میں اس قدر مستعد تھا کہ اکثر بندوق سنبھال کر قلعہ کی فصیل پر کھڑے ایک آدھ دشمن کو انتہائی کامیابی سے گولی کا نشانہ بنا لیتا تھا۔ ایک رات جب وہ مورچوں کا معائنہ کر رہا تھا' اس نے مناسب روشنی میں راجپوتوں کے لشکر کے درمیان زرہ بکتر میں ملبوس ایک شخص کو مشعل کی روشنی میں مورچوں کی مرمت کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے دیکھا' وہ کوئی کماندار معلوم ہوتا تھا۔ بادشاہ نے فوراً اپنے خدمت گار سے اپنی پسندیدہ بندوق سنگرام چھینی اور اس شخص کے ماتھے میں گولی مار دی۔ اس وقت اکبر اس بات سے آگاہ نہیں تھا کہ اس کا شکار کون ہے۔ فی الفور وہ راجہ بھگوان داس کی طرف گھوما اور بولا کہ "اسے اپنے ہاتھ کی مستعدی سے خوف محسوس ہوا کہ اس نے ضرور اس کے تلک کو نشانہ بنایا ہے۔" اصل میں اس نے اپنے خوفناک دشمن کو ہلاک کر دیا تھا' کیونکہ ہلاک ہونے والا سورما اس جگہ کے حاکم شیر چوڑ جے مل کے سوا اور کوئی نہیں تھا'

جو انتہائی دلیر اور قابل سردار تھا۔ قلعہ کی حفاظتی فوج نے جب دیکھا کہ ان کا جری سردار اب زندہ نہیں رہا' تو وہ حوصلہ ہار گئی اور مورچوں کو خالی کر کے قلعہ کے اندر چلی گئی۔ جے مل کی لاش مقبرے تک لائی گئی' جہاں عورتوں نے خود کو اپنے سردار کی نعش کے ساتھ شعلوں کی نذر کر دیا' نو رانیاں' پانچ شہزادیاں (دو کم سن بیٹوں کے ہمراہ) اور کمانداروں کی متعدد بیویاں چتا پہ جل کر راکھ ہو گئیں۔ مرد موت کو گلے لگانے کے لئے دوڑے جبکہ مسلمان فصیلوں پر چڑھے ہوئے تھے' ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا' ایک گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی' جس میں آٹھ ہزار راجپوت ہلاک ہوئے۔ فجر کے قریب چتوڑ تسخیر ہو گیا' اکبر اپنے ہاتھی آسمان شکوہ پر سوار ہو کر فاتحانہ انداز میں اس کے اندر داخل ہوا' قلعہ کی فصیل پر اب رانا کے سورج علم کی بجائے اسلام کا سبز پرچم لہرا رہا تھا۔

8 فروری 1658ء کو اکبر اپنی منت کے مطابق گھریلو پوشاک میں ملبوس خادموں کے ایک مختصر سے قافلے کے ہمراہ ننگے پاؤں صوفی بزرگ کی خانقاہ پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اجمیر کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے منڈل گڑھ تک سفر کیا تھا کہ خانقاہ کے ایک مرید نے خواب میں اس صوفی بزرگ کو کہتے سنا کہ خدائے پاک ان کے لئے بادشاہ کے جذبہ پارسائی اور زہد و تقویٰ سے بہت زیادہ خوش ہوا ہے اور یہ کہ اس کے نتیجہ میں خوش ہو کر مجھے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ بادشاہ کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے اس قدر تکلیف دہ مزید سفر کو ختم کر دے۔ چنانچہ بادشاہ نے باقی ماندہ سفر گھوڑے پہ بیٹھ کر طے کیا' آخر کار جب وہ اجمیر سے ایک منزل کے فاصلے تک پہنچا تو گھوڑے سے اتر آیا اور اپنا سفر دوبارہ پیدل شروع کیا اور 6 مارچ 1658ء بروز اتوار کو بحفاظت مقبرے تک پہنچ گیا۔

چتوڑ میں اپنی فتح کی یادگار کے طور پر اس نے اپنے خیمے کی جگہ پر سفید پتھر کا 35 فٹ بلند ایک تکونی ستون تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ چوٹی پر ایک بہت بڑا چراغ جلایا گیا' جس تک عمارت کے اندر ایک بل کھاتی ہوئی سیڑھی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ اسے "اکبر کا دیا" کہتے ہیں۔ اس واقعہ کی یادگار کے طور پر اکبر نے جو دوسری تدبیر اختیار کی' وہ چتوڑ کے راجپوت جرنیلوں جے مل اور پتہ کے بتوں کے ہمراہ دو دیو ہیکل ہاتھیوں کے سنگین مجسموں کی تعمیر تھی' جے مل اور پتہ کو ان پہ بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ گزشتہ صدی کے اختتام پر جب مرہٹوں نے دہلی پر قبضہ کیا تو انہوں نے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں دفن کر دیا اور اپنے انتقام کی آگ بجھائی۔ بغاوت کے بعد انگریزوں نے انہیں زمین میں 12 فٹ کی گہرائی میں دبے ہوئے بالکل صحیح سلامت مگر سواروں کے بغیر پایا۔ انہیں زمین سے کھود کر نکالا گیا۔ ان میں سے ایک اب دہلی میں عوامی باغ

کے اندر ا ستادہ ہے۔

اکبر عام طور پر آگرہ سے تیس یا چالیس کوس کے فاصلے پر چیتوں کا شکار کرتا تھا' وہ تو گرفتار شدہ چیتے کو اٹھارہ دن کے مختصر سے عرصہ میں شکار کے تعاقب کے لئے سدھانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ شاہی چیتوں کے رکھوالے (جن میں سے چند دو سو کے قریب تھے) انتہائی وقت کے ساتھ دو یا تین ماہ کے عرصہ میں انہیں سدھاتے تھے۔

ابوالفضل نے چیتے کو سدھانے کے متعلق دو قابل ذکر کہانیوں کا ذکر کیا ہے اور انہیں اکبر کی کرامات کے طور پر بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک چیتے کو پکڑا گیا تو اس نے بادشاہ کے محض ایک اشارے پر اور بغیر کسی تربیت کے بادشاہ کو ایک شکار لا کر دیا' وہاں موجود بھی لوگوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک دوسرے موقع پر ایک چیتا بادشاہ سلامت کے مہربان اور شفقت آمیز دل کے حیران کن تاثر کے باعث بغیر کسی پٹے یا زنجیر کے شاہی عملے کے پیچھے آنے لگا اور اس نے کسی باہوش شخص کی طرح ہر حکم کی تعمیل کی۔ ایک مرتبہ ایک پالتو ہرن نے ایک سدھائے ہوئے چیتے کے ساتھ دوستی کر لی۔ وہ اکٹھے رہتے اور ایک دوسرے کی صحبت کا لطف اٹھاتے تھے۔ جب اس چیتے کو دوسرے ہرنوں کے خلاف چھوڑا جاتا' تو وہ انہیں بالکل تنگ نہیں کرتا تھا۔ اس سے پیشتر گزشتہ زمانے میں دن کے اختتام کے قریب چیتوں کو آزاد کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ مگر اکبر کے تشکیل کردہ تربیت کے عملی قواعد کے نتیجہ میں اس کے دور میں انہیں شام کے وقت کھلا چھوڑ دیا جاتا اور وہ مطیع رہتے۔ ان کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے عمل کو ختم کر دیا گیا اور انہیں سر کے غلافوں کے بغیر رکھا جاتا لیکن اس کے باوجود وہ بے قابو نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی تماشائیوں کو کچھ کہتے تھے۔

سدھائے ہوئے چیتوں کے ذریعے ہرن کا شکار کیا جاتا تھا۔ وہ شکار کی بو پا کر اس کی سمت کی نشاندہی کرتے تھے۔ انہیں یہ سکھلایا گیا کہ دور سے کسی ہرن کو دیکھنے پر جھاڑی میں لیٹ جائیں' قریب آنے پر جانور پر چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیں۔ اس جانور کے کارناموں سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے شکار کو پکڑنے کے لئے وہ کون کون سے مکرو فریب استعمال کرتا ہے۔ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر وہ اپنے اگلے پاؤں اور پچھلی ٹانگوں سے گرد اڑاتا ہے یا اس قدر ہموار لیٹ جاتا ہے کہ زمین کی سطح پر اس کی تمیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اکبر ہرن کے شکار کا بہت زیادہ ماہر تھا۔ وہ صرف کھال کو دیکھ کر یہ بتا سکتا تھا کہ ہرن کا تعلق کس شکارگاہ سے ہے۔ ہرنوں کا شکار خود ہرن کے ذریعے بھی کیا جاتا تھا۔ ایک پالتو اور تربیت یافتہ ہرن کے سینگوں پر جال باندھ کر اسے کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جب یہ ہرن جنگلی ہرنوں کے ساتھ زور آزمائی کرتا تو اس کا سینگ یا پاؤں

یا کلن اس میں الجھ جاتا تھا' اس پر جھاڑیوں میں چھپے ہوئے شکاری آکر اسے پکڑ لیتے تھے۔

ہرن کی فہم و فراست اور وفاداری کے متعلق بہت سی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ اکبر نے ایک تربیت یافتہ ہرن کے بارے میں بیان کیا ہے۔ جس نے دربار میں بہت زیادہ سنسنی پیدا کر دی تھی۔ یہ الہ آباد سے بھاگ گیا (جہاں اسے پنجاب سے لے جایا گیا تھا) اور دریاؤں اور میدانوں کو عبور کرنے کے بعد پنجاب میں اپنے گھر کی طرف لوٹ گیا اور اپنے سابقہ مالک کے پاس پہنچ گیا۔ موسیقی کے آلات کی آواز سے ہرن مبہوت ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ مادہ ہرنی گا رہی ہے۔ تاہم' اکبر ہرن کے شکار کے لئے ان طریقوں کو ناپسند کرتا تھا۔ اکبر نسل کشی کے لئے سانڈ ہرنوں کو بھی پالتا تھا: نیز قید میں پیدا ہونے والے جانوروں کو شکاری مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے ان کے شکار کے لئے نئے طریقے وضع کئے تھے۔ ہرن کی کھالیں اکثر غریب لوگوں کو تحفہ کے طور پر دے دی جاتی تھیں۔

ولی عہد شہزادہ سلیم کے جنم دن پر اکبر نے اپنی قسم پوری کرتے ہوئے کبھی بھی جمعہ کے روز شکار نہیں کیا' وہ خرگوش اور لومڑی کے شکار کے لئے ایک چھوٹے سے پھرتیلے جانور سیاہ گوش کو استعمال کیا کرتا تھا' جو کالے ہرن کو بھی مار ڈالتا ہے۔

گزشتہ دور میں جنگلی ہاتھیوں کا شکار ڈھول تاشے پٹخے اور بانسریوں کی آواز کی مدد سے کیا جاتا تھا۔ شور بھاری بھر کم جانور کو بے چین کر دیتا تھا' وہ خوفزدہ ہو کر ہر طرف بھاگ اٹھتے تھے' تب شکاری ان کی گردنوں یا پاؤں کے گرد رسوں کے پھندے پھینک کر انہیں پکڑ لیتے تھے۔ جنگلی ہاتھیوں کو پکڑنے کے لئے مادہ ہتھنیاں بھی استعمال کی جاتی تھیں' مہاوت ہتھنی کی پیٹھ پر لیٹ جاتا اور بالکل بے حس و حرکت رہتا' تاکہ کسی پر اس کی موجودگی ظاہر نہ ہو سکے۔ نر ہاتھی ہتھنی کے قریب آتا تو اسے رسوں کی مدد سے پکڑ لیا جاتا۔ ایک دوسرے طریقہ میں جنگلی ہاتھیوں کو گھاس سے ڈھکے ہوئے ایک گڑھے میں گرا دیا جاتا' وہاں انہیں سدھانے تک بھوکا اور پیاسا رکھا جاتا۔ اور ایک طریقے میں ہاتھیوں کو آگ روشن کر کے اور ان کی پناہگاہ کے اردگرد شور برپا کر کے پکڑا جاتا تھا' وہاں ایک مصنوعی خندق کی ایک جانب ایک مصنوعی دروازہ بنایا جاتا تھا' جانور کو ہانک کر اس طرف لایا جاتا اور ایک رسے کے ذریعے پکڑ لیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے جنگلی ہاتھیوں کے گروہوں کو پکڑنے کے لئے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ ہانکنے والے انہیں تین جانب سے گھیرے میں لے لیتے تھے' ایک جانب کو کھلا رکھا جاتا تھا' جہاں متعدد ہتھنیوں کو کھڑا کر دیا جاتا تھا' ہاتھی ہر طرف سے ہتھنیوں سے ملاپ کرنے کے لئے آتے' تو ہتھنیوں کو آہستہ آہستہ ایک احاطہ کی طرف لے جایا جاتا' نر ہاتھی بھی ان کے پیچھے جاتے تو انہیں پکڑ لیا جاتا تھا۔

اکبر بازوں' تربیت یافتہ شکروں' شاہین اور شنقر (سیاہ آنکھ کا شکرا) کی مدد سے شکار کرنے کا بہت شوقین تھا اور اس نے انہیں انوکھے کارنامے سرانجام دینے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے باشاؤں (چھوٹے بازوں) کو متعدد نام دیئے تھے۔ وہ باشاؤں' بہریوں' شکروں' لگروں' جھگوں' چرغوں' ریکیوں' ترمتیوں' نسرپلاؤں' دھوتیوں' مولچیوں' چڑیوں اور بٹیروں کو شکار کے لئے تربیت دیتا تھا اور اس قسم کے شکار میں بہت زیادہ خوشی محسوس کرتا تھا۔ اس کے پاس میر شکار بھی تھے جو ان پرندوں کو شکار اور دوسرے جانوروں پر حملہ کرنا سکھاتے تھے۔ میر شکار کے تحت احدی دوسرے سپاہی اور ہرکارے ہوتے تھے۔ جو زیادہ تر کشمیری اور ہندوستانی ہوتے تھے۔ شاہی چڑیا خانے میں پرندے بھی پیشکش کے طور پر وصول کئے جاتے تھے۔ چڑیا خانہ ایک افسر کی زیر نگرانی ہوتا تھا' جسے قش بیگی کہا جاتا تھا۔

تیتر کے ذریعے شکار کرنا بہت دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایک تربیت یافتہ تیتر کو ایک پنجرے میں بند کر کے اس پنجرے کے اردگرد جال لپیٹ دیا جاتا تھا' چڑی مار کے اشارے پر پرندہ گانا شروع کر دیتا۔ اس کی آواز جنگلی پرندوں کو دلکش معلوم ہوتی اور وہ دوستانہ ملاقات کے لئے قریب آ جاتے اور جال میں پھنس جاتے تھے۔

مرغابی کا شکار بھی بہت زیادہ تفریح فراہم کرتا تھا۔ شکرے یا باز انہیں تیرتے وقت پکڑ لیتے۔ ابوالفضل نے انہیں پکڑنے کے لئے ایک انوکھے طریقے کا ذکر کیا ہے۔ پروں' چونچ اور دم کے سمیت کھال کی ایک مصنوعی مرغابی تیار کی جاتی تھی' اس کا جسم کھوکھلا ہوتا تھا اور اس سے باہر دیکھنے کے لئے کھال میں دو سوراخ رکھے جاتے تھے۔ شکاری اپنا سر اس میں رکھ کر گردن تک پانی میں کھڑا ہو جاتا' تاکہ صرف پرندے کی شکل ہی دکھائی دے سکے۔ اس کے بعد وہ آہستگی کے ساتھ پرندوں کی طرف چلا جاتا' وہ اس شکل کو اپنی ہی ایک قسم سمجھتے' اس پر چڑی مار یکے بعد دیگرے انہیں پانی کے نیچے کھینچتا چلا جاتا تھا۔ پرندوں کو پکڑنے کے لئے دوسرے ذرائع بھی استعمال کئے جاتے تھے۔

چڑیوں کو پکڑنے کے لئے مینڈکوں کو بھی تربیت دی جاتی تھی' اس سے بہت زیادہ تفریح حاصل ہوتی تھی۔

اکبر تمام مردانہ کھیلوں اور ورزشوں کا شوقین تھا۔ وہ چوگان کا ایک بہترین کھلاڑی تھا اور اسے کھیلنے کے لئے اپنے امراء کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اس کے مورخ کے مطابق اس نے اس میں پھرتی اور فیصلہ کن نتیجہ حاصل کرنے کے ذرائع کو دیکھ لیا تھا' یہ آدمی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہے اور دوستی کے بندھن کو مضبوط کرتا ہے' چھپے ہوئے جوہروں کو اجاگر کرتا ہے' آدمی کو

گھڑسواری کا فن سیکھاتا ہے' حوصلے کو بڑھاتا ہے' جانوروں کو پھرتی کے کارنامے سرانجام دینے اور باگ ڈور کا حکم ماننے کا عادی بناتا ہے۔ بادشاہ اپنی حرکات و سکنات کی مستعدی اور نہایت آسانی اور پھرتی سے گیند کو ضرب لگا کر تماشائیوں کو حیران کر رہا تھا۔ وہ مختلف انداز میں اس کو ٹھوکر لگاتا اور اسے اس وقت ضرب لگاتا جب یہ ابھی ہوا ہی میں ہوتا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں بھی چوگان کھیل سکتا تھا' یہ چیز اس فن کے انتہائی ماہر کھلاڑیوں کے لئے کسی طرح بھی کم حیرانی کی بات نہیں تھی۔

اکبر کبوتر بازی کو عشق بازی کہتا تھا۔ اس نے قدرت کی طرف سے کبوتر جیسے اس چھوٹے سے پرندے کو دانشمندی کے علاوہ اسرار و رموز کا عطیہ حاصل ہونے کے باعث اس کی تعریف و توصیف کے جذبہ کے ساتھ اور بادشاہ کے احکامات کی تعمیل کے لئے انسانوں کی خاطر ایک مثال قائم کرنے کی غرض سے' خود کو اس تفریح میں مصروف کیا تھا۔ چنانچہ اس کا سوانح نگار بیان کرتا ہے' انہی محرکات کو مد نظر رکھ کر بادشاہ سلامت اس تفریح پر بہت زیادہ توجہ صرف کرتے تھے۔

ایران اور توران کے بادشاہ اکبر بادشاہ کے لئے کبوتروں کے تحفے بھیجا کرتے تھے' جبکہ سوداگر بھی مختلف ملکوں سے بہت سی مختلف اقسام لاتے تھے۔ اکبر انتہائی کم عمری سے کبوتروں کا بہت شوقین تھا۔ اس نے جوان ہونے پر کبوتر بازی کو ترک کر دیا تھا' مگر بالغ نظر ہونے پر دوبارہ شروع کر دی۔

اکبر کے رضاعی بھائی خان اعظم کوکل تاش خاں کی ملکیت نیلے رنگ کا ایک بہترین تربیت یافتہ خوبصورت کبوتر بادشاہ کے ہاتھ لگ گیا۔ اسے موہنا کا نام دیا گیا۔ بادشاہ اس کی خوبصورتی اور رنگ سے اس قدر خوش تھا کہ اس نے اسے شاہی کبوتروں کا سردار بنا دیا۔ اس کی نسل سے کئی بہترین کبوتر حاصل کئے گئے اور انہیں اشکی' پری زاد' الماس اور شاہ لڈی کے نام دیئے گئے۔ انہوں نے دوبارہ بہترین قسم کے کبوتر پیدا کئے۔ آئین اکبری میں ان کی نسلوں اور اقسام کے متعلق تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اکبر کبوتروں کا ایک بہترین منصف (مشاہد) تھا اور انتہائی توجہ کے ساتھ ان کی متعدد اقسام کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک قسم کے لئے علیحدہ چڑیا خانہ تعمیر کیا گیا تھا۔

کبوتروں کو بہت بڑی تعداد میں اکٹھا ہوا میں اڑانے کے ساتھ ساتھ مختلف کرتب بھی سکھائے جاتے تھے' مثلاً" اوپر جانا اور نیچے آنا' اب ایک طرف مڑنا' اب دوسری جانب مڑنا' ایک مرتبہ چھتری پر بیٹھنا اور دوسری مرتبہ پرواز کر جانا اور مدمقابل کے کبوتروں کے غول کو شکست دینا' اس کے علاوہ اڑتے ہوئے' کبوتر باز کی سیٹی پر یا ایک لمبے بانس کے ساتھ بندھے ہوئے

جھنڈے کی آگے پیچھے حرکت کے ذریعے اس کے اشاروں پر "مکمل بکھرنا" انہیں بازی لگانے (یا قلابازیاں لگانے) اور چرخ (ایک تیز حرکت جس میں کبوتر خود کو ایک دائرے کی شکل میں گراتا ہے) کے علاوہ بہت سے دوسرے دلچسپ کرتب سکھائے جاتے تھے۔ کبوتروں کو ان جیسے کھیل تماشوں کے لئے اور ان کے بال و پر کی خوبصورتی کی خاطر پالا جاتا تھا' پرندوں کی شاندار وضع قطع اور رنگ برنگے پر ہمیشہ بادشاہ کے لئے خوشی کا باعث ہوتے تھے۔

آئین اکبری کے مطابق دربار میں بیس ہزار سے زائد کبوتر تھے' ان میں سے پانچ ہزار بہت عمدہ نسل کے تھے' جسے "خچ" کہا جاتا تھا' یہ اپنی مہارت اور بہت سے دلکش رنگوں کے باعث بہت زیادہ شہرت کے حامل تھے۔ لوٹن (قلاباز) کی بہت زیادہ تعریف کی جاتی تھی۔ بادشاہ کبوتروں کا اس قدر شوقین تھا کہ وہ انہیں پنجڑیوں پر (جنہیں آدمیوں نے اٹھایا ہوتا تھا) اپنے پڑاؤ کے ساتھ لے جاتا تھا۔ جب پڑاؤ اٹھایا جاتا تو اس کے بعد کبوتر اس کے پیچھے پیچھے آتے۔ اس نے کبوتروں کے باہمی ملاپ سے ان کی اقسام کو ترقی دی۔ اس سے پہلے کسی نے یہ عمل نہیں کیا تھا۔ ان پرندوں کی نسل کشی کے بارے میں اس کے اس خفیہ علم کے باعث اس کے درباری کچھ کم حیران نہیں تھے' وہ اس کی بہت زیادہ تعریف کرتے تھے۔

اکبر دشمنوں کو سزا دینے میں بڑا مستعد تھا اور ان پر کسی قسم کا رحم نہیں کرتا تھا۔ مگر اپنے دوستوں سے بہت مہربانی سے پیش آتا اور ان کے لئے شفقت آمیز جذبات رکھتا تھا۔ یہ جذبات باہمی تھے۔ ابوالفضل نے اس کی بے شمار مثالیں پیش کی ہیں۔ دور حکومت کے ساتویں برس 1562ء کے بیان کے ساتھ ایک واقعہ وابستہ ہے' اس المیہ کا تعلق قلعہ آگرہ سے ہے۔

ماہم انگہ: ماہم انگہ کا بیٹا ادھم خاں 5000 ہزاری منصب کے ساتھ اکبر کے دربار کا ایک امیر تھا۔ وہ اور منعم خاں خان خاناں دونوں اکبر کے رضاعی باپ محمد شمس الدین انگہ خاں سے دشمنی رکھتے اور اس سے نفرت کرتے تھے۔ 12 رمضان المبارک کی رات جب منعم خاں' انگہ خاں' شہاب الدین احمد خاں اور دوسرے امراء قلعہ کے دیوان خاص میں ایک سرکاری مجلس میں شریک تھے' ادھم خاں اچانک چند ساتھیوں کے ساتھ دیوان میں داخل ہوا۔ سب لوگ اس کا استقبال کرنے کے لئے اٹھے' تب ادھم خاں نے انگہ خاں پر اپنے خنجر سے حملہ کیا اور اپنے ایک مسلح ساتھی خوشم کو اشارہ کیا کہ اسے ہلاک کر دے۔ خوشم نے اپنا خنجر کھینچ کر انگہ کے سینے پر وار کیا' انگہ دروازہ کی طرف بھاگا' مگر دولت خان کے صحن میں گر پڑا اور فوراً" ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد' ادھم اپنے ہاتھ میں خنجر تھامے بادشاہ کی خواب گاہ کی طرف بڑھا' جو ایوان شاہی میں شور کے باعث جاگ اٹھا تھا۔ بادشاہ اپنے ہاتھ میں تلوار لے کر باہر آیا اور چلا کر بولا "

اے کتیا کے بچے (بچہ لاوا) تم نے میرے رضائی باپ کو کیوں مار ڈالا ہے۔ لوھم نے اپنے ہاتھوں سے اکبر کے دونوں بازو پکڑ کر اسے جواب دیا" حضور والا ایک لمحہ رکیے اور پہلے دریافت تو کر لیجئے۔ اکبر نے اس کے ہاتھوں کو پرے ہٹا کر لوھم کے منہ پر ایک مکا رسید کر دیا۔ لوھم ایک طاقتور شخص تھا' مگر مکا اس قدر شدید تھا کہ وہ زمین پر گر گیا۔ اکبر نے اپنے قریب کھڑے ہوئے خدمت گاروں فرحت خاں اور سنگرام سے کہا تم کیا دیکھ رہے ہو؟ اس شخص کو باندھ دو۔ اس کی تعمیل کی گئی اور اکبر کے حکم سے لوھم خاں کو دیوان خانہ کے چبوترے (صفا) سے سر کے بل زمین پر گرا دیا گیا۔ ابھی اس کی جان نہیں نکلی تھی کہ اسے سر کے بالوں سے گھسیٹ کر چبوترے کی طرف لایا گیا اور دوبارہ نیچے گرایا گیا' جس کے باعث وہ ہلاک ہو گیا۔ لوھم خاں اور اتکہ خاں کی نعشوں کو دفن کرنے کے لئے دہلی روانہ کر دیا گیا۔

جب مذکورہ بالا واقعات رونما ہوئے' تو لوھم خاں کی ماں ماہم انگہ (124) دہلی میں بیمار تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس کے بیٹے کو صرف قید کیا گیا ہے وہ آگرہ کی طرف روانہ ہوئی۔ اکبر نے اسے دیکھ کر کہا "اس نے میرے رضائی باپ کو مار ڈالا تھا اس لئے میں نے اس کی جان لے لی۔" اس نے بوڑھی خاتون کو تسلی دی تو وہ یہ کہتے ہوئے ایوان سے چلی گئی "حضور والا نے بہت اچھا کیا ہے۔" اس کی بیماری میں اضافہ ہو گیا اور وہ اپنے بیٹے کی موت کے چالیس روز بعد دلبرداشتہ ہو کر انتقال کر گئی۔ اس کی نعش کو دہلی روانہ کر دیا گیا۔ اکبر پورے دربار کے ہمراہ اشکبار آنکھوں کے ساتھ چند قدم تک اس کے پیچھے چلا: وہ بھی سوگ میں بیٹھ گیا۔ بادشاہ کے حکم سے دہلی میں لوھم خاں اور ماہم انگہ کی قبروں پر ایک انتہائی خوبصورت یادگار تعمیر کی گئی۔ (125)

اکبر نے اسی طرح اتکہ خاں (126) کے بیٹے مرزا عزیز کوکہ کو اس کے والد کی موت پر تسلی دی۔ اتکہ خاں کی نعش کو دہلی روانہ کیا گیا اور اسے بستی نظام الدین اولیاؒ میں دفن کیا گیا۔

(127)

اپنے لوگوں کی اصل حالت سے باخبر ہونے اور اپنے افسروں کی بدعنوانیوں کے خلاف بطور حفاظت (تاکہ کمزور کو طاقتور کے ہاتھوں سے گزند نہ پہنچے) بادشاہ شہر کے مختلف گلی محلوں اور مضافات میں بھیس بدل کر گشت کیا کرتا تھا۔ دور حکومت کے چھٹے سال کے واقعات کے بارے میں ابوالفضل نے آگرہ کے مضافات میں بادشاہ کے بھیس بدل کر نمودار ہونے سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ درج کیا ہے۔ بادشاہ نے بذات خود یہ واقعہ اس سے بیان کیا تھا۔ اودھ میں قصبہ بھڑائچ میں محمود غزنوی کی افواج کے ایک جرنیل سالار مسعودؒ کے مقبرہ پر ہر سال ایک بہت بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان میں اس فاتح کی لڑی گئی جنگوں میں سے ایک میں لڑتے ہوئے

شہید ہو گئے تھے۔ اس صوفی بزرگ کی یاد میں اس موقع پر نیزوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ آگرہ سے لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم اس میلے میں شرکت کرتا ہے۔ شہر کے مضافات میں بھی اس بزرگ کی یاد میں ایک بہت بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے۔ (128) اکبر بھیس بدل کر آگرہ کے ایک میلہ میں شریک ہوا اور بلا مقصد گشت کر رہا تھا کہ اسے ایک سادہ لوح شخص نے پہچان لیا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا' اس سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر دیا' تو لوگوں نے بادشاہ کو بھرپور توجہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اکبر نے اس بات کا جائزہ لے کر فوراً کچھ اس قدر مہارت کے ساتھ اپنا چہرہ تبدیل کر لیا کہ جن لوگوں نے اسے دیکھا تھا' وہ اس کی شناخت کے متعلق شک و شبہ میں پڑ گئے: وہ پریشان ہو گئے اور اس بات کا اعتراف کر لیا کہ انہیں غلطی لگی ہے' انہوں نے جس شخص کو دیکھا وہ اکبر نہیں تھا۔ اکبر کا اپنا بیان جو اس نے ابوالفضل کو بتایا اور جس کا موخر الذکر نے اپنی کتاب میں حوالہ دیا ہے' بہت زیادہ دلچسپ ہے۔ "لوگوں نے جو کچھ کہا' اس پر غور کرتے ہوئے میں نے اپنی ایک آنکھ کو فوراً" ٹیڑھا کر لیا (جیسے بھینگی ہو) اور اپنے چہرے کو کچھ اس انداز میں تبدیل کر لیا کہ جس شخص نے مجھے کبھی دیکھا بھی تھا وہ بھی پہچان نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ' میں نے اپنے نقوش کو تبدیل کر کے بالکل لاتعلق ہو کر اور پورے ذہنی اطمینان کے ساتھ میلے میں مٹرگشت شروع کر دی اور اشیاء کو دیکھتا رہا۔ لوگوں نے مجھے بغور دیکھنے کے بعد ایک دوسرے سے کہا "یقیناً بادشاہ کی اس جیسی آنکھیں یا نقوش نہیں ہیں' وہ اکبر نہیں ہے۔" اس کے بعد میں خاموشی سے اس جگہ سے واپس ہوا اور محل میں داخل ہو گیا۔" ابوالفضل لکھتا ہے کہ جب بادشاہ سلامت اسے یہ کہانی سنا رہے تھے' تو انہوں نے سمجھانے کی خاطر اپنی ایک آنکھ اور چہرے کو بالکل اسی طرح تبدیل کر لیا' جس طرح میلے میں کیا تھا' یوں انہوں نے اپنے فاضل دوست اور دانشمند وزیر کو تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی دے دی۔

اکبر زبردست حاضر جواب تھا اور اس کی بے تکلفانہ گفتگو ظرافت سے بھرپور ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک شاعر اور اعلیٰ حسب و نسب کے ایک چغتائی ترک شاہ قانی نے اکبر کی موجودگی میں کہا' کوئی شخص بھی تین چیزوں میں اس سے سبقت نہیں لے جا سکتا' شطرنج' لڑائی' شاعری۔ اس پر بادشاہ نے فوراً جواب دیا کہ ایک چوتھی چیز تم بھول گئے ہو' یعنی خود پسندی۔ قانی جنگ میں زبردست حوصلہ کے سلسلہ میں اپنا لوہا منوا چکا تھا اور اسے اس پر بہت فخر تھا۔

وہ ایک بہترین قیافہ شناس تھا اور اسے یہ ملکہ بھی حاصل تھا کہ ایک ہی نظر میں آدمیوں کو جانچ لیتا تھا۔ اسے مبارک اور منحوس دنوں پر یقین تھا۔ یقیناً یہ پنڈتوں اور برہمنوں سے دوستی کے باعث تھا۔

اکبر کا کتب خانہ: اکبر لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا مگر اسے حیرت انگیز یادداشت، زبردست مشاہدہ، زود فہمی اور دانشمندانہ دور اندیشی عطا ہوئی تھی۔ اس کے پاس ایوان عام اور حرم دونوں میں ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ جسے کئی حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ کتابیں ہندی، فارسی، عربی، یونانی اور کشمیری تصانیف پر مشتمل تھیں۔ بادشاہ ہر کتاب کو شروع سے آخیر تک پڑھواتا تھا۔ روزانہ پڑھنے والا جس صفحہ پر بھی رک جاتا، بادشاہ اپنے قلم سے اس پر نشان لگا دیتا۔ اور اگلے روز جس جگہ نشان لگا ہوتا، وہیں سے پڑھنا شروع کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کو جتنے صفحے پڑھ کر سنائے جاتے وہ ان کے مطابق پڑھنے والے کو طلائی و نقرئی سکوں سے نوازتا تھا۔ اگر کوئی کتاب اسے دوبارہ پڑھ کر سنائی جاتی تو وہ اس سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا، بلکہ اسے دوبارہ سن کر اس کی خوشی دوبالا ہو جاتی تھی۔

سرکاری عہدے: سرکاری عہدے عطا کرتے وقت اکبر کسی طبقے یا قوم میں امتیاز روا نہیں رکھتا تھا۔ حکومت کی طرف سے کم ترین سے اعلیٰ ترین تقرری کے سلسلے میں ہر عہدہ پوری رعایا کے لئے دستیاب تھا اور اس ضمن میں کسی فرقے یا قومیت کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کے شانہ بشانہ ترقی دی جاتی اور انہیں یکساں طور پر اس کا اعتماد اور احترام حاصل تھا۔ وہ کسی موروثی اثر و رسوخ یا شجرہ نسب یا آباؤ اجداد کی شہرت کا بالکل لحاظ نہیں رکھتا تھا، بلکہ ان لوگوں کی حمایت کرتا تھا، جن کے اطوار اعلیٰ اور باکمال ہوتے تھے۔ وہ اپنی فوج میں تمام طبقوں کے افراد، مثلاً" یہودی، ایرانی، تورانی، جارجین، پٹھان، افغان اور کشمیری وغیرہ بھرتی کرتا تھا، کیونکہ اس کے خیال کے مطابق اگر دوسروں کو نکال کر ایک ہی طبقہ کے لوگوں کو ملازم رکھا جائے، تو وہ بغاوت کا باعث بنتے ہیں، جس طرح ازبکوں اور قزلباشوں نے اپنے بادشاہوں کو معزول کر کے علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔

افسران کو قرضے کا اجراء: جن اعلیٰ سرکاری افسران کو زمین کی صورت میں عطیات دیئے جاتے تھے اور بہت بڑی بڑی ماہانہ تنخواہیں بھی وصول کرتے تھے، انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے روپے کی ضرورت ہو سکتی تھی یا وہ مالی مشکلات کا شکار ہو سکتے تھے۔ ان حالات کے تحت کوئی تحفہ مانگنا حکومت کے قواعد کے خلاف ہوتا تھا۔ اس اتفاقیہ ضرورت کے لئے مطلوبہ رقم فراہم کرنے کی خاطر بادشاہ نے ایک خزانچی اور ایک علیحدہ میر عرض مقرر کیا، جو افسران کو ان کے منصب اور اعزاز کا خیال رکھے بغیر اور بلا تاخیر پیشگی رقم بطور قرضہ دیتے تھے۔ پہلے سال کچھ وصول نہیں کیا جاتا تھا، دوسرے برس قرضے میں 16 فی صد اضافہ کر دیا جاتا،

تیسرے سال 1/8 دسویں برس رقم کو دوگنا کر دیا جاتا اور اس کے بعد مزید اضافہ نہیں کیا جاتا تھا۔

عطیات اور تحائف: بادشاہ عطیات بھی عنایت کرتا تھا اور افسران اور دوسرے اشخاص کو ہاتھی' گھوڑوں اور قیمتی اشیاء کی صورت میں تحائف بھی دیتا تھا۔ ایک خزانچی ہروقت دربار میں منتظر رہتا اور ضرورت مند لوگوں کو آزادانہ خیرات دی جاتی' انہیں روزانہ' ماہانہ اور سالانہ وظائف بھی ملتے تھے۔

بادشاہ کو تولنے کی رسم: بادشاہ کو سال میں دو مرتبہ مندرجہ ذیل اشیاء میں سے ہر ایک کے ساتھ تولا جاتا تھا' مثلاً" سونا' پارہ' تانبا' گھی' لوہا' چاول' دودھ' غلے کی سات اقسام اور نمک ان سب اشیاء کو خیرات کے طور پر بانٹ دیا جاتا تھا۔ بادشاہ کی عمر کے سالوں کی تعداد کے مطابق' بھیڑ بکریاں اور پرندے خیرات میں دے دیئے جاتے تھے۔ قمری مہینے کے مطابق جنم دن پر اسے آٹھ اشیاء یعنی چاندی' قلعی' کپڑا' سیسہ' پھلوں' رائی' تیل اور سبزیوں کے ساتھ تولا جاتا تھا۔ دونوں مواقعوں پر سالگرہ کی رسم کو انتہائی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اور ہر منصب کے لوگوں کو عطیات اور معافی عطا کی جاتی تھی۔

اکبر کا اصل مذہب: اکبر کے مذہبی خیالات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے' مگر اس سوال کا جواب ابھی تک نہیں دیا گیا کہ اس کا اصل مذہب کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کم عمری ہی میں رواداری کے تصورات اور آزادانہ خیالات اس میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے یا اسلام کی تعلیمات پر اس کا ایمان کم ہو گیا تھا: مگر یہ خیالات متفکر ذہن کا نتیجہ تھے' اس لئے ان پہ تحقیق اور تفتیش کرنا ایک قدرتی عمل تھا۔ اپنے دور حکومت کے ابتدائی حصہ میں وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دیتا' متقی و پرہیز گار بزرگان دین کو خراج عقیدت پیش کرتا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ حتیٰ کہ دور حکومت کے اکیسویں برس تک وہ سنجیدگی سے مکہ مکرمہ کے حج کی بات کرتا تھا۔ مگر حکومت کے چوبیسویں برس (1579ء) میں اس کے مذہبی خیالات میں تبدیلی رونما ہونے لگی' اس کی زبردست کجروی (جس نے ایک مرتبہ اسے اپنی پیشانی پر ہندوؤں کا تلک لگا کر دیوان عام میں آنے پر مجبور کر دیا تھا' ایک دوسرے موقع پر وہ آگ کے سامنے سجدہ ریز ہوا' اب سورج کی پوجا کر رہا ہے' دوبارہ بتی پرستش کرنے کا حکم دے رہا ہے' اب اپنی پیشانی پر عیسائیوں کی صلیب رکھ رہا ہے اور ایک بار پھر قرآن پاک کی وحی کے بارے میں جھگڑا کر رہا ہے) کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے مشیروں ابوالفضل اور فیضی (جو اسلام سے منحرف مانے جاتے ہیں) کی ترغیب آمیز فصاحت و بلاغت کے ذریعے جو

کچھ بھی اختیار کرنے یا کرنے کی ترغیب حاصل کی' پھر بھی اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کے لئے اس کے دل میں احترام ختم نہ ہوا۔ یہ اس حقیقت سے بھی ظاہر ہے کہ بدایونی (جس نے انتہائی جانفشانی سے دین میں بادشاہ کی اختراعات کی تفصیل بیان کی ہے) نے 990ھ (1582ء) سے متعلق واقعات کے ساتھ ایک واقعہ درج کیا ہے' جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ نے اپنے دل سے اسلام کا احترام ختم نہیں کیا تھا۔ مصنف لکھتا ہے:۔

"اس وقت شاہ ابو تراب اور اعتماد خاں گجراتی' جو اکٹھے حجاز مقدس کے سفر پر گئے تھے' وہاں سے واپسی پر اپنے ساتھ ایک بہت وزنی پتھر لائے' جسے اٹھانے کے لئے ایک طاقتور آدمی درکار تھا' اس کے اوپر پاؤں کا ایک نشان واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا' شاہ ابو تراب نے اعلان کیا کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے پاؤں مبارک کا نشان ہے۔

برلوح سر تربت خود نقش تو کندیم　　　　تا روز قیامت سرما زقدم تست

ترجمہ:۔ ہم نے اپنے لوح مزار پر آپ کے پاؤں مبارک کے نقش قدم کو کندہ کر دیا ہے تاکہ روز قیامت ہمارا سر آپ کے پاؤں کے نیچے ہو۔

بادشاہ اس کا استقبال کرنے کے لئے چار کوس (129) کے فاصلے تک گیا اور اپنے امراء کو حکم دیا کہ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر اسے اٹھائیں' لہٰذا اسی انداز میں اسے شہر لایا گیا"۔ (130)

اکبر کی پوری زندگی کے رویہ سے پتہ چلتا ہے کہ اصل میں اس کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کی پوری زندگی کا مقصد سب کے ساتھ پرامن رہنا اور ہر اس مذہب کا احترام کرنا تھا' جسے وہ منصفانہ اصولوں پر مبنی سمجھتا تھا۔ ملاؤں سے اس کی نفرت زیادہ تر شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث تھی' اکبر کے سب سے زیادہ منظور نظر بننے سے قبل انہیں ان کے ہاتھوں نقصانات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہندوؤں کے لئے اس کا پیار و محبت حقیقی تھا۔ یہ حکمت عملی پر مبنی تھا اور وہ اپنی ہندو بیویوں (131) کے بہت زیادہ زیر اثر تھا' جنہیں وہ ہر حالت میں خوش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ خدا کے وجود پر یقین رکھتا تھا اور تمام مذاہب کے متقی و پرہیزگار بزرگوں کا احترام کرتا تھا۔ وہ خدا کو قادر مطلق مانتا تھا اور یہ خیال کرتا تھا کہ جس طرح کوئی اسے عزیز ہو جاتا ہے' اسی طرح اس کے کلام (جن کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی طرف سے ہوتے ہیں) مستقبل کی کوکھ میں چھپے ہوئے معاملات کے سلسلہ میں انسانی برادری کی فلاح و بہبود پر اثر انداز ہو سکتے ہیں' اسی وجہ سے اس نے خود کو اقوام کے پیشوا کی حیثیت سے برملا مشہور کرا دیا تھا اور لوگوں کو اپنے چیلے بنایا تھا۔

امور سلطنت: اکبر کے تحت سلطنت پندرہ صوبوں میں منقسم تھی' (132) جو 105 سرکاروں

میں تقسیم کیے گئے تھے' یہ دوبارہ پرگنوں یا محلوں میں بانٹے گئے تھے اور انہیں دستوروں میں منظم کیا گیا تھا۔ آگرہ ایک صوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سرکار بھی تھا۔ 1,864 مربع میل کا خطہ (آگرہ سرکار) 31 پرگنوں پر مشتمل تھا' جسے پانچ دستوروں یعنی ہوالی' آگرہ' ایستوا' بیانہ اور مندلوا میں مرتب کیا گیا تھا۔

شاہی گھرانے کے شہزادگان کے پاس 10,000 ہزاری سے 7,000 ہزاری تک کے منصب تھے۔ ان کے بعد 5000 سے 10 تک کے مختلف 30 منصب دار آتے تھے۔ منصب داروں کے تحت سپاہیوں کو ان قبیلوں سے بھرتی کیا جاتا تھا' جن کے وہ سردار ہوتے تھے۔ 5000 ہزاری منصب کے کمانڈار کی ماہانہ تنخواہ 10,637 روپے سے 30,000 روپے تک' 1000 ہزاری کی 2/3,0151 روپے سے 8,000 روپے تک' 100 کے کپتان کی 313 روپے سے 760 روپے تک تھی۔ منصب داروں کو گھوڑے' ہاتھی' اونٹ' ہتھیار وغیرہ ان کی اپنی تنخواہوں میں سے مہیا کرنے ہوتے تھے۔ ہر منصب دار کو اس کی کمان کے تناسب کے حساب سے گھوڑے مہیا کئے جاتے تھے۔ یک ہزاری سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ 1,800 لائے گا۔

ابوالفضل کے مطابق اکبر کے تحت صوبہ جات کی مقامی رضاکار فوج کی تعداد 4,400,000 تک تھی: مگر غالباً" یہ ایک مبالغہ ہے۔ بدایونی کے مطابق' باقاعدہ فوج یعنی بادشاہ کی تنخواہ کے تحت سپاہیوں کی تعداد 25,000 تھی: ان میں سے 12,000 لشکری اور 13000 توپچی اور بندوق بردار تھے' ان لشکریوں کو شاہی خزانے سے تنخواہ ادا کی جاتی تھی اور وہ بادشاہ کے محافظوں پر مشتمل تھے۔

اکبر کا نظام مالگزاری فی الحقیقت اسی طرح کا تھا جیسا کہ شیر شاہ سور افغان نے متعارف کرایا تھا۔ اس نے اس نظام کو موثر طور پر چلایا' جسے شیر شاہ اپنی مختصر حکومت کے دوران ہندوستان کے تمام حصوں تک توسیع دینے سے قاصر تھا۔ اس نظام کے تین مقاصد تھے:۔

1- تمام زمینوں کی درست پیمائش حاصل کرنا۔

2- زمین کے ہر بیگھہ کی پیداوار کا اندازہ لگانے اور اس پر سرکاری مالیہ مقرر کرنا۔

3- روپے کی صورت میں پیداوار پر حکومت کے حصہ کا تعین کرنا۔

اس نے ٹوڈرمل اور مظفر خاں کے تحت اس نظام کو چلایا' دونوں ممتاز ماہر مالیات تھے۔ ایڈورڈ تھامس کے مطابق' اس کی تخمینی سالانہ خام آمدنی 32000,000 پاؤنڈ تھی۔

آئین اکبری کے مطابق' اکبر کا حرم پانچ ہزار سے زائد عورتوں پر مشتمل تھا: ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک علیحدہ کمرہ مختص تھا۔ انہیں مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حصہ کی

نگرانی کے لئے خاتون داروغہ تھی۔ اعلیٰ ترین منصب کی خواتین میں سے ہر ایک 1,610 روپے سے 1028 روپے ماہانہ تک وصول کرتی تھی۔ شاہجہان اور اورنگ زیب کے تحت ملکائیں اور شہزادیاں بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرتی تھیں۔ شاہجہان کی بیوی ممتاز محل کو دس لاکھ روپے اور اورنگ زیب کی بہن بیگم صاحب کو بارہ لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے۔ اکبر کے دور میں حرم کے اندر باعصمت اور رعب دار خواتین پہرہ دیتی تھیں: ان میں سے زیادہ بااعتماد عورتوں کو بادشاہ کی خواب گاہ پر تعینات کیا جاتا تھا۔ احاطہ کے باہر خوجہ سراؤں کو اور ان کے عقب میں راجپوت محافظوں کو مقرر کیا جاتا تھا' (133) سب سے آخر میں دروازوں پر چوکیدار آخری محافظوں کے طور پر تعینات کئے جاتے تھے۔ حرم شاہی اصل میں سابقہ بادشاہوں کے حرم سے مختلف نہیں تھا۔ 1595ء میں خرچ 7,729,669 روپے تھا' جبکہ دربار کے متعدد افسران کی تنخواہوں کا شمار سالانہ فوجی تخمینہ حساب میں ہوتا تھا۔

اکبر کی بیویاں اور بچے: اکبر کی آٹھ بیویاں تھیں:۔

1- اکبر کے چچا مرزا ہندال کی بیٹی سلطانہ رقیہ بیگم اکبر کی پہلی بیوی تھی۔ اس کا رجحان شاہجہان کی طرف تھا: نیز شیر افگن کے قتل کے بعد نور جہاں اسی کے ساتھ ٹھہری۔ اس سے اکبر کا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ 1035 (1625ء) یا جہانگیر کی حکومت کے بیسویں برس میں 84 برس کی عمر میں فوت ہوئی۔

2- مرزا نور الدین اور گل رخ بیگم (بابر کی ایک بیٹی) کی صاحبزادی سلطانہ سلیمہ بیگم تھی۔ بہرام خاں نے اکبر کے دور حکومت کے آغاز میں اس سے شادی کی۔ بہرام خاں کے انتقال کے بعد اکبر نے 968 (1560ء) میں اس سے شادی کر لی۔ اس کا شاعرانہ تخلص مخفی تھا۔

3- راجہ بہاری مل کی بیٹی اور راجہ بھگوان داس کی بہن کی شادی اکبر کے ساتھ سانبھر میں 968 (1560ء) میں ہوئی۔

4- عبدالوصی کی خوبصورت بیوی سے 970 (1662ء) میں شادی کی۔

5- جہانگیر کی والدہ جودھ بائی' جسے مریم الزمانی (134) کہا جاتا تھا۔ وہ ماہ رجب 1032 (1622ء) میں یا جہانگیر کے دور حکومت کے 17ویں برس میں فوت ہوئی۔

6- بی بی دولت شاد۔

7- عبداللہ خاں مغل کی ایک بیٹی۔

8- خاندیس کے میراں مبارک شاہ کی ایک صاحبزادی۔

اکبر کے تین بیٹے تھے' سلطان سلیم (شہنشاہ جہانگیر)' سلطان مراد اور سلطان دانیال: اور تین

بیٹیاں، شہزادی خانم (جو سلیم کے تین ماہ بعد پیدا ہوئی)؛ شکر النساء بیگم (1001ھ (1592ء) میں اس کی شادی مرزا شاہ رخ سے ہوئی تھی) اور آرام بانو بیگم، دونوں سلطان دانیال کے بعد پیدا ہوئیں۔ (135)

اکبر کی وضع قطع اور کردار: اکبر ایک خوبصورت شکل و صورت اور دلکش اطوار کے علاوہ ایک مضبوط و توانا جسم کا مالک تھا۔ گوا سے جانے والے پرتگیزی عیسائیوں نے اس کی وضع قطع اس طرح بیان کی ہے، وہ "تقریباً پچاس برس کی عمر کا ایک شخص، انگریزوں کی طرح سفید رنگت کا حامل اور صاحب عقل و دانش تھا۔" اس کا قد درمیانہ تھا، مگر قدرے طویل معلوم ہوتا تھا اور اپنے والد کی طرح فربہی کی طرف مائل دکھائی دیتا تھا، مگر اس کو اس نے اپنی جسمانی مشقت (جس کے لئے وہ بہت زیادہ مشہور تھا) کے ذریعے اچھی طرح توانا بنایا ہوا تھا۔ تیمور کی طرح اس کے بازو اور ہاتھ لمبے تھے، اس کی رنگت بادامی تھی، پیشانی کشادہ تھی، آنکھیں سیاہ اور بھنویں مخالف سمت سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ تھیں: ان گھنی بھنوں کے نیچے اس کی آنکھیں شاہانہ انداز میں چمک رہی ہوتی تھیں۔ شیر جیسی طاقت کا حامل، غالباً اپنے سینہ کی غیر معمولی چوڑائی اور اپنے لمبے اور قوی بازوؤں اور ہاتھوں کے باعث تھا۔ اس کے ناک کی بائیں جانب ایک پرگوشت مسّے نے اس کے چہرے کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے تھے، قیافہ شناسوں نے اسے بہت مبارک قرار دیا تھا۔ وہ ایک بلند اور بارعب آواز کا حامل تھا: نیز اس کی تقریر شاندار اور خوشگوار ہوتی تھی۔ وہ حیرت انگیز قوت کا مالک تھا، اس لئے اسے اپنی طاقت، شکاری کارناموں، شکاری مہمات، گھڑسواری اور ہاتھیوں پر دسترس ہونے پر بڑا فخر تھا۔ اس کا فولادی ارادہ اسے مشکلات اور محنت مشقت سے عہدہ برا ہونے کے قابل کر دیتا تھا۔ ایک موقع پر اس نے مسلسل دو دن میں آگرہ سے اجمیر (220 میل) تک سواری کی۔ وہ بیک وقت خوش اخلاق باوقار متحمل مزاج اور سخت تھا۔ اگرچہ اسے متعدد جنگیں لڑنا ہوتیں اور اپنے ملک کے انتظام میں اصلاحات کرنا ہوتی تھیں (اس سے پہلے کبھی بھی متعارف نہیں کروائی گئیں)، مگر اس کے باوجود وہ اپنے وقت کو اس قدر عقلمندی کے ساتھ ترتیب دے لیتا تھا کہ اپنے علم میں اضافہ کرنے اور شکار کرنے کے لئے اسے اچھی خاصی فرصت مل جاتی تھی۔ وہ جنگ کا شوقین نہیں تھا، مگر میدان جنگ میں جانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا اور اپنے عمل میں مضبوط اور فیصلہ کن ہوتا تھا۔ مفتوحہ دشمن کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا تھا اور بادشاہی فطرت سے متعلق منو کے قانون پر عمل کرتا تھا، جس میں بتایا گیا ہے کہ "جب کوئی راجہ کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو اسے اس ملک کے قوانین کا احترام کرنا چاہئے" یا اسے چاہئے کہ وہ مفتوحہ راجہ کے ساتھ اتحاد قائم کر کے اس

کے ساتھ متحد ہو جائے' کیونکہ ایک مضبوط حلیف حاصل کرنے کے باعث راجہ دولت اور علاقہ حاصل کرنے کے مقابلہ میں زبردست طاقت حاصل کر لیتا ہے۔" ان بہترین اصولوں کی پیروی میں اکبر نہ صرف اپنے مفتوحہ مخالفوں کو معاف کر دیتا' بلکہ انہیں مقامی امارت کے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز کر دیتا تھا۔ اس نے غلامی اور جزیہ کو ختم کر کے اپنی ہندو رعایا کو تحفظ فراہم کیا تھا اور ان کے پروہتوں اور مندروں کو پناہ دی تھی۔ وہ تمام مذاہب سے رواداری برتتا تھا۔ جہانگیر' جس کے مذہب کے بارے میں خیالات اپنے باپ کے خیالات سے مختلف تھے' اپنی تزک جہانگیری میں اس موضوع پر اکبر کے خیالات کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

وہ لکھتا ہے: "ایک موقع پر میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ اس نے بتوں کے ان بسیروں (یعنی ہندو مندروں) کی تعمیر کے سلسلہ میں کسی کو روکنے اور مداخلت کرنے سے کیوں منع کیا ہے؟ اس کا جواب مندرجہ ذیل اصطلاح میں تھا: "میرے عزیز بیٹے مجھے میں نے خود کو روئے زمین پر ظل الٰہی کی صورت میں ایک طاقتور بادشاہ پایا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اپنی مخلوقات پر بغیر کسی امتیاز کے اپنا لطف و کرم اور رزق نچھاور کرتا ہے' اگر میں اپنے اعلیٰ منصب کے فرائض صحیح طرح سرانجام نہ دوں' تو گیا میں ان لوگوں کے لئے لطف و کرم اور شفقت و محبت روک نہیں رہا' جن کا ذمہ مجھے سونپا گیا ہے۔ پوری نسل انسانی اور خدا کی تمام مخلوق کے ساتھ میں صلح جو ہوں۔ اس لئے مجھے کسی کے ساتھ زیادتی اور چھیڑ چھاڑ کی وجہ بننے کے لئے خود کو اجازت کیوں دینی چاہیے؟ اس کے علاوہ نسل انسانی کے چھ حصوں میں سے پانچ حصے یا تو ہندو ہیں یا لادین ہیں' اس لئے اگر میں تمہاری دریافت میں تجویز کئے گئے محرکات کے مطابق ان پر حکومت کروں' تو ماسوائے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے میرے پاس اس کا متبادل کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ میں نے اپنے دانشمندانہ منصوبے سے یہ سوچا ہے کہ ان لوگوں کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ لوگ (جن کی ہم بات کر رہے ہیں) آگرہ کے دیگر شہریوں کے ساتھ مشترکہ طور پر' یا تو علم کی تحصیل یا انسانیت کی بھلائی کے سلسلہ میں بہتری پیدا کرنے میں مفید طور پر مصروف ہیں اور بے شمار مواقعوں میں سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر پہنچے ہیں۔ درحقیقت' اس شہر میں ہر قسم کے آدمی اور روئے زمین پر ہر مذہب مل سکتا ہے۔""

بادشاہ کی علالت: بادشاہ کی علالت کی وجوہات کو تاریخ آگرہ پر لکھے گئے باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ زیادہ تر جذبات کے دباؤ اور آزردگی کے باعث وارد ہوئی۔ ایک فوری وجہ ہاتھیوں کی لڑائی کے موقع پر سلیم (جہانگیر) کے سب سے بڑے بیٹے خسرو کے رویہ کے سبب دکھ اور غم و غصہ تھا۔ سلیم کے پاس گراں بار نامی ایک ہاتھی تھا' جس کے بارے میں اندازہ

لگایا گیا کہ اس کا مقابلہ اکبر کے اصطبل کے کسی بھی ہاتھی سے ہو سکتا ہے: مگر خیال تھا کہ اس کی طاقت صرف خسرو کے ایک ہاتھی آبروپ ہی کے برابر ہے۔ اکبر نے یہ دیکھنے کے لئے کہ ان میں سے کون فاتح ثابت ہوتا ہے' مقابلہ کرانے کا حکم دے دیا۔ فوری طور پر ایک مقابلے کا انتظام کیا گیا۔ ان جیسی لڑائیوں میں طریق کار یہ تھا کہ اگر کسی ہاتھی کو دوسرا نہایت بری طرح پیٹ رہا ہوتا' تو اس کی مدد کرنے کے لئے دونوں ہاتھیوں کے درمیان ایک تیسرے ہاتھی کو تبنچہ کے طور پر تیار رکھا جاتا تھا۔ اس تماشا کے وقت اکبر اور خرم (شاہجہان) ایک جھروکے میں براجمان تھے۔ سلیم اور خسرو میدان میں گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گراں بار نے آبروپ کو مکمل طور پر شکست دے دی' جب اس کی حالت بری ہو گئی' تو تبنچہ ہاتھی کو آبروپ کی مدد کے لئے آگے بھیجا گیا۔ سلیم کے آدمی گراں بار کی آخری فتح دیکھنے کے لئے بے تاب تھے' چنانچہ انہوں نے پتھر مار کر تبنچہ کی کھال پھاڑ ڈالی اور مہاوت کو زخمی کر دیا۔ اس پر اکبر طیش میں آ گیا اور اس نے خرم کو سلیم کے پاس یہ کہنے کے لئے بھیجا کہ وہ قوانین کو نہ توڑے' کیونکہ آخر کو تمام ہاتھی اسی کے ہوں گے۔ سلیم نے کہا کہ اس نے پتھروں سے حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی تھی' خرم اس کے جواب سے مطمئن ہو کر اپنے دادا کی طرف لوٹ آیا۔ اس کے بعد آتش بازی کے ذریعے ہاتھیوں کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی' مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہوا یوں کہ گراں بار نے تبنچہ ہاتھی کو بھی مارا' جس کے باعث شکست خوردہ ہاتھی بری حالت میں دوڑے اور خود کو دریائے جمنا میں گرا دیا۔ اس پر اکبر اور زیادہ ناراض ہو گیا مگر اس کے غصہ میں اس وقت اور بھی زبردست اضافہ ہو گیا۔ جب خسرو نے اپنے باپ کو سرعام بلا روک ٹوک برا بھلا کہنا شروع کر دیا' یہ سن کر شہنشاہ اکبر اٹھا اور انتہائی بیزاری کی حالت میں واپس چلا گیا' اگلے روز اس نے اپنے طبیب علی کو بلوایا اور اسے بتایا کہ خسرو کے برے رویہ نے اسے بہت زیادہ آزردہ کر کے بیمار کر دیا ہے۔ اس پر اسہال کا حملہ ہوا۔ مذکورہ طبیب آٹھ روز تک اس امید کے تحت کسی قسم کی دوا تجویز کرنے سے باز رہا کہ بادشاہ کی قوت ارادی بیماری پر قابو پا لے گی۔ مگر جب کوئی امید نہ رہی تو انتہائی سخت قبض کی تدبیر کی گئی: اس کے باعث اس کے اسہال رک گئے: مگر بخار اور حبس البول کا حملہ ہو گیا۔ جلاب دیا گیا' لیکن اس سے پہلی بیماری دوبارہ عود کر آئی' آخر کار بادشاہ اس کا شکار ہو گیا۔ یہ واقعہ 13 اکتوبر 1605ء کو رونما ہوا۔ کسی جگہ یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ ایک بہترین مسلمان کے تمام لوازمات کے ساتھ فوت ہوا۔" (137)

اکبر کا دربار

شیخ ابوالفضل: شہنشاہ اکبر کا بہترین دوست اور وزیر شیخ ابوالفضل تھا۔ وہ 6 محرم 958 (14 جنوری' 1551ء) کو اسلام شاہ سور پٹھان کے دور حکومت کے دوران آگرہ میں پیدا ہوا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری کی تیسری جلد میں اپنے خاندان کے بیان کے لئے ایک باب وقف کیا ہے۔

وہ کہتا ہے "میں نے اپنے خاندان کی تاریخ پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا' مگر میرے دور کے تقاضے کچھ اس قدر اہم تھے کہ یہ ارادہ پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ' اس کتاب کے اختتام پر اپنے خاندان کے بارے میں ایک مختصر بیان درج کرنے کا موقع میسر آیا ہے' مجھے یہ یقین ہے کہ اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔" اس کے بعد شیخ بیان کرتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد اصل میں یمن کے باشندے تھے۔ اس کے پانچویں جد امجد شیخ موسیٰ نویں صدی ہجری میں اس ملک سے ہجرت کر کے سیوستان (سندھ) میں اس مقام پر آباد ہو گئے' جسے رائل کہا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ ایک صحرا سے شہر میں آئے تھے' مگر انہوں نے گوشہ نشینی کی عادت اور اپنا وقت عبادت و ریاضت کے لئے وقف کرنا نہ چھوڑا۔ ان کے بچوں نے پرہیزگاری و عبادت و ریاضت کے معاملہ میں ان کی بہترین مثال کی پیروی کی اور پورا خاندان اپنے گھر میں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگا۔ دسویں صدی کے آغاز پر اس وقت خاندان کے سربراہ شیخ خضر عرب میں حجاز کے مقام پر چند روزہ قیام اور اپنے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ دوبارہ جان پہچان کرنے کے بعد چند عزیزوں اور دوستوں کے ہمراہ ہندوستان ہجرت کر آئے اور اجمیر کے شمال مغرب میں واقع شہر ناگور میں آباد ہو گئے۔ وہ ایک پرہیزگار و متقی بزرگ تھے اور ان کا ذہن متصوفانہ تعلیمات سے لبریز تھا۔ وہ متقی و پرہیزگار اولیائے کرام کی صحبت میں رہتے تھے: نیز انہیں عظیم صوفی بزرگ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد شیخ عبدالرزاق قادری بغدادی حضرت مخدوم جہانیاں کے جانشین اوچ کے سید یحییٰ بخاری اوز سندھ کے شیخ یوسف جیسی مشہور و معروف متقی و پرہیزگار شخصیتوں کا اعتماد اور احترام حاصل رہا' یہ سب انتہائی باکمال اور عالم فاضل اشخاص تھے۔

ابوالفضل کا باپ شیخ مبارک' 911 (1505) میں ناگور کے مقام پر پیدا ہوا۔ چار سال کی عمر میں ہی اس کی پیشانی سے دانشمندی کی علامات ظاہر ہونے لگیں اور اس نے غیر معمولی ذہنی صلاحیت کا اچھا خاصا ثبوت فراہم کیا۔ نو برس کی عمر میں اس نے علم کے ذخیرہ سے وسیع و عریض خزانے جمع کر لئے اور چودھویں برس میں وہ ایک باکمال عالم بن گیا۔ اس نے خود کو ترک نسل کے ایک عالم فاضل شیخ عطا کے رنگ میں رنگ لیا' جنہوں نے توران اور ایران میں اپنی ابتدائی

تعلیم حاصل کی اور سکندر لودھی کے دور میں ناگور کے مقام پر آباد ہو گئے اور شیخ سالار ناگوری" کے مرید ہو گئے' انہوں نے ایک سو بیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اب شیخ خضر نے ناگور کو اپنا مستقل مسکن بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے خاندان کے مزید افراد کو ہندوستان لانے کے لئے سندھ کی طرف روانہ ہوئے' مگر راستے میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

اس موقع پر ناگور میں ایک زبردست قحط اور طاعون پھوٹ پڑا' جس کے باعث خاندان کو اس قدر نقصان کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کے تمام افراد میں سے صرف شیخ مبارک اور اس کی بوڑھی والدہ ہی زندہ بچے۔

شیخ مبارک سیر و سیاحت کرنے اور ملک کے عظیم اساتذہ کے ساتھ میل جول رکھنے کا بہت شوقین تھا' اس کا مقصد ان کی صحبت سے فائدہ اٹھانا اور مختلف قسم کا تجربہ حاصل کرنا تھا: مگر اپنی عمر رسیدہ ماں کے احترام کے بموجب اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتا تھا' جو پدرانہ شفقت کے باعث اپنے بیٹے کو جدا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس نے بخارہ کے شیخ فیضی سے جان پہچان پیدا کی' اور ان کے توسط سے عظیم صوفی بزرگ عبیداللہ المعروف خواجہ احرار سے متعارف ہوا اور ان کی تعلیمات اور صحبت سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ تقریباً اسی دور میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ مالدیو کی یورشوں کا آغاز ہو گیا تو مبارک نے ملک میں سفر کرنے کے لئے اپنے پرانے منصوبہ پر عمل کیا۔ وہ گجرات میں احمد آباد کی طرف روانہ ہوا اور شیخ ابن عربی' شیخ ابن فرض اور شیخ صدر الدین جیسے نامور استادوں کی معیت میں اپنے جامع کملات میں اضافہ کر کے انہیں مزید آراستہ و پیراستہ کیا۔ اس کا علم علم و فضل کی ہر شاخ تک وسیع ہو گیا اور وہ امام مالک"' امام شافعی"' امام ابو حنیفہ"' امام حنبل" اور امامیہ کے قوانین میں ماہر ہو گیا: یہ اسلام کے عظیم مسالک ہیں۔ ابتداء میں وہ خود امام ابو حنیفہ" کے مسلک کا پیروکار تھا۔ احمد آباد میں اس نے فارس کے علاقہ خوارزم کے مشہور مقرر ابوالفضل کی مریدی اختیار کر لی اور خطیب کے شیخ عمر اور شیخ یوسف جیسے متعدد عالم فاضل اور متقی و پرہیزگار اشخاص کی صحبت سے بہت زیادہ مستفید ہوا۔

احمد آباد میں کئی سال ٹھہرنے کے بعد شیخ مبارک اپنے مذہبی معلمین کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر سلطنت ہند کے دارالخلافہ آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے شیوخ کی نصیحت تھی کہ اگر اسے آگرہ میں کامیابی حاصل نہ ہو تو وہ توران اور ایران کی طرف چلا جائے۔ مبارک 6 محرم' 950 (1543ء) بروز بدھ آگرہ پہنچا اور ایک ولی اللہ شیخ علاؤ الدین مجذوب رح کے ساتھ ملاقات کی۔ ابوالفضل کہتا ہے "وہ دلوں کے راز اور قبر کے اسرار و رموز جانتے تھے۔" اس بزرگ نے ہند کی سرزمین پر مبارک کے لئے ایک عظیم اور روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی۔ اس ولی اللہ کی

خوش کن پیش گوئی سے مسرور ہو کر مبارک بابر کے چار باغ تفریحی محل (جسے اس وقت نورافشاں کہا جاتا تھا' مگر اب رام باغ کہا جاتا ہے) کے قریب شہر آگرہ کے سامنے جمنا کے بائیں کنارے پر ایک صوفی بزرگ میر رفیع الدین صفوی (جنہوں نے انتہائی مہربانی و شفقت سے اس کا خیر مقدم کیا) کی ہمسائیگی میں آباد ہو گیا۔ اس محلے میں قبیلہ قریش آباد تھا' مبارک نے اس میں سے متعدد گہرے دوست بنائے۔ میر' شیراز کے علاقہ انجو کے رہنے والے تھے اور آگرہ میں انتہائی شان و شوکت سے مقیم تھے۔ انہوں نے حجاز' عرب اور مصر کا سفر کیا اور مولانا جلال الدین دوانی کے مرید ہو گئے۔ مصر میں انہوں نے شیخ ابن حجر عسقلانی کے پیروکار قاہرہ کے شیخ سخاوی کی مریدی اختیار کر لی۔ مبارک نے میر کے مریدوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا' جب 954 (1547) میں میر کا انتقال ہوا' تو تجربی علوم کے ایک استاد کی حیثیت سے اس نے علم کی روشنی پھیلانے کے لئے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی' جبکہ سینکڑوں افراد نے مختلف موضوعات پر اس کے فن خطابت اور تبلیغ سے استفادہ کیا۔ یہ وہ دور تھا' جب ہندوستان پر پٹھان بادشاہوں کی حکومت تھی' لہٰذا جب مبارک کی شہرت پھیلی' تو اس کے دوستوں نے دربار شاہی سے اس کے لئے ایک وظیفہ مقرر کرنے کی تجویز پیش کی' مگر شیخ چونکہ بلند حوصلہ شخص تھا' اس لئے وہ اس تجویز سے انکاری رہا۔ غالباً اسی دور میں مبارک کے دونوں بڑے بیٹے ابوالفیض اور (چار سال بعد) ابوالفضل پیدا ہوئے۔ ابوالفضل آئین اکبری میں آگرہ کے متعلق اپنے بیان میں کہتا ہے' "جمنا کے دوسرے کنارے پر فردوس مکانی (شہنشاہ بابر) کا تعمیر کردہ چار باغ تفریحی محل ہے' وہاں راقم الحروف پیدا ہوا اور وہیں اس کے والد اور بڑے بھائی (138) کی آخری آرام گاہیں ہیں' شیخ علاؤ الدین مجذوب رح اور میر رفیع الدین صفوی بھی یہیں پر دفن ہیں۔"

اپنے بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو شیخ مبارک کی نصیحت سے اس کے جامع علم اور لیاقت کلی کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے: اس ابتدائی تعلیم نے دونوں بھائیوں کے ذہنوں میں ان غیر اسلامی خیالات کو مضبوط اور گہرا کر دیا' جنہوں نے اکبر کی زندگی پر بہت زیادہ تاثر قائم کیا۔ ابوالفضل کی تصانیف میں ایسے بے شمار قطعات ہیں' جن میں اس نے اپنے باپ کے بارے میں فرزندانہ سعادت مندی اور محبت کے انداز میں بات کی ہے۔ وہ جامع ذہانت اور حیرت انگیز یادداشت کا مالک تھا' جو اس کے وسیع و عریض علم و فضل کا ذخیرہ ثابت ہوئی۔

اب تک شیخ مبارک نے اپنا وقت علم کی تدریس کے لئے وقف کیا ہوا تھا: ہمایوں کی ہندوستان پر از سر نو فتح پر اس نے علم معرفت کو قدرت کے اسرار و رموز پر بحث کے لئے اپنی

تعلیمات کا موضوع بنالیا۔ جب 1556ء میں ہیمو نے آگرہ پر قبضہ کر لیا تو امن عامہ تباہ ہو گیا۔ شیخ مبارک عارضی طور پر عوامی زندگی سے کنارہ کش ہو گیا: مگر تخت ہندوستان کے غاصب کے دربار میں اس کا اثرورسوخ ابھی تک اس قدر زیادہ تھا کہ شیخ کی سفارش پر شہر کے ان بے شمار علمائے کرام اور مشہور شخصیتوں کو رہا کر دیا گیا' جنہیں اس کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا تھا اور ہیمو نے اپنے افسران کا ایک وفد اس کے پاس بھیج کر محترم شیخ سے معافی مانگی۔

اکبر کے دور کا پہلا سال ایک زبردست قحط کے لئے مشہور ہے' جس نے پورے ملک میں زبردست تباہی پھیلائی۔ آبادی منتشر ہو گئی اور آگرہ میں صرف چند اہم خاندان ہی باقی رہ گئے۔ اس کے بعد طاعون پھیل گیا' جس نے ملک کو ویران کر دیا اور بہت سے شہر بے آباد ہو گئے۔ ان میں سے کسی آفت نے شیخ مبارک کو اپنا پسندیدہ مسکن چھوڑنے پر مجبور نہ کیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ وہ اس وقت پانچ برس کا تھا۔ اسے اس بہت بڑی آفت کا حال مکمل طور پر یاد تھا' جس میں خاندان در خاندان تباہ ہو رہے تھے۔ وہ گنجان آباد گاؤں جس میں شیخ مبارک آباد تھا' اس میں دونوں اصناف کے صرف ستر اشخاص باقی بچے تھے۔ یہ لوگ انتہائی وقت سے حاصل کردہ ابلے ہوئے غلہ کے چند دانوں پر گذارہ کرتے تھے اور کچھ نے صرف اس کے رس سے جسم و جان کا رشتہ قائم کیا ہوا تھا۔ جب ملک میں امن و امان بحال ہوا' تو لوگ معمول کے مطابق علوم دنیاوی اور علوم معرفت کے اسباق حاصل کرنے کے لئے شیخ مبارک کے گرد جمع ہو گئے۔ اس کے علم و فضل کی شہرت کے ساتھ ساتھ اس کے مریدوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جس کے باعث اسے حاصل ہونے والی اہمیت اور اثرورسوخ نے مخالف علماء میں حسد پیدا کر دیا۔ حتیٰ کہ اس پر مہدویہ فرقے کا پیروکار ہونے کا الزام لگایا گیا' مذکورہ فرقے کو شیخ علائی کی شکل میں ایک پرجوش حامی میسر آگیا تھا۔

مسلمانوں کے درمیان رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پیش گوئی روایت کی شکل میں موجود ہے کہ دنیا کے وجود کے خاتمہ کے قریب امام مہدیؓ کا ظہور ہو گا۔ حضرت امام مہدی نبی کریمؐ کے اہل بیت میں حضور پاکؐ کی صاحبزادی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی زوجہ مطہرہ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے۔ انہیں اسلام کے آخری ایام میں ظاہر ہونا ہے' جب اسلامی دنیا میں سیاسی طاقت اور اخلاق میں تنزلی ہو گی۔ دسویں صدی ہجری کے آغاز کے قریب اور پندرھویں صدی عیسوی کے شروع میں بڑے بڑے دعوئی کے متعدد مہدی ہندوستان میں نمودار ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم جونپور کے میر سید خاں کا بیٹا میر محمد تھا۔ اس نے دنیا کے سامنے اپنی رسالت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اسے

زمین پر لوگوں کو گناہ اور مکاری سے ہٹانے اور نیکی اور صراط مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے اور یہ کہ آسمان سے ایک آواز نے اس کے کانوں میں یہ پیغام الٰہی پہنچایا ہے کہ انت مہدی "تم مہدی ہو" چنانچہ' اپنے بارے میں یہ اعلان کر کے اس نے ایک عوامی مبلغ اور مذہبی معلم کی حیثیت سے اپنی زندگی کو مصروف کر لیا۔ اس کے زبردست زور خطابت نے اس کے بہت سے پیروکار بنا دیئے' جو اس کی کرامات پر یقین رکھتے تھے۔ اس نے گجرات کے بادشاہ سلطان محمد اول کی صورت میں ایک پر جوش پیروکار پا لیا' مگر بعد میں اس کے دشمنوں نے اسے مکہ مکرمہ کی طرف جانے پر مجبور کر دیا' وہاں سے بلوچستان کی طرف روانہ ہوا' جہاں 911ھ (1505ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا مقبرہ مرجع خلائق بن گیا اور اس کے انتقال کے بعد اس کا قائم کردہ فرقہ پھلنا پھولنا شروع ہو گیا۔

اس وقت جس دوسرے نام نہاد مہدی کا ظہور ہوا' وہ ایک بنگالی مسلمان شیخ علائی تھا' جو 935ھ (1528ء) میں بیانہ میں آباد ہو گیا۔ اس کی شہرت اسلام شاہ تک پہنچی تو اس نے اسے آگرہ بلوا بھیجا اور اگرچہ پہلے پہل اس نے ایک خطرناک مفسد کی حیثیت سے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا' مگر بادشاہ کی موجودگی میں علائی نے جس فصاحت و بلاغت کے ساتھ دنیا کی نمود و نمائش اور دنیاوی دولت کی بے ثباتی پر خطاب کیا' اس سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے نہ صرف شیخ کو معاف کر دیا' بلکہ شاہی طعام خانے سے اس کے لئے پکی ہوئی اشیائے خورد و نوش بھی روانہ کیں۔ تقریباً اسی دور میں شیخ مبارک مہدویہ فرقے سے وابستہ ہو گیا۔ چنانچہ دربار میں ایک بارسوخ جماعت یعنی سلطنت کے علمائے کرام اس کے مفادات کے سخت دشمن بن گئے۔ علمائے کرام کی اس جماعت کے سربراہ مولانا عبداللہ سلطانپوری المعروف مخدوم الملک تھے۔ بیس برس سے زائد عرصہ تک مبارک کو اذیت پہنچائی گئی' اس کی زمینیں ضبط کر لی گئیں اور اسے جان بچا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا' اس دوران اس کے بیٹے جوان ہو گئے اور انہوں نے اپنے اذیت رساؤں پر بساط کو الٹ دیا۔

اسلام شاہ کے دور حکومت کے آخری حصہ کے دوران مہدویہ رہنماؤں پر اذیت رسانی زور و شور سے جاری رہی۔ چنانچہ' ایک نیازی افغان اور سید محمد جونپوری کے مرید میاں عبداللہ کو بیانہ میں بادشاہ کے پاس بلوایا گیا' وہ معمول کے مطابق آداب محفل کا خیال رکھنے میں ناکام رہا' تو اسے بادشاہ کی موجودگی میں انتہائی بری طرح پیٹنے کے بعد مار کر زمین پہ پھینک دیا گیا۔ جس وقت شاہی پڑاؤ پنجاب میں تھا' شیخ علائی کو ایک ہم رکاب شخص نے بادشاہ کے حکم سے اس بری طرح کوڑے لگائے کہ اس کی گردن پر چند انتہائی شدید زخم پھٹ گئے اور شیخ علائی غشی کی حالت

میں ہلاک ہو گیا۔ اس کی لاش کو ایک ہاتھی کے پاؤں تلے روندا گیا اور یہ احکامات جاری کئے گئے کہ اس کو دفن نہ کیا جائے' تب ایک انتہائی تباہ کن طوفان اچانک نمودار ہوا تو لوگ بری طرح خوفزدہ ہو گئے' جب یہ طوفان تھما تو علائی کی لاش کو گلاب اور دوسرے پھولوں کے نیچے دبا ہوا پایا گیا۔ یہ واقعہ 957ھ (1550ء) میں رونما ہوا۔ اس کی تھوڑی دیر بعد اسلام شاہ کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی بادشاہت زوال پذیر ہو گئی۔

شیخ علائی کی موت مہدویوں کے لئے ایک شدید ضرب اور دربار کے علمائے کرام کی بہت بڑی فتح تھی۔ آگرہ میں اکبر کے دربار کے قیام کے بعد تک مہدویوں پر لعنت رسانی انتہائی زور شور سے جاری رہی۔ علماء کی جماعت (جن میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک نمایاں تھے) نے شیخ مبارک کے خلاف اکبر کے کانوں میں زہر گھول دیا اور کہا کہ اس کا تعلق بدعتیوں کے طبقہ سے ہے' وہ نہ صرف خود دغاباز ہے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔ کسی طرح بادشاہ کی اجازت حاصل کر کے انہوں نے مبارک کو پکڑ کر بادشاہ کے حضور پیش کرنے کے لئے پولیس کے افسران کو روانہ کیا۔ شیخ اور اس کے دونوں بیٹوں کو گھر میں نہ پا کر انہوں نے اس کے عبادت خانہ کے منبر کو اکھاڑ ڈالا۔

شیخ' فتح پور سیکری کی طرف فرار ہو گیا اور شیخ سلیم چشتیؒ (جو اس وقت اپنی شان و شوکت کے عروج پر تھے) سے گذارش کی کہ وہ اس کی بادشاہ کے ساتھ مصالحت کرا دیں: مگر محترم شیخ نے اپنے مریدوں کے ذریعے مبارک کو کچھ رقم بھجوائی اور اسے گجرات کی طرف روانہ ہونے کا مشورہ دیا۔ مبارک نے جب یہ دیکھا کہ شیخ سلیمؒ نے اس کی سلامتی کے سلسلہ میں کوئی دلچسپی نہیں لی' تو وہ آگرہ کی طرف لوٹ گیا' جہاں وہ پناہ حاصل کرنے کے لئے اپنے ایک دوست کے گھر گیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے' وہ دوست مایوسی اور خوف کی حالت میں اٹھا اور مبارک کو مکان کے ایک اندھیرے اور چھوٹے سے اندرونی کمرے کی طرف لے گیا' جس میں وہ اپنے بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ دو روز تک رہا' اس دوران انہیں بہت زیادہ وقت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار دوست نے اپنے بن بلائے مہمانوں سے سرد مہری کا اظہار شروع کر دیا' جو اب یکے بعد دیگرے دوسرے سے تیسرے دوست کے مکان میں منتقل ہوتے رہے' ان میں سے ہر ایک نے انہیں ایک یا دو دن ٹھہرانے کے بعد نکال باہر کیا۔ وہ آگرہ سے فرار ہو کر ایک گاؤں میں چلے گئے' جہاں ایک دوست زمیندار نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس وقت بادشاہ آگرہ میں تھا: فیضی فتح پور سیکری گیا اور وہاں اپنے والد کے چند دوستوں کو آمادہ کیا کہ وہ اس کی طرف سے بادشاہ سے گذارش کریں۔ مبارک اود ابوالفضل گاؤں میں ایک ماہ تک رہنے کے بعد آگرہ

کی طرف لوٹ آئے اور ایک دوست کے مکان میں روپوش ہو گئے۔

شیخ مبارک کی طرف سے دربار میں اس کے دوستوں کی گذارشات نے الٹا اثر دکھایا۔ شیخ کے خلاف بادشاہ کا قہر و غضب دوبارہ عود کر آیا۔ جن لوگوں نے مداخلت کی تھی' انھیں اس نے سخت سزا دی اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: "تم کیا سمجھتے ہو میں اس کے حالات سے بے خبر ہوں؟ میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے۔ مگر تم نہیں جانتے کہ علماء نے اس کے خلاف فتویٰ دے دیا ہے' اس لئے میں ان کے حکم کے خلاف کسی قسم کے احکامات جاری کرنے سے قاصر ہوں۔"

مذکورہ بالا واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مبارک اور اس کے بیٹوں کے عروج سے پہلے اکبر کو علمائے کرام سے کس قدر وابستگی تھی۔ لیکن انہوں نے عروج حاصل کر کے ترازو کے پلڑے کو اپنے حق میں جھکا لیا تھا اور اکبر کے ذہن کو اس حد تک تبدیل کر کے علماء پر انتہائی کاری ضرب لگائی کہ اس کے نتیجہ میں وہ زوال سے دوچار ہو گئے۔

جب دربار کی خبریں مبارک تک پہنچیں' تو وہ دوبارہ اپنی جان بچانے کے لئے آگرہ سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے بادشاہ کے ملازم ایک امیر کے ہاں پناہ حاصل کی' جو دارالخلافہ سے چند میل کے فاصلہ پر پڑاؤ میں کچھ دیر پہلے آیا تھا اور اسی کی دوستی پر اس نے کچھ اعتبار کیا۔ مفرور (باپ اور بیٹے) رات کے وقت امیر کے پڑاؤ میں پہنچے۔ دربار کے امور کی نوعیت سے بے خبری میں اس نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا: مگر تین روز کے بعد جب اسے معاملات کی نوعیت کا پتہ چلا تو اس نے دوغلا رویہ اختیار کر لیا۔ ایک صبح اپنے بن بلائے مہمانوں کو کسی قسم کی اطلاع دیئے بغیر وہ اپنے پڑاؤ سے چلا گیا اور اس کے نوکروں نے خیمے اتارنے شروع کر دیئے۔ مبارک اور اس کے بیٹے جس خیمے میں ٹھہرے ہوئے تھے' اسے بھی نیچے گرا کر خچروں کی پشت پر لاد کر لے گئے' جبکہ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے چٹیل میدان پہ بیٹھے رہ گئے۔ باپ بیٹے پیدل ایک گاؤں کی طرف گئے' مگر انھیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں ان کا ایک دشمن موجود تھا' لہٰذا اگر وہ ان کی آمد سے باخبر ہو جاتا تو انھیں فوراً پکڑ سکتا تھا۔ زندگی سے تنگ آ کر وہ ایک اور دیہات میں چلے گئے' مگر انھوں نے وہاں بھی خود کو بن بلایا ہی پایا۔ چنانچہ' رات کے وقت وہ آگرہ کی طرف لوٹ گئے اور ایک دوست کے ہاں پناہ لی' جس نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ وہ اس کے مکان میں دو ماہ تک مقیم رہے' اس دوران دربار میں ان کے دوستوں نے ان کی طرف سے بادشاہ کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے مناسب مواقع ڈھونڈ لئے۔ اکبر کے دودھ شریک بھائی خان اعظم مرزا کوکہ نے ان کی بہت زیادہ حمایت کی' اس نے بادشاہ کے ذہن سے تمام شکوک و شبہات ختم کر دیئے اور اس کے غصہ کو کسی حد تک کم کر دیا۔

وہ اس حد تک راضی ہو گیا کہ اس نے شیخ مبارک کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دے دیا۔ شیخ مبارک اپنے بیٹے فیضی کے ہمراہ دربار کی طرف روانہ ہوا' اور بادشاہ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ابوالفضل ابھی تک بہت کمسن تھا' اس لئے اس کا تعارف بادشاہ سے نہ کرایا جا سکا۔ اکبر نے بڑے اعزاز سے شیخ مبارک کا استقبال کیا اور انتہائی شفقت آمیز گفتگو کی۔ اس وقت سے مبارک نے صوفی فرقہ اختیار کر لیا اور چشتی مسلک کا پیروکار ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ جب دربار دھلی میں تھا' وہ دھلی کے مشہور اولیائے کرام خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزارات پر باقاعدگی سے حاضری دیتا تھا: ہو سکتا ہے' یہ سب کچھ محض حکمت عملی کے تحت ہو' کیونکہ مبارک کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ وہ باقاعدگی سے دربار میں حاضری دیتا' ایک مرتبہ حاضری پر اس نے ابوالفضل کو بادشاہ سے متعارف کروایا' جو نوجوان عالم کے خطاب اور اس کی گفتگو میں زبردست ذہانت کے اظہار سے بہت متاثر ہوا۔ اس وقت سے اکبر نے مبارک اور اس کے بیٹوں کو بہت زیادہ عزیز رکھنا شروع کر دیا اور ان کے لئے اس کا احترام بڑھ گیا۔ ابوالفضل مصائب و آلام میں پروان چڑھا تھا' اس لئے اس نے شائستگی اور تحمل مزاجی کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ وہ لکھتا ہے: "میں نے پروردگار کی قسم کھائی تھی کہ اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لوں گا' بلکہ درگذر کرتے ہوئے ان کے برے کاموں کو فراموش کر دوں گا۔" اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ آخری دم تک اپنے الفاظ پر قائم رہا۔ اسے سلطنت میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز کیا گیا اور اسے بادشاہ کے اعتماد کا انتہائی قیمتی استحقاق بھی حاصل تھا' اسی لئے وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا تھا۔ جب مذہبی اجلاسوں میں گرما گرم الفاظ استعمال کئے جاتے تو اس کی تقاریر معتدل ہوا کرتی تھیں اور وہ خود اعتمادی کو کبھی ختم نہیں ہونے دیتا تھا۔ آئین اکبری' اکبر نامہ اور اس کے مشہور منشیات (یا خطوط) میں ایسے کئی قطعات ہیں' جن میں اس نے مذہبی اختلافات کے موضوع پر بحث کی ہے: مگر اپنے خاندان کے بدترین دشمنوں' مثلاً شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک (جنھوں نے انھیں اذیت پہنچائی' ان پر تباہی مسلط کی اور سب کچھ کرنے کے علاوہ اس کے باپ کو مار ڈالا) کے لئے اس نے نرم زبان استعمال کی ہے اور ان کے کاموں پر بحث کرتے ہوئے کبھی بھی جائز تنقید کی حدود سے متجاوز نہیں ہوا۔ ابوالفضل کس قدر بلند نظر تھا' اس کا اندازہ اس صورت حال سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی عظیم تصنیف اکبر نامہ میں ان اشخاص کی جلاوطنی کا ذکر کرتے ہوئے بلاواسطہ طور پر بھی اشارۃً اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے کوئی لفظ استعمال نہیں کیا۔

ابوالفضل کی خصوصیات: چودہ برس کی ابتدائی عمر میں اس میں ذہنی قابلیت کی ترقی کی

علامات کا اظہار ہو گیا تھا۔ اس نے معقول و منقول (یعنی عقل اور شہادت پر مبنی) کے نام سے مشہور علم و حکمت کی شاخوں کے نصاب میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ اپنے باپ کی طرح اس نے بھی اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز بیس سال کی عمر میں درس و تدریس سے کیا۔ اس کی غیر معمولی ذہانت کے سلسلہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے' کہ مشہور شاعر اصفہانی کا مرتب کردہ ایک انتہائی نادر قلمی نسخہ کئی پھٹی حالت میں اس کے حوالے کیا گیا' ہر صفحہ کا نصف حصہ عمودی شکل میں اوپر سے لے کر نیچے تک بہت سی جگہوں پر مٹا ہوا یا جلا ہوا تھا اور ان میں موجود قطعات یا تو مکمل طور پر غائب یا ناقابل فہم تھے' ابوالفضل نے دانشمندی اور مہارت (جو اسی کے لئے مخصوص تھی) سے کام لیتے ہوئے اس قدر صحت اور درستگی کے ساتھ ہر صفحہ کی آدھی سطروں پر مشتمل قطعات کو درست کر دیا کہ جب کئی ماہ بعد اس تصنیف کی ایک مکمل نقل تیار کی گئی تو موازنہ کرنے پر اس قدر حیران کن مماثلت پائی گئی' کہ ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے مصنف نے زندہ ہو کر بذات خود اپنی یادداشت سے اس قلمی نسخہ کو ازسرنو تحریر کیا ہو۔ اس کے دوست بھی اس نوجوان عالم کی تیز فہمی' زیرکی اور صحت سے کچھ کم حیران نہیں تھے۔

ابوالفضل تعلیم کے حصول میں کچھ اس قدر کھو گیا تھا کہ بیرونی دنیا کے متعلق ذرا کم ہی سوچتا تھا اور درباری امور سے لاتعلق تھا' جہاں اس کے باپ کے بے شمار دشمن موجود تھے۔ آخر کار جب اکبر نے فیضی کو دربار میں شرکت کرنے کی دعوت دی' تو موخر الذکر نے اپنے بھائی کو نصیحت کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ وہ دربار شاہی میں اپنے خاندان کے مفادات کا خیال رکھا کرے' یوں ابوالفضل گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کے خیال کو ترک کرنے پر رضامند ہو گیا۔ عمر کے سترھویں (17) برس اس کے ذہن میں تبدیلی واقع ہو گئی' یوں اس نے اپنے سابقہ رہن سہن سے یکسر مختلف طرز زندگی اپنا لیا۔ دربار میں اپنے پہلے تعارف پر ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتا ہے' "ان دنوں (دور حکومت کے انیسویں برس یا 1574ء) خوش قسمتی سے مجھے بادشاہ کے حضور حاضری دینے کے لئے مدعو کیا گیا اور اس کے ساتھ ملاقات کرنے کا شرف بھی بخشا گیا۔ اس کے کوائف مختصراً یہ ہیں: "چندرہ برس کی عمر تک میں اپنے والد کی اتالیقی میں رہا اور حکمی (فلسفہ) اور نقلی (روایت) کے نام سے مشہور مروجہ علوم کی شاخوں میں دسترس حاصل کی۔ اگرچہ دانشمندی کا دروازہ میرے اوپر کھل گیا تھا اور میں غوروخوض کے قوانین کا عادی ہو چکا تھا' مگر بدقسمتی کے باعث میں خود پسند اور مغرور ہو گیا اور گوشہ نشینی کی زندگی کو ترجیح دی۔ میرے ارد گرد جمع ہونے والے شاگردوں نے میری علمی شیخی میں اضافہ کیا: ڈھٹائی اور بے عقلی نے میرے اوپر اس قدر غلبہ پا لیا تھا کہ میں گوشہ نشینی اور تنہائی کے تصور سے سرشار رہنے لگا۔ اگرچہ

میرے دن طلباء کو علم پڑھانے میں بسر ہوتے تھے، مگر میں رات کے وقت ویرانے میں چلا جاتا اور وہاں حق کے متلاشی لوگوں کی صحبت کا لطف اٹھاتا اور ان لوگوں سے فائدہ حاصل کرتا تھا جو اگرچہ خالی ہاتھ تھے، مگر ذہن اور قلب کے لحاظ سے بہت مالا مال تھے۔ نام نہاد علماء کے مناظروں اور جھوٹے دعویداروں کے اختلافات نے میری حیرت اور نفرت کو ہوا دی۔ نہ تو مجھ میں چپ رہنے کی طاقت اور نہ ہی بولنے کی خواہش تھی۔ اگرچہ میرے والد کے مفید مشورہ نے مجھے انتشار دماغی کے اظہار سے روک دیا تھا، مگر میرے پر آشوب دماغ پر عقلی علاج ناکام ہو گیا۔ بعض اوقات میرا ذہن ختا (شمالی چین) کے فلسفیوں کی طرف چلا جاتا، دوسرے موقعوں پر لبنان کی تصانیف کی طرف؛ بعض اوقات محسوس کرتا کہ میں تبت کے لاماؤں کے ساتھ بحث مباحثہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؛ بعض اوقات خیال کرتا کہ میں پرتگال کے عیسائی پادریوں کے ساتھ ملاقات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؛ بعض اوقات مجھ میں فارس کے آتش پرستوں کے ساتھ رہنے کی خواہش پیدا ہو جاتی؛ بعض اوقات میں محسوس کرتا کہ زند او ستا کے علماؤں کا مشورہ لینے کے لئے بے چین ہوں۔ میں اپنے وطن کے علماء کی صحبت سے بیزار ہو گیا۔ میرے والد، بھائیوں اور دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آگرہ جا کر دربار شاہی میں حاضری دوں کیونکہ بادشاہ کے ساتھ ملاقات مجھے میری بہت سی پریشانیوں سے نجات دلا دے گی۔ پہلے پہل تو میں نے ان کی نصیحتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا، مگر آخر کار رضامند ہو گیا اور قلعہ آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا، وہاں بادشاہ سے ملاقات کرنے کی سعادت حاصل کی۔ نذرانہ کے طور پر قیمتی اشیاء نہ ہونے کے باعث میں نے بادشاہ سلامت کے سامنے قرآن پاک کی آیت الکرسی کی تفسیر بطور نذرانہ پیش کی۔ اس نذرانہ کو کمال مہربانی سے قبول کر لیا گیا اور میرا مناسب استقبال کیا گیا۔ پس یوں میں پہلی مرتبہ دربار سے متعارف ہوا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کس خوش اخلاقی اور ملنساری کے ساتھ میرا استقبال کیا گیا اور بادشاہ سلامت نے اتنی بے تکلفانہ اور مشفقانہ گفتگو میرے ساتھ کی کہ اس نے مجھ پر جادو کا سا اثر کیا اور میرے ذہن میں پیار و محبت کا ایک ایسا گہرا تاثر پیدا کیا، جو میں ہمیشہ ان کے لئے اپنے دل میں رکھتا تھا۔"

اس کے کچھ ہی دیر بعد (1575ء) بادشاہ مشرقی بنگال اور بہار کو تسخیر کرنے کے لئے اپنی عظیم مہم پر کربستہ ہوا۔ فیضی شاہی پڑاؤ کے ہمراہ تھا، جبکہ ابوالفضل آگرہ میں ٹھہرا۔ بادشاہ نے پڑاؤ میں فیضی سے ابوالفضل کے بارے میں دریافت کیا، جب بادشاہ فتح پور سیکری کی طرف لوٹا، تو وہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہو گیا۔ فتح پور سیکری کی جامع مسجد میں بادشاہ نے اس پر جس طرح دھیان دیا اور اسے سورۃ فتح کی تفسیر پیش کی گئی، اس کے بارے میں فتح پور سیکری کے بیان میں

بتا دیا گیا ہے۔(139)

بنگال سے بادشاہ کی واپسی کے فوراً بعد جمعرات کی شام کو یادگار مذہبی مناظرے منعقد کئے جاتے' جن میں بادشاہ بھی نمایاں حصہ لیتا تھا۔ بادشاہ کی جماعت کا سربراہ ابوالفضل تھا' جو علماء کے اتحاد کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا' وہ اب آپس میں بٹ گئے تھے۔ ابوالفضل نے اس قدر مہارت کے ساتھ جھگڑوں کو ایک سے دوسرے نکتہ تک منتقل کیا کہ یہ اختلافات اپنے عروج پر پہنچ گئے۔ اسی دور میں اکبر کو دنیاوی طاقت کے علاوہ روحانی اختیار اپنانے کی طرف راغب کیا گیا' اس کے لئے شیخ مبارک کی تحریر شدہ مشہور دستاویز کا نفاذ کیا گیا' جس میں مجتہد کا منصب بادشاہ کو تفویض کیا گیا اور مذہب کی طاقت "عادل بادشاہ" کی شخصیت میں مرکوز کر دی گئی تھی۔ صرف اسی کے پاس قانون سازی کا اختیار رکھا گیا اور دین کے علمائے کرام اور قضہ و مفتی حضرات اسی کے فیصلے کے پابند رکھے گئے۔ ابوالفضل کہتا ہے۔ "مذکورہ دستاویز شاندار نتائج کے لئے سود مند ثابت ہوئی ——— (1) دربار تمام فرقوں اور قومیتوں کے علمائے کرام اور دانشوروں کا مسکن بن گیا (2) ہر ایک کو امن و امان فراہم کیا گیا تھا اور مکمل رواداری موجود تھی (3) بادشاہ کے بے غرض محرکات' جن کی کوششوں کا رخ سچ کی تلاش تھا' واضح ہو گئے اور علم و فضل کے دعویدار شرمندہ ہو گئے۔"

اب ان دونوں بھائیوں کو بادشاہ کی گہری دوستی کا استحقاق حاصل تھا: اس کو ان پر مکمل بھروسہ تھا۔ اس دور میں شہزادگان کی اتالیقی کو ایک انتہائی قابل بھروسہ اور امتیازی عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ فیضی کو کس قدر اعتماد حاصل تھا' اس کا اندازہ اس صورت حال سے لگایا جا سکتا ہے کہ دور حکومت کے 24 ویں برس (1579ء) میں جب قطب الدین خاں بہاری کو ولی عہد شہزادہ سلیم کا اتالیق مقرر کیا گیا تو فیضی کو شہزادہ مراد (جو اس وقت آٹھویں برس میں پہنچ گیا تھا اور حال ہی میں طویل علالت سے صحت یاب ہوا تھا) کی تعلیم کے لئے اسی عہدے پر مقرر کیا گیا۔ قطب الدین خاں شاہی خاندان کا ایک پرانا اور آزمایا ہوا نوکر تھا' شہزادہ مراد کے اتالیق کے عہدہ پر فیضی کے تقرر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے بادشاہ کے بہت زیادہ اعتماد میں لے لیا گیا تھا: جیسے وہ بھی خاندان کا پرانا نوکر ہو۔ اگر اپنی خدمات کے صلہ میں قطب الدین خاں کو بیگلر بیگی (140) کا خطاب عطا کیا گیا' تو دو سال کے بعد فیضی کو بھی آگرہ' کالپی اور کالینجر کے صدر کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔ سال 1585ء کے آغاز میں ابوالفضل کو ہزاری کے منصب پر ترقی دے دی گئی اور اس سے اگلے برس صوبہ دہلی کا دیوان مقرر کیا گیا۔

1589ء کے اختتام کے قریب ابوالفضل کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اکبر نامہ میں

مندرجہ ذیل سادہ نظموں کو درج کیا ہے' جن میں اس موقع پر اس کے انتہائی رنج والم کا اظہار کیا گیا ہے:-

جون مادر من بزیر خاک است گر خاک بسر کنم چہ باک است
دانم کہ بدین شعب نوائی زانجا کہ تو رفتہ نیائی
لیکن چہ کنم کہ ناشکیم خود راب بہانہ مے فریبم۔

ترجمہ: چونکہ میری ماں زیر خاک دفن ہے اس لئے اگر میں (غم کے ہاتھوں) اپنے سر پر خاک ڈالوں تو کیا ہرج ہے۔ میں جانتا ہوں کہ واویلا مچانے اور شوروغوغا کرنے سے وہ اس مقام سے واپس نہیں آ سکتی' جہاں چلی گئی ہے' مگر میں کیا کروں؟ میرے ذہن کو سکون نہیں ملتا' بہانہ بنانے کے لئے میں نے خود کو دھوکہ دے لیا ہے۔"

اپنے دوست کو تسلی دینے کے لئے اکبر اس سے تعزیت کرنے گیا اور اس طرح اس سے خطاب کیا۔

اگر جہانیان طراز پایندگی داشتے و جز یکے پائی نیستی نسپر دے دوستان شناسا دل را از رضا و تسلیم گزیر نبود - ہرگاہ دریں کاروان سرا ہیچکس دیر نماند کوحش ناشکیبائی را کجا اندازہ بر توان گرفت۔

ترجمہ: اگر اس جہان کے لوگوں کو ہمیشہ کی زندگی عطا کر دی جاتی اور وہ جلد یا بدیر نہ مرتے تو دوستان شناسا دل اس کی تسلیم و رضا سے واقف نہ ہو سکتے' اس لحاظ سے اس دنیا کے کارواں سرائے میں کسی کو ہمیشہ کی زندگی عطا نہیں کی گئی' سوائے تسلی کے دکھی کے لئے کچھ نہیں چھوڑا گیا۔"

ابوالفضل لکھتا ہے: "اس دانشمندانہ نصیحت نے میرے ذہن پر گہرا اثر مرتب کیا اور وہ دکھ سے آزاد ہو گیا۔"

اسی دور میں بادشاہ کے زیر اہتمام ادبی مہمات کا آغاز کیا گیا' چنانچہ' شیخ فیضی نے ریاضی پر ایک ہندی تصنیف لیلی وتی کا فارسی میں ترجمہ کیا' اسے مہابھارت کے چند ابواب کا ترجمہ کرنے کا کام بھی سونپا گیا تھا۔ اس نے مثنوی لیلیٰ مجنوں کی بحر میں نل اور دمن کی محبت کے بارے میں ہندی کہانی کا اوزانی ترتیب میں ترجمہ کیا۔ اسے 1003ھ (1594ء) میں تحریر کیا گیا اور یہ تقریباً 4'200 اشعار پر مشتمل تھی' بدایونی کے مطابق' فیضی نے پانچ ماہ کے قلیل عرصہ میں اس قابل ستائش تصنیف کو مرتب کیا۔ مصنف نے چند اشرفیوں کے ساتھ یہ باشاہ کو پیش کی' بادشاہ اس

سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے نقیب خاں کو مقرر کیا کہ وہ اسے یہ پڑھ کر سنائے۔ ابوالفضل نے عیار دانش کے زیر عنوان کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کیا۔

1592ء کے آغاز میں ابوالفضل کو دو ہزار سواروں کے کمانڈار کے منصب پر ترقی دے دی گئی۔ اب اس کا تعلق سلطنت کے عظیم امراء سے تھا۔ اسی برس کے دوران شیخ فیضی کو دکن میں برہان الملک اور خاندیس کے راجہ علی خاں کے درباروں میں اقتدار اعلیٰ کے مختار کل کی حیثیت سے روانہ کیا گیا۔ مگر اس کا چھوٹا بھائی دربار ہی میں حاضر رہا۔

اس مشہور دستاویز کی اشاعت کے بعد مبارک نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی؛ مگر جس وقت شاہی پڑاؤ لاہور میں تھا' بادشاہ نے اسے بلوا بھیجا۔ شیخ اس وقت انتہائی ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ اس نے شاہی پڑاؤ میں حاضری دی' مگر تھوڑے عرصہ بعد اس کی صحت بگڑ گئی اور وہ سات روز تک بیمار رہا۔ ابوالفضل اپنے باپ کے آخری لمحات کے وقت اس کے پاس موجود تھا۔ بوڑھے مبارک نے اپنے بیٹے کو چند نصیحتیں کیں اور مکمل ہوش کی حالت میں اپنی آنکھیں بند کیں اور انتقال کر گیا۔ وہ نوے برس کی عمر میں 17 ذ-حقعد 1001ھ بروز اتوار (یا 4 ستمبر 1593ء) میں فوت ہوا۔ اپنی زندگی کے خاتمہ کے قریب اس نے گوشہ نشینی میں زندگی بسر کی۔ زندگی کے آخری سال اس نے قرآن پاک کی تفسیر لکھنے میں گزارے' جسے اس نے منبع و نفایس العیون کا نام دیا اور اسے اپنی موت سے قبل بگڑتی ہوئی صحت اور ضعیف بصارت کے باوجود مکمل کیا۔ اس نے سات سو اشعار پر مشتمل قصیدہ فرضی' قصیدہ بردہ' کعب بن زبیرؓ کا قصیدہ اور قادر مطلق کی شان میں دیگر مقدس قصیدے زبانی یاد کر لئے تھے اور روزانہ کے خطبات میں انھیں پڑھتا تھا۔ (141) اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بہترین مسلمان کی طرح فوت ہوا۔

دو سال کے بعد ابوالفضل اپنے بڑے بھائی فیضی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ 1595ء کے موسم خزاں میں لاہور میں بیمار پڑا اور اس کی شکایت بڑھ کر سکتے کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کی بیماری دو ماہ تک رہی اور موت سے تین روز پہلے وہ بے ہوش رہا۔ البدایونی لکھتا ہے کہ فیضی نے آخری لمحات تک اسلام کو رو کیا۔ مورخ لکھتا ہے "اس کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جان کنی کے عالم میں اسے کتے کی طرح بھونکتے ہوئے سنا گیا۔ چونکہ وہ متعصب اور اسلام پر یقین نہ رکھنے کے باعث ملحد ہو چکا تھا' اس لئے اس نے نیم غشی کی حالت میں بھی سچے دین کے رہنماؤں کے ساتھ خلاف شرع اور بیہودہ انداز میں بات کی' آخر کار وہ خاموش ہو گیا اور اپنے اصل ٹھکانے کی طرف چلا گیا۔"

اس کی تاریخ وفات ان الفاظ میں دریافت کی گئی:

وے فلسفی و شیعی و طبعی و دھری

ترجمہ: وہ ایک فلسفی، فرقہ پرست، عقلیت پسند اور دھریہ تھا۔
ایک اور تاریخ ان الفاظ میں دریافت ہوئی:-
قاعدہ الحاد شکست

ترجمہ: کفر کا ادارہ ٹوٹ گیا ہے۔
جب وہ جان کنی کے عالم میں تھا، تو بادشاہ نصف شب کے وقت اس کے پاس گیا اور اپنے ہاتھوں سے اس کا سر آہستگی سے اٹھا کر کئی مرتبہ اسے پکارا، "شیخ جیو! شیخ جیو! میں حکیم علی کو اپنے ساتھ لایا ہوں، تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟" چونکہ وہ بے ہوش تھا، اس لئے کوئی جواب یا آواز نہ آئی۔ بادشاہ نے دوبارہ اسی سوال کو دہرایا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس پر بادشاہ پر رنج و الم کا غلبہ ہو گیا اس نے اپنی دستار پھاڑ کر زمین پر پھینک دی۔ شیخ ابوالفضل سے تسلی کے چند الفاظ کہے اور واپس چلا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد فیضی کے انتقال کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ واقعہ 5 اکتوبر 1595ء کو رونما ہوا۔ اکبر نامہ میں درج اپنے بھائی کے انتقال کے بارے میں ابوالفضل کا بیان مورخ بدایونی کے بیان کے مقابلہ میں قدرتی طور پر زیادہ موزوں ہے۔ ابوالفضل کے مطابق، "جب بادشاہ نے فیضی کو اس کے آخری لمحات میں پکارا، تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور مایوسی کی حالت میں بادشاہ کو دیکھا مگر کچھ نہ بول سکا۔" (142)
اب ابوالفضل کو اڑھائی ہزاری منصب پر ترقی دے دی گئی۔ مگر دربار میں اس کے بہت سے دشمن تھے اور وہ یہ دیکھنے کو بے چین تھے کہ اسے دکن جیسے کسی دور دراز علاقہ میں کسی عسکری مہم پر بھیج دیا جائے، اس بات کا امکان ہے کہ وہ اس مہم کا ٹھیک طرح سے انتظام نہیں کر سکے گا، یا اس کے بندوبست کے سلسلہ میں کم مہارت دکھائے گا، تو بادشاہ کی ناراضگی مول لے گا۔ مگر ابوالفضل کے اپنے الفاظ میں، "اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے اکبر کو کبھی بھی دھوکہ نہیں دیا تھا اور جب بھی بادشاہ کو اس سے دریافت کرنے کا موقع ملتا، تو وہ دوسروں کے بارے میں جو کچھ جانتا، ایمانداری سے بادشاہ کے گوش گذار کر دیتا تھا۔" اسی چیز نے اسے دربار میں غیر مقبول بنا دیا تھا: نیز، ولی عہد شہزادہ سلیم بھی مخالف دھڑے سے تعلق رکھتا تھا۔ دور حکومت کے 43 ویں برس کے اختتام کے قریب (1597ء) ابوالفضل کو پہلی مرتبہ ایک اہم فرض ادا کرنے کے لئے روانہ کیا گیا۔ اسے دکن کی طرف بھیجا گیا، جہاں بادشاہ کے دوسرے بیٹے شہزادہ مراد نے خان خاناں مرزا عبدالرحیم کی مدد سے ایک فوج جمع کر لی تھی۔ اس کی ہدایات یہ تھیں کہ اگر دکن

کے امیر اس ملک کی حفاظت کا بیڑا اٹھائیں تو ابوالفضل شہزادے کو دربار میں لے آئے۔ اگر نہیں تو وہ شہزادے کو دربار روانہ کر کے خود بادشاہ کے داماد شاہ رخ مرزا (143) کی زیر قیادت افواج کی کمان کے سلسلہ میں دکن میں رہے۔۔۔۔۔۔ تاہم' شہزادہ دولت آباد سے بیس کوس کے فاصلہ پر واقع پرنا کے کنارے پر 1066 (1597ء) میں کثرت شراب نوشی کے باعث انتقال کر گیا۔ ابوالفضل برہانپور پہنچا' جہاں خاندیس کے بادشاہ بہادر خاں (جس کے بھائی کی شادی ابوالفضل کی بہن سے ہوئی تھی اور وہ دکن میں ان کی جنگ میں شاہی فوج کی مدد کرنے سے انکاری تھا) نے وزیر کو ایک قیمتی تحفہ بھیج کر رشوت دینے کی کوشش کی۔ تاہم' ابوالفضل نے یہ کہتے ہوئے اس سے انکار کر دیا کہ اس پر بادشاہ کی عنایات کی بارش نے دوسرے لوگوں سے تحائف وصول کرنے کی ہر قسم کی خواہش کو ختم کر دیا ہے۔ جب بادشاہ کے تیسرے بیٹے شہزادہ دانیال کو احمد نگر کی کمان پر مقرر کیا گیا تو ابوالفضل اکبر کی درخواست پر مرزا شاہ رخ سے رخصت ہوا اور بادشاہ بذات خود اب میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا تو ابوالفضل بیجاگڑھ کے نزدیک خرگن کے مقام پر اس سے ملا۔ اکبر نے مندرجہ ذیل شعر کے ساتھ اس کا استقبال کیا:

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے تا باتو حکایت کنم از ہر بابے

ترجمہ: "جب میں تم سے خوشی کے ساتھ مختلف موضوعات پر بات کرتا ہوں' تو رات مبارک اور چاندنی خوش آئند ہوتی ہے۔"

ابوالفضل کا منصب بڑھا کر چار ہزاری کر دیا گیا۔ اس نے جنگ میں اپنی شجاعت کا لوہا منوایا اور اپنے بادشاہ کی ستائش وصول کی۔

دریں اثناء' شہزادہ سلیم (جسے راجہ مان سنگھ کے ساتھ بطور نائب اودھے پور کے رانا کے خلاف روانہ کیا گیا) نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے الہ آباد میں بادشاہت کا اعلان کر دیا' خزانے پر قبضہ کر لیا (جو 300,000 سٹرلنگ پاؤنڈ پر مشتمل تھا) اور اپنے نام کے نقرئی و طلائی سکے مضروب کرائے۔ اکبر جو برہانپور سے آگرہ کی طرف لوٹ گیا تھا' اپنے بیٹے کے رویہ پر مشتعل ہو گیا' اس نے اپنے واحد قابل اعتماد نوکر ابوالفضل کو بلوا بھیجا۔ وزیر اپنے بیٹے عبدالرحمان کو اپنی افواج کا انتظام سونپ کر اور شہزادہ دانیال سے رخصت لے کر دو یا تین سو سواروں کے ہمراہ آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ شاہ سلیم یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ابوالفضل اس کے مفادات کا کس قدر دشمن ہے چنانچہ بغیر کسی وجہ کے اسے یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ اس موقع پر دربار شاہی میں اس کی موجودگی اس کے لئے مضر ہو سکتی ہے اور اس کا والد اس کے خلاف مزید مشتعل ہو جائے گا' اس لئے اس نے دارالخلافہ کی طرف جاتے ہوئے وزیر کو قتل کرنے کے

ذرائع ڈھونڈنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ' اس نے ارچھ کے ایک بندیلہ سردار راجہ بیر سنگھ (جس کے علاقہ سے ابوالفضل نے گذرنا تھا) کو اس کا راستہ روک کر ہلاک کرنے کے لئے اکسایا اور اس خدمت کے صلہ میں اسے چند ہزار سواروں کی کمان کے ساتھ ایک بہت بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا۔ راجہ نے گوالیار سے تین یا چار کوس کے فاصلہ پر ایک ہزار سوار اور تین ہزار پیادہ فوج تعینات کر دی اور گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ ابوالفضل نے بے خبری میں بیر سنگھ کے علاقہ میں اپنا سفر جاری رکھا۔ اجین کے مقام پر اسے سلیم کے ارادوں سے آگاہ کر دیا گیا' مگر اس نے کہا' دارالخلافہ جانے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ نروار سے چھ کوس کے فاصلے پر سرائے بار کے قریب راجہ کی فوج کے سامنے آ گیا۔ اس آخری لمحہ میں اس کے ایک پرانے بااعتماد نوکر گدائی خاں (ایک پٹھان) نے اسے مشورہ دیا کہ اپنا راستہ کاٹ کر انتاری کی طرف چلا جائے' جہاں رائے ریان اور سورج سنگھ کی قیادت میں تین ہزار شاہی فوج تعینات تھی' مگر بلند حوصلہ وزیر نے مراجعت کو اپنی جوانمردی کے لئے حقیر جانا۔ حفاظتی دستہ پر مشتمل مٹھی بھر سواروں نے آخری دم تک انتہائی بہادری سے اس کا دفاع کیا' مگر برتر تعداد کے سامنے بتدریج تھک ہار کر رہ گئے۔ ابوالفضل ایک قریبی درخت کے نیچے کھڑا خوفناک فسادیوں کے خلاف ایک سورما کی طرح لڑا' لیکن سپاہیوں کی برچھیوں سے اس کا جسم چھلنی ہو گیا۔ چنانچہ' زخموں سے چور ہو کر وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ اس کا سر تن سے کاٹ کر فتح کی نشانی کے طور پر شہزادہ کے پاس بھیجا گیا وہ اسے دیکھ کر خوش ہوا اور حکم دیا کہ اسے کسی گندی جگہ پر پھینک دیا جائے' جہاں یہ کافی عرصہ تک ایسے ہی پڑا رہے۔ یہ واقعہ بروز جمعہ' 4 ربیع الاول 1011ھ (12 اگست 1602ء) کو پیش آیا۔

جہانگیر اپنی تزک میں بے تکلفی کے ساتھ اپنے جرم کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے لئے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ دربار میں اس کے مفادات کے خلاف کام کرنے کی پاداش میں شیخ سے انتقام لیا گیا۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے' "اگرچہ' میرا باپ پہلے پہل بہت ناراض تھا' مگر اب میں کسی ناراضگی کے بغیر اس کے پاس جا سکتا تھا' اس نے آہستہ آہستہ مجھ سے مصالحت کر لی۔"

جب ابوالفضل کی موت کی خبر دربار میں پہنچی' تو بادشاہ کو آگاہ کرنے کے لئے کسی کو جرات نہ ہوئی۔ بڑے سے بڑا امیر اور ممتاز ترین وزیر بھی اس کے انتہائی پیارے دوست اور قیمتی مشیر کی موت کی بری خبر کے ساتھ بادشاہ تک جانے سے کانپتا تھا یا ایسا کرنے میں ہچکچاتا تھا۔ تیموری گھرانے کی اولاد میں کسی شاہی گھرانے کے شہزادے کی موت کا اعلان کرنے کے لئے ابھی تک ایک قدیم تاتاری رسم موجود تھی کہ اس کے وکیل کو بادشاہ سے متعارف کرانے کے لئے اس کی کلائی پر ایک نیلا رومال باندھ دیا جاتا تھا۔ اس رسم پر عمل پیرا ہو کر ابوالفضل کا وکیل اپنی کلائی

پر نیلا رومال باندھے بادشاہ کے سامنے پیش ہو گیا۔ اکبر نے محسوس کر لیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے دوست اور وزیر کی موت پر انتہائی دکھ اور رنج محسوس کیا۔ اس نے اپنے پیارے بیٹے کی موت کے مقابلہ میں اسے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اس نے کئی روز تک لوگوں سے ملاقات نہ کی۔ جب اس کے قتل کے کوائف سے بادشاہ کو آگاہ کیا گیا تو وہ بولا:

"اگر سلیم بادشاہ بننا چاہتا تھا' تو اسے چاہئے تھا اپنے باپ کو مار ڈالتا' مگر ابوالفضل کو چھوڑ دیتا۔" اور اس کے بعد مندرجہ ذیل شعر پڑھا:

شیخ ما از شوق بیحد چون سوے ما آمدہ

زاشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ

ترجمہ: جب ہمارا شیخ بے پناہ خلوص کے ساتھ ہمیں ملنے آیا' تو ہماری قدم بوسی کے اشتیاق میں وہ بے سروپا آیا۔"

بادشاہ نے بیر سنگھ کو سزا دینے کے لئے پتر داس اور راجہ راج سنگھ کو ایک فوجی دستہ کے ساتھ روانہ کیا' مگر ایک ہلکی سی جھڑپ کے بعد وہ جنگلوں کی طرف فرار ہو گیا۔ بعد میں دیگر فوجی دستے بھی روانہ کئے گئے ایک موقع پر بیر سنگھ زخمی ہو گیا اور بال بال بچا: مگر بادشاہ کا اپنا انجام قریب تھا۔ بادشاہ کے انتقال کے ساتھ ہی تمام خدشات دور ہو گئے۔ بیر سنگھ انتہائی بیباکی سے نئے بادشاہ کے سامنے پیش ہوا' جس نے اس کی خدمات کے صلہ میں انعام کے طور پر اسے اندچہ کی جاگیر عطا کی اور اسے تین ہزار سواروں کا کمانڈر مقرر کیا۔

ابوالفضل بلند کردار اور عظیم قلب کا حامل تھا۔ اس نے شاعری کے لئے کسی قسم کے خاص ذوق کا اظہار نہیں کیا' مگر اس کا انداز ترکیب انتہائی مخصوص ہے اور اسے باآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات خیالات کی پاکیزگی' تعصب سے مکمل آزادی' بلند اخلاقی تمنائیں اور صاف ستھرا ذوق ہیں۔ اس کی ضخیم تصانیف میں کوئی ایسا قطعہ نہیں مل سکتا' جس میں غیر جانبداری کے ساتھ کسی عیب کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ انداز انوکھا اور ممتاز ہے اور نوآموزوں کے لئے گرچہ مشکل اور پیچیدہ ہے مگر اس کا ایک اپنا حسن ہے۔ دلائل وزنی ہیں' موضوعات کے ساتھ انتہائی قابل تعریف حد تک معاملہ کیا گیا ہے' جو قاری کے ذہن کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اس باکمال مصنف کے لئے تعریف و توصیف کے جذبے سے اسے سرشار کر دیتے ہیں۔ اس کے اسلوب کی تہران کے دربار میں بہت زیادہ تعریف کی گئی اور بخارہ کے بادشاہ عبداللہ نے کہا' "وہ اکبر کی تلوار سے کہیں زیادہ ابوالفضل کے قلم سے خوفزدہ ہے۔"

ابوالفضل کی نجی زندگی کے بارے میں ماثرالامراء کا مصنف پروفیسر بلا خمین کے حوالہ سے

لکھتا ہے' "وہ سب کے ساتھ پر امن رہنا چاہتا تھا اور کبھی بھی کسی سے نامناسب بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے گھر میں گالم گلوچ' تنخواہوں کی بندش' جرمانے' نوکروں کی غیر حاضری جیسے مسائل موجود نہیں تھے۔ اگر وہ کسی شخص کا تقرر کرتا اور بعد میں اسے کار آمد نہ سمجھتا تو اسے سبکدوش نہیں کرتا تھا' بلکہ حتی المقدور اپنے پاس رکھتا تھا' کیونکہ وہ کہا کرتا تھا' اگر وہ اسے سبکدوش کرتا ہے' تو لوگ ایک غیر مناسب نمائندے کی تقرری کرتے وقت اس پر فہم و فراست کی کمی کا الزام لگائیں گے۔ جس روز سورج' برج حمل میں داخل ہوتا تو وہ اپنے پورے گھر کا معائنہ کرتا' فہرست کو اپنے پاس رکھ کر ذخیرہ کرتا اور گزشتہ سال کی کتابوں کو نذر آتش کر دیتا تھا۔ وہ اپنے پائجاموں کے سوائے' کپڑوں کی پوری الماری نوکروں کو دے دیتا' جنہیں اس کی موجودگی میں جلا دیا جاتا۔

"اس کی بھوک غیر معمولی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پانی اور ایندھن کے علاوہ وہ روزانہ بائیس سیر غذا استعمال کرتا تھا۔ اس کا بیٹا عبدالرحمان ایک سفارچی کی حیثیت سے میز پر بیٹھا کرتا تھا: طعام خانے کا نگران (جو ایک مسلمان ہوتا تھا) بھی خدمت پر مامور ہوتا' دونوں یہ دیکھتے کہ آیا ابوالفضل ایک میں سے دو مرتبہ اور ایک ہی کھانا کھائے گا۔ اگر وہ ایسا ہی کرتا تو وہی کھانا اگلے روز دوبارہ بھجوا دیا جاتا۔ اگر کوئی چیز بے ذائقہ معلوم ہوتی تو ابوالفضل اسے چکھنے کے لئے اپنے بیٹے کو دے دیتا اور وہ نگران کو دے دیتا' مگر اس کے بارے میں کوئی لفظ نہ کہا جاتا۔ جب ابوالفضل دکن میں تھا' تو اس کی میز کی عیاشی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ ایک بہت بڑے خیمہ (چہیل رواتی) میں روزانہ ایک ہزار عمدہ اور بہترین کھانے پیش کئے جاتے اور امراء میں بانٹ دیئے جاتے: نیز اس کے قریب ایک اور بہت بڑا خیمہ نصب کیا جاتا' جس میں سب کو کھانا کھلایا جاتا' چاہے وہ امیر ہو یا غریب: سارا دن کھچڑی (چاول اور دال کی) پکتی اور جو کوئی بھی مانگتا اسے پیش کی جاتی تھی۔" (144)

سلطنت میں اعلیٰ منصب پر فائز ہونے اور بادشاہ کا بہت زیادہ اعتماد حاصل ہونے کے باوجود ابوالفضل نے کبھی کسی خطاب کو قبول نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ تمام مسلمان مصنفین اس پر کافر ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور اسلام سے اکبر کے انحراف کو اس سے اور اس کے بھائی فیضی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے' اس کے باوجود اپنے عظیم آقا کے رہنما جذبے کے تحت رواداری اور آزادی کے ان اصولوں کے اعلان کا سہرا ان کے سر رہتا ہے' جس نے ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے ساتھ تمام فرقوں اور قومیتوں کے لوگوں کی مصالحت کرانے کے لئے خوش آئند نتیجہ برآمد کیا اور ان کو حکومت سے وابستہ کر کے اکبر کے دور حکومت کو مشرق میں مقامی

حکومت کی تاریخ کا ایک روشن ترین اور انتہائی خوشحال باب بنادیا۔

خان اعظم مرزا کوکہ نے ابوالفضل کی تاریخ وفات کو اس میں تلاش کیا:

یفعل اللہ ما یشاء و یحکم اللہ ما یرید　　تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید

"اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ نبی اللہ کی معجز نما تلوار نے باغی کا سر کاٹ دیا ہے۔"

لفظ باغی کے اعداد 1013 ہیں۔ لفظ باغی کا پہلا حرف ب ہے اور اس کے اعداد کی تعداد 2 ہے۔ چنانچہ' 1013 میں سے 2 کو منہا کرنے سے بقایا 1011 ابوالفضل کی وفات کا ہجری سال مہیا کرتا ہے۔ یہ مصرعہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کے طبقہ کی ابوالفضل کے خلاف نفرت کو ظاہر کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالفضل خان اعظم کے خواب میں آیا اور کہا: "میری تاریخ وفات الفاظ بندہ ابوالفضل میں پائی جاتی ہے' جس سے 1011 ہجری کا سال برآمد ہوتا ہے۔

ابوالفضل کی تصانیف:

ابوالفضل کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں: (1) آئین اکبری' جسے اس نے اکبر کے دور کے 42 ویں سال میں مکمل کیا (2) تین جلدوں میں اکبر نامہ جو دور حکومت کے 46 ویں برس تک اکبر کے ایک بیان پر مشتمل ہے (3) انشائے ابوالفضل' جو ابوالفضل کی طرف سے بادشاہوں اور راجگان کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں پرتگیزی پادریوں اور بخارہ و ایران کے بادشاہوں کو لکھے گئے دلچسپ خطوط شامل ہیں۔ ابوالفضل کے انتقال کے بعد اسے ابوالفضل کے بھانجے اور داماد عبدالصمد پسر افضل محمد نے یکجا کیا (4) عیار دانش' کلیلہ دمنہ کا ایک فارسی ترجمہ ہے (5) رسالۂ مناجات (6) جامع اللغات ایک تدوینی لغت ہے (7) کشکول' واقعات اور افسانوی داستانوں کا ایک مجموعہ ہے (8) قرآن پاک کی چند سورتوں کی تفسیر۔ اس نے سنسکرت کی تصانیف کے ترجمہ کے لئے جو کردار ادا کیا' اس کے بارے میں پہلے ہی حوالہ دیا جا چکا ہے۔

آئین اکبری کے اختتام پر اپنے سوانحی تذکروں میں ابوالفضل نے خود کو خوش قسمت قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کو شمار کیا ہے اور ان کے لئے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ اس نے ایک شکر گزار دل سے نکلنے والے اقرار کے طور پر ان تحفوں کا ذکر کیا ہے:۔

1- عالی نسب اور اعلیٰ گھرانہ۔

2- فضل و کرم اور امن کا دور۔ قدیم باشندے پرانے ادوار کے بادشاہوں کے عدل پر فخر

کرتے تھے' اگر میں بادشاہ کے لائے ہوئے دور یگانگت پر فخر کروں تو اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں۔

3- خوش قسمتی۔
4- باپ کی طرف سے اعلیٰ نسبی۔
5- ایک تندرست و توانا متناسب جسم۔
6- طویل عرصہ تک بادشاہ کی خدمت' جو اندرونی و بیرونی خطرات سے حفاظت کا سرچشمہ ہے۔
7- مدام صحت و تندرستی۔
8- رہنے کے لئے شاندار گھر۔
9- ذرائع معاش کے متعلق پریشانی سے مکمل آزادی۔
10- اپنے والدین کی خدمت کرنے اور انہیں خوش رکھنے کی روزانہ بڑھتی ہوئی خواہش۔
11- اپنے والد کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی مہربانی۔
12- بارگاہ الٰہی میں لجاجت۔
13- خدا کے پیارے بندوں کے لئے احترام۔
14- غیر متزلزل ثابت قدمی۔
15- مفید اور دلچسپ علم کی ہر شاخ پر لکھی گئی تصانیف پر مشتمل ایک وسیع و عریض کتب خانہ۔
16- اپنے والد کی دلی خواہش کہ میں اپنا وقت ضائع نہ کروں' بلکہ تحصیل علم میں صرف کروں۔
17- اہل بصیرت اور خوش مزاج دوست۔
18- سچ کو تلاش کرنے کی آرزو۔
19- شہنشاہ عالم (جہاں خدا[illegible]) کی خدمت۔
20- غرور اور خود پسندی سے گریز۔
21- سب کے ساتھ صلح و امن۔
22- خدا شناسی کے باعث اپنے آقا سے وفاداری۔
23- کسی کا ممنون ہوئے بغیر اور بلا کسی تگ و دو کے بادشاہ کے اعتماد اور سرپرستی کا حصول۔
24- فرض شناس اور عالم فاضل بھائی۔

25- ایک اچھے خاندان میں شادی۔
26- ایک فرض شناس بیٹا۔
27- ایک پوتا۔
28- اخلاقیات پر لکھی گئی کتابوں کے مطالعہ کا شوق۔
29- کسی انسان کا درست اندازہ۔
30- سچ بولنے کی عادت اور کسی شخص سے بدکلامی کرنے سے نفرت۔
31- دنیاوی امور میں عدم اعتماد۔
32- اس اہم تصنیف (آئین اکبری) کو لکھنے کی اہلیت۔

ابوالفضل نے ہر موضوع پر فصاحت و بلاغت کے ساتھ بحث کی ہے: مگر اللہ تعالیٰ کے عطیات کے متعلق اس کی تسلیم و رضا کو یہاں مختصراً" درج کرنا ہی کافی خیال کیا گیا ہے۔ آخری عطیہ کے متعلق مندرجہ ذیل نظم میں اس نے کتاب کو مکمل کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے:-

یکے نامہ ساختم پر شگفت | کہ ہر دانشے زوتوان برگرفت
چنان گفتم این نامہ نغز را | کہ روشن کند خواندنش مغز را

ترجمہ:- "میں نے ایک ایسی حیرت انگیز کتاب لکھی ہے کہ اس کے اوراق سے ہر قسم کی دانش اکٹھی کی جا سکتی ہے۔ میں نے دانشمندی کی اس تصنیف کو یکجا کیا ہے کہ اس کا مطالعہ ذہن کو روشن کر دیتا ہے۔"

جہاں تک ابوالفضل اور فیضی کی اضافی صلاحیتوں اور کمالات کا تعلق ہے' تو اس بارے میں اس رائے کا اظہار کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں سے بڑا عالم کون ہے۔ دونوں باصلاحیت اشخاص تھے اور غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے۔ فیضی شاعرانہ ذہن کا مالک تھا' جبکہ ابوالفضل نے نثر میں نام پیدا کیا۔ اگر فیضی کی نظمیں اپنی خوبصورتی اور فضیلت کے سلسلہ میں علماء کی تعریف حاصل کرتی ہیں' تو ابوالفضل کی نثر اپنے خیالات کی اصلیت' پاکیزگی اور فضیلت' اپنے تدبر اور اسلوب کی پختگی کے لئے مشہور ہے۔ دونوں سیاسی ذہن کے مالک تھے۔ ابوالفضل جس مکتبہ فکر میں پروان چڑھا تھا' اس نے اس کو اس دور کی توقعات سے کہیں زیادہ تحمل مزاج اور شائستہ رہنا سکھا دیا تھا۔ اس بات کا زیادہ تر سہرا اس کے باپ کے سر رہتا ہے کیونکہ اس نے اپنے بیٹوں کو اسی قسم کی مناسب تعلیم دی تھی اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ بیٹوں نے اپنا زیادہ تر علم و فضل اپنے والد کے عظیم کمالات سے حاصل کیا۔ ان کی تحریروں سے ایک دوسرے کے لئے پیار

و محبت اور احترام واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے اپنی تصانیف سے بے شمار قطعات متعارف کرا کے اپنے بھائی کے لئے اپنی الفت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ فیضی نے اپنے ایک طویل قصیدہ میں اپنا موازنہ اپنے بھائی ابوالفضل سے کیا ہے:۔

جائیکہ از بلندی و پستی سخن رود — دارد زمانہ مغز معانی معطرم
از آسمان سرآمد و از خاک کمترم — صد سالہ رہ میان من و اوست در کمال
با اینچنین پدر کہ نوشتم مکارمش — در عمر گرازو دوسہ سالہ فزون ترم
در فضل مفتخر ز گرامی برادرم — در چشم باغبان نشود قدر او بلند
برہان علم و عقل ابوالفضل کروش — گرازدرخت گل گذرد شاخ عرعرم

ترجمہ:۔ "جہاں کہیں بلندی و پستی سے بات نکلتی ہے' تو میں اپنا ٹھکانہ آسمانوں سے بالاتر اور پھر خاک سے بھی کمتر سمجھتا ہوں۔ باپ کے ساتھ' جس کی مہربانی کی میں عکاسی کر چکا ہوں' علم و فضل میں میرے محترم بھائی سے میرا فخر پیدا ہوا ہے۔ برہان علم و عقل ابوالفضل کہ جس سے علم کا مغز معطر ہو جاتا ہے۔ کمالات کے معاملہ میں میرے اور اس کے درمیان سینکڑوں برس کا سفر ہے۔ اگرچہ عمر میں اس سے دو یا تین برس بڑا ہوں۔ باغبان کی نظر میں اس کا اندازہ بلند نہیں ہو سکتا' چاہے ایک صنوبر درخت کی ایک باریک ٹہنی ساتھ کھڑے ہوئے گلاب کے اوپر سایہ فگن ہو جائے۔"

ابوالفضل آئین اکبری میں شیخ مبارک کے بیٹوں کی مندرجہ ذیل فہرست پیش کرتا ہے:۔

1- شیخ ابوالفیض (اپنے تخلص فیضی کے نام سے مشہور) 954ھ (1547ء) میں پیدا ہوا: 1595ء میں لاولد فوت ہوا۔
2- شیخ ابوالفضل 14 جنوری' 1551ء میں پیدا ہوا' 12 اگست' 1602ء میں قتل ہوا۔
3- شیخ ابوالبرکات' 17 شوال 960 (1552ء) میں پیدا ہوا' گرچہ اس کے کمالات زیادہ بلند نہیں ہیں' مگر بتایا گیا ہے کہ وہ بہترین کاروباری شخص تھا اور شمشیرزنی میں بہت ماہر تھا' وہ اچھی خصلت کا شخص تھا اور درویشوں کی صحبت کا شوقین اور وہاں جانے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ اس نے خاندیس میں ابوالفضل کے تحت خدمات سرانجام دیں۔
4- شیخ ابوالخیر 967ھ (1559ء) میں پیدا ہوا۔ وہ امیر فتح اللہ شیرازی کا شاگرد تھا۔ دکن میں خدمات سرانجام دیں۔
5- شیخ ابوالمکرم 976ھ (1568ء) میں پیدا ہوا۔

جملہ مذکورہ بالا اشخاص ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے۔

6- شیخ ابو تراب 988ھ (1580ء) میں پیدا ہوا۔

پروفیسر بلا جمین نے ذکر کیا ہے کہ مبارک کی چار بیٹیاں تھیں۔

1- ایک کی شادی دکن کے خداوند خاں سے ہوئی' جو ایک ہزاری منصب پر فائز تھا۔ وہ جاذب نظر قدو قامت کا شخص تھا اور اپنی زبردست دلیری اور حوصلہ کے سلسلہ میں بہت زیادہ مشہور تھا لیکن اس کا مزاج گرم تھا۔ ایک مرتبہ ابوالفضل نے اپنے گھر میں چار امراء کو رات کے کھانے پر مدعو کیا: ان میں خداوند خاں بھی شامل تھا۔ اس کے آگے پرندے کے گوشت کے کھانے پیش کئے گئے' مگر دوسروں کے سامنے بھنا ہوا گوشت رکھا گیا۔ خدواند خاں مشتعل ہو کر دعوت سے چلا گیا۔ نیک خو اکبر نے اسے اس بات کی یقین دہانی کرانے کی کوشش کی کہ اس میں اہانت کا کوئی ارادہ شامل نہیں تھا' مگر اس نے ابوالفضل کے ساتھ صلح نہیں کی۔

2- ایک کی شادی خاندیس کے راجہ علی خاں کے بیٹے سے ہوئی۔

3- ایک کی شادی غازی خان بدخشی کے بیٹے حسام الدین سے ہوئی' جو ایک ہزاری کمان پر فائز تھے۔ انہوں نے دکن میں خان خاناں کے تحت خدمات انجام دیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر ایک فقیر بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خان خاناں نے انھیں اس خیال سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی' مگر بے سود' حسام اگلے روز اپنے کپڑے پھاڑ کر' اور بدن پر مٹی اور بھبوت مل کر جنگل میں چلے گئے۔ اکبر نے انھیں کنارہ کشی اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ حسام حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر تیس سال تک ایک زاہد و عابد کی طرح رہے۔ صوفی بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے انھیں [illegible] زہد و اتقا کی راہ پر چلنے والے مسافروں کی رہنمائی کا اختیار دے دیا۔ انہوں نے 1034ھ (1624ء) میں انتقال کیا۔ ان کی بیوی (ابوالفضل کی ہمشیرہ) نے اپنے خاوند کی خواہش پر اپنے تمام جواہرات درویشوں کو دے دیئے۔ انہوں نے اپنے شوہر کے حجرہ کی دیکھ بھال کے لئے 12,000 روپے کا ایک سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

4- لاڈلی بیگم کی شادی حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے پوتے اسلام خاںؒ کے ساتھ ہوئی' ان کا انتقال 1017 (1608) یا اپنے خاوند کی وفات سے پانچ برس پہلے ہوا۔ (145)

ابوالفضل کا اکلوتا بیٹا عبدالرحمٰن 979ھ (1571ء) میں پیدا ہوا۔ سنی نام اس کے دادا نے رکھا تھا۔ اس نے تلنگانہ کی جنگ میں اپنی شجاعت کا لوہا منوایا۔ جہانگیر نے اپنی نفرت اس کو منتقل نہیں کی' جو وہ اس کے باپ کے لئے رکھتا تھا' کیونکہ اس نے اسے چار ہزار سواروں کے کماندار

کے رتبہ پر سرفراز کیا اور اسے افضل خاں کے خطاب سے نوازا۔ جہانگیر کی حکومت کے تیسرے سال اسے ابوالفضل کے بہنوئی اسلام خاں کی جگہ حاکم بہار کے عہدے پر فائز کیا گیا اور گورکھپور جاگیر کے طور پر عطا کیا گیا۔ بطور حاکم بہار اس کا صدر مقام پٹنہ میں تھا۔ وہ 1022ھ (1613ء) میں جہانگیر کی حکومت کے آٹھویں برس یا اپنے والد کے انتقال کے گیارہ سال بعد فوت ہوا۔ عبدالرحمٰن کا ایک بیٹا بشوتن تھا جو 999 (1590ء) میں پیدا ہوا۔ وہ جہانگیر کے دور میں سات سو ذات کے ساتھ تین ہزار سواروں کا کماندار تھا جبکہ شاہجہان کے دور میں پانچ سو سواروں کا کماندار تھا۔ وہ شاہ جہاں کی حکومت کے پندرھویں برس میں فوت ہوا۔

دربار اکبری میں ابوالفضل کے بعد زیادہ اہم شخص اس کا بڑا بھائی شیخ فیضی تھا۔ دونوں بھائیوں کی زندگی کے واقعات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے ہیں اور موجودہ خاکہ میں موخرالذکر کے بارے میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اب ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کی زندگی کا ایک مختصر حال یہاں بیان کر دیا جائے۔

ناگور کے شیخ مبارک کا بڑا بیٹا شیخ فیضی 954ھ (1547ء) میں آگرہ میں پیدا ہوا۔ اس کا اصل نام ابوالفیض تھا اور تخلص فیضی تھا۔ مگر اپنی زندگی کے اختتام کے قریب اس نے اپنے چھوٹے بھائی ابوالفضل کے لقب علامی کی نقل میں فیاضی تخلص رکھ لیا۔ وہ ایک ممتاز عالم اور عظیم شاعر تھا۔ اس نے عربی ادب اور فن شاعری میں بہت زیادہ ناموری حاصل کی۔ وہ فن طب میں بھی بہت ماہر تھا اور غریبوں کا مفت علاج کرتا تھا۔ اکبر سے متعارف ہونے سے قبل اس نے آگرہ میں صدر شیخ عبدالنبی کو 100 بیگھ زمین کی امداد کے لئے درخواست دی: مگر شیعہ مذہب کی طرف رجحان کے شک میں اسے ذلیل کر کے ایوان سے نکال باہر کیا گیا۔ اکبر نے اس کی ادبی شہرت کا سنا' لہٰذا وہ حکومت کے 12 ویں برس میں بادشاہ سے متعارف ہوا۔ اپنی ذہانت کے بل پر بادشاہ کا منظور نظر اور مستقل ساتھی بن گیا۔ اسے تین سو کا کماندار بنایا گیا اور 1588ء میں بادشاہ نے اس کی عظیم شاعرانہ ذہانت کے اعتراف میں اسے اعلیٰ منصب پر فائز کر کے ملک الشعراء کا خطاب عنایت کیا۔ اکبر نے کبھی بھی شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ مگر اس کے باوجود فیضی کی صلاحیتوں کے متعلق اس کی ستائش سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اصلی جوہر کو شناخت کرنے میں کبھی بھی سست نہیں رہا۔ اسے شہزادگان کا اتالیق مقرر کیا گیا اور اس نے بادشاہوں کے لئے بطور سفیر بھی خدمات سرانجام دیں۔ اس نے 101 کتابیں تصنیف کیں' ان میں سے بزبان عربی قرآن پاک کی تفسیر' سواطع الالہام اور موارد الکلام ہیں' دونوں بے نکت ہیں' جن میں فیضی نے اپنے عظیم جامع اللغاتی کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ ابوالفضل نے اس کے اشعار کی تعداد

کا اندازہ 50,000 لگایا ہے۔ اکبر نامہ فیضی کی تصانیف کے بے شمار اقتباسات پر مشتمل ہے۔ وہ دین الٰہی کا رکن تھا۔ وہ 1595ء میں لاہور میں فوت ہوا۔ (146)

ابوالفضل اور فیضی دونوں بھائیوں کے بعد اکبر کا گہرا دوست اور منظور نظر بیربر تھا۔

راجہ بیربر

شہنشاہ اکبر اوائل عمری ہی سے مختلف قبائل' قومیتوں اور مذاہب کے لوگوں سے بحث مباحثہ کرنے کا شوقین تھا۔ عبدالقادر بدایونی کے مطابق' اس میں ابتداء ہی سے ہندوانہ رجحانات ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے اور وہ برہمنوں' باد فروش (یعنی خوشامدیوں) اور مسخروں کی صحبت میں بہت خوش رہتا تھا۔ چنانچہ' برہم داس نامی ایک برہمن جو پیشے کے اعتبار سے ایک بھاٹ تھا' کالپی سے دور حکومت کے آغاز میں دربار میں حاضر ہوا۔ وہ بہت غریب مگر ہوشیار اور بذلہ سنج تھا۔ اس کا پیشہ لوگوں کو لطیفہ بازی اور مزاحیہ گفتگو سے خوش کرنا تھا' اس کے چٹکلوں اور حاضر جوابی نے جلد ہی اسے دربار میں سب کا پسندیدہ بنا دیا۔ ایک مختصر سے عرصہ میں اس نے بادشاہ پر اس قدر اثر و رسوخ حاصل کر لیا کہ وہ اس کا منظور نظر بن گیا اور مستقل طور پر اس کے قریب رہنے لگا۔ اسے ایک اعلیٰ منصب عطا کیا گیا اور وہ ایک بااعتماد مشیر بن گیا۔

پہلے اسے کاب رائے یا ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور اس کے تھوڑی دیر بعد راجہ کے منصب کے ساتھ بیربر کے خطاب سے نوازا گیا۔ جب نگر کوٹ (کانگڑا) کا راجہ جے چند زیر عتاب آیا اور اسے قید میں ڈال دیا گیا' تو اس مقام کا قلعہ بطور جاگیر بیربر کو عنایت کر دیا گیا: نیز حاکم لاہور حسین قلی خاں کو احکامات جاری کئے گئے کہ وہ قلعہ پر قبضہ حاصل کر کے اسے بیربر کے انتظام میں دے دے۔ حسین قلی خاں پنجاب کے امراء مثلاً مرزا یوسف خاں' قوزق خاں کے بیٹے جعفر خاں اور فتو کے ہمراہ سواروں' ہاتھیوں' اونٹوں' اسلحہ' بڑے بڑے مکلوں اور بسیرو بنگاہ کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ روانہ ہوا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ کے بیٹے بدھی چند نے نہایت دلیری کے ساتھ قلعہ کا دفاع کیا۔ نگر کوٹ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی زیارت گاہ تھی: لاکھوں افراد ہر سال ہندو دیوی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے وہاں جمع ہوتے اور سونا' چاندی اور دیگر قیمتی اشیاء کی صورت میں بہت بڑے بڑے نذرانے پیش کرتے تھے۔ حملہ آور فوج نے پہاڑی باشندوں کو قتل کر دیا اور مندر کے گنبد پر سایہ فگن طلائی چھتری تیروں سے چھلنی کر دیا۔ انہوں نے ان گایوں کو بھی ذبح کر دیا (جو ہندوؤں کے لئے انتہائی مقدس

ہوتی ہیں) جنہیں برہما کے پجاری مندر پر نذرانہ کے طور پر پیش کر چکے تھے اور فوج نے ان کے خون سے مندر کی دیواروں کو رنگین کر دیا۔ بدایونی کے مطابق (جس نے یہ تفصیلات بیان کی ہیں) مندر پہ اتنے خدمتگاروں اور برہمنوں کو قتل کیا گیا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کارروائیوں کے سبب ہندوؤں نے راجہ بیربر کے نام پر لعنت بھیجی' وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ اسی کے باعث ہوا ہے۔ نگر کوٹ شہر پر قبضہ کر لیا گیا اور ایک بہت بڑی توپ بدھی چند کے محل پر نصب کر دی گئی' اس کا ایک گولہ اسی افراد کو موقع پر ہی ہلاک کر دیتا تھا۔ حملہ آور قلعہ پر قبضہ کرنے والے تھے کہ بدھی چند نے صلح کر لی۔ دریں اثناء' لاہور سے پنجاب پر مرزا ابراہیم حسین اور مسعود حسین مرزا کی چڑھائی کی خبر پہنچی۔ شاہی فوج کو رسد کی شدید کمی کا سامنا شروع ہو گیا: چنانچہ صلح کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بدھی چند نے پانچ من سونے کا تحفہ پیش کیا (جو مندر کی ایک برس کی آمدنی کے برابر تھا) اور بطور تاوان قیمتی اشیاء کی ایک بہت بڑی تعداد لایا۔ بروز جمعہ' ماہ شوال 980 (1572ء) کو بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکہ مضروب کرایا گیا۔ راجہ جے چند کے محل کے دروازے پر مسجد کی ایک بلند محراب تعمیر کر کے مسلمانوں کی فتح کا اشارہ دے دیا گیا' حسین قلی خاں مرزاؤں کو لاہور سے نکال باہر کرنے کے لئے لاہور کی طرف لوٹ گیا۔ یوں بیربر نگر کوٹ جاگیر پر قبضہ حاصل نہ کر سکا' جو اسے عطا کی گئی تھی۔

اکبر نامہ کے مطابق (دور حکومت کے اٹھارہویں برس کا بیان) کمسن راجہ بدھی چند کے ساتھ مندرجہ ذیل شرائط طے ہوئیں' جنہیں کمسن راجہ کے چچا اور سرپرست راجہ گوبند چند نے تسلیم کر لیا۔ پہلی یہ تھی کہ راجہ جے چند کی ایک بیٹی کو اکبر کے حرم میں بھیجا جائے: دوسری یہ تھی کہ زر نقد کی صورت میں ایک مناسب نذرانہ بادشاہ کو روانہ کیا جائے: تیسری یہ کہ راجہ کے ایک بیٹے کو یرغمال کے طور پر آگرہ بھیجا جائے اور چوتھی یہ' چونکہ شاہی حکم کے مطابق راجہ کا علاقہ بیربر کو دیا جانا تھا' اس لئے راجہ کو تاوان کے طور پر ایک بڑی رقم ادا کی جائے۔

بیربر کو تاوان کے طور پر روپیہ ادا کیا جاتا ہے: مفتوحہ راجہ نے تمام شرائط پوری کر دیں۔ اس معاہدہ کے بعد راجہ گوبند چند حسین قلی خاں کی زیر قیادت شاہی فوج کے ہمراہ ملتان کے قریب دیپالپور کی طرف روانہ ہوا' جہاں شاہی فوج اور حملہ آور فوج کے درمیان ایک جنگ لڑی گئی۔ مرزا ابراہیم حسین کی زیر قیادت فوج کو شکست ہوئی۔ حسین قلی خاں کو دلیری کا مظاہرہ کرنے پر خان جہاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ راجہ بیربر نے اس جنگ میں اپنی شجاعت کا لوہا منوایا اور مصاحب دانشور کا خطاب حاصل کیا۔ ابراہیم حسین مرزا' جس نے بلوچیوں کے پاس پناہ حاصل کر لی تھی' کچھ عرصہ بعد ہی رنج و الم کے باعث فوت ہو گیا' مگر مسعود حسین مرزا اور اس

کی جماعت کے دوسرے آدمیوں کو گائے کی کھالوں میں سینگھوں کے سمیت سی دیا گیا اور اسی حالت میں فتح پور سیکری کے دربار میں اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ ان جیسے مواقعوں پر ہمیشہ برداشت کا مظاہرہ کرتا تھا' اس نے بدقسمت افراد کو گائے کی کھال سے باہر نکال کر نہلا دھلا کر کپڑے پہنوائے اور بعد میں ایک موقع پر جب دربار میں انھیں بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا' تو اس نے انھیں عام معافی دے کر' وقار اور فیاضانہ طبیعت کے ایک اعلیٰ جذبے کا ثبوت فراہم کر دیا۔

وہ اکبر کے ہمراہ دکن جاتا ہے: اگلے سال (1573ء) جب مرزا ابراہیم حسین نے دوبارہ گجرات میں علم بغاوت بلند کیا تو اکبر نے اس مقام کی طرف اپنے امراء کے ہمراہ اپنی مشہور زمانہ پیش قدمی کی۔ راجہ بیربر اپنے آقا کے جلو میں شامل تھا۔ بادشاہ نے اپنے 300 اعلیٰ شترسوار افسران کے ہمراہ موسم برسات کے دوران 450 سے زائد میل کا فاصلہ اتنی پھرتی کے ساتھ طے کیا کہ وہ آگرہ سے روانگی کے 9 ویں روز پٹن پہنچ گیا حالانکہ اس کی افواج دشمن کی فوجوں کے مساوی نہیں تھیں' مگر اس کے باوجود اس نے دشمن کو شکست دے دی۔ مکمل طور پر امن و امان بحال کرنے کے بعد وہ آگرہ کی طرف لوٹ گیا۔

اسے بیرونی خدمات پر بھیجا جاتا ہے: راجہ بیربر کو اکثر بیرونی خدمات پر روانہ کیا گیا۔ چنانچہ ہم دور حکومت کے 21 ویں سال (1576ء) دیکھتے ہیں کہ وہ رائے کی بیٹی کو آگرہ پہنچانے کے لئے راجہ لون کرن کے ہمراہ دونگرپور روانہ ہوا' کیونکہ رائے نے بادشاہ سے اپنے خلوص اور بے حد احترام کا اظہار کرتے ہوئے' اپنی بیٹی بادشاہ سلامت کے حرم میں شامل کرنے کی پیش کش کی' لہٰذا شہنشاہ نے راجہ کو خصوصی اعزاز بخشنے کی خاطر اس کی درخواست قبول کرلی۔ جب سال 977 (1569ء) میں بھاٹھ کے راجہ رام چند نے کالینجر کا قلعہ اکبر کے کماندار مجنون خاں کے حوالے کر دیا تو اس نے اپنا بیٹا بیرسادر بطور یرغمال دربار میں بھیجا لیکن اعتماد کی کمی کے باعث بذات خود بادشاہ کو تعظیم بجالانے حاضر نہ ہوا۔ راجہ کی اس خود سری پہ برہم ہو کر اکبر نے بھاٹھ کی طرف ایک فوج روانہ کرنے کا حکم جاری کیا' مگر جب اس کے سامنے گذارشات پیش کی گئیں تو اس نے اپنا فیصلہ تبدیل کرلیا اور راجہ کو دربار میں لانے کے لئے اپنے انتہائی بااعتماد امراء کے ایک وفد کو بھاٹھ روانہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کام کے لئے راجہ بیربر اور زین خاں کوکہ کو منتخب کیا گیا۔ آخرکار راجہ دربار پہنچ گیا' جہاں شہنشاہ نے نہایت عزت و احترام سے اس کا استقبال کیا۔ یہ واقعہ دور حکومت کے اٹھائیسویں برس (1582ء) میں رونما ہوا۔

بھانٹھ کے راجہ کا شمار ہندوستان کے ان تین عظیم راجاؤں میں ہوتا ہے' جن کا ذکر بابر نے اپنی تزک (سوانح عمری) میں کیا ہے۔ وہ موسیقی کا ایک عظیم سرپرست تھا' اور یہ کہ اکبر نے مشہور زمانہ میاں تان سین کو اس سے مانگ کر اپنے دربار میں ملازم رکھ لیا۔ راجہ ایک عالی حوصلہ شخص تھا اور اپنی فیاضی کے سلسلہ میں ہندوستان بھر میں اسے زبردست شہرت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک موقع پر تان سین کی موسیقارانہ مہارت پہ خوش ہو کر اس نے اسے ایک کروڑ روپیہ انعام کے طور پر دیا: نیز اس نے بادشاہ سلطان ابراہیم لودھی کے تحت بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ مغل شہنشاہ کے دارالخلافہ میں بہ نفس نفیس آداب بجالانے کے لئے اس کی حاضری کو ہندوستان میں مسلمانوں کی فتح کا عروج قرار دیا گیا۔

بادشاہ کا بااعتماد مشیر بن جاتا ہے: بیربر بادشاہ کا بااعتماد مشیر بن گیا۔ ان کی باہمی رازداری اس قدر تھی کہ بادشاہ نے اسے اپنے بھرپور بھروسہ میں لے لیا۔ فتح پور سیکری میں بادشاہ کے محل کے قریب بیربر کے لئے بھی ایک محل تعمیر کیا گیا: نیز دور حکومت کے ستائیسویں برس (1582ء) میں جب مذکورہ محل کی تکمیل ہوئی' تو راجہ نے انتہائی شان و شوکت اور کروفر کے ساتھ بادشاہ کی آؤ بھگت و خاطرمدارت کی۔

ایک ضیافت میں بادشاہ کی بھرپور تواضع کرتا ہے: اکبر اپنے درباریوں اور وزیروں کے ساتھ آزادانہ طور پر گھل مل جاتا تھا۔ چنانچہ' ہم اکبر نامہ میں دیکھتے ہیں کہ جب شہنشاہ صوبہ الہ آباد (المعروف بہ دیار شرقی) میں محو سفر تھا' تو اس دوران زین خاں کوکہ نے ایتاوہ کے مقام پر' مہتاب خاں تیویل نے کالپی اور راجہ بیربر نے الہ آباد کے نزدیک اکبر پور کے مقام پر بادشاہ کی خاطرمدارت کی۔

بیربر کے زبردست اثرورسوخ کے باعث ہندوستان سے اکبر کا لگاؤ: اکبر پر بیربر کا اس قدر اثرورسوخ تھا کہ اسی کے باعث اسے ہندوستان سے بہت زیادہ لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ اس نے ہندوانہ طرز کی پوجا پاٹ اختیار کر لی اور اس کے علاوہ ہندوؤں کی مذہبی رسومات بھی ادا کرنے لگا تھا۔ پس' بدایونی کے مطابق بیربر (اسے "مردود" کا خطاب دیتا ہے) نے بادشاہ کے ذہن میں بٹھا دیا تھا کہ ہر شے کی اصل اور منبع سورج ہے۔ اس کی گرمی کھیتوں میں غلے' باغات میں پھلوں اور میدانوں میں سبزہ جات کو پکاتی ہے اور دنیا کی روشنی و رونق اور اس کے باشندوں کی حیات کا انحصار اسی پر ہے۔ انہی وجوہات کے باعث تمام انسانیت کو اس کی پوجا اور تعظیم کرنی چاہئے اور لوگوں کا یہ فرض ہے کہ جب عبادت کر رہے

ہوں تو اپنے منہ اس جانب کریں، جس طرف سے عظیم سورج نمودار ہوتا ہے، نہ کہ اس طرف جدھر غروب ہوتا ہے۔ اسی طرح کی توجیہات پر زور دیتے ہوئے بیربر نے بادشاہ کو باور کرایا کہ آگ، پانی، پتھر، درختوں اور زندگی کی دیگر اشکال بلکہ اس سے بھی پست گائے بھینسوں اور ان کے گوبر کی بھی تعظیم کرنی چاہئے۔

اکبر کے دین الٰہی کا رکن بن جاتا ہے: جب اکبر نے اپنا دین الٰہی قائم کیا تو بیربر ابوالفضل، فیضی، شیخ مبارک، صدر جہاں، سلطان خواجہ، عظیم خاں کوکہ اور دیگر اشخاص کے ہمراہ اس کا رکن بن گیا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ بادشاہ کی موجودگی میں ایک روز مذہب کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ بادشاہ نے قطب الدین محمد خواجہ اور شہباز خاں کو اپنے موقف پر قائل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر بے سود۔ قطب الدین نے کہا: "جب قسطنطنیہ جیسے حکمران اور ولایت کے بادشاہ یہ سب کچھ سنیں گے تو کیا کہیں گے، وہ سب بھی اسی مذہب کا دعویٰ کرتے ہیں، جس کا ہم کرتے ہیں، چاہے ان کے خیالات وسیع ہوں یا محدود" اس پر بادشاہ نے کہا:

مذہبی مجالس میں بیربر کا رویہ: "تم ڈھکے چھپے انداز میں قسطنطنیہ کے سلطان کا اعتماد حاصل کرنے کی خاطر اس کے موقف کا دفاع کر رہے ہو، تاکہ جب تم یہ ملک چھوڑو تو بغیر کسی وقت کے وہاں اس کے پاس ملازمت حاصل کر سکو، اسی وقت ہندوستان سے چلے جاؤ اور وہاں جا کر ایک محترم اور باعزت شخص بن جاؤ۔" اس پر شہباز خاں مشتعل ہو گیا اور جب بیربر نے مذہب پر ایک مضحکہ خیز جملہ کسا تو اس کے غصہ کی انتہا نہ رہی، اس نے اسے برملا طور پر برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا "ملعون کافر، اس مجلس میں اس جیسی گستاخانہ زبان میں گفتگو کرنے کی تجھے جرات کیسے ہوئی؟ اب میں مزید تمہارے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔" صورتحال انتہائی گھمبیر ہو گئی۔ بادشاہ نے شہباز خاں سے خصوصی طور پر اور دیگر افراد سے عمومی طور پر مخاطب ہو کر کہا: "بہتر تو یہ ہے کہ تمہارے منہ پر گندگی سے لتھڑے ہوئے جوتے مارے جائیں" یہ کہتا ہوا وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ (147)

اکبر کے ساتھ دلی خلوص کا دعویٰ: بیربر اکبر کے نئے دین کی پیش کردہ تعلیمات کا سچا پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتا تھا، لہٰذا اپنے دوست کے خلوص کے دعویٰ کے سلسلہ میں بادشاہ کے اعتماد کو کبھی بھی ٹھیس نہ پہنچی۔ بدایونی لکھتا ہے، جب بھی دربار میں میر فتح اللہ دکنی (جو کٹر شیعہ تھا) جیسے مذہبی اشخاص (جن کو نئے دین کے اختیار کرنے پر کسی طرح بھی راغب نہیں کیا جا سکتا تھا) پر نئے دین کی سچائی ثابت کرنے کے لئے پر دلائل تابڑ توڑ حملے کئے گئے تو جواب میں انہوں

نے ایک لفظ بھی نہیں کہا کیونکہ وہ اپنی ضد پر سختی سے قائم تھے۔ بیربر نے ہمیشہ بادشاہ کے دلائل سر تسلیم خم کیا اور کہا: "جی ہاں' ہم یقین کرتے ہیں' جی ہاں ہم اعتقاد کرتے ہیں!"

بیربر جوگی بننے کا فیصلہ کرتا ہے' مگر بادشاہ اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے:

سال 990 (1582ء) کے واقعات سے متعلق بدایونی ایک واقعہ درج کرتا ہے' جس سے پتہ چلتا ہے کہ دربار میں بیربر کے بے شمار دشمن تھے اور یہ کہ اس کے لئے بادشاہ کی خصوصی تعظیم و تکریم کے باعث بھی کوئی وقت ضائع کئے بغیر اسے ذلیل و رسوا کیا جا سکتا تھا۔

شیطان پورہ: سلطنت کے تمام علاقوں کی طوائفیں دارالخلافہ میں اتنی بڑی تعداد میں جمع ہو گئی تھیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بادشاہ نے شہر سے باہر ان کے لئے ایک علیحدہ علاقہ تفویض کر دیا تھا' جسے شیطان پورہ کہا جاتا تھا۔ اس علاقہ کے لئے ایک داروغہ' ایک نائب اور ایک معتمد مقرر کیا گیا۔ یہ ان اشخاص کے نام درج کرتے تھے' جو ان طوائفوں کے پاس آتے یا انہیں اپنے گھر بلواتے تھے۔ کسی بھی طوائف کو داروغہ کی اجازت کے بغیر رات کے وقت کسی شخص کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ماسوائے علاج معالجہ کے شراب کے استعمال کی ممانعت تھی' اس کے علاوہ نشہ آور اشیاء کے بے تحاشہ استعمال' شراب خوری اور سرکش رویہ یا برتاؤ پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ پیشگی طور پر نائب کو درخواست دیئے اور دربار سے اجازت حاصل کئے بغیر کوئی شخص بھی شیطان پورہ سے کوئی کنواری دوشیزہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ آبلوکاروں نے فرضی ناموں کے تحت یا شیطان پورہ کے منتظمین کی چشم پوشی سے فائدہ اٹھا کر من مانی حرام کاریاں کیں۔ قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں بے شمار مشہور امراء کو بادشاہ کے حکم کے تحت سخت سرزنش کی گئی اور سزائیں دی گئیں یا طویل عرصے تک قلعوں میں قید رکھا گیا۔ بادشاہ نے بذات خود چند مشہور زمانہ طوائفوں کو بلا بھیجا اور تنہائی میں ان سے دریافت کیا کہ کن اشخاص نے ان کی عصمت دری کی ہے' یوں جو امراء اس جرم میں ملوث پائے گئے' ان کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آیا۔ بدایونی کہتا ہے ان میں راجہ بیربر کا نام بھی شامل تھا' جسے دین الٰہی کا رکن بننے کے باعث بادشاہ کا چیلہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور وہ چاروں درجات (148) عبور کر کے فضائل اربعہ (149) حاصل کر چکا تھا: اس وقت بیربر خوش قسمتی سے اپنی جاگیر کیرو کے پرگنہ میں تھا۔ جب اسے ان حالات سے آگاہ کیا گیا تو اس نے ایک جوگی بننے کا اعلان کر دیا اور اس مقصد کے لئے بادشاہ کی اجازت حاصل کرنے کی خاطر درخواست پیش کر دی لیکن بادشاہ نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے دربار میں بلوا کر اس کے ساتھ ہمیشہ

کی طرح مہربانی اور بلا تکلفی کے ساتھ پیش آیا۔

اسے یوسف زئیوں کے خلاف فوجی مہم پر بھیجا جاتا ہے: بیربر کی زندگی کا زیادہ تر حصہ دربار میں گذرا تھا۔ اگر بدقسمتی سے راجہ کے لئے سب کچھ ٹھیک ہوتا تو وہ فتح پور سیکری کے محل میں ایک زندہ دل درباری کی حیثیت سے موجود رہتا' لیکن حالات نے اسے ایک ایسی فوجی مہم میں الجھا دیا جس کے لئے اس کی ذہانت نامناسب تھی' چنانچہ وہ ایک غیر ملکی جنگ میں اپنی ناتجربہ کاری اور موقع شناسی کی کمی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ سال 994 (1585ء) میں سوات اور باجوڑ کے یوسف زئی افغانوں کو سزا دینے کے لئے زین خاں کوکہ کی زیر قیادت ایک فوجی مہم روانہ کی گئی۔ اس جرنیل نے ضلع باجوڑ میں پیش قدمی کی اور متعدد جھڑپوں میں دشمن کو شکست دی۔ اسے کمک کے لئے کہنا پڑا' تو اکبر نے یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ آیا ابوالفضل کو یا بیربر کو روانہ کیا جائے قرعہ اندازی کی۔ قرعہ اندازی کے ذریعے بیربر کا نام نکل آیا' یہ بادشاہ کی مرضی کے بالکل خلاف ہوا' بادل نخواستہ بیربر کو حکیم ابوالفتح کے ہمراہ میدان جنگ کی طرف روانہ کیا گیا۔

شاہی افواج کی خوفناک شکست: شاہی افواج کو شکست ہو گئی اور ان کی پسپائی کے دوران افغانوں نے ایک انتہائی تنگ وادی میں ان پر حملہ کر دیا۔ ہر طرف سے ان پر تیروں اور پتھروں کی بارش ہو رہی تھی اور وہ انتہائی ابتری کی حالت میں اگلے مورچہ تک پہنچے' ان میں سے زیادہ تر رات کے اندھیرے میں راستہ بھٹک گئے۔ اگلے روز افغانوں نے شاہی افواج کے بھاگتے ہوئے دستوں پر حملہ کر کے 500 افسروں سمیت 800 جوانوں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ یہ اکبر کی افواج کو اب تک ہونے والی سب سے زیادہ تباہ کن شکست تھی۔

بیربر کی ہلاکت 1586ء: بیربر سمیت متعدد امراء اس جنگ میں مارے گئے' ان میں حسن خاں' خان جہاں کا خزانچی' خواجہ عرب اور شاعر ملا شیری بھی شامل تھے۔ حکیم ابوالفتح اور زین خاں اپنی شکست خوردہ افواج کی باقیات کے ساتھ اٹک کے قلعہ تک پہنچ گئے۔

اس کی موت پر بادشاہ کا رنج و الم: بادشاہ کو اپنے کسی امیر کی موت پر اس قدر افسوس اور دکھ نہیں ہوا جتنا اپنے چہیتے درباری اور منظور نظر بیربر کی موت پر ہوا۔ اس نے کہا: "افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اس کی لاش کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکے تاکہ اسے نذر آتش کر دیا جاتا۔" دو روز تک وہ سب سے الگ تھلگ تنہائی میں رہا اور کھانا کھانے سے انکار کر دیا لیکن آخر کار اس یقین کے ساتھ خود کو تسلی دے لی کہ بیربر اب تمام دنیاوی مشکلات سے مکمل طور پر آزاد اور لاتعلق ہو گیا ہے' اور اپنے تئیں یہ کہتے ہوئے اطمینان محسوس کیا: "اس کے جسد کو پاک کرنے

کے لئے عظیم سورج کی شعاعیں کافی ہیں' اس لئے آگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" بادشاہ نے طویل عرصے تک اس کا سوگ منایا۔ اس کے علاوہ ابوالفضل کے مکتوبات میں ایک مراسلہ ہے' جس میں بادشاہ کی طرف سے دکن کے صوبیدار خان خاناں کو مخاطب کر کے اس موقع پر زبردست رنج و الم کا اظہار کیا گیا ہے۔ بیربر فروری 1586ء میں فوت ہوا۔

اس کے زندہ ہونے کی افواہیں پھیل جاتی ہیں: اپنے دوست بیربر کے نقصان پر اکبر نے جس قدر دکھ اور رنج محسوس کیا' اس نے جھوٹے اشخاص کو اس کے زندہ ہونے سے متعلق کہانیاں تراشنے کا موقع فراہم کر دیا۔ ایک افواہ کچھ اس انداز میں پھیلی کہ اسے نگر کوٹ (کانگڑہ) کے پہاڑوں میں جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ پھرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

بادشاہ فوراً ان پر یقین کر لیتا ہے: اکبر نے یہ خیال کرتے ہوئے گرمجوشی سے اس خبر کا خیر مقدم کیا کہ ہو سکتا ہے یوسف زئیوں کے علاقہ میں شکست کے بعد شرمندگی محسوس کرتے ہوئے بیربر دربار میں نہ حاضر ہوا ہو اور فقیر بن گیا ہو' جس کا اظہار وہ اس سے قبل اپنی جاگیر میں کر چکا تھا: نیز بادشاہ اس بات پر پکا یقین رکھتا تھا کہ بیربر نے کبھی بھی دنیا کی پرواہ نہیں کی۔ چنانچہ' اس اطلاع کی تصدیق کی خاطر کہ اس میں کہاں تک سچائی ہے' ایک احدی کو نگرکوٹ روانہ کیا گیا' تب معلوم ہوا کہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ہی ایک اور اطلاع موصول ہوئی کہ بیربر کو اس کی جاگیر کالینجر میں دیکھا گیا ہے' بادشاہ نے فوراً اس پر یقین کر لیا کیونکہ کروڑی (کلکٹر) نے اسے سرکاری طور پر مطلع کر دیا تھا۔ یہ بیان کیا گیا کہ بیربر کو ایک حجام نے پہچان لیا تھا' جس وقت وہ اس کے بدن پر تیل کی مالش کر رہا تھا تو اس نے جسم پر موجود چند نشانات دیکھے تھے۔ بادشاہ نے حجام کو دربار میں لانے کا حکم دیا لیکن چونکہ وہاں بھیجنے کے لئے کوئی تھا ہی نہیں اس لئے یہ عذر پیش کیا گیا کہ اصل میں بیربر کو تلاش کر لیا گیا تھا' مگر بعد میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس افواہ کو سچائی کا رنگ دینے کے لئے ایک بے گناہ سیاح کو (جسے پہلے اصلی بیربر کا بہروپ دیا گیا تھا) ہلاک کر کے قطعی طور پر شناخت کو ناممکن بنا دیا گیا۔ یوں بادشاہ کو دوبارہ سوگ منانے پر مجبور کر دیا گیا لیکن کروڑی اور متعدد دوسرے افراد (جنھوں نے من گھڑت اطلاعات کو حقیقت کا رنگ دے کر پیش کیا تھا) کو دربار میں طلب کر کے سزا دی گئی' کروڑی کو ایک بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا۔

بیربر کی اولاد: بیربر نے اپنے پیچھے دو بیٹے لالہ اور ہری ہر رائے چھوڑے۔ بڑا بیٹا لالہ دو سو کا کماندار تھا لیکن بدایونی نے اس کا ذکر ایک فضول خرچ شخص کے طور پر کیا ہے' حتیٰ کہ اپنی

جائداد ضائع کرنے کے بعد وہ ایک فقیر بن گیا۔ ہری ہر رائے دربار میں رہا' چنانچہ' دور حکومت کے اڑتالیسویں برس اسے شہزادہ دانیال کو دربار میں لانے کے لئے دکن روانہ کیا گیا۔

بیربر کے چٹکلے: اکبر اور بیربر کے درمیان باہمی طور پر کہے گئے چٹکلے عالمگیر شہرت کے حامل ہیں اور آج کل بھی کیپ کومورین سے لے کر درہ خیبر تک زبان زد خاص و عام ہیں۔ ایک بہترین بذلہ سنج ہونے کے علاوہ بیربر موسیقی میں بھی بہت ماہر تھا' ہندی میں اس کے مصرعے اور دوہے شیرینی بیان اور بندش کی لطافت کے حامل ہیں' اس کے علاوہ ان کے ذریعے اخلاقی پیغام بھی دیا گیا ہے۔ بحیثیت شاعر اس نے برہما کا تخلص اختیار کر کے نظمیں لکھیں۔

ابوالفضل اور فیضی کی بالادستی سے قبل اکبر کے تحت ہندوستان میں جس شخص کے پاس سب سے زیادہ اختیارات تھے' وہ اس کا مشہور زمانہ اتالیق اور جرنیل بہرام خاں تھا۔

بہرام خاں

بہرام خاں کی ہمایوں کی فوج میں شمولیت: اکبر کا جرنیل بہرام خاں سیف علی بیگ کا بیٹا تھا اور بدخشاں میں پیدا ہوا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ مطالعہ اور حصول علم کی خاطر بلخ چلا گیا۔ سولہ برس کی عمر میں ہمایوں کی فوج میں شامل ہوا اور اس کے تحت متعدد جنگوں میں حصہ لیا۔ ہندوستان کی فتح کو اصولی طور پر اسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ 963 (1555ء) میں اسے شہزادہ اکبر کا اتالیق مقرر کیا گیا اور اس کے ہمراہ سکندر خاں کے خلاف پنجاب کی طرف روانہ کیا گیا۔ کلانور کے مقام پر اکبر کی تخت نشینی کے موقع پر اسے خان خاناں کے خطاب کے ساتھ سلطنت کا وکیل یا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ اکبر اسے "خان بابا" کہہ کر بلایا کرتا تھا۔ 966 (1558ء) میں بہرام کی شادی گلرخ بیگم (بابر کی صاحبزادی) اور مرزا نورالدین محمد کی بیٹی سلطانہ سلیمہ بیگم کے ساتھ کر دی گئی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اکبر اور بہرام کے مابین رنجش پیدا ہو گئی۔ بہرام نے آگرہ کو خیرباد کہہ کر پنجاب میں برملا طور پر بغاوت کا اعلان کر دیا۔

پنجاب میں بغاوتیں: اکبر نے اس کے خلاف پیش قدمی کر دی' مگر اس سے پہلے کہ وہ جالندھر پہنچتا اسے اتگہ خاں کے ہاتھوں بہرام کی شکست کی خبریں موصول ہو گئیں۔ بہرام معافی کا طلب گار ہوا۔ اکبر نے سلطنت کے شیخ الاسلام مولانا مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری کو اسے اپنے پڑاؤ میں آنے پر آمادہ کرنے کی خاطر روانہ کیا اور ساتھ ہی اپنے ضعیف اتالیق کی جاں بخشی کا وعدہ بھی کیا۔

اس کی شکست اور بعد میں معافی: بہرام خاں شاہی پڑاؤ میں حاضر ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ امراء اور اعلیٰ عہدہ داروں کا ایک جلوس بہرام خاں کا استقبال کرنے کے لئے گیا' جو بہرحال ایک ملتجی کی صورت ننگے پاؤں اس حالت میں اپنے آقا کے روبرو پیش ہوا کہ اس کی پگڑی اس کی گردن کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے خود کو تخت کے پائے پر گرا دیا اور پرانی باتوں کی یاد سے دل بھر آنے کے باعث زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ اپنے اتالیق کے لئے اکبر کے دل میں ہمدردی اور احترام کے جذبات ابھر آئے۔ وہ فوراً اپنی نشست سے اٹھا اور اپنے ہاتھوں سے بوڑھے اتالیق کو اٹھا کر اپنی دائیں جانب بٹھایا۔ اسے خلعت فاخرہ سے نوازا گیا اور یہ اختیار دیا گیا کہ وہ کالپی اور چندیری کی حکومت لے لے یا مکہ مکرمہ چلا جائے۔ بہرام کے فخروناز اور دانشمندی نے اسے موخرالذکر راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسے ایک فیاضانہ وظیفہ عنایت

کر کے اپنے خاندان کے ہمراہ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ تاہم، گجرات میں پٹن کے مقام پر مبارک نام کے ایک افغان نے اسے قتل کر دیا، جس کے باپ کو مچھی واڑا کی جنگ میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔

اس کی ہلاکت 1561ء: یہ عظیم شخص جب دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے لبوں پر الفاظ تھے، "اللہ اکبر۔" (30 جون، 1561ء) اکبر نے بہرام کے بیٹے عبدالرحیم کی ذمہ داری سنبھال لی اور جلد ہی کچھ عرصے بعد اس کی بیوہ سلطانہ سلیمہ بیگم سے شادی کر لی۔ سلطنت کے وزراء میں جنہیں بجا طور پر حکومت کے ستون کہا جا سکتا ہے، انتہائی ممتاز شخص اکبر کا وزیر مال راجہ ٹوڈر مل تھا۔

راجہ ٹوڈرمل

ٹوڈرمل کی جائے پیدائش: یہ انتہائی غیر معمولی شخص اودھ کے علاقہ لاہرپور کا ایک کھتری تھا۔ (150) کمسنی میں اس کا والد انتقال کر گیا اور اس کے لئے روزمرہ ضروریات کی کوئی چیز اپنے پیچھے نہ چھوڑی اس کے باعث اس کی بیوہ انتہائی ابتری کی حالت میں تھی۔ اس نوجوان نے ایک ادیب کی حیثیت سے یعنی معمولی درجہ سے اپنی زندگی کا آغاز کیا' مگر اس ادنیٰ رتبے سے خود کو بلند کرنے کے لئے ازحد محنت کی۔

شیر شاہ کے تحت اس کا پہلا عہدہ: حتیٰ کہ عظیم پٹھان شیر شاہ سوری نے پنجاب میں نئے قلعہ روہتاس کی تعمیر کا اہم کام اس کے سپرد کر دیا: اس سے اس کا مقصد صوبہ میں گکھڑوں کی لوٹ مار کو موثر طور پر روکنا اور مغلوں کے راستے میں ایک رکاوٹ کھڑی کرنا بھی تھا۔ اس کے دانشمندانہ انتظام و انصرام کے ذریعے مزدوروں کی اجرتیں کام کے آغاز پر ایک روپیہ فی پتھر سے کم کر کے روپے کا 1/40 کر دی گئیں۔ تاریخ خاں جہاں لودھی کے مصنف سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جب قلعہ کا کام ختم ہو گیا تو پٹھان بادشاہ نے قلعہ کی تعمیر کے سلسلہ میں اس کی دانشمندی اور قابلیت کی بہت تعریف کی۔ شیر شاہ کی آل حکومت کے تحت ٹوڈرمل کے قدرتی جوہر پروان چڑھے۔ جب مسند اقتدار پٹھان خاندان کے ہاتھوں سے نکل کر تیمور کے وارثین کے پاس آئی تو اس وقت بھی ٹوڈرمل سرکاری ملازمت میں تھا۔

اکبر کی ملازمت میں شمولیت: 1567ء میں اس نے اودھ کے باغی جاگیردار کی بغاوت کو دبا دیا۔ اسی برس اس نے چتوڑ کے یادگار محاصرہ میں اپنا لوہا منوایا۔

جنگ میں اس کے جوہر: اپنے مورچوں میں نہ تو قاسم خاں اور نہ ہی اس نے کسی قسم کا آرام کیا بلکہ چور راستوں میں اس قدر جوش و خروش سے کام کرتے رہے کہ انہوں نے مسلسل ایک دن اور دو راتوں تک نہ تو آرام ہی کیا اور نہ ہی کھانا کھایا۔ بادشاہ بذات خود حملے کی ہدایات کے سلسلہ میں بہت مستعد تھا۔ برچھیوں اور بھالوں کی بارش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ خاموشی اور مکمل ذہنی اطمینان کے ساتھ اپنی افواج کو ہدایات دے رہا تھا اور اس کی زیر نگرانی سپاہی انتہائی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ لڑے۔

اس کو عطا کردہ مراعات: وہ افغانستان میں بہادری سے لڑا' اسے واپس بلا کر کشمیر کی طرف ایک مہم پر روانہ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس نے خاں جہاں کے تحت بنگال کی جنگ اور گجرات

و اڑیسہ کی مہمات میں بہادری کے جوہر دکھائے۔ دورِ حکومت کے انیسویں برس اسے علم اور نقارہ رکھنے کا اعلیٰ اعزاز بخشا گیا: یہ استحقاق صرف شاہی خاندان کے شہزادگان یا صفِ اول کے امراء کو حاصل تھا۔ ستائیسویں برس اسے سلطنت کا دیوان مقرر کیا گیا۔ اسی برس اس نے عظیم مالی اصلاحات متعارف کرائیں:

مالی اصلاحات متعارف کراتا ہے: جس کی وجہ سے اسے اور اس کے آقا کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ آئین کی تیسری کتاب سے اس کی نئی فرد لگان کی مکمل تفصیلات کا پتہ چلتا ہے، جس نے بہرام خاں کے دیوان مظفر کے بندوبست کو منسوخ کر دیا، جو قانون گو حضرات کے حاصل پر مبنی تھا۔ اس نے سکہ سازی سے متعلق بھی قواعد و ضوابط تشکیل دیے، جس کی مکمل تفصیلات اکبر نامہ میں دی گئی ہیں۔ اس کی سب سے اہم اصلاح سرکاری حسابات میں فارسی متعارف کرانا تھی۔

سرکاری حسابات میں فارسی متعارف کراتا ہے: اس سے پیشتر یہ حسابات ہندو محرر ہندی میں لکھا کرتے تھے۔ اس نے اپنے ہم مذہب افراد کو اپنے حکمرانوں کی درباری زبان سیکھنے پر مجبور کر دیا اور انہیں سلطنت میں اعلیٰ ترین عہدوں کے لئے مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیا: جو اکبر کی فیاضانہ حکمت عملی کے باعث سب کے لئے یکساں طور پر دستیاب تھے۔

اسے یوسف زئیوں کے خلاف بھیجا جاتا ہے: انتیسویں برس بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو ملاقات کا شرف بخشا۔ بتیسویں برس ایک کھتری نے ذاتی رنجش کی بناء پر اس پہ قاتلانہ حملہ کیا۔ رات کے وقت پیش قدمی کے دوران وہ زخمی ہو گیا، مگر مجرم کو فوراً کاٹ کے رکھ دیا گیا۔ اسی سال کے دوران ٹوڈرمل کو بیربر کی موت کا انتقام لینے کے لئے یوسف زئیوں کے خلاف بھیجا گیا۔ جب چونتیسویں برس (1588ء) بادشاہ تو لاہور کا انتظام ٹوڈرمل کے ساتھ راجہ بھگوان داس اور قلیج خاں کے سپرد کر دیا گیا۔ اسی سال پیرانہ سالی اور گرتی ہوئی صحت نے راجہ کو اپنا استعفیٰ پیش کرنے پر مجبور کر دیا۔

اسے سبکدوش ہونے کی اجازت دے دی جاتی ہے: جس کو بادشاہ نے بادل نخواستہ منظور کر لیا۔ راجہ کو دریائے گنگا کے کنارے پر جانے کی اجازت دے دی گئی تاکہ وہ وہاں اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن گذار لے اور سکون سے مر سکے۔ تاہم، تجربے نے اکبر کو دکھا دیا تھا کہ وہ اپنے وفادار وزیر کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔

لیکن اسے دوبارہ فرائض منصبی پر بلا لیا جاتا ہے: چنانچہ، اس نے اسے ایک پیغام

بھیجا' جس میں اس پر زور دیا گیا تھا کہ گنگا کے کنارے پر بے مقصد بیٹھے رہنے کی بجائے اپنے فرائض منصبی کو احسن طریقے سے نبھانا زیادہ قابل تعریف عمل ہے' یوں اسے از سر تو اپنا عہدہ سنبھالنے کے لئے کہا گیا۔

اس کا انتقال 1589ء: بادشاہ کے احکامات کی پیروی میں راجہ اپنے فرض منصبی پر لوٹ آیا لیکن لاہور پہنچنے کے بعد گیارھویں روز 10 نومبر 1589ء کو انتقال کر گیا۔ کریا کرم (نعش سوزی) کے موقع پر اس کا دوست راجہ بھگوان داس وہاں موجود تھا۔ اپنے گھر واپسی پر اسی روز اس پہ حبس البول کا حملہ ہوا' جس کے باعث وہ بھی فوت ہو گیا۔ بادشاہ ابھی کابل ہی میں تھا کہ اسے اس کے دو انتہائی با اعتماد وزیروں اور دوستوں کے انتقال کی خبر پہنچائی گئی۔ انتقال کے وقت راجہ کے پاس چار ہزاری منصب اور وکیل السلطنت اور مشرف دیوان کے خطابات تھے (151)

اس کے خطابات: راجہ بھگوان داس امیرالامراء تھا۔ مارچ 1590ء میں بادشاہ نے اپنے انتہائی با اعتماد دوستوں اور مشیروں کے بغیر خود کو لاہور میں زبردست رنج و الم کی حالت میں پایا۔

اس کا کردار: ابوالفضل ذاتی طور پر ٹوڈرمل کو کبھی بھی پسند نہیں کرتا تھا' مگر وہ اس کے اوصاف اور دیانتداری کی تعریف کرتا ہے۔ راجہ ایک منفرد حوصلے کا حامل اور کٹر ہندو تھا۔ ابوالفضل اسے ایک متعصب ہندو کہتا ہے' یہاں تک کہ اس نے اکبر سے اس کے رویے کی شکایت بھی کی' مگر موخرالذکر چونکہ پرانے اور وفادار ملازموں کی پہچان رکھتا اور ان کی حمایت کرتا تھا' اس لئے اس نے اس کی شکایات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بیربر نے انتقال سے کچھ دیر پہلے اکبر کا دین الٰہی اختیار کر لیا تھا۔ ٹوڈرمل اس معاملہ میں بیربر کے یکسر برعکس تھا۔ ایک مرتبہ وہ اکبر کے ہمراہ پنجاب کی جانب پیش قدمی پر تھا' تو عجلت کے باعث اپنے بت (مورتیاں) کھو بیٹھا۔ چونکہ وہ بتوں کی پوجا کے بغیر کوئی کام نہ کرنے کا عادی تھا اس لئے اس نے کئی روز بغیر کھائے پیئے گزار دیئے۔ آخر کار' جب بادشاہ نے انتہائی مشکل سے اسے آمادہ کیا تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔

سلطنت کے امراء: بادشاہ کے امراء میں رشتے داری اور مرتبہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم شخصیت راجہ بھگوان داس کی تھی۔

راجہ بھگوان داس

کچھواہا کے تھم تھا K

کے بیٹے راجہ بہاری مل کا فرزند تھا۔ بہاری مل وہ پہلا راجپوت تھا جس نے اکبر کے دربار میں شمولیت اختیار کی۔ اسے دور حکومت کے پہلے سال کے اختتام سے قبل اکبر سے متعارف کرایا گیا۔ اس ملاقات کے موقع پر اکبر ایک مست ہاتھی پر سوار تھا۔ بہاری مل اپنے پورے خاندان سمیت سنگانیر کے مقام پر دربار میں حاضر ہوا' اس کا انتہائی عزت و احترام سے استقبال کیا گیا۔ (152) راجہ کی یہ درخواست قبول کر لی گئی کہ وہ اکبر کی ملازمت میں آنا چاہتا ہے اور بادشاہ سلامت کے ساتھ شادی بیاہ کے بندھن سے دوستی کو مزید تقویت دینا چاہتا ہے۔ اکبر نے سانبھر کے مقام پر راجہ کی بیٹی سے شادی کر لی اور پتن کے مقام پر راجہ' اس کا بیٹا بھگوان داس اور پوتا کنور مان سنگھ بادشاہ سے آن ملے۔ پورا خاندان آگرہ جاتے ہوئے اکبر کی معیت میں تھا۔ وہاں راجہ بہاری مل کو پنج ہزاری کماندار کا منصب عطا کیا گیا۔ راجہ آگرہ میں انتقال کر گیا۔

راجہ بھگوان داس کی بادشاہ کی ملازمت میں شمولیت: راجہ بھگوان داس اپنے باپ کے ہمراہ بادشاہ کی ملازمت میں شامل ہوا۔ 985 (1572ء) میں سرنال کے قریب ابراہیم حسین مرزا کے ساتھ لڑائی میں اس نے اکبر کی جان بچائی۔ تیسویں برس اسے پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا اور تیسویں برس اس کی بیٹی کی شادی شہزادہ سلیم (بعد ازاں' جہانگیر) کے ساتھ ہوئی۔ اس شادی کے نتیجہ میں شہزادہ خسرو پیدا ہوا۔ تیسویں برس اسے پنج ہزاری کماندار بنا دیا گیا۔ راجہ بھگوان داس (1581ء) 998 کے آغاز میں لاہور کے مقام پر راجہ ٹوڈر مل کے تھوڑی دیر بعد انتقال کر گیا۔ اس کے پاس امیر الامراء کا خطاب تھا۔

اس کا بیٹا راجہ مان سنگھ: راجہ بھگوان داس کے انتقال پر اکبر نے اس کے بیٹے مان سنگھ کو راجہ کا خطاب عطا کیا اور اسے پانچ ہزاری کماندار کا منصب عنایت کیا۔ جہانگیر کے دور حکومت کے نویں برس دکن میں طبعی موت سے انتقال کر گیا۔

سلطنت کے امراء میں ایک اور اہم شخص مرزا عبد الرحیم خان خاناں تھا۔

خان خاناں مرزا عبد الرحیم

اس کی خدمات: وہ بہرام خاں کا بیٹا تھا اور 964 (1556ء) بمقام لاہور پیدا ہوا۔ اس کی عمر ابھی پانچ سال تھی کہ اس کے باپ کو پتن کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔ اکبر نے اس کی ذمہ داری سنبھال لی' اسے مرزا خاں کا خطاب دیا اور بعد ازاں مرزا عزیز کوکہ کی ہمشیرہ ماہ بانو کی شادی اس

سے کر دی۔ اس نے احمد آباد میں مرزا مظفر کو دو مرتبہ شکست سے دوچار کیا' حالانکہ ایک لڑائی میں اس کے پاس صرف 10,000 سپاہیوں کا دستہ تھا جبکہ اس کے دشمنوں کی فوجی تعداد 40,000 تھی۔ ان فتوحات کے باعث اکبر نے اسے پانچ ہزاری منصب عطا کر کے انتہائی پر تکلف خطاب خان خاناں سے نوازا۔

واقعات بابری کا ترکی زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ: چونتیسویں برس اس نے بادشاہ کی درخواست پر واقعات بابری کا چغتائی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کی زندگی کے انتہائی شاندار کارناموں میں گجرات اور سندھ کی فتح اور بیجاپور میں سہیل خاں کی شکست ہیں۔ جہانگیر کی کابل سے واپسی پر نورجہاں نے عبدالرحیم کو مہابت خاں کے تعاقب میں روانہ کیا اور اس مہم کے لئے اپنی طرف سے بارہ لاکھ روپے دیئے۔ مگر اس سے پیشتر کہ ضروری تیاریاں کی جاتیں' مرزا جہانگیر کے دور حکومت کے اکیسویں برس' 1666ء میں بمقام لاہور بہتر برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔ اسے دہلی میں اس مقبرہ میں دفن کر دیا گیا' جو اس نے اپنی بیوی کے لئے تعمیر کروایا تھا۔

اس کا کردار: مرزا عبدالرحیم عربی اور فارسی زبان کا زبردست عالم تھا اور ترکی و ہندی زبانوں میں بھی بہت مہارت رکھتا تھا۔ بطور شاعر وہ رحیم تخلص رکھتا تھا۔ اس کی فیاضی اور علم دوستی ضرب المثل بن گئی تھیں۔ گجرات کی آخری فتح کے موقع پر اس نے اپنی پوری جائداد سپاہیوں کو دے دی' حتیٰ کہ سب سے آخر میں آنے والے سپاہی کو اپنا قلمدان بھی دے دیا۔ اکبر کو جن حضرات سے زبردست وابستگی تھی اور جنہوں نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی' ان میں اس کا رضائی بھائی' مرزا عزیز کوکہ خان اعظم بھی تھا۔

خان اعظم مرزا عزیز کوکہ

مرزا عزیز کی خدمات: مرزا عزیز' شمس الدین محمد اتگہ خاں (جس کو اکبر کی طرف سے اتگہ (رضائی باپ) کا لقب عطا ہوا تھا) کی بیوی' یعنی اکبر کی دائی جی جی انگہ کا بیٹا ہونے کے ناطے سے اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا۔ مرزا اکبر کے ساتھ پروان چڑھا تھا اسی وجہ سے اسے اس کے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔ 988 (1580ء) میں اسے ترقی دے کر پنج ہزاری منصب عطا کر کے اعظم خاں کا خطاب مرحمت کیا گیا۔ اسے دو مرتبہ بہار میں خراب حالات کو درست کرنے کے لئے بھیجا گیا

اور دور حکومت کے ستائیسویں برس اس نے بنگال کی طرف پیش قدمی کی۔ اکیسویں برس اسے دکن میں تعینات کیا گیا۔ بتیسویں برس اس کی بیٹی کی شادی شہزادہ مراد سے کر دی گئی۔ چونتیسویں برس اسے خان خاناں کی جانشینی میں گجرات کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس نے جام اور کچھ کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ سینتیسویں برس اس نے سومنات اور سولہ دیگر ساحلی قصبات کو فتح کیا اور جونا گڑھ کو تسخیر کیا۔ اٹھائیسویں برس حج ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ چلا گیا۔ اکبر کو اس کی جدائی کا افسوس ہوا' اس لئے اسے ہندوستان روانہ ہونے کے لئے بحری جہاز پر سوار ہونا پڑا۔ وہ 1003 (1594ء) میں دوبارہ اکبر سے آن ملا اور دین الٰہی کا رکن بن گیا۔ اسے بہار کا حاکم مقرر کیا گیا اور اگلے برس وکیل سلطنت بنا دیا گیا۔ 1018 (1599ء) میں جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو اکبر نے تابوت لے جانے میں خود بھی ہاتھ بٹایا۔

اس کی وفات 1623ء: جہانگیر کی حکومت کے پانچویں برس مرزا عزیز کو 10,000 سپاہیوں کی نفری کے ساتھ دکن روانہ کیا گیا اور جب آٹھویں برس شاہجہاں کو دکن کی کمان کے لئے بھیجا گیا تو مرزا عزیز کو شہزادے کا مشیر مقرر کیا گیا۔ مرزا عزیز جہانگیر کے دور حکومت کے انیسویں برس (1623ء) احمد آباد میں انتقال کر گیا۔

مرزا عزیز نے نظمیں لکھیں اور اس کے علاوہ وہ فن خطابت' بذلہ سنجی اور تاریخ کے علم کے لئے بھی بہت مشہور تھا۔

موسیقار: اکبر کی کابینہ کا انتہائی ہر دلعزیز شخص میاں تان سین تھا' جس کی صحبت اس کے لئے مسرت و شادمانی اور تفریح طبع کا سامان تھی۔

میاں تان سین

اکبر فن موسیقی کا ایک عظیم سرپرست: ابوالفضل کے فصیح و بلیغ الفاظ میں علم و فضل کا تعویذ اکبر موسیقی کا ایک عظیم سرپرست تھا۔ اس کے پاس اس فن کا اس قدر علم تھا کہ تربیت یافتہ موسیقاروں کے پاس بھی نہیں تھا' اس کے علاوہ وہ ایک بہترین فنکار تھا' خاص طور پر نقارہ بجانے میں بہت ماہر تھا۔ دربار میں ہندوستان' کشمیر' ایران' توران' تبریز اور ماوراالنہر سے آئے ہوئے دونوں اصناف کے بیشمار موسیقار تھے۔ درباری موسیقاروں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

تان سین کا اصل مالک: ہر حصہ ہفتہ کے ہر دن کے لئے وقف تھا' ان کا سربراہ گوالیار کا ایک مشہور و معروف راجپوت مطرب میاں تان سین تھا۔ وہ باندھو کے راجہ رام چند کی ملازمت میں تھا' جو مشہور و معروف موسیقاروں اور گویوں کا سرپرست تھا۔ اکبر نے اس کی شہرت سن کر دربار کے ایک امیر اور پنج ہزاری کماندار جلال خاں کرچی کو ایک فرمان کے ساتھ روانہ کیا۔

تان سین کی آگرہ کے دربار میں شمولیت: جس میں راجہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ تان سین کو آگرہ کے دربار میں شمولیت کی اجازت دے دے۔ فرمان میں حکم ایک درخواست کی شکل میں پوشیدہ تھا۔ راجہ نے اکبر کی درخواست کو رد کرنے کے سلسلہ میں خود کو کمزور محسوس کیا' چنانچہ' اس نے بوجھل دل کے ساتھ اپنے پسندیدہ مطرب کو بمعہ سازوسامان موسیقی اور ایک بہت بڑے اور قیمتی تحفہ (جو ہیرے جواہرات اور چند ہاتھیوں پر مشتمل تھا) کے ہمراہ آگرہ روانہ کیا۔ یہ واقعہ دور حکومت کے ساتویں برس رونما ہوا۔ جب اس نے پہلی مرتبہ دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو اسے بجا طور پر شاہی حکومت کے شایان شان انعام سے نوازا گیا' اس موقع پر بادشاہ نے اسے دو لاکھ روپے بطور انعام کے عنایت کئے۔ گویوں کا یہ شہزادہ دربار میں ہی رہا اور یہ زیادہ تر اس کے ہندی گانوں اور مدھر دھنوں کے باعث ہوا۔

اس کی نظمیں اور تراکیب: کیونکہ اکبر ہندوؤں کی منظوم داستانوں اور عشقیہ حکایات کو بخوبی سمجھ لیتا تھا' چنانچہ ان کی عادات و اطوار اور رسم و رواج کے متعلق گہری بصیرت حاصل کر کے بعد ازیں اس نے خود بھی انہیں اپنا لیا۔ تان سین کی مسحور کن نظمیں اور تراکیب آج بھی ہندوستان کے لوگ گاتے ہیں' اگرچہ اس کی متعدد شیریں دھنوں کا تعلق براہ راست اس کے بادشاہ کے ساتھ ہے۔

علماء اور مصنفین: دربار کے ساتھ وابستہ علماء اور ادیبوں میں خواجہ نظام الدین احمد اور ملا عبدالقادر بدایونی بھی تھے۔

خواجہ نظام الدین احمد

نظام الدین کا والد خواجہ مقیم ماروی: خواجہ نظام الدین شہنشاہ بابر کے ایک ماتحت خواجہ مقیم ماروی کا بیٹا تھا' جس نے اپنے دور حکومت کے آخری حصہ میں اسے شاہی گھرانے کا دیوان بنا دیا تھا۔ جب بابر کے انتقال کے بعد حیدر آباد کا صوبہ ہمایوں کے بھائی مرزا عسکری کے

حوالے کیا گیا تو خواجہ کو مرزا کا وزیر مقرر کیا گیا۔ ہمایوں قنوج کے مقام پر شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر آگرے کی طرف پلٹا' تو خواجہ نے اس کے ہمراہ آگرے کی طرف ہجرت کی۔ بعد ازیں اس نے شہنشاہ اکبر کے تحت خدمات سرانجام دیں۔

نظام الدین کی بطور بخشی گجرات میں تقرری: اس کے بیٹے نظام الدین کو اکبر کے شاہی گھرانے کا دیوان مقرر کیا گیا۔ ماثر الامراء کے مصنف کے مطابق' انتظامی علم اور فہم و فراست کی درستگی کے معاملہ میں وہ اپنے تمام ہمعصروں سے سبقت لے گیا تھا اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اکبر کے دور حکومت کے انتیسویں برس اسے صوبہ گجرات کا بخشی مقرر کیا گیا' یہ عہدہ کافی عرصہ تک اس کے پاس رہا۔ اکبر اس کے ادبی کمالات' جوش و خروش اور راست بازی کے متعلق بہت اچھی رائے رکھتا تھا۔

اس کی عظیم تصنیف طبقات اکبری: وہ طبقات اکبری کا مصنف ہے' جس کا شمار ہندوستان کی انتہائی مشہور و معروف تواریخ میں ہوتا ہے' اس کو تمام ہمعصر مورخوں نے اکبر کے دور کی ایک معیاری تاریخ گردانا ہے۔ وہ تاریخ کو اکبر کے دور حکومت کے ستائیسویں برس (1592ء) تک لے آتا ہے۔ عبدالقادر بدایونی اور فرشتہ دونوں نے اس تصنیف کی بہت تعریف کی ہے۔ بدایونی کو مذہب اور دوستی کے بندھن کے باعث خصوصی طور پر اس سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ 23 صفر' 1003 (1594ء) کو بخار کے باعث لاہور میں انتقال کر گیا اور اسے شہر میں واقع اس کے باغ میں دفن کر دیا گیا۔ اس کا شمار دربار اکبری کے بہترین افراد میں ہوتا تھا۔ وہ شمشیر اور قلم دونوں کا دھنی تھا اور شہہ سواری میں بھی اتنا ہی مشاق تھا جتنا قلم کا ماہر۔ خان خاناں مرزا عبدالرحیم اسے بہت پسند کرتا تھا اس نے اسے اپنے عملہ کے سربراہ کی حیثیت سے ملازم رکھا ہوا تھا اور عسکری و انتظامی معاملات میں ہمیشہ اس کے مشورہ پر عمل کیا۔

ملا عبدالقادر بدایونی

عبدالقادر بدایونی کی پیدائش: ملا عبدالقادر المتخلص قادری 947 یا 949ھ (1542ء) میں دہلی کے قریب ایک قصبہ بدایوں میں پیدا ہوا' اس لحاظ سے وہ اکبر سے دو برس بڑا تھا۔ وہ سانبھل کے صوفی بزرگ حضرت بنگو کے ایک مرید شیخ ملوک شاہ کا بیٹا تھا۔

علم و فضل میں اس کے زبردست کمالات: اس نے مختلف علوم کا مطالعہ کیا اور

موسیقی، تاریخ و علم نجوم میں بھی کمال حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اپنی خوش الحانی کے باعث بدھ کے ایام کے لئے درباری امام مقرر کیا گیا۔ زندگی کے ابتدائی دنوں میں اسے اکبر سے متعارف کرایا گیا، یوں وہ چالیس برس تک شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کی صحبت میں رہا: مگر وہ اپنے دل میں ان کے لئے دوستی کے جذبات نہیں رکھتا کیونکہ انہیں بدعتی سمجھتا تھا۔ وہ مذہب اسلام سے زبردست لگاؤ رکھتا تھا

دین اسلام کے ساتھ اس کی گہری وابستگی: اور دین اسلام میں متعارف کرائی گئی اکبر کی تبدیلیوں (بدعتوں) کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کی تاریخی تصنیف "منتخب التواریخ" اکبر کے دور حکومت سے لے کر 1004ھ (1595ء)

اس کی عظیم تاریخی تصنیف: یا اس بادشاہ کی وفات سے گیارہ سال قبل تک کے زمانہ کی ایک انتہائی قابل قدر تاریخ ہے (اس کے بعد جلد ہی بدایونی کا انتقال ہو گیا تھا) اس کا اسلوب فصیح و بلیغ ہے جو قاری کو اس کے وسیع علم اور زبردست ذہانت سے آگاہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خود مصنف کی تحریر کردہ عربی اور فارسی کی نظموں کی ہلکی آمیزش اور مشہور و معروف مصنفین کے اقوال اور خیالات

اس کا خاص وصف: اس کے وسیع علم کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ اگرچہ، اپنے دین کی حمایت کے سلسلہ میں اپنے جوش و خروش کی رو میں وہ مخالفین اسلام کے ساتھ نرمی کا ثبوت فراہم نہیں کرتا، تاہم، اس کی تصنیف کا خاص وصف یہ ہے کہ اس دور کے رجحان کے برعکس اس نے کبھی بھی شاہی حمایت میں اعلیٰ عہدیداروں کے کارناموں یا شاہی اقدامات کی جھوٹی تعریف نہیں کی بلکہ معاشرے کے مخصوص طبقات کی علیت یا مخصوص آراء اور مذہبی اعتقادات کے افراد سے آزاد ایک مکمل خود مختار جذبہ کے تحت ہر واقعہ درج کیا ہے۔ اس کی تاریخ بہت قابل قدر ہے کیونکہ یہ اکبر نامہ اور آئین اکبری کے مبالغہ آمیز طرز اسلوب اور مرزا نظام الدین احمد کی طبقات اکبری کے ناپسندیدہ قصائد اور ماثر رحیمی کے مصنف کا تضاد پیش کرتی ہے اور اکبر کے دور حکومت کے واقعات کا حال بتاتی اور اس کے دربار کا بیان ایک نقاد کے جذبہ کے تحت کرتی ہے۔ اس نے کبھی بھی انفرادی ناکامیوں کو نہیں چھپایا اور تاریخ کے عمومی سچ سے ہرگز پہلوتہی نہیں کی۔ مراۃ العالم کے مصنف بختاور خاں کے مطابق، اس کی تصنیف کو خفیہ رکھا گیا اور جہانگیر کے دور حکومت تک منظر عام پر نہیں لایا گیا۔

اکبر کے حکم پر بدایونی نے رامائن کا سنسکرت سے اور مہابھارت کے اقتباسات کا فارسی میں

ترجمہ کیا۔

عوامی زندگی سے علیحدگی اختیار کرلیتا ہے: اس کی تاریخ کے مندرجہ ذیل قطعات سے پتہ چلتا ہے کہ آخر میں اس نے عوامی زندگی سے علیحدگی اختیار کرلی اور دربار جانا بند کردیا تھا:

نہ تو میں خود کو درست حمایتی شخص خیال کرتا تھا' نہ ہی بادشاہ سلامت خدمت کے لئے موزوں تھے' اس لئے میں مکمل طور پر مطمئن تھا:

بیا تا تکلف بیکسو کنیم   نہ از تو پیام و نہ از ما سلام

ترجمہ: "ہم کیا آئیں جبکہ اب ہر تقریب ختم ہو چکی' نہ تو آپ کی طرف سے کوئی پیغام آیا نہ میری طرف سے سلام۔"

اور طویل وقفوں میں' میں بذات خود دیوان خاص کی دہلیز پر سجدہ ریز ہو جایا کرتا اور کچھ دیر تک وہاں ٹھہر جاتا تھا' محض ایک تماشائی کی حیثیت سے یعنی اس ضرب المثل کے مطابق:

کہ صحبت برنیاید تا موافق نیست مشربہا

ترجمہ: "جہاں عادات موافق نہ ہوں وہاں دوستی پیدا نہیں ہو گی۔" میں نے اس قول پر عمل کیا:

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است
صحبت گزاشتم ز تماشائیان شدم

ترجمہ: "میں نے محسوس کیا کہ آپ کی صورت دور سے دیکھنا' خیال کرنے سے زیادہ خوش کن بات تھی' میں نے آپ کی دوستی کو خیرباد کہا اور ایک تماشائی بن گیا۔"

وہ مندرجہ ذیل عربی نظم میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ بتاتا ہے کہ ملا اس جیسی الگ تھلگ حالت میں بالکل مطمئن تھا:

رضیت بما قسم اللہ لی   وفوضت امری الی خالقی
لقد احسن اللہ فیما مضٰی   کذلک یحسن ۔ فیما بقی

ترجمہ: "اللہ نے جو کچھ مجھے حصہ کے طور پر دیا ہے میں اس سے مطمئن ہوں۔ میں نے اپنے ہر کام کو اپنے خالق کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ میں نے ماضی میں اگر کوئی نیکی کی تو یہ خدا کی مرضی ہی تھی' آگے جو کچھ بھی آنے والا ہے وہ اس میں بھی ضرور بہتری پیدا کرے گا۔"

بدایونی کی شاندار تصنیف میں موجود قطعات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں' جن میں شہنشاہ اکبر کے مذہبی خیالات بیان کئے گئے ہیں۔ ہم نے اس سے پیشتر اس کے اقتباسات درج کئے ہیں۔ مذکورہ تصنیف اکبر کے دور کے انتہائی مشہور و معروف افراد اور شعراء کی دلچسپ سوانح حیات پر بھی مشتمل ہے۔

شعراء: درباری شعراء میں عرفی شیرازی کو انتہائی نمایاں مقام حاصل ہے۔

عرفی شیرازی

عرفی کا اصل نام: اس کا نام خواجہ سیدی محمد اور تخلص عرفی تھا' جو اس کے والد کے پیشہ کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ شیراز کے حاکم فوجداری کا نائب تھا' یوں اسے عرفی (جانے پہچانے قانونی معاملات) کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ وہ سمندر کے راستے دکن کی طرف روانہ ہوا' جہاں اس کی صلاحیتوں کی قدر نہ کی گئی۔ چنانچہ' فتح پور سیکری چلا گیا' جہاں شاہی طبیب حکیم ابوالفتح کی صورت میں اسے ایک سرپرست مل گیا۔ اس کی تعریف و توصیف میں اس نے قصیدے لکھے جو اس کے مشہور و معروف قصائد کا ایک حصہ بن گئے۔ اپنے سرپرست کے انتقال پر اس نے مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے تحت ملازمت اختیار کرلی۔

اس کی وفات 1582ء: لہٰذا اسے اکبر سے متعارف کرایا گیا۔ وہ 1582ء میں چھتیس برس کی صغر سنی میں بمقام لاہور انتقال کرگیا۔ تیس سال بعد اس کی نعش کو قبر سے نکال کر شاعر صابر اپنے ساتھ اصفہان لے گیا اور اسے نجف اشرف (حضرت علیؓ کے مقام مدفن) میں سپرد خاک کردیا گیا۔ وہ ایک شیعہ تھا' اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ' کی شان میں لکھے گئے قصائد میں سے ایک میں اپنی موت سے کافی عرصہ پیشتر اس کی پیشن گوئی کا پتہ چلتا ہے:-

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم　　اگر بہند ھلاکم کنی وگر بتتار

ترجمہ: "چاہے وہ مجھے ہند میں قتل کریں یا تاتار میں' میں اپنی پلکوں کے بل چل کر اپنی قبر سے نجف تک کا سفر کروں گا۔"

اس کی تاریخ وفات ان الفاظ میں ملتی ہے'

عرفی جوانہ مرگ شدی

ترجمہ: "عرفی تم جوان مرگ ہوگئے۔"

وہ ایک باصلاحیت شاعر تھا اور اس کے طرز اسلوب میں ایک مخصوص شان پائی جاتی ہے۔
اس نے خود ستائی اختیار کی۔

اس نے اپنے سرپرست کے لئے 14,000 اشعار چھوڑے' جن کو خان خاناں کی درخواست پر اصفہان کے سراجانے مرتب کیا۔ عرفی کو شہزادہ سلیم سے بہت انسیت تھی' چنانچہ اس نے اس کی اور اکبر کی تعریف میں بھی قصائد لکھے ہیں۔

چٹکلہ: ایک روز عرفی نے فیضی کو اس کے پالتو کتوں میں گھرے ہوئے دیکھا تو مذاق میں اس سے پوچھا "خاندان کے ان اچھی نسل کے بچوں کے نام کیا ہیں" بذلہ سنج شاعر نے جواب میں کہا' ان کا نام عرفی (153) یا (جانا پہچانا) ہے۔" اس پر ذہین عرفی نے فوراً ترکی بہ ترکی جواب دیا "مبارک" یہ اشارہ شاعر کے باپ کی طرف تھا' جس کا نام مبارک تھا۔ عرفی کے فوری جواب کے باعث فیضی کو زبردست خفت اٹھانا پڑی۔

دربار اکبری میں ایک اور مشہور عالم امیر فتح اللہ شیرازی تھا۔

امیر فتح اللہ شیرازی

امیر فتح اللہ شیراز کا رہنے والا تھا۔ اس نے طبعی فلسفہ کی تمام شاخوں خصوصاً میکانیات میں زبردست کمال حاصل کیا تھا' چنانچہ' ابوالفضل اس کے کمالات کی بہت اعلیٰ پیمانے پر تعریف کرتا ہے' وہ کہتا ہے: "اگر عہد رفتہ کی تمام کتابیں ضائع ہو جائیں' تو امیر اپنے علم و فضل کے بل پر انہیں دوبارہ درست کر دیتا۔" بیجاپور کے بادشاہ عادل شاہ نے اسے شیراز سے دکن بلایا۔ 988 (1580ء) میں عادل شاہ کا انتقال ہونے پر اکبر نے اسے اپنے دربار میں بلوا بھیجا اور اسے صدر سلطنت کی شان و شوکت سے نوازا۔ کچھ عرصہ بعد اسے اعزالدولہ (یا سلطنت کا بازو) کے خطاب سے مشرف کیا گیا۔ وہ 997 (1588ء) میں بمقام کشمیر فوت ہوا۔ ابوالفضل' فیضی اور بیربر کے بعد اکبر کا سب سے زیادہ چہیتا تھا۔

شاہی اطباء: شاہی اطباء میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

حکیم علی جیلانی: وہ ایران کے قصبہ جیلان کا رہنے والا تھا اور انتہائی ابتری کی حالت میں ہندوستان آیا لیکن بعد میں اکبر سے متعارف ہو کر اس کا بااعتماد ملازم اور دوست بن گیا۔ 988 (1580ء) میں اسے بحیثیت سفیر بیجاپور کے بادشاہ عادل شاہ کے پاس بھیجا گیا۔ دور حکومت کے

تیسویں برس اس نے ایک پراسرار حوض تعمیر کیا جس کی وجہ سے پورا دربار حیران و ششدر رہ گیا۔

پراسرار حوض: حوض کے ایک کونے سے اس کی گہرائی تک ایک سیڑھی نیچے تک لے جاتی تھی' وہاں سے ایک ڈیوڑھی ایک ملحقہ کمرے کی طرف جاتی تھی' جو چھ مربع گز کی شکل میں تھی اور اس میں دس یا بارہ افراد کو ٹھہرانے کی گنجائش تھی۔ ڈیوڑھی کچھ اس تدبیر سے بنائی گئی تھی کہ پانی کو کمرے میں داخل ہونے سے یکسر روک دیا گیا تھا۔ جب اکبر حوض میں غوطہ لگا کر اس کے پیندے تک پہنچا تو اس نے کمرے میں داخل ہونے پہ دیکھا کہ وہ مکمل طور پر روشن کیا گیا تھا۔ اسے گدیوں' قالینوں' تکیوں اور دیگر اشیاء سے آراستہ کیا گیا تھا اور مطالعہ کے لئے چند کتابیں اور تفریح کا سامان بھی موجود تھا: اس کے علاوہ ناشتہ بھی چنا ہوا تھا۔

دور حکومت کے چالیسویں برس علی کو ہفت ہزاری کماندار بنا کر "جالینوس زماں" کے خطاب سے نوازا گیا۔ دربار میں حکیم کو زبردست شہرت حاصل ہو گئی' خصوصاً اپنے کسیلے آمیزوں کے سلسلہ میں بہت مشہور تھا۔

اکبر کی وفات سے کچھ دیر پہلے حکیم علی نے اس کا علاج کیا تھا۔ جہانگیر نے 1017ھ (1608ء) میں علی کے حوض کا دورہ کیا اور اسے دو ہزاری کماندار بنا دیا۔ تاہم' وہ اس اعزاز سے زیادہ عرصے تک فائدہ نہ اٹھا سکا اور اگلے برس محرم الحرام میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ بڑے فیاضانہ دل کا مالک تھا اور غریبوں میں مفت ادویہ تقسیم کرنے کے لئے 6,000 روپے سالانہ خرچ کرتا تھا۔

حکیم ابوالفتح: حکیم ابوالفتح ایران کے علاقہ جیلان کا رہنے والا تھا اور اسے اکبر کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ اس کا سرکاری امور اور خود بادشاہ پر بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا۔ عظیم شاعر عرفی شیرازی اس کا ثناخواں تھا اسی لئے قصائد عرفی میں اس کی شان میں لکھی گئی بے شمار نظمیں شامل ہیں۔ ابوالفضل اور بدایونی دونوں نے اس کے کمالات کی زبردست تعریف کی ہے۔ وہ 997ھ (1588ء) میں زابلستان جاتے ہوئے انتقال کر گیا۔ چنانچہ' بادشاہ کے احکامات کے مطابق خواجہ شمس الدین اس کے جسد خاکی کو حسن ابدال لے آیا اور اسے خود خواجہ کے اپنے لئے تعمیر کردہ مقبرہ میں دفن کر دیا گیا۔ کشمیر سے واپسی پر اکبر نے ابوالفتح کے مزار پہ فاتحہ خوانی کی۔

حوالہ جات:

(115) مولوی (اب سر) سید احمد نے بغاوت ہند کے ممتاز مورخ سر جان کے کی درخواست پر مغل بادشاہوں کی رسم ختنہ کے موضوع پر ایک بیان لکھا۔ اس میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہمایوں کے دور تک تمام مغل بادشاہوں کے ختنے ہو چکے تھے۔ جب اکبر کی پیدائش ہوئی' تو اپنے والد کے ناسازگار حالات کے باعث اس کے ختنے نہ کئے جا سکے۔ جب ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان کا تخت حاصل کیا' تو اکبر پورے تیرہ برس کی عمر کو پہنچ چکا تھا اور ختنے کی رسم کے لئے اس کی عمر بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ بادشاہ اکبر اور اس کے وارثین کے ہندوؤں سے روابط کے باعث وہ ختنہ کی رسم کو اب اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے' لہٰذا' ہندوؤں کی تمام شادیوں کی یہ شرط بنا دی گئی کہ اولاد کے ختنے نہ کئے جائیں۔ سر سید نے یادداشت تحریر کی ہے کہ جب' 1857ء کی بغاوت سے کچھ عرصہ پیشتر دہلی کے برائے نام آخری بادشاہ بہادر شاہ نے اپنی جانشینی کے متعلق سوال اٹھایا تو وہ اپنی چہیتی ملکہ زینت محل کے بطن سے اپنے چھوٹے بیٹے جواں بخت کی جانشینی کے لئے متردد تھا اور اس نے اپنی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے مرزا فخرالدین المعروف مرزا فخرو کے حق کو خارج کر دیا۔ بوڑھے بادشاہ نے دلیل پیش کی کہ جانشینی کے لئے تیار کئے جانے والے چھوٹے بیٹے کے ختنے نہیں کئے گئے' جبکہ فخرالدین کی رسم ادا کر دی گئی تھی' چنانچہ وہ اس اعزاز کے لئے نامناسب ہے۔ اس بات کی یقین دھانی کرائی گئی کہ فخرالدین کے ختنے طبی وجوہات کی بناء پر کئے گئے تھے۔ اکبر کے متعلق سر سید کا بیان غلط ہے۔ ابوالفضل اور مرزا نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری دونوں نے اکبر کے ختنہ کا ذکر کیا ہے۔ مرزا لکھتا ہے :۔ مرزا یادگار ناصر در ملازمت مریم مکانی بہ کابل آمدہ وطوے سائے عظیم درین ایام ترتیب یافتہ و سنت حضرت شہزادہ دریں ایام بوقوع آمد۔

"مرزا یادگار ناصر ملکہ مریم مکانی (حمیدہ بانو) کی خدمت کے لئے کابل سے آیا۔ ان دنوں زبردست جشن منایا گیا' اور ننھے شہزادے کی رسم ختنہ ادا کی گئی۔" ایلیٹ' صفحہ 223۔ اس وقت اکبر کی عمر چار برس دو ماہ اور پانچ دن تھی۔

(116) آئین اکبری میں ایک تصویر کے ذریعے پہیے کی عکاسی کی گئی ہے۔

(117) میلہ مویشیاں پر باب 31' آئین اکبری۔

(118) باب' 84' آئین اکبری۔

(119) اکبر' از کاؤنٹ آف نوئر' جلد دوئم' صفحہ' 57۔

(120) کرکٹ اور ٹینس سے ملتا جلتا کھیل' مگر گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے۔

(121) جب اکبر کی ولادت عمر کوٹ میں ہوئی' تو اس کی بیوی اکبر کے لئے دایہ (انگہ) بن گئی۔

ہمایوں نے اسے جی جی انگہ کا خطاب عطا کیا۔ اکبر نے شمس الدین اتگہ خاں کو حاکم پنجاب مقرر کیا۔ اس نے اکبر کے پہنچنے سے قبل جالندھر کے قریب بیرم خاں کو شکست دی' اس خدمت کے صلہ میں اکبر نے اسے اعظم خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔

(122) اکبر کے شکاری کتے زیادہ تر راولپنڈی کے شمال میں واقع ضلع ہزارہ یا کابل سے آتے تھے۔ کتوں کو زیورات پہنائے جاتے تھے اور ان کے باقاعدہ نام رکھے گئے تھے۔ آئین اکبری۔

(123) ایلفنسٹن' جلد دوئم' صفحہ' 251۔

(124) ماہم انگہ اکبر کی ایک دایہ تھی اور اس نے پالنے سے لے کر تخت نشینی تک اکبر کی خدمت کی تھی۔ حرم اور اکبر پر اس کا اثر ورسوخ بے انتہا تھا۔ اس نے بہرام خاں پر زوال لانے کے لئے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

(125) ادھم خاں کا مقبرہ دوسرے لفظوں میں "بھول بھلیاں" کے نام سے مشہور عمارت قطب مینار دہلی سے موضع مہرولی کو جانے والی سڑک کے دائیں ہاتھ مینار سے پانچ منٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مثمن شکل کی ہے اور اس کا قطر 200 فٹ ہے۔

(126) محمد شمس الدین اتگہ خاں المعروف عظیم خاں کا مقبرہ موضع نظام الدین اولیاءؒ دھلی میں اس صوفی بزرگ کے مزار سے 20 گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسے اس کے دوسرے بیٹے مرزا عزیز کوکل تاش خاں نے تعمیر کروایا تھا۔

(127) اکبر کے دودھ شریک بھائی مرزا عزیز کوکل تاش کا مقبرہ دھلی میں اپنے والد عظیم خاں کے مزار سے تقریباً 20 گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ 64 ستونوں والا 69 فٹ کا ایک مربع شکل کا ایوان ہے اور اسی وجہ سے اسے "چونسٹھ کھمبا" کہا جاتا ہے' اسے مرزا نے بذات خود اپنی زندگی میں تعمیر کروایا تھا۔ اس کے ستون' جالیاں' فرش اور چھت سب سنگ مرمر کے ہیں۔

(128) آگرہ میں ابھی تک یہ میلہ منعقد ہوتا ہے' اسے چھڑیوں کا میلہ کہا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان کے متعدد دوسرے بڑے شہروں میں بھی منعقد ہوتا ہے۔

(129) اس وقت بادشاہ (1582ء) فتح پور میں رہائش پذیر تھا۔

(130) بدایونی۔ صفحہ 110۔

(131) اکبر نے دو ہندو راجپوت شہزادیوں سے شادی کی تھی۔

(132) وہ تھے الہ آباد' آگرہ' اودھ' اجمیر' احمد آباد' بہار' بنگال' دھلی' کابل' لاہور' ملتان' مالوہ' برار' خاندیس اور احمد نگر۔

(133) مغل بادشاہ بالکل قدیم ہندو راجاؤں کی طرح رہتے تھے اور وہ وسیع و عریض حرم سرا رکھتے

تھے۔ جب اپنی افواج کے ساتھ پڑاؤ کے ہمراہ باہر جاتے' تو اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے کر جاتے' جس پر مسلح عورتوں کا پہرہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے تربیت یافتہ درندے بھی پڑاؤ کے ہمراہ لے کر جاتے تھے۔

(134) اکبر کی والدہ کا لقب مریم مکانی تھا۔

(135) ان کے مزارات کے بیان کے لئے ملاحظہ کیجئے' باب دوئم' "سکندرا"

(136) ملاحظہ کیجئے' صفحات 71 اور 72 وغیرہ۔

(137) ملاحظہ کیجئے' صفحہ 73 سے قبل —— ہمارے بیان کی مزید تصدیق' اس تیسری سفارت کے بیان سے بھی ہوتی ہے' جسے گوا میں عیسائی حکام نے اکبر کے دربار میں بھیجا تھا' وہ لاہور اور آگرہ میں گرجے قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے 1595ء سے بادشاہ کے انتقال کے کافی عرصہ بعد تک اپنی کوششوں کو خفیہ رکھا۔ سفارت کا سربراہ سینٹ فرانسس کا ایک بھتیجا فادر جیروم ایکسیویئر تھا۔ یہ سفارت بادشاہ کو مائل کرنے میں ناکام رہی۔ فادر انتھونی بوتیلو (اکبر کے انتقال کے چند سال بعد بھی وہ صوبہ ہی میں تھا) کے تحریر کردہ مسودہ میں اکبر کے انجام کو واضح طور پر دکھایا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں فادر نے بیجاپور کے عادل شاہی شہزادہ کے ساتھ اپنی گفتگو بیان کی ہے' اس میں شہزادے نے اس سے کہا' سچ جیہنے کیہارا بنکسابکابر خرستین موحاکل بان؟ "سچ ہے کہ بڑا بادشاہ اکبر خرستین مواہ کہ ناہیں؟) "کیا یہ سچ ہے کہ شہنشاہ اکبر ایک عیسائی مرا؟ اس پر پادری نے جواب دیا۔ "جناب میرا خیال تھا کہ شاید ایسا ہی ہے' مگر بادشاہ جب تک زندہ رہا' اسے عیسائی بنانے میں کامیابی نہ ہو سکی' آخر کار وہ جس طرح پیدا ہوا تھا' اسی طرح ایک مسلمان کی حیثیت سے انتقال کر گیا۔"
بادشاہ اکبر کے لئے عیسائی سفارت' از ای' ڈی میکلیگن' بحوالہ

(138) بعد ازیں' ان کی نعشوں کو جمنا کے دوسرے کنارے پر منتقل کر دیا گیا' مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کب۔ ملاحظہ کیجئے' باب' دوئم۔

(139) ملاحظہ کیجئے' باب دوئم' صفحہ 231 سے قبل۔

(140) ایک ترکی خطاب' جو ہندوستانی امیر الامراء کے مساوی ہوتا ہے۔

(141) عبدالقادر بدایونی کہتا ہے کہ اس نے کمسنی میں آگرہ میں کئی سال تک شیخ مبارک کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔

(142) مسلمان مصنفین کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے' جو فیضی کو کفر کے الزام سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بیان کرتا ہے کہ مرنے سے قبل اس نے نبی کریمؐ پر درود بھیجا تھا۔ اسی طرح ابوالفضل کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب لاہور کے شاہ ابوالمعالی قادریؒ نے

ابوالفضل کو کافر قرار دے کر اس پر لعنت ملامت کی' تو انہوں نے رسول کریمؐ کو جنت الفردوس میں ایک اجلاس منعقد کرتے ہوئے اپنے خواب میں دیکھا۔ کہانی کے مطابق' ابوالفضل مجلس میں آیا' تو حضور پاکؐ نے اسے بیٹھنے کو کہا اور فرمایا: "اس شخص نے اپنی زندگی میں کچھ وقت تک برے کام کئے ہیں' مگر اس کی ایک کتاب کا آغاز "اے خدا' اچھے لوگوں کو ان کی نیکیوں کے بدلے میں جزا دے اور اپنی محبت کے صدقے میں برے لوگوں کی مدد کر" سے ہوتا ہے' لہٰذا ان الفاظ نے اسے بچالیا ہے۔" بلا خمین۔

(143) 1001 ہجری (1592ء) میں اس کی شادی شکر النساء بیگم سے ہوئی۔ اسے مالوہ کا حاکم بنادیا گیا' اس نے دکن کی فتح میں اپنا لوہا منوایا۔ اس کا دادا مرزا سلیمان المعروف والی بدخشاں ابوسعید مرزا کے پوتے کی حیثیت سے تیمور کی چھٹی پشت سے تھا۔ شاہ رخ ہفت ہزاری منصب پر فائز تھا' جو جہانگیر کے دور تک قائم رہا۔ بلا خمین۔

(144) بلا خمین' صفحہ 28۔

(145) اس کے مقبرہ کے بیان کے لئے' ملاحظہ کیجئے' باب 3' صفحہ ۲۷۹ سے قبل۔

(146) اس کے انتقال کے کوائف کے متعلق' ملاحظہ کیجئے' صفحہ ۳۴۹' ما قبل۔

(147) بدایونی۔

(148) بادشاہ سلامت پر ایمان لانے کے چار درجات تھے' ان کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ بادشاہ کے لئے' جان و مال' عزت و آبرو اور مذہب قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا یعنی جو شخص یہ چاروں چیزیں قربان کر دے اسے چاروں درجات حاصل ہو جاتے ہیں اور جو کوئی چاروں میں سے ایک شے قربان کرے اسے ایک درجہ اور اسی طرح دوسرے۔ بدایونی' صفحہ 288

(149 فضائل اربعہ یا چاروں ثواب عظیم' عقلمندی' حوصلہ' پاک دامنی اور انصاف ہیں۔

(150) ملاحظہ کیجئے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی کارروائی' ستمبر 1871ء صفحہ 178 : نیز امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا' "VIII" 401۔ راجہ ٹوڈرمل کو چونیاں ضلع لاہور کے کھتری رائے ٹوڈرمل سے ہرگز گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے' جو شاہ جہاں کے تحت ڈیڑھ ہزاری منصب دار تھا۔ ملاحظہ کیجئے' بادشاہ نامہ۔ جلد "II" صفحہ 728 سو خرالذکر شاہ جہاں کے تحت سرہند کا فوجدار تھا۔

(151) مشرف خزانے کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے' جو حسابات کی تصدیق کرتا ہے۔

(152) اکبر اور راجہ بہاری مل کے مابین پہلی ملاقات کی تفصیلات ملاحظہ کیجئے صفحہ ۲۹۹ وغیرہ۔

(153) عربی زبان میں عرفی کا مطلب جانا پہچانا ہے۔

باب چہارم

جدید شہر

آگرہ ڈویژن: آگرہ شمال مغربی صوبہ جات میں کمشنری یا ڈویژن کا صدر مقام ہے اور یہ چھ اضلاع' آگرہ' متھرا' فرخ آباد' ایٹہ' ایٹاوہ اور مین پوری پہ مشتمل ہے۔

ضلع آگرہ: یہ اسی نام کی ڈویژن کا ضلع بھی ہے' جس کا انتظامی صدر دفتر آگرہ شہر میں ہے۔ یہ ضلع شمال کی طرف متھرا اور ایٹہ مشرقی جانب مین پوری اور ایٹاوہ' جنوب کی طرف دھول پور و گوالیار کی ریاستوں اور مغربی جانب ریاست بھرت پور سے گھرا ہوا ہے۔

طبیعاتی پہلو: شمال کی جانب دریا بر آمد ایک بہت بڑا میدان گنگا اور جمنا کے درمیان دو آبے کی شکل میں موجود ہے' اس کی زمین بہت عمدہ اور پیداواری ہے: مگر اس زمین کی زرخیزی ہر طرف موجود چھوٹی چھوٹی کھائیوں کے باعث بری طرح متاثر ہوئی ہے۔

زراعت: خریف کی فصل باجرہ' جوار' موٹھ و دیگر غذائی اجناس اور کپاس پر مشتمل ہے' جنہیں جون میں پہلی بارشوں کے بعد کاشت کیا جاتا ہے۔ گندم' جو' چنے' پھلیوں اور دیگر دالوں پر مشتمل ربیع کی فصل اکتوبر یا نومبر میں بوئی جاتی ہے اور مارچ و اپریل میں پک کر تیار ہو جاتی ہے تو اسے کاٹ لیا جاتا ہے۔ باجرہ اور غلہ موسم خزاں میں بویا جاتا ہے' جبکہ نیل' پوست' تمباکو اور گنا بھی وافر مقدار میں کاشت کئے جاتے ہیں۔ مجموعی زیر کاشت علاقہ تقریباً" آٹھ سو ہزار (8 لاکھ) ایکڑ پر مشتمل ہے۔

قدرتی آفات: 1838ء میں ضلع آگرہ میں ایک بہت بڑا قحط پڑ گیا' اس وقت صرف آگرہ شہر میں حکومت نے 1,13,000 محتاجوں کو امداد بہم پہنچائی' جبکہ 3,00,000 بھوکے افراد روزمرہ ضروریات کے سامان کی تلاش میں مذکورہ ضلع میں وارد ہوئے۔ 1861ء' 69 - 1868ء اور 78 - 1877ء میں اس ضلع کو دوبارہ قحط کا سامنا ہوا' جس کے باعث اشیائے خورونوش کی شدید کمی واقع ہو گئی تو اس وقت حکومت نے عورتوں اور معذور حضرات کی بے لوث امداد کی' جبکہ

تندرست اشخاص کو نہر اور دیگر کاموں پر ملازمت دی گئی۔

تجارت: سلطان پور' شمس آباد' جوڑا اور قندھار پور میں عظیم الشان میلہ جات مویشیاں منعقد کئے جاتے ہیں لیکن سب سے بڑا تجارتی میلہ دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر باتیسر کے مقام پر منعقد ہوتا ہے' جہاں تقریباً" دو لاکھ افراد مقدس دریا میں اشنان کرنے کی خاطر اس کے کناروں پر جمع ہوتے ہیں۔ اس موقع پر گھوڑوں' اونٹوں اور مویشیوں کا بہت بڑے پیمانے پر کاروبار ہوتا ہے اور باتیسر کئی روز تک خوب رونق اور جشن کا سا منظر پیش کرتا ہے۔

آگرہ شہر: آگرہ کا جدید شہر ضلع کے تقریباً" وسط میں جمنا کے مغربی کنارے دریا کے خم پر واقع ہے' جہاں یہ دریا تیزی سے مشرق کی جانب مڑتا ہے۔ قلعہ زاویہ میں گھر آنے کے باعث کنارے کے عین اوپر موجود ہے۔ شہر کھائیوں سے پر زمین پر تعمیر کیا گیا ہے۔ قدیم آگرہ تقریباً" گیارہ مربع میل پر مشتمل تھا' مگر اب آباد علاقہ اس رقبہ کے نصف حصہ پر محیط ہے باقی ماندہ علاقہ کھنڈرات' کھائیوں' ملبے کے ڈھیروں اور چٹیل میدان کے قطعات کی شکل میں ہے' یہ آگرہ کا قرب و جوار کہلاتا ہے۔ قلعہ کے جنوب کی طرف چھاؤنیاں ہیں: شہر اور اس کے شمال مغربی جانب سول لائنز ہیں: جبکہ سول اسٹیشن اور دریا کے مابین شہر آباد ہے۔ شہر نگین راستوں سے آراستہ شاہراؤں کے ساتھ طویل بازاروں' پر رونق مارکیٹوں اور شمال مغربی صوبہ جات کے کسی بھی شہر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بڑھ کر پتھر کے عالی شان اور کشادہ مکانات کی بہت بڑی تعداد پر مشتمل ہے۔ اس کو بڑی عمدگی اور نفاست سے تعمیر کیا گیا ہے اور یہ رقبہ و اہمیت کے لحاظ سے شمال مغربی صوبہ جات میں دوسرا شہر ہے۔

کارخانے: آگرہ شہر ضلع کا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے' اس کے علاوہ مختلف اطراف میں نئی کاروبار کا آغاز بڑھتی ہوئی خوشحالی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ضلع میں ظروف سازی اور کھدر کی صنعتوں کے علاوہ تیل تیار کرنے اور روئی بیلنے کے متعدد کارخانے ہیں' اس میں کوئی شک نہیں کہ مقامی حکومت کا صدر مقام جنگ آزادی سے لے کر اب تک تجارتی لحاظ سے بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے۔ وسط میں واقع ہونے کے باعث اردگرد کے اضلاع کے روئی کے کاروبار کا ایک بہت بڑا حصہ اس شہر میں آتا ہے کیونکہ یہاں سات سٹیم پریس اور تین جننگ فیکٹریاں ہیں۔ روئی کاتنے کا ایک کارخانہ (سپننگ مل) کام کر رہا ہے اور دوسرا زیر تعمیر ہے۔ اس کے علاوہ چمڑہ رنگنے کا بھی ایک کارخانہ ہے' جہاں چمڑہ کمانے کے لئے جدید ترین یورپی آلات کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔ پتھر کا ایک بہت بڑا کاروبار موجود ہے' اس کی کانیں ضلع کے جنوب مغرب میں

واقع ہیں۔ سنگی کندہ کاری کا آغاز سب سے پہلے اکبر کے دور میں آگرہ سے ہوا اور اب بھی یہ کام لامتناہی توانائی' ذوق و شوق اور مہارت کے ساتھ جاری ہے۔ پتھر آگرہ میں کاٹ کر اور کندہ کاری سے مزین کر کے دریائے جمنا کے راستے برآمد کیا جاتا ہے۔

ریلوے: آگرہ شہر ایک عظیم ریلوے نظام کا مرکز ہے۔ اس میں مختلف لائنیں آ کر ملتی ہیں' لہٰذا یہ اس ضلع کے پھلتے پھولتے کاروبار اور صنعتی ترقی کا بین ثبوت ہے۔ ایسٹ انڈین ریلوے لائن پورے دو آبہ سے گذرتی ہے اور آگرہ میں راجپوتانہ سٹیٹ ریلوے کی پل پار کر کے قلعہ کی مخالف سمت میں فیروز آباد' تندلا اور برہان کے سٹیشنوں سے مل جاتی ہے۔ راجپوتانہ ریلوے لائن آگرہ سے بمبئی تک ہے اور آگرہ کو بھرت پور' جے پور' اجمیر' الور' ماؤنٹ آبو' مارواڑ' بڑودا' احمد آباد' پولن پور' سورت اور بروچ سے ملاتی ہے' اس میں اودے پور' اندور' نصیر آباد اور نیموچ کی برانچ لائنیں آ کر ملتی ہیں۔ سندھیہ سٹیٹ ریلوے لائن آگرہ میں راجپوتانہ لائن کو چھوڑتے ہوئے' اس شہر کو دھول پور' گوالیار' جھانسی اور بھوپال کے ساتھ ملاتا ہے' جبکہ ایک میٹر گیج لائن اچھیرہ کے مقام پر راجپوتانہ ریلوے سے علیحدہ ہو کر ضلع آگرہ میں آگرہ شہر کو متھرا کے ساتھ ملاتی ہے۔

آگرہ نہر: آگرہ نہر قابل جہاز رانی راستے کی حامل ہے اور بھاری بھرکم مال تجارت جمنا کے ذریعے مشرقی جانب پہنچایا جاتا ہے' حالانکہ ہلکی اشیاء اور مسافروں کی آمدورفت کے سلسلہ میں ریلوے اس سے سبقت لے گیا ہے۔ مذکورہ نہر دہلی' گڑگاؤں' متھرا اور آگرہ کے اضلاع اور ریاست بھرت پور کے لئے برائے جہاز رانی دستیاب ہوتی ہے۔ یہ مجموعی طور پر 376,800 ایکڑ رقبہ پر محیط ہے۔ آگرہ غذائی اجناس اور کپاس کا ایک بہت بڑا تجارتی مرکز ہے اور جنوب و مغرب کے لئے تجارت کرنے والوں کو کھیپ مہیا کرتا ہے۔ یہ بوندیل کھنڈ کی شکر' راجپوتانہ کی کپاس اور قریبی اضلاع کی گندم کے لئے بہت بڑی منڈی ہے۔ حتمی طور پر دیگر علاقوں میں استعمال کے لئے تقسیم کرنے سے قبل ان اضلاع کی اشیاء یہاں لائی جاتی ہیں۔

اہم مصنوعات اور تجارت: آگرہ اپنی ہر قسم کی سنہری لیس (گوٹہ)' بانسریوں' جوتوں' قالینوں اور سنگ مرمر میں پچی کاری کے کام کے لئے خصوصی طور پر مشہور ہے۔ آج کل بھی آگرہ میں کاریگر پتھر میں اتنی ہی نزاکت اور خوبصورتی سے پچی کاری اور کندہ کاری کا کام کرتے ہیں' جتنا مغل بادشاہوں کے ادوار میں ہوتا تھا۔ یورپی سیاح آگرہ کے سنگی کام کو اس کی سب سے اہم خصوصیت قرار دیتے ہیں۔

درآمد و برآمد: اہم درآمدات غلہ، کپاس، شکر، تمباکو اور نمک ہیں۔ آلو کی خاص درآمد نہایت عمدگی کے ساتھ مستقل طور پر ہوتی ہے، اس کی رسد فتح گڑھ سے آگرہ بھیجی جاتی ہے۔ اول الذکر مقام کے عالی حوصلہ کاچھی آگرہ سے فتح گڑھ درآمد کئے جاتے ہیں۔ کھاد کیلئے ارنڈ کے تیل کی تکیاں آگرہ کی آئل ملوں میں تیار کی جاتی ہیں—— برآمدات دریوں، فتح پور سیکری کی کانوں اور ہندروں کی پہاڑیوں سے حاصل کردہ آرائشی پتھر اور طلائی گوٹہ پر مشتمل ہیں۔

آبادی: 1891ء کی مردم شماری کے مطابق بلدیاتی حدود کے اندر آگرہ شہر کی آبادی کا تخمینہ 1,45,361 نفوس لگایا گیا: ان میں 95,711 ہندو، 44,021 مسلمان، 1,723 عیسائی اور 3,906 متفرق تھے۔ چھاؤنیوں کی آبادی 23,301 نفوس تھی، اس میں سے 14,965 ہندو، 5,348 مسلمان، 2,292 عیسائی اور 696 متفرق تھے۔ بلدیہ اور چھاؤنی کی مجموعی آبادی 1,68,662 نفوس پر مشتمل تھی، ان میں 1,10,676 ہندو، 49,369 مسلمان، 4,015 عیسائی اور 4,602 متفرق تھے۔

مکانات: مکانات پختگی اور طرز تعمیر کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں اور اکثر تین یا چار منزلہ ہوتے ہیں، زیادہ تر محلات میں بالائی منزلیں کندہ کاری سے مزین برآمدوں یا بالکونیوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ زیریں منزلیں کشادہ اور ہوادار ہوتی ہیں اور محراب دار سنگی برآمدوں سے گھری ہوئی ہوتی ہیں۔

بلدیاتی آمدنی اور اخراجات: سال 95-1894ء کے لئے مجموعی بلدیاتی آمدنی 4,99,078 روپے تھی، اس کا بڑا حصہ محصول چنگی سے حاصل کیا گیا تھا۔ خام وصولیوں کی رقم 3,87,9,32 روپے آبادی کے فی کس 11 - 2 - 1 روپے کے برابر تھی، اس میں 1,4,6,275 روپے بھی شامل ہیں، جو ذرائع آب رسانی پر خرچ کئے گئے۔

تعلیم: بلدیہ کے زیر انتظام یا اس کی امداد کے تحت چلنے والے مدارس ہیں: آگرہ کالج جس کو حکومت کے انتظام سے علیحدگی کے بعد مقامی آبادی کے نذرانوں اور امداد سے چلایا جاتا ہے؛ سینٹ جان کالج کی حوصلہ افزائی پروٹسٹنٹ مشنریوں کی جانب سے انتہائی جوش و ولولہ سے کی جاتی ہے؛ وکٹوریہ ہائی سکول اور مفید عام سکول، یہ سب اعلیٰ تعلیم کے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ سینٹ پیٹرز کالج اور کونوینٹ سکول ہیں، مزید یہ کہ تو نچلے درجہ کے زنانہ مدارس، ایک زنانہ مشن سکول، وویہ دھرم وردھان سکول، محمڈن کلب اور چرچ مشن بھی موجود ہیں۔ سینٹ پیٹرز کالج اس قطعہ زمین پر تعمیر کیا گیا ہے، جس کو شہنشاہ اکبر نے عیسائیت کے پرچار کے لئے چار دیواری

کرواکر وقف کر دیا تھا' یہاں سے اس مذہب سے تعلق رکھنے والے غریب ترین طبقات کو بے شمار فوائد میسر آئے۔ تھامسن ہسپتال کے ساتھ ایک میڈیکل سکول وابستہ ہے' جہاں طلباء کو اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ لیڈی ڈفرن کا ادارہ' تھامسن ہسپتال کے ساتھ منسلک ہے۔

اسکندرہ یتیم خانہ اسکول: اسکندرہ یتیم خانہ (اناتھ آشرم) سکول عیسائی پادریوں اور راہباؤں کی زیر نگرانی یہ ایک اور انتہائی مفید ادارہ ہے' جو طلباء کو مروجہ تعلیم کے علاوہ تکنیکی تعلیم بھی دیتا ہے۔ ایسے طلباء جو اپنی انگریزی تعلیم ایک اعلیٰ درجہ پر حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں انہیں سینٹ جان کالج میں داخل کرلیا جاتا ہے' جبکہ صنعتی شاخ میں دیگر طلباء کو لوہار اور ترکھان کی حیثیت سے تربیت دی جاتی ہے' یوں وہ ہنر مند دستکار بن کر فوری طور پر ریلوے کی مختلف ورکشاپوں میں ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ادارہ جلد سازوں' پریس مینوں' کمپوزیٹروں' ریڈروں' مالیوں اور درزیوں کی کھیپ بھی فراہم کرتا ہے۔ لڑکیوں کے شعبہ میں سوزن کاری اور مفید گھریلو فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسکندرہ یتیم خانہ عیسائی مشنریوں نے 1838ء کے قحط کے دوران قائم کیا تھا' اس وقت انہوں نے ایسے بے شمار یتیم بچوں کی ذمہ داری سنبھالی' جنہیں ان کے والدین نے چھوڑ دیا تھا۔

خیراتی ادارے: بلدیہ ایک غریب خانہ' ایک شفاخانہ امراض جذام اور دو زنانہ ڈسپنسریوں کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے' ان میں سے ایک بیلن منڈی اور دوسری لوہا منڈی میں ہے۔ اصطباغی پادریوں پر مشتمل مشنریاں باقاعدگی سے شفاخانہ امراض جذام کا دورہ کرتی رہتی ہیں اور جادوئی لالٹین وغیرہ کے شو منعقد کرواکر بدقسمت مریضوں کی یکسانیت اور اکتاہٹ کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ لیڈی لائل ہسپتال برائے خواتین بھی ہے۔ زنانہ ڈسپنسریاں انتہائی مقبول ہیں اور بہترین و مفید کام سرانجام دے رہی ہیں۔

محکمہ حفظان صحت: شہر کے محکمہ حفظان صحت کی دیکھ بھال نہایت توجہ سے کی جاتی ہے۔ قدرتی ذریعہ نکاسی آب بہت اچھا ہے اور پانی ماسوائے ان مقامات کے جہاں واٹر ورکس کے سٹینڈ پوسٹ موجود ہیں کسی جگہ نہیں ٹھہرتا۔

ذریعہ نکاسی آب: ایک مستعد ذریعہ نکاسی آب کے نتیجہ میں شہر کی شکل و صورت مکمل طور پر تبدیل ہو گئی ہے۔ سٹینڈ پوسٹوں اور گھروں کا گندا پانی نکالنے کی سطح سرآب کے لئے متعدد اصلی واٹر ورکس تعمیر کئے گئے ہیں: اس نظام کے تحت شہر کے کئی محلوں کا گندا پانی نکالا جاتا

ہے۔ شہر سے گذرنے والے نالوں کو بڑی حد تک بہتر بنایا گیا ہے۔ مسلسل بہنے والے نالوں کو مرکز میں کاٹ دیا گیا ہے اور اطرافی راستوں کو اس قدر وسیع کیا گیا ہے کہ وہاں چھکڑے اور دوسری گاڑیاں آسانی سے آجا سکیں: اس سے پیشتر وہاں سے پیدل گذرنا بھی دشوار تھا' جھاڑیاں اور جنگلات کاٹ کر جہاں تک ممکن ہو سکا ہے درخت لگائے گئے ہیں۔

آب و ہوا: مغربی ریتلے صحراؤں کی قربت کے باعث آگرہ میں درجہ حرارت کی شدت مشرقی علاقہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ موسم گرما میں درجہ حرارت شدید ہوتا ہے' جبکہ موسم سرما میں سردی متعدد یورپی شہروں کے مساوی ہوتی ہے۔ آب و ہوا کو غیر صحت بخش نہیں سمجھا جاتا۔ درجہ حرارت جنوری میں گر کر 40 درجہ ہوتا ہے اور جون میں بڑھ کر 115 درجہ تک ہو جاتا ہے۔ موسم سرما میں زندگی خوشگوار اور دلفریب ہوتی ہے لیکن موسم گرما میں گرمی کی شدت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اس لئے کمروں کے درجہ حرارت کو کم کرنے کے لئے مصنوعی ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔

ذرائع آب رسانی: بیلین گنج کے شمال میں نئے واٹر ورکس لگائے گئے ہیں' جو شہر کو صاف پانی مہیا کرتے ہیں۔ بہت بڑے افقی انجنوں کے ایک جوڑے کی مدد سے پانی پمپ کے ذریعے دریائے جمنا (154) سے نکالا جاتا ہے۔ ہر ایک میں پانی آگے پھینکنے والے ہمپوں کے تین سیٹ کام کرتے ہیں' جن کی پانی اٹھانے کی استعداد 1,600 گیلن فی منٹ ہے۔ افقی انجن لوسطا" تو گھنٹے فی دن کے حساب سے کام کرتے ہیں۔ پانی گھومنے والے تین مصفی ہمپوں سے گذرنے کے بعد تین ٹینکیوں میں پہنچتا ہے۔ جن کی گنجائش ساڑھے چھ ملین گیلن ہے۔ تین مصفی انجن ہیں' ہر ایک میں 20,000 مربع فٹ رقبہ پانی صاف کرنے کی گنجائش ہے۔ صاف پانی کے حوض کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصہ میں 630,000 گیلن پانی رکھنے کی گنجائش ہے۔ صاف شدہ پانی کو دو جڑواں کثیف عمودی انجنوں (کمپاؤنڈ کنڈ۔نسنگ بیم انجنز) کے ذریعے شہر میں بھیجا جاتا ہے' اس کا انتظام کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ یہ اکٹھے یا علیحدہ دونوں طرح سے کام کر سکتے ہیں۔ صاف شدہ اور غیر صاف شدہ پانی کی فراہمی ایک ہی عمارت سے ہوتی ہے اور یہ انجن مشینری اور برقی رو کے ذریعے ایک جیسے بوائلروں سے بھاپ کی فراہمی حاصل کرتے ہیں۔ اب پمپنگ اسٹیشن ٹیلی فون کے ذریعے میونسپل انجنیئر" میونسپل ہال اور بڑے بڑے پولیس اسٹیشنوں کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔

جدید عمارات: مندرجہ ذیل اہم جدید عمارات ہیں:۔

1- ڈرمنڈ روڈ پر واقع آگرہ کالج بلند کرسی پر تعمیر شدہ ایک منزلہ عمارت ہے۔ درمیان میں ایک کشادہ راستہ ہے' اس کی دونوں جانب کرہ ہائے جماعت کی قطاریں ہیں۔ ایک سائنس لیبارٹری کے علاوہ بڑی بڑی جماعتوں کے بیٹھنے اور بطور لیکچر روم کام دینے کے لئے ایک گیلری بھی ہے۔ کالج کے دو بڑے حصوں کے عقب میں سکول کی عمارت ہے۔ اس کے علاوہ بہترین اقامت گاہیں کالج کے ساتھ وابستہ ہیں۔

2- سنٹرل جیل تقریباً" ڈیڑھ میل قطر پر محیط عمارت ہے۔ یہ اپنے تیار کردہ خوبصورت قالینوں کے لئے بہت مشہور ہے' جو نہ صرف اس ملک کے امراء کے کمروں کو آراستہ کرتے ہیں بلکہ یورپ بھی بھیجے جاتے ہیں' جہاں اپنی نزاکت اور ملائم سطح کے باعث ان کی بہت زیادہ قدر و قیمت ہے۔ (155)

3- جج صاحبان کی عدالتیں اسی احاطہ میں منعقد کی جاتی ہیں' جس کو 1869ء میں الہ آباد سے منتقلی سے پیشتر آگرہ ہائی کورٹ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ منصف کی عدالت اور چھوٹے معاملات کی عدالت اس عمارت میں منعقد ہوتی ہے' جسے اس سے پیشتر ڈسٹرکٹ کورٹس کے لئے استعمال کیا جاتا تھا' جبکہ بار کے ممبران کے چیمبر ان کمروں میں ہیں' جو اس سے پہلے بورڈ آف ریونیو کے ارکان کے قبضہ میں تھے۔ آگرہ ایک سیشن جج کا ہیڈ کوارٹر ہے' جس کا دائرہ اختیار متھرا میں ہے۔

4- کیتھولک مشن اور یتیم خانہ' سنٹرل جیل کے عقب میں واقع ہیں۔ یہ ادارہ اس لئے بھی دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ اسے اکبر کے دور میں عیسائی پادریوں کے اثر و رسوخ کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کالج اور لڑکیوں کے اسکول منسلک ہیں' جن کے بیٹھنے کے لئے ان کشادہ عمارات میں بہت گنجائش ہے۔ ایک بہترین گرجا اور پادری کے ماتحت ایک عمارت کی بھی خوب اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

5- لارڈ میٹکاف کی یاد میں تعمیر کردہ میٹکاف ہال یونانی طرز تعمیر پر بنایا گیا ہے۔ یہ سرکاری جلسوں' ناچ گانوں' سماجی اجلاسوں اور تفریحات کو منعقد کرنے کے کام آتا ہے۔ چند انتہائی دلچسپ مقبرے اور یادگاریں بمعہ آرمینیائی عمارت کے عیسائیوں کے قبرستان میں دیکھے جا سکتے ہیں' ان میں سے سب سے نمایاں والٹرزین ہارٹ اور ڈائس سومبر کے مقبرہ جات ہیں۔ (156)

دیگر مشہور عمارات میں ایک مشنری ادارہ' سینٹ جان کالج: وکٹوریہ کالج جس کو الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک وکیل اور آگرہ کے باسی آنجہانی محترم پنڈت اجودھیا پرشاد کی فیاضی سے وجود

مڈل انگریزی اسکول شہر میں میونسپل کمیٹی کے قابل اور جفاکش سیکرٹری رائے بہادر منشی شیونارائن نے قائم کیا۔ فوجیوں کے لئے بیرکیں، تار گھر، تھامسن ہسپتال اور چند دیگر سرکاری عمارات ہیں۔ آگرہ کے مراکز کی کاروباری سرگرمیاں بیلن گنج میں ہوتی ہیں، جہاں سیٹھوں، بینکاروں، سوداگروں اور بیوپاریوں کی کشادہ دوکانیں موجود ہیں۔

آگرہ میونسپل بورڈ: یہ امر انتہائی اطمینان بخش ہے کہ میونسپل کمیٹی کے ارکان۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بھائی چارے اور دوستی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس حقیقت کا بین ثبوت یہ ہے کہ اسکندرہ میں کیلاش میلہ کے موقع پر ہر مذہب کے قابل احترام افراد نے اس موقع کے لئے فراہم کردہ خیمہ جات برائے طعام میں دوسرے مذہب کے افراد کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس سلسلہ میں صدر جناب آر۔ ڈبلیو کرویک شینک، میونسپل رپورٹ برائے 95-1894ء میں نائب صدر رائے بہادر منشی جگن پرشاد اور سیکرٹری رائے بہادر منشی شیونارائن کی بجا طور پر تعریف کرتے ہیں۔ اول الذکر صاحب کے متعلق وہ لکھتے ہیں:-

"یہ زیادہ تر ان کی خوش اخلاقی اور شاندار فہم و فراست کے باعث ہے کہ اب آگرہ میونسپل بورڈ کا اجلاس طبقاتی احساسات اور ذاتی منافرت سے قطعی طور پر پاک ہے۔" چیرمین لکھتے ہیں "منشی شیونارائن رائے بہادر نے یہ دکھا دیا ہے کہ بڑھتے ہوئے ماہ و سال ضروری نہیں ہے کہ توانائی کو کم کردیں، اس سلسلہ میں ان کی ماہرانہ ہدایت اور ذاتی توجہ کے لئے میونسپل بورڈ ان کا دلی طور پر مشکور ہے۔" (157)

میونسپل حسابات کو مروجہ سرکاری مالیات سے ہم آہنگ بنانے کے سلسلہ میں ایک سابق ڈپٹی کلکٹر اور ٹریژی آفیسر رائے بہادر بالموکند کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔

اراکین: میونسپل کمیٹی کے ارکان مندرجہ ذیل ہیں:

منشی عبداللہ؛ شیخ محمد عظیم؛ چوکے لال؛ بابو متھرا داس؛ رائے بہادر بالموکند؛ رائے بہادر جگن پرشاد؛ مولوی محمد مسعود حسین خاں؛ رائے دمودرداس؛ لالہ کنہیا لال؛ کنور کنہائی سنگھ؛ بابو صاحب نارائن؛ سیٹھ بیسنم مول؛ شیخ مولا بخش؛ حافظ محمد صدیق؛ لالہ ہرنارائن؛ لالہ فقیر چند؛ راجہ لچھمن سنگھ؛ ڈبلیو، ایم کلارک، بہادر؛ پنڈت سکھ دیو بسواس؛ لالہ اوتم چند؛ منشی عبدالرسول خاں؛ پنڈت امیر سنگھ؛ بابو مدھوبن داس؛ لالہ کشن پرشاد؛ حکیم سید مخلوت علی؛ بابو شاچرن گھوس منشی گنگا سہائے؛ مولوی محمد زین العابدین خاں بہادر۔

شمال مغربی صوبہ جات کے لیفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈونل کی آگرہ جدید کے بارے میں پیش کردہ رائے:

شمال مغربی صوبہ جات کے لیفٹیننٹ گورنر اور اودھ کے چیف کمشنر سر انتھونی پیٹرک میکڈونل کے۔ سی۔ ایس۔ آئی نے گزشتہ جنوری میں آگرہ کا دورہ کیا —— میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اراکین کے پیش کردہ سپاسناموں کے جواب میں ہز آنر کا خطاب انتہائی دلچسپ ہے کیونکہ انہوں نے قاری کے سامنے جدید آگرہ، اس کے مختلف اداروں اور امن کے فنون میں اس کے مستعد اور محنتی باشندوں کی ترقی کے بارے میں بالکل سچی تصویر پیش کی ہے۔ میونسپلٹی کو اپنے جواب میں انہوں نے کہا:

"اگرچہ آپ کا شہر اپنی قدیم شان و شوکت کھو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ایک فنکارانہ اور تاریخی دلچسپی اس سے وابستہ ہے، اس بات کا امکان نہیں ہے کہ وہ معدوم ہو جائے گی۔ ہم اس درخشاں دور کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، جس نے اس شہر کی بنیاد کو دیکھا ہے۔ سرکار، ادب اور فن کے سلسلہ میں ماضی کی عظمت کی یادداشتیں آپ کے ذہن میں ابھی تک برقرار ہیں، اس سے آگرہ میں رہتے ہوئے دل میں یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ موجودہ دور کے مقابلہ میں ماضی میں رہنا زیادہ بہتر تھا۔ تاہم، آپ نے اس تحریک کے برعکس ثبوت مہیا کیا ہے اور بحیثیت عملی انسان آپ موجودہ دور کو بہتر بنانے میں کوشاں ہیں۔ آپ کی توجہ ایک گذرے ہوئے زمانہ کے مندروں اور محلات کی بجائے سکول، ہسپتال اور کارخانے میں زیادہ ہے: بلاشک و شبہ آپ اس معاملہ میں بالکل درست ہیں۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ مادی لحاظ سے کی گئی ترقی آپ کو آپ کے شہر کی قدیم شان و شوکت سے بیگانہ نہیں کر دے گی اور یہ کہ آپ آگرہ اور اس کے قرب و جوار میں پائی جانے والی ہندوستانی ذہانت کی متعدد خوبصورت یادگاروں میں دلچسپی اور ایک فخر محسوس کریں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی محسوس ہوئی ہے کہ بحیثیت میونسپل کونسلر آپ کے کاندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے، آپ اس کو نہایت احسن طریقے سے سرانجام دے رہے ہیں۔ مجھے اس بات پر بھی مسرت ہوئی ہے کہ آپ نے میری توجہ شہر کی صفائی کے سلسلہ میں ہونے والی جس ترقی اور بہتری کی طرف دلائی ہے وہ ایک مستعد میونسپل انتظامیہ کی کارکردگی کا بین ثبوت فراہم کرتی ہے۔ آپ نے شہر کے تعلیمی اداروں کے سلسلہ میں جو حوالہ جات پیش کئے ہیں، میں نے اس پر اطمینان محسوس کیا ہے۔ آپ نے مجھے بتایا کہ ان اداروں کے انتظام و انصرام کے بارے میں آپ کا مطمع نظر یہ ہے کہ "نوجوانوں کو اس بات کی تعلیم دی جائے کہ وہ دوسروں کی امداد پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے آپ میں اعتماد پیدا کریں۔" کسی بھی اسکول کے دروازے پر اس سے بہتر اور کوئی عبارت (اصول عمل کے لئے) نہیں لکھی

جا سکتی اور اگر یہ سبق ابھرتی ہوئی نوجوان نسل اپنے ذہن و دل میں بٹھا لے تو اس بات کی امید ہے کہ مستقبل کا آگرہ ماضی کے آگرہ سے کسی طرح بھی حیثیت میں کم نہیں ہو گا۔ آپ کے سپاسنامہ میں اور بھی کئی نکات تھے' لہٰذا جب بلدیہ کے امور پر بحث کرنے کا موقع مجھے فراہم ہو گا تو موجودہ وقت کے مقابلہ میں' اس وقت زیادہ بہتری سے غور و خوض کیا جا سکے گا۔ اب میں ایک بار پھر آپ کے سپاسنامہ کے بارے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

میونسپل بورڈ کے سپاسنامہ کے جواب میں ہز آنر نے فرمایا: "آپ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے زیر انتظام تعلیم' طبی امداد' صفائی اور تعمیرات عامہ کے بڑے بڑے محکمہ جات نے خوب ترقی کی ہے۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ واقعی ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن آپ کے اپنے بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مثال کے طور پر تعلیم کے بارے میں آپ کے بیان سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے ابھی محض آغاز کیا ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ آپ نے اپنے سپاسنامہ میں سکولوں کی جو تعداد بتائی ہے (یعنی 129 سکول) وہ کسی طرح بھی ضلع کی تعلیمی ضروریات کو اطمینان بخش حد تک پورا کر سکتے ہیں۔ یہ ضلع 1,800 اور 1,900 مربع میل کے درمیان رقبہ کے علاقہ پر محیط ہے اور اس کی آبادی ایک ملین افراد ہے۔ موجودہ اسکولوں کی شرح ہر 14 مربع میل کے لئے ایک سکول سے بھی کم ہے اور ایک سکول بھی سکول جانے کی عمر کے ہر 1,000 بچوں کے لئے موجود نہیں ہے۔ شہری آبادی کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس سے پیشتر کہ یہ خیال کرتے ہوئے کہ اسکول مناسب طور پر کافی ہیں' قطعی فیصلہ سنا دیا جائے آپ کو ان کی تعداد میں چار گنا اضافہ کرنا ہو گا۔"

حوالہ جات

(154) پانی صاف کرنے کے تجربات کے نتائج کے متعلق کافی غور و خوض کرنے کے بعد حال ہی میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ دریائے جمنا کی موجودہ ریت کو تبدیل کر دیا جائے کیونکہ یہ تطہیری عمل کے لئے غیر تسلی بخش ثابت ہوئی ہے اس لئے اس کی جگہ دریائے چمبل کی ریت ڈال دی جائے۔

(155) جب اکتوبر 1895ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے ہزایکسی لینسی لارڈ ایلجن نے آگرہ جیل کا دورہ کیا تو اس وقت جیل میں قیدیوں کی تعداد 2,290 تھی' جن میں 74 عورتیں بھی شامل تھیں۔ ہزایکسی لینسی کو نیلے رنگ کے ایک قالین کا خوبصورت ڈیزائن دکھایا گیا' جسے حال ہی میں جرمنی کے بادشاہ کے لئے تیار کیا گیا تھا' اس کی بہت زیادہ تعریف کی گئی۔

(156) ان مقبروں کے بیان کے لئے ملاحظہ کیجئے۔ باب دوئم' صفحہ 287 وغیرہ۔

(157) مصنف کو بذریعہ ہذا تصنیف یہ موقع ملا ہے کہ وہ میونسپلٹی سے متعلق مواد فراہم کرنے (جس کی مدد سے میونسپل بورڈ کے اعداد و شمار اور تازہ ترین رپورٹوں کا خاکہ تیار کیا گیا ہے) کے سلسلہ میں آگرہ میونسپل بورڈ کے قابل اور محنتی سیکرٹری رائے بہادر منشی شیونارائن کے ہر قسم کے تعاون کا شکریہ ادا کر سکے۔

اشاریہ

BIBLIOGRAPHY کتابیات

1. Ain - i - Akberi, The translation of, by Professor Blochmann.
2. "Akber" by Count of Noer, Vol II, p 57.
3. A Voyage to East India, by Edward terry. p 81.
4. Beglar, Mr., references of his work.
5. Biography of Sir John Lawrance, by Bosworth Smith.
6. Bishop Heber, refrences of his work.
7. Blochmann - page 28.
8. Catron (Traveller) refrence of his work.
9. Civil and Military Gazette, Lahore.
10. Early History of Multan (1891), by Syed Mohammad Latif.
11. Elliot - V 223.
12. Elphinstone - Vol II. Page 234.
13. Gazetteer of India, by Sir William Hunter.
14. Hand book of Agra, by Mr Keene.

15. History of India, by Honourable Monstuart Elphinstone.

16. History of Lahore (1892 - A D) P.P 376 - 383, by Syed Mohammad Latif.

17. History of Punjab (1891-AD) by Syed Mohammad Latif.

18. History of India, by Wheeler, Edition of 1875.

19. History of India, by Murray.

20. History of India, by Rayard Taylor, P-508. Edition of 1883.

21. History of Sepoy War, By Sir John Kay.

22. Imperial Gazetteer of India, Vol III, 401.

23. "Jesuit Mission to the Emperor Akber" by M.E.D, Maclagan, Esq.

24. Manouchi - References of his work.

25. Memoirs of Baber, (p 357) by Erskine.

26. Miftahul Tawarikh, by Mr. Beal, (1847-AD).

27. Mughal Empire, by Keene, Edition of 1866, P.P. 76 & 78.

28. Muncipal Reports, furnished by Rai Bahadur Munshi Shiv Narain, Secretary, Agra Muncipal Committee.

29. Narrative of Du Jerrie, a Portugues missionary in the time of Akber.
30. Narrative of Reverend, John Robson.
31. Narrative about Taj Mahal, of lady Nugent, the wife of sir George Nugent, late Commander-in-Chief.
32. Narrative about Taj Mahal,of Mrs. G-Fagan, the wife of Col. C-Fagan, Adjutent General under Lord Combermere.
33. Official Reports, furnished by H. T. Hoare, Esq, Collector Agra.
34. Proceedings of Bengal Asiatic Society, September, 1871. Page-178.
35. Quintus Curtius (A Greek writer) references of his work.
36. Richard Temple, Sir, (Writer, Historian) references of his work.
37. Sleeman - references of his work.
38. Travels of a Hindu.
39. Travels into Bokhara, Vol II, P.P 121 - 123, by Bernier.
40. Travels of Captain Hawkins, (Envoy).

41. Travels of Calbanke.
42. Travels of Sir Thomas Smith.
43. Travels of William Finch (Traveller, in the time of Jahangir).
44. Travels of Thomas Coryart.
45. Travels of Sir Thomas Roe.
46. Travels of Tavernier (a French merchant and jeweller, 1640-AD).
47. Travels of Wandelslo, (1638-AD).
48. Travels of Rvd. C-J-French.
49. Travels of Mr. James Fergusson.
50. Travels in India, Vol I, Page 106, by Tavernier, (1640-AD).
51. Travels in the Moghal Empire, P-293, by Francis Bernier (A French traveller).
52. Travels of Raynor.
53. Travels of Catron.
54. Travels in India, Africa, etc., by Thomas Herbert, Page 64, Ed. of 1660, London.
55. Victor Hugo (Traveller) references of his work.

کتابیات

56 - آئین اکبری' از ابوالفضل۔

57 - اکبر نامہ' از علامی ابوالفضل۔

58 - انشائے ابوالفضل (مکتوبات) مرتبہ عبدالصمد۔

59 - بادشاہ نامہ' از ملا عبدالحمید لاہوری۔

60 - بدایونی۔ جلد دوم۔ صفحہ 310

61 - تاریخ مظفری۔

62 - تاریخ تاج محل (قدیم قلمی نسخہ) (مقبرہ کے متولین کے قبضہ میں ہے)۔

63 - تاریخ داؤدی (فارسی تصنیف) از عبداللہ۔

64 - تاریخ خان جہاں لودھی' از نیامت اللہ (1621ء)

65 - تاریخ سندھ' از محمد معصوم۔

66 - تزک بابری' از شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر۔

67 - تزک جہانگیری' از شہنشاہ نور الدین جہانگیر۔

68 - تزک جہانگیری (ترجمہ) از معتمد خان۔

69 - تذکرۃ الاولیاء۔

70 - تذکرۃ الواقعات' از جوہر (مورخ دور ہمایوں)۔

71 - تیمور کی سوانح عمری' از شرف الدین۔

72 - جامع اللغات (فرہنگ) از علامی ابوالفضل۔

73 - خلاصۃ التواریخ۔

74 - داستان' (عہد اکبری کی ایک تاریخ)۔

75- رسالہ مناجات' از ابوالفضل۔

76- سیر المتاخرین' از مولوی غلام حسین خان۔

77- شاہجہان نامہ' از ملا عبدالحمید لاہوری۔

78- شاہنامہ فردوسی۔

79- صواتی الالہام' تفسیر قرآن پاک (عربی) از ملا فیضی۔

80- طبقات اکبری' از مرزا نظام الدین احمد۔

81- عالمگیر نامہ' از ملا محمد کاظم۔

82- عبدالکریم کی یادداشتیں۔

83- عمل صالح' از محمد صالح۔

84- عیار دانش (فارسی ترجمہ' کلیلہ و دمنہ) از ابوالفضل۔

85- فرشتہ' از محمد قاسم۔

86- قرآن پاک کی چند سورتوں کی تفسیر' از ابوالفضل۔

87- قصائد سلمان' از مسعود سعد سلمان (عہد غزنوی)۔

88- قصائد فیضی' از ملا فیضی۔

89- قصائد عرفی' از عرفی شیرازی۔

90- قصائد ملا شیری' 1582ء۔

91- قصیدہ بردہ شریف۔

92- قصیدہ فرہنگی (سات سو اشعار پر مشتمل)۔

93- قصیدہ حضرت کعب بن زہیرؓ۔

94- قصص الاولیاء۔

95- کشکول (واقعات و قصہ کہانیوں کا مجموعہ) از علامی ابوالفضل۔

96- لیلا وتی (علم الحساب پر ایک ہندی تصنیف)۔

97- ماثر عالمگیری' از محمد ساقی۔

98- ماثر الامراء۔

99- مآثر رحیمی۔

100- مراۃ العالم' از بختاور خاں۔

101- منبع و نفیاس العیون' (تفسیر قرآن پاک) از شیخ مبارک۔

102- منتخب التواریخ' از ملا عبدالقادر بدایونی۔

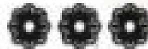
103- منتخب اللباب' از خفی خاں۔

104- موارید الکلام (بے نکت) از فیضی۔

105- مہا بھارت' از پراسارا۔

106- نفحات الانس۔

107- وقائع بابری (فارسی ترجمہ تزک بابری) از عبدالرحیم خان خاناں۔







سید محمد لطیف
1902-1845

مصنف کی تصانیف

1. **HISTORY OF THE PUNJAB**
   (From Remotest Antique to The Present Time)

2. **LAHORE**
   Its History Architectural Remains & antiquities.

3. **AGRA**
   Historical & Descriptive.
   With an Account Of Akbar and His Court
   and Of The Modern City Of Agra

4. **THE EARLY HISTORY OF MULTAN**

5. تاریخ پنجاب (ترجمہ)
6. تاریخ لاہور (ترجمہ)
7. آگرہ اکبر اور اس کا دربار (ترجمہ)
8. پنجاب میں سکھوں کا عروج و زوال
9. تاریخ ملتان (ترجمہ)
10. دیوان لطیف (شعری مجموعہ)



تخلیقات
اکرم آرکیڈ ۲۹۱ ٹیمپل روڈ (اسٹاپ والا چوک) لاہور پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۳